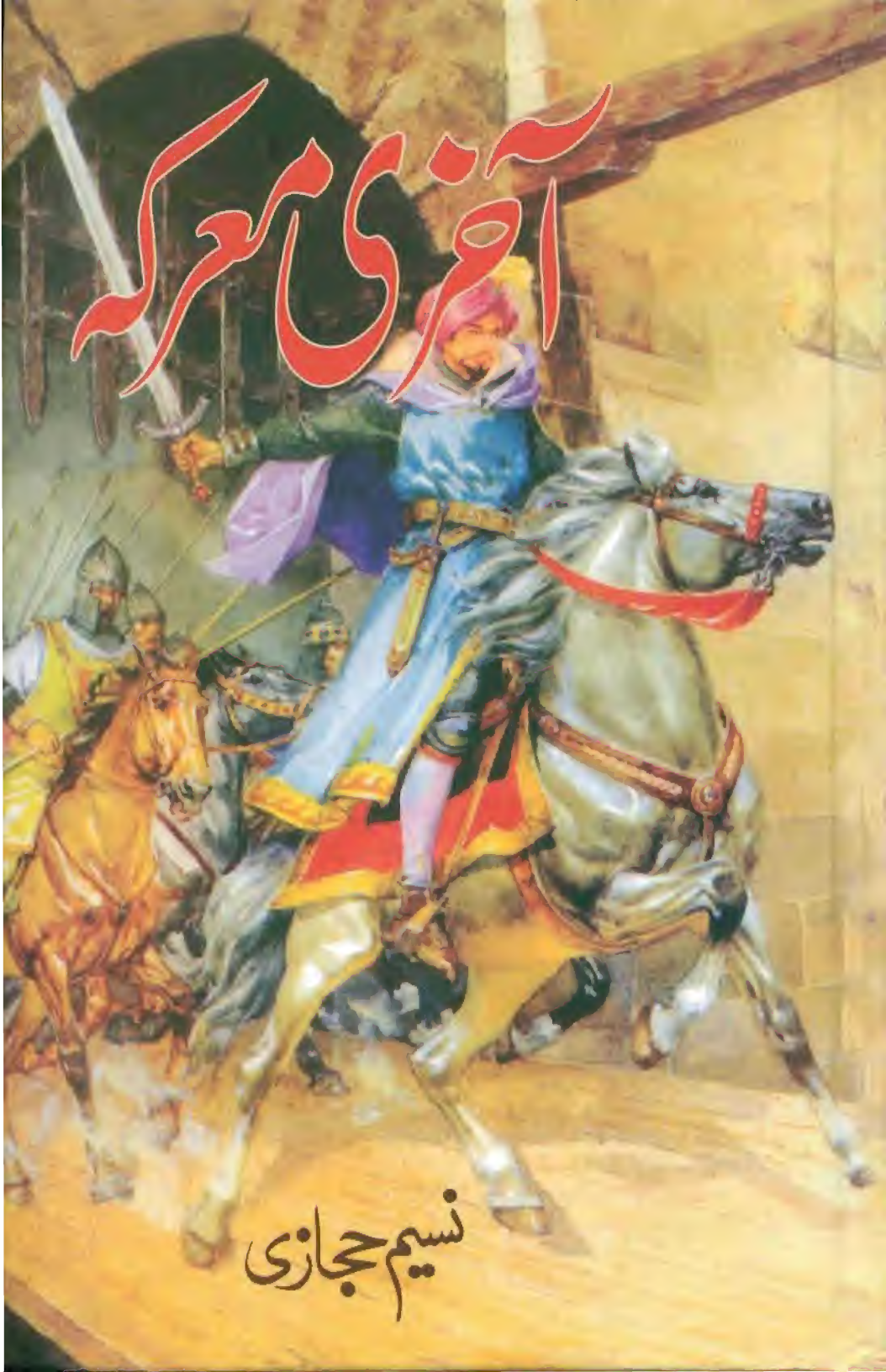


آفری ہرک



نسیم حجازی

آخری معرکہ

نسیم حجازی

جہانگیر بکس

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

برقِ سوزاں تیغِ بے زہارِ اُو
دشت و در لرزنده از یلعنِ اُو
مهرگرِ دِل از جلالش در رکوع
از شعاعش دوشش می گردد طلوع

(اقبال)

فہرست

۹	نئے دور کے مشعل بردار
۲۸	نندنہ کا قیدی
۵۹	آشا
۱۲۰	روپ دق
۱۴۵	اپنا گھر
۱۷۰	تلاش
۱۹۲	نیا ساتھی
۲۰۲	دہت کے کنارے
۲۱۶	رنبیر کی داپسی
۲۳۲	ایک اور فتح
۲۴۲	جے کرشن کی بیٹی
۲۵۲	نئی منازل
۲۶۷	شکستہ کی سرگزشت
۲۸۲	صبحِ مرت
۳۱۳	رام ناتھ کا سفر

نئے دور کے مشعل بردار

وہ جاہل تھے اور اپنی جہالت پر فخر کرتے تھے۔ اُن کے ماضی کی تاریخ نہ ختم ہونے والی قبائلی جنگوں تک محدود تھی اور ان کے سامنے ان جنگوں کو جاری رکھنے کے سوا کوئی مستقبل نہ تھا۔ جو ظلم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ظلم سننے پر مجبور کر دیے جاتے تھے لیکن جب اسلام آیا تو یہی لوگ ایک نئے دور کے مشعل بردار بن گئے۔ کادسائز فطرت نے اپنی رحمت کے نزول کے لیے ایک بے آب درگیاہ صحرا کو منتخب کیا۔ عرب کے ظلم کدے سے نور کا ایک سیلاب نمودار ہوا اور مختلف قبائل اور اقوام کو اپنے آغوش میں لیتا ہوا اطراف عالم پر چھا گیا۔

اسلام پڑھتے ہوئے صحرائیں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا اور خلقِ خدا اس کی پیاسی تھی۔ دنیا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور اسلام ایک نئی صبح کا آفتاب تھا۔ انسانیت ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہی تھی اور اسلام اس کے لیے عدل و مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔

بدو حنین کے معرکوں میں اسلام کی ابتدائی فتوحات دراصل صدیوں کی رونا، پس اور سسکتی ہوئی انسانیت کی فتوحات تھیں۔ موزغ جنھوں نے روم اور ا

۳۲۶

۳۲۹

۳۶۶

۴۰۰

۴۲۵

۴۵۰

۴۸۲

۵۰۰

۵۲۰

۵۲۹

۵۶۲

۵۶۹

مصر اور روپ وئی

زبیر اور دام ناٹھ

مندر کی دیوی

مفرد

جان پہچان

مدگار

ہن اور بھائی

دشمن کے گھر میں

نمٹان سے آگے

ستی

آخری معرکہ

جنگ کے بعد



کرنے کی ٹرپ پیدا ہوتی رہی۔ اگر انھیں کوئی اچھا حکمران یا دارہنما مل گیا تو انھوں نے مشرق و مغرب کی درمگاہوں میں ایک بادبھر گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کر دی کبھی ان کی اذائیں فرغانہ کی دادیوں میں گونجنی تھیں اور کبھی ان کے اقبال کے پرچم اندلس کے مرغزاروں میں لہراتے تھے :

(۲)

اموی حکمرانوں کے زوال کے بعد زمام حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں آئی تو ملوکیت کی خرابیوں کے ساتھ عجمی تصورات کی بُرائیاں بھی شامل ہو گئیں اور قبائلی اور قومی عصبیت نئی شدت کے ساتھ جاگ اٹھی۔ دین کا وہ رشتہ جس نے اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا، کمزور پڑ گیا اور عباسی خلفاء دور افتادہ ممالک کو مرکز کے ساتھ وابستہ نہ رکھ سکے۔

۳۲۸ھ میں عبدالرحمن الداخل نے ہسپانیہ میں اموی خاندان کی خود مختار سلطنت قائم کر لی اور اس سے چند سال بعد علوی خاندان کے ایک فرد اور یس نے مراکش میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ قریباً اسی زمانے میں طونس بھی عباسی سلطنت سے کٹ گیا۔ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں محمد بن زیاد نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اسی صدی کے وسط میں مصر کے گورنر احمد ابن طولون نے عباسی اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور مصر بھی علیحدہ ہو گیا۔ ۳۵۸ھ میں مصر پر فاطمیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور انھوں نے چند سال کے عرصہ میں شام پر بھی تسلط جمایا۔

انحطاط کے اس دور میں فارس، خراسان اور شمال کے ممالک پر بھی عباسی خلفاء کا اقتدار برائے نام تھا۔ ان ممالک کی گورنریاں چند خاندانوں کی میراث بن چکی تھیں۔ بنی عباس کے عروج کے زمانے میں اقتدار کی مسندوں پر عربوں کی بجائے ایرانی اُمراء قابض تھے لیکن زوال کے دور میں ایرانیوں کی جگہ ترک اُمراء نے لی۔

کے شہنشاہوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا، اب ان بوریانشینوں کو اقوام دلی کی قسمت کا فیصلہ کرتے دیکھ رہے تھے جو اپنی پٹی ہوئی قباؤں کو اپنے ہاتھ سے پوند لگا کر تے تھے۔

وقت کے فرعون، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواروں کی طرح حائل تھے۔ جب یہ دیواریں ٹوٹ گئیں تو ہمسایہ ممالک کے باشندوں نے دیکھا کہ عرب کے صحرائشین ان کے دشمن نہیں بلکہ دوست اور محاط بن کر آئے۔ ہیں چنانچہ وہ لوگ جو اپنی نسلی اور وطنی عصبیتوں کے باعث کبھی اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ اب کفر و اسلام کی درمگاہوں میں عربوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے۔

خلافت راشدہ اسلامی نظام حکومت کا ایک مثالی دور تھا لیکن اس کے بعد جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اسلامی سلطنت کا تدریجی زوال شروع ہو گیا۔ حکومت کے ایوانوں میں اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے حاوی نہ رہ سکا اور بعض دور تو ایسے بھی تھے۔ جب برسرِ اقتدار طبقہ کھلے بندوں احکام الہی کی خلاف ورزی کرتا رہا۔

تاہم اس انحطاط کے دور میں بھی ہمیں کبھی کبھی اسلام کے ابتدائی دور کی مثالی ریاست کی بھلبکیاں نظر آتی ہیں۔

قرن اولی کے مسلمانوں نے انسانی سیرت و کردار کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اس کا تصور مختلف ادوار میں ملت بیضا کے قافلوں اور قافلہ سالاروں کو ان کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں دکھاتا رہا جن کا تصور انبیاء کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ جس باغ کی خداں کا یہ عالم تھا اس کی بہار کیا رہی ہوگی۔

عامۃ المسلمین کے دلوں میں، مختلف زمانوں میں اس مثالی دور کی طرف رجوع

چوتھی صدی میں ہر ملک کا گورنر ایک خود مختار بادشاہ تھا اور حکومت کے شوق میں نئے نئے قسمت آزمایا میدان میں آ رہے تھے۔ عباسی خلفاء بے بس تماشائیوں کی حیثیت میں حکومت کے پرانے اور نئے دعویداروں کی زور آزمائی دیکھا کرتے تھے جو غالب آ جاتا وہ اس کی برائے نام سرپرستی قبول فرما لیتے تھے اور اُسے ایک ادھ خطاب سے نواذ دیتے تھے۔

سامانی خاندان جس کے عروج کی ابتدا خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں ہوئی تھی۔ تیسری صدی کے وسط تک ایک ایسی عظیم الشان سلطنت پر قابض ہو چکا تھا جو خراساں سے لے کر کاشغر، خوارزم اور طبرستان تک پھیلی ہوئی تھی عباسی خلفاء جن کے اسلاف نے سامانیوں کو خراساں کی امارت عطا کی تھی۔ اب اس خاندان کے مرنے اور سرپرست نہ تھے بلکہ مجبور اور بے بس دُعا گو بن کر رہ گئے تھے۔ چوتھی صدی کے وسط آخر میں اس سلطنت کا زوال شروع ہوا اور اس کے آخر تک سامانی تاجدار فقہ ماضی بن کر رہ گئے۔ پھر یہ سلطنت اقتدار کے نئے دعویداروں کی رزمگاہ بن گئی۔ لیکن غزنی کی وادیوں سے وہ عظیم الشان شخصیت نمودار ہوئی جس کی ہمہ گیر قوت کے سامنے ان قسمت آزمایوں کے حوصلے ٹھنڈے پڑ گئے۔ جن فضاؤں میں کرگس پرداز کر رہے تھے وہاں ایک عقاب نمودار ہوا۔ جن شکارگاہوں میں بھیڑیے اور گیسڈ چبچیں مارتے تھے وہاں اب ایک شیر کی گرج سنائی دینے لگی۔

محمود غزنوی کا ظہور سمندر کی اس اٹھتی ہوئی لہر کی طرح تھا جو اپنی راہ کی ہر موج کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ وہ ایک ایسا ناتج تھا جس کی تلوار کی جھنکار کبھی ترکستان اور کبھی ہندوستان کے میدانوں میں سنائی دیتی تھی۔ جس کے گھوڑے کبھی ججوں اور کبھی گنگا کا پانی پی پیتے تھے۔ وہ شاہراہ حیات کے ان مسافروں میں سے تھا جو کسی منزل پر قیام کرنے کی بجائے ہر منزل سے آگے گزر جاتے ہیں اور جن

کا ذوق سفر کسی سرحد کو تسلیم نہیں کرتا۔ پہاڑ دیا اور صحرا اس کی راہ کے سنگ میل تھے۔ غزنی جسے الپتگن کے زمانے میں معمولی شہرت حاصل تھی۔ محمود کی فتوحات کے باعث وسط ایشیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام بن چکا تھا جو خراساں، کرمان، سیستان، کمران، طبرستان، آذربائیجان، خوارزم اور فرغانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمالی ممالک کی فتوحات نے محمود کو تاریخ کے عظیم ترین فاتحین کے درجہ بدوش کھڑا کر دیا تھا لیکن ہماری داستان کا تعلق محمود غزنوی کی ان فتوحات کے ساتھ ہے جو ہندوستان میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

نظا ہر اس کے سامنے اطراف عالم میں اپنی فتح و نصرت کے پرچم لہرانے کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا لیکن ہندوستان میں قدرت اسے اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع مقصد کی تکمیل کی راہیں ہموار کرنے کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ قدرت جو خزاں رسیدہ چمن کے خشک پتے جھاڑ کر نئی بہار کے شکوفوں کی جگہ پیدا کرنے کے لیے شمال کی خشک اور تند و تیز ہواؤں کو حرکت میں لاتی ہے اور بھلے ہوئے صحراؤں کی بیاس بھانے کے لیے دریا فتادہ پہاڑی ندیوں میں چٹانوں کے سینے چیر کر اپنی گزرگاہیں بنانے کی قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اُسے ایک کا عظیم کے لیے منتخب کر چکی تھی۔

ہندوستان پر صدیوں سے اس فلسفہ حیات کی حکومت تھی۔ جس کا اولین مقصد انسانوں میں اوج اور نیچ، چھوت اور اچھوت کی تفریق پیدا کرنا اور اُسے قائم رکھنا تھا جب وسط ایشیا کے آریں فاتحین اس ملک میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنی ابتدا سامنے کے لیے زرخیز زمینوں اور سرسبز چراگاہوں کو منتخب کیا اور اس ملک کے قدیم باشندوں کے لیے صرف وہ جنگلات، پہاڑ اور بھر علاقے رہ گئے جنہیں آریں عمران اپنے تصرف میں نہیں لاسکتے تھے۔ پھر اپنی مفتوح اقوام پر دائمی تسلط قائم رکھنے اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات ختم کرنے کے لیے انھوں نے مذہب کے نام

ہوتے تھے۔ اگر اس مقدس زبان کا ایک لفظ بھی شودر تک پہنچ جاتا تھا تو اس کے کالوں میں گھلا ہوا سیر ڈال دیا جاتا تھا۔ اونچی ذات کے ہندو کا دھرم اچھوت کو چھونے اور اس کے ساتھ بات کرنے سے بھر شٹ ہو جاتا تھا۔ ان حالات میں شودر کسی حکم کے بغیر ہی اپنی جھونپڑیاں ہندو سماج کے خوشنما ایوانوں کی بھینٹ کر دیتے تھے۔

صدیوں ظلم و استبداد کی اس چکی میں پسے کے بعد جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، ایک شودر صرف ایک برہمن کی نگاہ میں ہی ذیل نہ تھا بلکہ خود اپنی نگاہوں میں بھی ذیل ہو چکا تھا۔ وہ سماج کا دشمن ہونے کی بجائے سماج کا ایک قابل نفرت حصہ بن جانے پر قانع ہو چکا تھا۔ جابر دھالم برہمن سے اس کی نفرت خوف اور خوف نیاز مندی کے جذبات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ دور دور سے ان ایوانوں کو سلام کرتا تھا جو اس کے اسلاف کی جھونپڑیوں پر تعمیر ہوئے تھے اور ان مندروں کی تقدیس اور عظمت کا اعتراف کرتا تھا جن کی مورتیوں کے سامنے برہمن اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اچھوتوں کا بیدان دیا کرتے تھے۔ وہ مقصد جس کے لیے آریہ قوم کے فاتحین نے منوجی کا فلسفہ حیات قبول کیا تھا پورا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے مغلوب اقوام کے لیے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے یا اپنے گھوٹے ہوئے حقوق کے لیے لڑنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

لیکن انسانوں کی تقسیم صرف یہیں تک محدود نہ رہی۔ بلکہ خود اونچی ذات کے ہندو بھی ادنیٰ اور اعلیٰ ذاتوں میں تقسیم ہو گئے۔ برہمن سب سے اعلیٰ تھے۔ اس لیے سب پر ان کی تعظیم فرض تھی۔ وہ مذہب کے اجارہ دار تھے اور مذہب میں دیوتاؤں کی پوجا کے ساتھ برہمنوں کی اطاعت بھی فرض تھی۔ کھتری ہندو سماج کا سپاہی تھا اور برہمن نے اپنی سہولت کے لیے سیاسی اختیارات اُسے سونپ

سے ایک ایسے سماجی نظام کو جنم دیا جس نے مغلوب اقوام کو ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس سماجی نظام کے نگہبان ہندو مذہب کے وہ مقدس دیوتا تھے جن کی نگاہ میں ایک برہمن ہر لحاظ سے قابل تعظیم تھا اور ایک شودر ہر لحاظ سے قابل نفرت۔ اونچی ذات کے ہندو کے بدترین اعمال بھی اس سے اس کی پیدائشی رتری نہیں بچیں سکتے تھے اور نیچ ذات شودر کے بہترین اوصاف بھی اس کے مقدر کی سپاہی نہیں دھو سکتے تھے۔

ہندو سماج کے قانون کی نگاہ میں اونچی ذات کے فرد کا کوئی گناہ اگر ناقابل معافی تھا تو یہ کہ وہ نیچ ذات کے کسی فرد کو انسان سمجھنے لگے اور نفرت حسدات کی اس دیوار کو پھاندنے پر آمادہ ہو جائے جو چھوت اور اچھوت کے درمیان کھڑی کی گئی تھی۔ منوجی کے حیلوں نے جس مسلک کو مذہب قرار دیا تھا اس کا نصب العین انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنا نہ تھا بلکہ مساوات کے تصور کی جڑیں کاٹنا تھا۔ اس کا مقصد کسی ضابطہ اخلاق کی اشاعت نہ تھا۔ بلکہ اونچی ذات کے انسانوں کے مفاد کی ترجمانی تھا۔ شودروں کو ہندو سماج کا قابل نفرت حصہ بنا کر اس ملک کے زرخیز علاقوں سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ کسی بستی کو شودروں سے خالی کر کے لیے انھیں ہر وقت تلوار اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ شودر کے اعصاب پر ان کی تلواروں سے زیادہ ان کے دیوتاؤں کی مورتیوں کا خوف سوار ہو چکا تھا۔ یہ مورتیاں جس مقام پر نصب کر دی جاتی تھیں وہاں شودر کا رہنا ناممکن بنا دیا جاتا تھا جس کو نہ ان سے ان مورتیوں کے بھاری پانی پیتے تھے وہ مقدس بن جاتا تھا اور ایک شودر کا ان کے قریب پھٹکا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جن مندروں میں ان مورتیوں کے لیے بھی گائے جاتے تھے ان کے آس پاس کے راستے شودروں کے لیے بند ہو جاتے تھے۔ بھاری اپنے دیوتاؤں سے منسکرت کی مقدس زبان میں بگلا

پر کھنے والے مذہب کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ بدھ مذہب کی مسخ شدہ صورت کو صرف اس حد تک ہندو مذہب میں جذب ہونے کی اجازت دی گئی جس حد تک کہ وہ اپنی ذات کے اقتدار کے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں بس سلاسلے کے سلطان نک محمد بن قاسم کی فتوحات نے اس ملک میں ایک نئی روشنی کے دروازے کھول دیے۔ یہ دور اگرچہ اسلام کا مثالی دور نہ تھا لیکن ابتدائی دور کی بہت سی خصوصیات ابھی تک باقی تھیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ کر ان کا راستہ روکنے کے لیے تلوار اٹھائی تھی، ان کی اکثریت اسلام کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھ کر اسلام کے علمبرداروں کی جماعت میں شامل ہو گئی۔ مسلمانوں کے سترہ سالہ سپہ سالار کی فتوحات نے ہندوستان کے طول و عرض میں ان الزاموں پر لرزہ طاری کر دیا جن کی بنیادیں چھوٹ اور اچھوت کی تفریق پر رکھی گئی تھیں لیکن محمد بن قاسم کی بے وقت موت کے باعث یہ گھٹا جو ہندوستان کے لیے نئی بہادری کا پیغام لے کر آئی تھی، ملتان سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اموی خاندان کے عہد حکومت تک سرگز کے ساتھ سندھ کا تھوڑا بہت تعلق قائم رہا لیکن عباسیوں کے زمانے میں یہ رشتہ عملی طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ عباسی سلطنت کے اختیارات کی حدود سے باہر ہونے کے باعث سندھ عالم اسلام کے تخریبی عناصر کے لیے ایک جائے پناہ بن گیا۔ ہر وہ خطرناک تخریب جس کے لیے اسلامی دنیا میں بڑھنے اور بھولنے کے امکانات ختم ہو جاتے تھے۔ سندھ میں پناہ لیتی تھی۔ فتنہ پردازوں اور انتشار پسندوں کے وہ گردہ جنہیں عباسی حکومت کچلنے کی کوشش کرتی تھی چاروں طرف سے فراہم ہو کر سندھ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیتے تھے۔ سندھ میں اسلام کے نظریات کو کبھی اور ہندی تصورات کی آمیزش نے پہلے ہی کافی حد تک مسخ کر رکھا تھا۔ اب نئی بدعتوں نے اس کی رہی سہی صورت بھی بگاڑ کر رکھ دی۔

لکھتے تھے کھتری اپنی تلوار کی طاقت سے حکومت حاصل کرنا تھا اور برہمن اس کے مشیر کی حیثیت سے حکومت کا کاروبار اپنی مرضی کے مطابق چلاتا تھا۔ حکومت کا اولین مقصد ان حد بندیوں کو قائم رکھنا تھا جو برہمن اداس کے بعد کھتری کی برتری منوانے کے لیے ضروری تھیں۔

ملک کے محنت کش لوگ دلش کھلاتے تھے۔ انھیں برہمن اور کھتری کے مقابلے میں کم تر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے خون اور پسینے کی کمائی سے کھتری حکمرانوں کے محل اور برہمن پیشواؤں کے مندر تعمیر ہوتے تھے۔ تاہم برہمن جو نذرانہ وصول کرتا تھا۔ وہ حکمرانوں کے خراج سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ حکمران صرف دلش کی آمدنی کا ایک حصہ لے سکتا تھا لیکن برہمن کے مندر کا خزانہ پر کرنے کے لیے دلش کی طرح کھتری حکمران بھی اپنی آمدنی کا ایک حصہ مندروں پر وقف کرنے پر مجبور تھے۔

برہمن اور کھتری کی دہری حکومت میں ملک کا محنت کش طبقہ بری طرح پس رہا تھا لیکن کسی کو سسکنے، کراہنے یا شکایت کرنے کی اجازت نہ تھی۔

بدھ مت اس سماجی نظام کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ یہ ایک سیلاب تھا جس کی لہر میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں اور کچھ مدت کے لیے اس نے ان بلند چٹانوں کو بھی اپنے آغوش میں لے لیا جن پر برہمن کے اقتدار کے محل کھڑے تھے لیکن اس کی طغیانی کا زور کم ہوتے ہی یہ چٹانیں پھر نمودار ہونے لگیں اور ہندوستان کی سرزمین ایک بار پھر منوجی کے جیلوں کی تسکناگاہ بن گئی۔ بدھ مت نے انسان کو اچھے اور برے اعمال کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور یہ برہمن کی نسلی برتری کے خلاف ایک اعلان جنگ تھا۔ چنانچہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے بعد بدھ کے جیلوں کے خلاف برہمن کے ہاتھ میں انتقام کا خنجر اس خنجر سے کہیں زیادہ تیز تھا جو اس نے کسی زمانے میں شوروں کے خلاف اٹھایا۔ دیوتاؤں کی سرزمین میں دیوتاؤں کے مقدس بیٹوں کو عام انسانوں کی طرح اعمال کی کسوٹی پر

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں غزنی کے افغانوں سے جو طوفان نمودار ہو رہا تھا، وہ قدرت کی طرف سے ہندوستان کے برصغیر میں بسنے والے ان گنت انسانوں کی صدیوں کی پیکار کا جواب تھا۔

(۳)

دہند کی سلطنت کے ہندو حکمران کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کی ابتدا سلطان محمود غزنوی کے باپ سبکتگین کے عہد میں ہوئی تھی۔ راہ بے پال کے عہد حکومت میں اس سلطنت کی حدود لمغان سے دریا ئے چناب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بے پال کو اپنی فوجی قوت کی برتری پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے شمال کی سرحد پر سبکتگین کے حملے سے غضب ناک ہو کر غزنی کی سلطنت کو ہمیشہ کے لیے نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ غزنی پر چڑھائی کر دی۔ سبکتگین نے لمغان اور غزنی کے درمیان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ ہندو بہادری کے ساتھ لڑے لیکن مسلمانوں کے پلے درپلے حملوں اور اس کے ساتھ برہمنوں کے طوفانوں نے ان کے حوصلے توڑ دیے۔ بے پال نے اپنی سرحد کی چند بستیوں اور قلعے سبکتگین کے حوالے کرنے اور خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی لیکن واپسی پر اپنی سلطنت کی حدود میں داخل ہوتے ہی اپنے عہد سے پھر گیا اور اس نے سبکتگین کے ان افسروں کو قید کر لیا جو تراج و وصول کرنے کے لیے اس کے ہمراہ آئے تھے۔ سبکتگین نے اس عہد شکنی کی سزا کے طور پر فوج کشی کی اور سرحد کے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

بے پال نے شمال ہند کے کئی راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے بلایا اور ایک لاکھ فوج کے ساتھ دوبارہ غزنی پر چڑھائی کر دی لیکن سبکتگین نے قبیل فوج کے باوجود پشاور اور لمغان کے درمیان بے پال اور اس کے حلیفوں کے لشکر جبار کو تتر بتر کر دیا۔

محمود اپنے باپ کے ساتھ ان جنگوں میں شریک ہوا تھا اور وہ یہ اندازہ کر چکا

تھا کہ غزنی اور ہندوستان کے درمیان فیصلہ کن معرکے ابھی باقی ہیں۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ ہر نئے معرکے میں بے پال کی فوج تعداد میں پہلے سے زیادہ ہوتی تھی اور اگر اس کے حکمران اسی طرح بے پال کی حمایت پر میدان میں آتے رہے تو کسی دن غزنی کی سلطنت کو اس برصغیر کی ان گنت افواج کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس لیے جب تک ہندوستان میں یہ لامحدود قوت موجود ہے۔ کوئی دریا یا کوئی پہاڑ غزنی کے لیے خط دفاع نہیں بن سکتا۔ چنانچہ محمود اپنی مداخلت کے لیے بھی اُن خطرناک عناصر کو منتشر اور مغلوب رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ جن کا اتحاد کسی وقت بھی نہ صرف غزنی بلکہ شمال اور مغرب کے کئی ممالک کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔

ہندوستان میں دہند کی ہم پلہ کئی اور سلطنتیں تھیں اور محمود نے دہند کی طاقت سے متاثر ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان سلطنتوں کی طاقت کو کھوکھلا رکھنے کے لیے ہر سال کم از کم ایک بار کسی نہ کسی سلطنت کے ساتھ ضرور ٹکرائتا رہے گا۔

سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی کی مسند حکومت پر رونی افروز ہوتے ہی محمود نے ہندوستان پر حملے شروع کر دیے۔ ۳۹۰ھ میں محمود نے لمغان کے آس پاس بے پال کی سلطنت کے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے پھر چڑھائی کی۔ بے پال محمود کے پندرہ ہزار سواروں کے مقابلے کے لیے تیس ہزار پیادہ فوج بارہ ہزار سواروں اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ پشاور کے قریب ۸ محرم ۳۹۲ھ کے دن فریقین کے درمیان ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دوپہر کے قریب غزنی کے ترکمان نیزہ بازوں کے تند و تیز حملوں کے باعث بے پال کی افواج میں سرسریگی پھیل گئی اور ہندو لشکر میدان میں پانچ ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ بے پال اپنے پندرہ بیٹوں اور پوتوں سمیت گرفتار ہوا اور اڑھائی لاکھ دینار اور پچاس ہاتھی بھروسہ فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کی لیکن دہند واپس پہنچنے کے بعد اس نے پلے دپلے

نے انھیں غیرت دلائی اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر دشمن کی اگلی صفوں پر ٹوٹ پڑا۔
جانبازوں کے گردہ آن کی آن میں اپنے امیر کے دائیں بائیں جمع ہو گئے اور اس
کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے قلب تک جا پہنچے۔ محمود کی اس شجاعت
نے تمام فوج میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ سینہ اور میسرہ کے نیزہ باز دشمن کے دائیں
بائیں بازو پر ٹوٹ پڑے اور دشمن جو اپنی فتح کے متعلق پر امید ہو چکا تھا۔ اب تیزی
سے پیچھے ہٹنے لگا۔ غروب آفتاب سے قبل باجی رائے میدان چھوڑ کر قلعے میں پناہ
لے چکا تھا۔

بٹھنڈہ کے قلعے کی خندق اس قدر چوڑی اور گہری تھی کہ کسی حملہ آور کے لیے
براہ راست فسیل پر لینا کرنا ممکن نہ تھا۔ محمود نے خندق کے ایک حصے کو درختوں
اور پتھروں سے بھر دینے کا حکم دیا۔ باجی رائے کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو
خندق پھاندنے اور فسیل پر لینا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ اس
نے مالوسی کی حالت میں ایک رات قلعہ سے بھاگ کر جنگل میں پناہ لینے کی کوشش
کی لیکن محمود کے چند دستوں نے جنگل میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ باجی رائے نے ہتھیار
ڈالنے کی بجائے اپنے سینے میں خنجر گھونپ کر خودکشی کر لی۔ بٹھنڈہ کے قلعے پر
قبضہ کرنے کے بعد محمود نے اس سلطنت کے دور افتادہ مقامات کو فتح کیا۔

اس معرکے سے فارغ ہو کر محمود نے ملتان کے راستے غزنی کا رخ کیا۔ ملتان
کا قریبی حکمران ابو الفتح داؤد ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات کو اپنے لیے کم
خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ دیباے سندھ میں قبل از وقت بارشوں کے باعث شدید
طغیانی آگئی تھی اور اسے عبور کرتے ہوئے غزنوی لشکر کے بہت سے سپاہی لہروں
کا شکار ہو گئے اس کے علاوہ ملتان کے قریبی حکمران ابو الفتح داؤد کی غیر مصالحتانہ
رواں نے محمود کی مشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔

شکستوں کی ذلت سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا انسداد پال
تخت نشین ہوا اور اس نے کچھ عرصہ سلطان محمود کے ساتھ مصالحتانہ تعلقات قائم
رکھے۔

محمود غزنوی کی ان کامیابیوں کے بعد ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ان فتوحات کے ساتھ ساتھ اس دین کی تبلیغ و
اشاعت کے دروازے کھل رہے تھے جو ہر لحاظ سے ہندو مت کی ضد تھا۔ نسلی
اور قبائلی عصبیتوں کی جڑیں کاٹ کر تمام انسانوں میں اخوت اور مساوات کے
رشتے جوڑنے والا دین ہندو سماج کے ان مقدس بیٹوں کی نگاہ میں ایک عظیم خطرہ
تھا جو ذات پات کی تمیز میں اپنا مفاد دیکھتے تھے۔ برہمن بیدار ہو چکا تھا اور وہ اس
خطرے کے مقابلے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض میں راجپوت حکمرانوں کو متحد
اور منظم کر رہا تھا۔ ہندوؤں کی طاقت کے اصلی مراکز وہ سلطنتیں تھیں جو تلچ، گنگا اور
نربدا کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ راج پال کی شکستوں نے ان سلطنتوں میں جوہر ملیں
پیدا کر دی تھی۔ وہ محمود غزنوی کی عقاب کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھیں۔ ان سلطنتوں
کے ساتھ قوت آٹمانی کا فیصلہ کرنے کے بعد اس کے سامنے اولین مسئلہ
اپنے راستے میں بٹھنڈہ کی سلطنت کو مسخر کرنا تھا۔

۳۹۵ء میں محمود نے ملتان کے قریب دیباے سندھ عبور کر کے بٹھنڈہ کا
رخ کیا۔ بٹھنڈہ کے راجہ باجی رائے کو اپنی قوت پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے
قلعہ بند ہو کر لڑنے کی بجائے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا۔ تین دن تک اس جنگ
کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا باجی رائے کو قرب و جوار سے لگ بھگ پہنچ رہی تھی اور ہندوؤں
کی طرف سے بہادری کا ایسا مظاہرہ محمود نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چوتھے روز
باجی رائے کی فوج کے حملے مسلمانوں کو ہر محاذ سے پیچھے ہٹا رہے تھے لیکن محمود

نے ملتان کے چند سرحدی علاقے فتح کیے تھے کہ اُسے خراسان میں الگ خان کے حملوں کی مدافعت کے لیے اچانک واپس جانا پڑا۔ محمود نے ملتان میں مکمل فوج پانچ سال کے بعد حاصل کی۔

(۴)

یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا کے ممالک میں محمود کا تسلط ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوا تھا اور اسے قریباً ہر سال کسی نہ کسی قسمت آزمائی سرکوبی کے لیے ایک

۳۹۶ء میں محمود نے قرامطہ کے استیصال کے لیے ملتان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا لیکن اند پال جس کے ساتھ اس کے تعلقات مصالحانہ تھے۔ ملتان کے قسطنطین حکمران ابوالفتح داؤد کا طرفدار بن گیا اور اُس نے محمود کو پشاور کے قریب دریا عبور کر کے اپنی حدود سے گزرنے کی اجازت نہ دی اور اس کا راستہ روکنے کے لیے پیش قدمی کی۔ محمود نے اُسے عبرتناک شکست دی اور دریائے چناب تک اس کا تعاقب کیا۔ اند پال نے اپنی رہی سہی فوج کے ہمراہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر پناہ لی۔ محمود غزنوی نے اس کا تعاقب کرنے کی بجائے ملتان کا رخ کیا لیکن ابھی اس

لے جا سبوں کے انحطاط کے زمانے میں عالم اسلام میں جن فتنوں نے سراٹھایا تھا اُن میں قرامطہ سب زیادہ خطرناک تھے۔ اعتقادات کے لحاظ سے قرامطہ کا اسلام کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ صرف حکومت ہی کے دشمن نہ تھے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی گردن زدنی سمجھتے تھے تیسری صدی ہجری کے وسط میں انھوں نے عراق اور شام میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ۲۸۴ھ میں خلیفہ مکتفی نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن قرامطیوں نے اس فوج کو بصرہ کے قریب عبرتناک شکست دی اور سپہ سالار کے سوا کسی کو بھی بچ نہ بچنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے بعد دو پھر شام کی طرف متوجہ ہوئے اور دمشق سے لے کر انطاکیہ تک ہزاروں انسانوں کو قتل کرنے کے بعد اُن کے رہنما ذکردی کے ایک بیٹے نے شام پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

خلیفہ نے اپنے مصری جرنل محمد کی قیادت میں فوج روانہ کی اور اُس نے قرامطیوں کو شکست دی۔ ذکردی کا بیٹا مارا گیا لیکن قرامطیوں کے حوصلے نہ ٹوٹے۔ ایک سال کے بعد ذکردی پھر گنہگار کے پردوں سے نمودار ہوا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اُس کی اعانت کے لیے ہمدی کا ظہور ہونے والا ہے اور خدا نے اُسے کفر اور اُس کے بعد

شام میں فوجات چل کرنے اور اپنے نائب کی حیثیت سے حکومت کرنے کی بشارت دی ہے۔ اس اعلان نے قرامطیوں کے حوصلے پھر تازہ کر دیے اور انھوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں عراق پر چڑھائی کر دی۔ کوفہ سے کچھ دور خلیفہ کی فوج کو پسپا کرنے کے بعد انھوں نے کوفہ اور بصرہ کے درمیان پڑاؤ ڈال لیا اور مکہ سے حاجیوں کے ہوتا فائدہ واپس آتے تھے، ان کے متوقع راستوں پر پیرے بٹھا دیے۔ ایک قافلہ کسی بستی کے لوگوں کے انتباہ پر بچ کر نکل گیا۔ اس پزیرمطیوں نے اس بستی کو جلا کر راکھ کر دیا۔ دو قافلے ان کے زبے میں آگئے اور انھوں نے بیس ہزار انسانوں کو زندہ تیغ کر ڈالا۔ بربریت اور وحشت کے اس طوفان نے بغداد پر لرزہ طاری کر دیا۔ خلیفہ نے ایک آزمودہ کار ترک جرنل کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ دو دن کی خونریز لڑائی کے بعد قرامطہ کو شکست ہوئی۔ ذکردی مارا گیا۔ اور یہ فتنہ کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا لیکن چوتھی صدی کے آغاز میں قرامطی پھر نمودار ہوئے اور ۳۱۱ھ میں انھوں نے اچانک بصرہ پر قبضہ کر کے چند روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ بغداد سے حکومت کی افواج کی آمد کی اطلاع پا کر انھوں نے شہر خالی کر دیا لیکن ہزاروں عورتوں کو لوٹنوں کی حیثیت میں اپنے ساتھ لے گئے اس کے بعد انھوں نے قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ حاجیوں کے ایک قافلے کے سات ہزار

سنے محاذ پر جانا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ ہندوستان کی تسخیر کا کام جاری نہ رکھ سکا۔ ہر سال شمال کے ممالک اور ہندوستان کی فتوحات اُس کی سلطنت کی حدود میں اضافہ کر رہی تھیں۔ لیکن اس نسبت سے اس کی مشکلات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان دو محاذوں کے درمیان کئی پہاڑوں، میدانوں اور

آدمی انھوں نے کوفہ کے قریب موت کے گھاٹ اتار دیے اور پھر اچانک کوثر پر قبضہ کر لیا۔ اور یہاں بھی بصرہ کی تاریخ دہرائی گئی۔

قرامطہ کے نزدیک مسلمان عورتوں اور بچوں کو بھی بدترین عذاب دے کر قتل کرنا ایک کارثواب تھا۔ عراق میں ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ دوسرے شہروں کی طرح بغداد کے لوگ بھی اپنے گھروں سے بھاگ کر دریائے پار پیانہ لے رہے تھے۔ چار سال ان دشمنوں نے قتل و غارت جاری رکھی۔ بالآخر بغداد کی فوج نے انھیں شکست دی اور وہ عرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی ان کی بربریت میں کوئی فرق نہ آیا۔ انھوں نے مکہ معظمہ میں بھی کوثر اور بصرہ کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔ ان کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے خانہ کعبہ میں پناہ لینے والوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ شہیدوں کی لاشیں چاہے زمر میں پھینکی گئیں۔ قرامطہ خانہ کعبہ سے حجر اسود اٹھا کر لے گئے اور یہ میں سال تک ان کے پاس رہا۔

ان واقعات کے بعد تمام اسلامی ممالک میں قرامطیوں کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی سرگرمیاں ایک مدت کے لیے ٹھنڈی پڑ گئیں۔ عراق، شام اور دوسرے ممالک سے جو قرامطی حکومت اور عوام کے انتقام سے خوفزدہ ہو کر بھاگے ان کی جائے پناہ سندھ تھی جو پچھٹی صدی ہجری کے وسط آخر میں ملتان پر قرامطیوں کی حکومت تھی۔ عالم اسلام کی ہزاروں بستیاں جلائے اور ان گنت انسانوں کو انتہائی سیدھی سے قتل کر دیا۔ بعد ازاں یہی ایک پُرسبیختہ تھا جہاں ان جنونیوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا موقع ملا تھا۔

مہمراؤں کی دستیں حائل تھیں اور محمود کی فوجی قوت کا بیشتر حصہ ان دستوں میں بکھرا ہوا تھا۔ وہ دریا سندھ عبور کرتا تو جیوں کے کنارے کوئی فتنہ جاگ اٹھتا۔ وہ پنجاب کے میدانوں میں پڑاؤ ڈال کر گنگا اور جمنہ کا رخ کرنے کا ارادہ کرتا تو مکران سے لے کر خوارزم تک کسی نہ کسی ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے کہ اُسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس جانا پڑتا۔ تاریخ کا کوئی زمانہ اولو العزم فاتحین کے تذکروں سے خالی نہیں لیکن ایسے شہسوار بہت کم ہوں گے جنھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر دن گھوڑے کی پیٹھ پر زمین کی دستیں ناپنے میں گزارے ہوں۔ اسے مرہیں ایوانوں کی بجائے جنگ کے میدان پسند تھے۔ اسے پھولوں کی سیج پر سونے کی بجائے چٹانوں کا روندنا مرغوب تھا۔ غزنی کے عقاب کا ذوقی پرواز ہر شین سے دور رہنا پسند کرتا تھا۔ قدرت نے ایک انسان کے وجود میں اُن عناصر کو جمع کر دیا تھا۔ جو ہمیشہ متحرک رہنا پسند کرتے ہیں :

(۵)

ملتان سے واپسی کے بعد خراسان میں محمود غزنوی کی مصروفیات کے باعث اند پال کو اپنی فوجی قوت از سر نو منظم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے مسلمانوں کے حملوں کو ایک اجتماعی خطرہ ثابت کر کے پڑوس کے راجاؤں سے مدد کی درخواست کی۔ اس دفعہ شمالی ہندوستان کے حکمرانوں نے محمود کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں پہلے کی نسبت زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑی فوج اند پال کے بیٹے برہمن پال کی قیادت میں پشاور کی طرف کوچ کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

سلطان محمود نے ان حالات سے باخبر ہوتے ہی ۳۹۹ھ میں غزنی سے کوچ کیا اور یلغار کرتا ہوا دہند کے قریب جا پہنچا۔ ایک شدید معرکے کے بعد ہندو افواج

رہی۔ بالآخر بھیم پال اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اس نے کھلے میدان میں سلطان محمود کی افواج پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوج کے آگے ہاتھیوں کی قطاریں تھیں لیکن محمود کی صفِ اول میں ترکمان بستے تھے جن کے تیروں کی بارش نے ہاتھیوں کے منہ پھر دیے۔ اس کے ساتھ ہی نیمینہ اور میسرہ کے سوار دونوں پہلوؤں سے دشمن کی صفیں درہم برہم کرتے ہوئے عقب تک جا پہنچے۔ بھیم پال اُن گنت لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگا۔ اس کے بعد محمود نے نندنہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ میدان جنگ میں بھیم پال کی شکست کے باعث قلعے کے محافظوں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیے۔

نندنہ کی فتح کے بعد سلطان محمود ترلوچن پال کی طرف متوجہ ہوا جس کی اعانت کے لیے کشمیر کی مزید افواج جہلم کے شمال کی دالوں میں جمع ہو رہی تھیں۔ کشمیر کے لشکر کا سپہ سالار محمود کے ایک گشتی دستے کو شکست دینے کے بعد اپنی قوت کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا لیکن جنگ کے پہلے معرکے ہی میں وہ بدتراس ہو گیا۔ اس نے اپنے لشکر کو دوبارہ منظم کر کے حملہ آور دوں کے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل نہ سکا۔

ان شکستوں کے بعد ترلوچن پال کا آخری مستقر مشرقی پنجاب میں شوالک کی پہاڑیاں تھیں۔ وہ ہند کی سلطنت کا عملی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا۔

میدان چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ سلطان محمود نے کانگڑہ تک انند پال کے حلیفوں کی افواج کا تعاقب کیا اور کانگڑہ کے پاس نگر کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ تین دن کی سخت مدافعت کے بعد اہل قلعہ نے ہمت ہار دی اور سلطان کی فوج قلعہ پر قابض ہو گئی۔ اس قلعے کے اندر وہ مشہور مندر تھا جس کے ہجاری نہ صرف ہندو عوام بلکہ شمالی ہند کے راجاؤں سے بھی خراج وصول کرتے تھے۔ مندر کے دروازے کھولے گئے تو وہاں سونے اور چاندی کے انبار پڑے تھے۔ برہمنوں کا یہ عشرت کدہ ان گنت انسانوں کی صدیوں کی محنت کا بھل تھا۔ یہ ان لوگوں کی کافی تھی جو سماج کے دیوتاؤں کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اس مندر سے سات کروڑ درم کی مالیت کے سکے اور قریباً سات ہزار من چاندی اور سونا برآمد ہوا۔ نگر کوٹ کے مندر کی دولت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف قیمتی جواہرات کا وزن بیس من کے قریب تھا۔

سلطان محمود کی داپسی کے بعد انند پال نے نندنہ کو اپنی راجدھانی بنا کر کوہستان تک کے آس پاس کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا لیکن وہ جلد ہی مر گیا اور اس کی جگہ ترلوچن پال تخت نشین ہوا۔ سلطان محمود نے اس خاندان کا رہا سہا اقتدار ختم کرنے کے لیے نندنہ پر حملہ کیا۔ ترلوچن پال نے سلطان کی پیش قدمی کی اطلاع پا کر قلعے کی حفاظت اپنے بیٹے بھیم پال کو سونپ دی اور خود کشمیر کے راجہ کو اپنی اعانت پر آمادہ کرنے کے لیے وہاں کا رخ کیا۔

بھیم پال نے پہاڑیوں کے درمیان سے نندنہ کے قلعے کی طرف جانے والی تنگ گزرگاہ کو بند کرنے کے لیے ہاتھیوں کی صفیں کھڑی کر دیں اور سلطان کی فوج کوئی دن پہلے درپے حملوں کے باوجود قلعے کے پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں کشمیر کے علاوہ جنوبی ہند کی کئی ریاستوں سے بھیم پال کو برابر کمک پہنچتی

رئیر قنوج کے ایک راجپوت سردار ہیں چند کا بیٹا تھا۔ قنوج کے حکمران راجہ پال کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اپنی جوانی کے ایام میں مہن چند نے راجہ پال کی فوج کے ایک افسر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات سر انجام دی تھیں۔ جب شمالی سرحد کے ایک بااثر جاگیردار بھ کرشن نے پڑوس کے چند راجاؤں کی شہ پر قنوج کے حکمران کے خلاف بغاوت کی تو اس نے بھ کرشن کی سرکوبی کے لیے مہن چند کو روانہ کیا۔ مہن چند کا حملہ اس قدر راجا تک تھا کہ بھ کرشن کو اپنے حلیفوں کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچ سکی اور اس نے معمولی جھڑپ کے بعد راہ فرار اختیار کی اور مہن کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوا۔ راجہ پال نے اس کی جاگسید ضبط کر کے اپنے چند سرداروں میں تقسیم کر دی۔ اس جاگیر کا ایک بڑا حصہ اور بھ کرشن کا محل مہن چند کو ملے۔ اس عالی شان محل میں مہن چند کی خوشی کے دن بہت مختصر تھے تقریباً تین سال کے بعد اس کی بیوی ایک چار سالہ لڑکے رئیر اور چھ ماہ کی لڑکی شکنتلا کو چھوڑ کر چل بسی۔

یہ دو بچے مہن چند کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز تھے۔ وہ رئیر کو راجہ کے بعد قنوج کی سب سے بڑی شخصیت دیکھنے کا متمنی تھا۔ اور شکنتلا کو کسی سلطنت کی رانی دیکھنا چاہتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں رئیر ایک خوبصورت جوان تھا۔ ایک سپاہی کے خصائل لئے اپنے باپ سے درجہ میں ملے تھے۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہت کم زور جوان ایسے تھے جو اس کی ہم عمری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ راجہ کے کانوں تک فون سپہ گری میں رئیر کے کمالات کی خبریں پہنچیں تو اس نے اُسے بلا کر محل کے محافظ دستے کا افسر اعلیٰ بنا دیا۔

اپنے بچوں کے متعلق مہن چند کے سپنوں کی تعبیر کے دن قریب آ رہے تھے۔ لیکن

نندنہ کا قیدی

نندنہ کے قلعے میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے رئیر کے لیے زندگی اب صبح و شام کے لیے ایک بے کیف تسلسل کے سوا کچھ نہ تھی۔ قید کے ابتدائی ایام اس کے لیے بے حد تلخ اور صبر آزما تھے۔ وہ ہر وقت فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا کبھی وہ تصور میں جنوبی ہند کے راجاؤں کے بے شمار لشکر کو قلعے پر حملہ کرتے دیکھتا کبھی خواب کی حالت میں اس کے لیے قلعے کے دروازے کھل جاتے اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سینکڑوں میل دور دریائے گنگا کے کنارے اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا اور پھر کبھی یہ دیکھتا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور زمانہ وہی ہے جو چار سال پہلے تھا۔ اس کے دوست اس کے گرد جمع ہیں۔ وہ ان کے ساتھ تیر اندازی یا تیغ زنی کی مشق کر رہا ہے اور اس کا باپ محل کے ایک کونے میں کھڑا ایک ہلکی سی سکراہٹ کے ساتھ اس کے کمالات کی داد دے رہا ہے۔ شکنتلا اس کی ننھی بہن اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ باغ میں بھولا بھول رہی ہے لیکن حال کے تلخ حقائق ہر بار اُس کے حسین خیالوں اور رنگین سپنوں کی دنیا درہم برہم کر دیتے۔ جن جن وقت گزرتا گیا رئیر کا کرب و اضطراب مایوسی اور بے حسی میں تبدیل ہوتا گیا ایک لامتناہی قید کا بھیا تک تصور ماضی کی ہر یاد اور مستقبل کی ہر امید پر حاوی ہو چکا تھا۔

پنجاب میں محمود غزنوی کی فتوحات کے باعث جو ہڑھاب ہندوستان کے راجاؤں، سرداروں اور سہنڈتوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ وہ آئے دن بڑھ رہا تھا۔ دھرم کی رکھشا کے لیے قنوج کے جن بازرگوں نے ترلوچن پال کی حمایت کے لیے آواز اٹھائی ان کے ساتھ مہن چند بھی شامل تھا۔ قنوج کا حکمران اپنی ہمسایہ ریاستوں کی دیکھا دیکھی ترلوچن پال کی مدد کے لیے ایک ہزار سپاہی بھیجنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب ان سپاہیوں کی قیادت کا مسدیش آیا تو راجہ کی نگاہ زہیر پڑی۔ مہن چند خود اس مہم میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن جوڑوں کے درد کے باعث اُسے رکتا پڑا۔ قنوج سے روانہ ہوتے وقت زہیر کی عمر کوئی بیس سال تھی اور اس کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جب راجہ کے دربار کے نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر یہ مژدہ سنایا کہ تم نندہ سے فتح کے پھر رہے اڑاتے ہوئے واپس آؤ گے تو زہیر نے مسکرا کر کہا ”ہم نندہ نہیں غزنی جا رہے ہیں“ اس پر جب ایک بوڑھے سپاہی کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ غزنی بہت دور ہے تو زہیر کے باپ کا چہرہ غصے سے تنہا اٹھا اور اُس نے چلا کر کہا ”غزنی دور نہیں تم ہی بے غیرت ہو گئے ہو“

قنوج کی سرحد عبور کرنے سے پہلے زہیر اپنی بستی سے گزرا جب وہ اپنے محل کے قریب پہنچا تو شکستہ لگا گئی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے جلدی سے زہیر کی کمر کے ساتھ لٹکا ہوا خنجر نکالا اور اُس کی نوک سے اپنے ہاتھ کی انگلی پیر کر اُس کی پیشانی پر خون کا لگ لگا دیا اور اپنے آنسو صلا کرتے ہوئے بولی ”بھیا! دیوتا تمہاری رکھشا کریں۔ جلد واپس آنے کی کوشش کرنا“ زہیر نے کہا ”میں بہت جلد آ جاؤں گا۔ لیکن میری ننھی بہن نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں آتی دفعہ اُس کے لیے کیا لاؤں؟“

”کچھ نہیں۔ ایک بہن کو اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔“ ان الفاظ کے ساتھ شکستہ لاکٹوڑے جیسی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑے۔ زہیر نے ایک

ٹاہیہ توقف کے بعد کچھ کہے بغیر گھوڑے کی باگ موڑ لی۔

(۳)

نندہ کی جنگ میں بھیم پال کی مدد کے لیے قنوج کے علاوہ جنوبی ہند کی کئی اور ریاستوں نے بھی امدادی دستے بھیجے تھے۔ اپنی اپنی ریاست کے سپاہیوں کے جوہر دیکھنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے برہمنوں کی ٹولیاں بھی ان کے ساتھ آئی تھیں اور ان میں سے کئی برہمن میدان کارزار میں ہندو دھرم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کا ہوش و خروش زندہ رکھنے کے لیے اپنے ساتھ مورتیاں بھی لے آئے تھے۔ چنانچہ نندہ کے قلعے میں جو چیز سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں وہ ان دیوتاؤں کی مورتیاں تھیں جن کی کرات کے انسانے بیان کر کے برہمنوں نے سماج کے بیٹوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کی موجودگی میں مسلمان سپاہی نندہ کے قلعے میں پاؤں رکھتے ہی بھسم ہو جائیں گے۔

چنانچہ جب قلعہ سے باہر ایک کھلے میدان میں بھیم پال اور محمود غزنوی کی قیادت میں لڑنے والی افواج مردانگی کے جوہر دکھا رہی تھیں تو برہمن قلعہ کی چار دیواری کے اندر ناقوس اور گھنٹیاں بجا کر اپنے دیوتاؤں کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ملافانہ قوت جو ان سونے چاندی اور پتھر کی مورتیوں میں پوشیدہ تھی بروئے کار نہ آئی۔

میدان میں شکست کھانے کے بعد بھیم پال کے فوج کے بعض دستوں نے قلعے میں پناہ لینے کی کوشش کی اور باقی فوج ادھر ادھر منتشر ہو گئی۔ بعض راجاؤں اور سرداروں نے اپنی اپنی فوج کو از سر نو منظم کر کے جوابی حملہ کیا لیکن بھیم پال کے فرار ہو جانے سے ہندوستانی سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے اور وہ کسی جگہ

راہیگاں نہیں جائے گا اور دشمن اتنا بے وقوف نہیں کہ اپنی فتح کے بعد صرف چند آدمیوں کو قتل یا گرفتار کرنے کے شوق میں اپنے کئی سپاہیوں کی جانیں خطرے میں ڈالنے پر آمادہ ہو جائے اور اگر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار بھی ہو تو ایک راجپوت کے بیٹے دھرم کے دشمنوں کی قید میں چلے جانے کی بجائے موت کہیں بہتر ہے۔ میں اپنے اُن ساتھیوں کو بزدلی کا طعنہ نہیں دیتا جو ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں لیکن وہ یوقوت فرد دستھے۔ دشمن نے ہماری شکست کے آثار دیکھتے ہی اپنے محفوظ دستوں کے تازہ دم سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ اس وقت تک ان میں سے اکثر اگر قتل نہیں ہو چکے تو قید ضرور ہو گئے ہوں گے۔ دشمن اُن کے فرار ہونے سے بہت پہلے قلعہ کے دروازوں تک پہنچ چکا تھا۔ کاس و سدرج غروب ہونے تک ہمارا ساتھ دیتے۔“

تھوڑی دیر بعد محاصرہ کرنے والے گھوڑوں سے اتر کر تپھروں کی آڑ لیتے ہوئے ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ رنیر کے ساتھیوں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا اور اُس نے معمول لہجے میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کو ہمارا بچ نکلتا منظور نہیں لیکن وہ ہمیں بہادری کی موت سے محروم نہیں کر سکتے۔ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہو اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک کہ وہ ہمارے تیروں کی زد میں نہ آجائیں۔“ کسی نے ٹیلے کی چوٹی سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک تپھر کی ادٹ سے سر نکالا اور ہندی زبان میں بلند آواز میں کہا۔ ”تم اگر جانیں بچا نا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال کر بیچے آ جاؤ۔“

اس کے جواب میں رنیر کی کمان سے ایک سنسناتا ہوا تیر نکلا لیکن بولنے والے نے اچانک اپنا سر پتھر کے پیچھے چھپا لیا۔ محاصرہ کرنے والوں نے چاروں طرف سے تیروں کی بادش شروع کر دی۔ اتنے میں رنیر اور اس کے ساتھیوں کو ہتھیار

بھم کر لڑائی نہ کر سکے۔ غزنی کے شہسواروں کے طرفانی حملوں نے انھیں پھر ایک بار میدان سے دھکیل کر آس پاس کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ سلطان نے اپنے لشکر کا ایک حصہ ان لوگوں کے تعاقب کے لیے چھوڑ دیا اور باقی فوج کے ساتھ آگے بڑھ کر نندنہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

دوپہر کے قریب ایک طرف سلطان کی فوج کے سوار اور پیادہ دستے قلعے کے ارد گرد پہاڑیوں اور وادیوں میں میلوں تک بکھرے ہوئے دشمن کا تعاقب کر رہے تھے اور دوسری طرف قلعے کی مکمل ناکہ بندی ہو چکی تھی۔

رنیر زخمی ہونے کے باوجود آخری وقت تک میدان میں ڈٹا رہا۔ جب میدان خالی ہونے لگا تو اس نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک ٹیلے پر پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر میں دوسروں کی دیکھا دیکھی فوج کے سپاہی بھی بھاگ نکلے۔ رنیر کے ساتھ صرف پندرہ جاں نثار رہ گئے۔ فاتح لشکر نے جو بھاگتے ہوئے دشمن کی بڑی بڑی ٹولیوں کا دور دورہ تک پیچھا کر رہا تھا، ان مٹھی بھر سرفروشیوں کو اہمیت نہ دی۔ ترک اور افغان سواروں کے کسی دستے آئے اور اس ٹیلے سے کترا کر آگے نکل گئے۔ بالآخر سلطان کی فوج کے ایک دستے نے ٹیلے کا محاصرہ کر لیا۔ رنیر کے ساتھی اپنی کمائیں سیدھی کر کے تپھروں کی آڑ میں بیٹھ گئے لیکن ٹیلے کا محاصرہ کرنے والے سپاہی چوٹی پر بیٹھا کرنبے کی بجائے اطمینان سے چاروں طرف کھڑے تھے۔

رنیر نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”بھائیو! ہمارے لیے یہاں سے بچ نکلتا آسان نہیں لیکن سدرج غروب ہونے والا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر اور مقابلہ کر سکیں تو ممکن ہے رات کی تاریکی میں سے بعض کو جان بچا کر بھاگنے کا موقع مل جائے۔ اس ٹیلے کی چوٹی سے حملہ کرنے والے دشمن پر ہمارا کوئی تیر

ڈال دینے کی ترغیب دینے والا اجنبی تیزی کے ساتھ پتھروں کی آڑ لیتا ہوا پندرہ بیس گز ادا پر آگیا اور بلند آواز میں بولا: ”تم میری توقع سے زیادہ بیوقوف ثابت ہوئے ہو لیکن میں تمہیں ایک بار پھر سوچنے کا موقع دیتا ہوں“ اس مرتبہ اس نے اپنا سر پتھر کی آڑ سے نکالنے کی کوشش نہ کی۔ ہندی زبان میں اس کا لب لہجہ یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ یا تو اسی ملک کا باشندہ ہے اور یا اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس ملک میں گزارا ہے۔ رنیر اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے کہا: ”میں یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے اس ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ جائیں گے۔ اگر تم خود کسی پر آمادہ نہیں ہو چکے تو ہتھیار ڈال دو، میں تمہاری جان بچانے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ممکن ہے کسی دن تم اپنے گھر بھی جاسکو“

رنیر اور اس کے ساتھیوں کے لیے بظاہر یہ الفاظ سراب تھے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس سراب کی دلکشی اُن کے تصورات پر چھا گئی۔ کسی دن آزاد ہو کر اپنے گھروں کو دوبارہ دیکھنے کی مویوم امید نے مایوسی کی تاریکیوں میں وہ چراغ روشن کر دیے جن کی روشنی میں انھیں موت کا چہرہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بھانک نظر آنے لگا۔ اس آواز کی بازگشت انھیں سینکڑوں کوس کے فاصلے پر سنائی دے رہی ان کے والدین، ان کے بال بچے، اُن کے دوست اور عزیز صوب یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے تھے: ”ممکن ہے کہ تم کسی دن ہمیں دیکھ سکو“

بولنے والا دیرینک خاموش رہا۔ اچانک رنیر کا ایک ساتھی ہتھیار پھینک کر اٹھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے ٹیلے سے اترنے لگا۔ ایک ثانیہ توقف کے بعد تین اور اس کے پیچھے چل دیے۔ باقی رنیر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: ”میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ تم میں سے جو چاہے جاسکتا ہے۔ میں خوشی

سے اجازت دیتا ہوں“

چار آدمی ادا اٹھ کر چل دیے۔ ان میں سے ایک قدم چلنے کے بعد مرکزہ زنبیر کی طرف دیکھا اور کہا: ”ممکن ہے کہ وہ بھوٹ نہ بولتا ہو۔ وہ ہماری زبان بولتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ان راہبوتوں میں سے ہو جو دشمن کے ساتھ مل چکے ہیں اور اس کا مقصد ہماری جانیں بچانا ہو“

زنبیر کرب الگیز لہجے میں چلایا: ”بھگوان کے لیے جاؤ، مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں“ اور وہ بھاگ کر دوسروں کے ساتھ جا ملا۔ ٹیلے پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر پتھر کی اوٹ سے آواز آئی: ”سورج غروب ہونے والا ہے۔ میں تمہیں تھوڑی دیر اور سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ بہادری اور حماقت میں بہت فرق ہے“

تھوڑی دیر اور جب زنبیر کے باقی ساتھیوں میں سے کسی نے جنبش نہ کی تو خطا کرنے والے نے کہا: ”میں تنہا اوپر آتا ہوں اور تمہیں یقین دلانا ہوں کہ تم میرا راستہ نہیں روک سکو گے“

ایک دراز قامت انسان پتھر کی آڑ سے نکل کر اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا ٹیلے کی چوٹی کی طرف بڑھنے لگا۔ زنبیر نے اس کی طرف کمان سیدھی کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”یہ دھوکا ہے۔ وہ تنہا اوپر نہیں آئے گا۔ تم چاروں طرف خیال رکھو“ لیکن انھیں کسی طرف حملے کے آثار دکھائی نہ دیے۔ محاصرہ کرنے والوں میں سے بعض پتھروں کی آڑ سے نکل کر اپنی جگہ اطمینان سے کھڑے چوٹی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زنبیر کے وہ ساتھی بھی جو ہتھیار پھینک کر نیچے اترے تھے، اُن کے قریب جا کر اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بلند قامت آدمی کوئی پندرہ قدم آگے بڑھا تھا کہ زنبیر اپنے مورچے سے نکلا اور اس کی طرف کمان سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جواب میں نیچے سے کی آدھوں

زخم بہت جلد مندمل ہو جاتے ہیں لیکن تمہیں تھوڑی بہت احتیاط ضرور کرنی چاہیے۔
اتنی دیر میں چند اور سپاہی اوپر پہنچ گئے اور انھوں نے اپنے سالار کے اشارے
پر زنبیر کے دو اور ساتھیوں کے زخموں پر پٹیاں باندھ دیں۔

ان کا یہ سلوک زنبیر اور اس کے ساتھیوں کی توقع کے برعکس تھا۔ ان کی پریشانی
نگاہیں اپنے دشمنوں کے چہروں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھیں کہ اب کیا
ہوگا؟ بیٹے کے ارد گرد کوسوں دور تک گردوغبار کے بادل یہ ظاہر کر رہے تھے کہ ابھی
تک شکست خوردہ لشکر کی منتشر ٹولیوں کا تعاقب جاری ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سات
آدمی قیدیوں کی حیثیت سے نیچے اترے اور اپنے اُن رفیقوں کے ساتھ جا ملے جنھوں
نے ہتھیار ڈالنے میں سبقت کی تھی۔

سالار نے اپنے چند ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ قیدیوں کو حفاظت سے پڑاؤ میں
لے جائیں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر باقی سپاہیوں کے ہمراہ ایک طرف چل دیا۔
”یہ کون تھا؟“ زنبیر بار بار اپنے دل سے اس سوال کا جواب پوچھ رہا تھا۔

پڑاؤ کی طرف جاتے ہوئے قیدی اپنے پریمیادوں میں سے بعض کو ہندی میں
باتیں کرتے ہوئے سُن رہے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا: ”اس شکست کے بعد ہندوستان
کے تمام راجاؤں کو یہ یقین ہو جانا چاہیے کہ اب دیہند کے حکمرانوں کو مدد دینے سے
کوئی فائدہ نہیں۔ اب ترلوچن پال اور اس کے بیٹے کے لیے پنجاب میں کوئی جگہ
نہیں رہی۔“

دوسرا بولا: ”لیکن مجھے یقین ہے کہ برہمن اس ملک کے باشندوں کو آخری وقت
تک لڑائیں گے۔ ترلوچن پال اگر ختم بھی ہو جائے تو کوئی اور راجے میدان میں آجائیں
گے۔“

تیسرے نے کہا: ”لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں کسی برہمن کو خراش تک

نے زنبیر کی طرف اپنی کمانوں کا رخ پھیر دیا لیکن بلند قامت آدمی نے جلدی سے مڑ کر
ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے انھیں تیر چلانے سے منع کر دیا۔ پھر وہ
زنبیر کی طرف متوجہ ہوا اور چوٹی کی طرف اس کے پاؤں اسی وقار اور تمکنت کے ساتھ
اُٹھنے لگے۔ اس کے قدم و قامت کی طرح اس کا چہرہ بھی جاذب نگاہ تھا۔ سیکھے
نقوش، سیاہ اور چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، جرأت، اولوالعزمی اور عالی ظرفی
کی شہادت دے رہے تھے۔ اس کا انداز فانتحانہ تھا لیکن اس کی مسکراہٹ یہ
ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے مفتوح کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ سینے سے لگانے جا
رہا ہے۔ زنبیر کے ساتھی مبسوت ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زنبیر نے تیر کھینچنے
کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے دو تین قدم پیچھے ہٹ کر
دوبارہ تیر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ساتھی بھاگ کر اُس کے آگے کھڑا
ہو گیا اور چلایا: ”نہیں، زنبیر نہیں۔“

اجنبی نے کہا: ”تمھاری شکل و صورت کے نوجوان کو زندگی سے اس قدر بے زار
نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک تمھارے کالوں میں کسی کی آواز
نہ پہنچی ہو اور تمھارے دل میں کسی سے دوبارہ ملنے کی امید پر زندہ رہنے کی خواہش
پیدا نہ ہوئی ہو؟“

زنبیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہاتھ سے کمان گر چکی تھی اور وہ سینکڑوں میل
دور سے کسی کے یہ الفاظ سن رہا تھا: ”بھئی! دیوتا تمھاری رکشا کریں جلد واپس آنے
کی کوشش کرنا۔ ایک بہن کو اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔“

”تم زخمی ہو۔“ دراز قامت آدمی نے زنبیر کی خون سے بھگی ہوئی آستین دیکھ کر
کہا۔ زنبیر کی خاموشی پر اس نے آگے بڑھ کر زنبیر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اطمینان سے بازو
کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اس پر اپنا رومال باندھتے ہوئے کہا: ”جوانی میں ایسے

نہیں آئی ہوگی۔ انہوں نے قلعے کے اندر کئی مہدیاں جمع کی تھیں اور کئی دنوں سے انھیں جگانے کے لیے گھنٹیاں اور ناقوس بجا رہے تھے لیکن تم دیکھو گے کہ نگر کوٹ کی طرح اس قلعہ کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بھی وہ ان مورتیوں کا خیال تک نہیں کریں گے۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اب تک قلعہ چھوڑ کر بھاگ نہیں گئے ہوں گے؟ پہلا سپاہی یہ کہہ کر رہبر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ کا وطن کہاں ہے؟“
رہبر کی خاموشی پر اس کے ایک عمر رسیدہ ساتھی نے جواب دیا ”ہمارا وطن قنوج ہے۔“

سپاہی بولا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں قنوج بھی جانا پڑے گا۔“
ایک ترک نے جو باقی سپاہیوں کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ ”تمہیں قیدیوں سے مذاق کرنے کی اجازت نہیں۔“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”یہ مذاق نہیں، میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ جنگیں جو ہمارے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی ہیں، لنگا اور جینا کی وادیوں میں لڑی جائیں گی۔ وہاں کے لوگ ہماری نسبت زیادہ مظلوم ہیں۔ اگر سلطان محمود قدرت کی طرف سے مظلوم لوگوں کی پکار کا جواب ہے تو وہ وہاں ضرور جائے گا۔“

اگر ایسی باتیں کوئی ترک، ایرانی یا افغانی کہنا تو رہبر شاید اس قدر متاثر نہ ہوتا لیکن ایک ہندوستانی کے منہ سے یہ الفاظ رہبر کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ تاہم انتہائی بے بسی کے احساس نے اُسے زبان ہلانے کی اجازت نہ دی۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا ”بھگوان کرے کہ ایسے نادان دوستوں کے مشورے محمود کے دل میں لنگا اور جینا کی وادیوں کی فتوحات کا شوق پیدا نہ کریں اور دیوتاؤں کی مقدس

دھرتی پر پاؤں رکھتے ہی وہ یہ محسوس کرے کہ بھیڑوں کے شمار کا شوق اُسے شیروں کے کچھاریں لے آیا ہے۔“ تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے گرد پیش کو فراموش کر کے اس دن کا تصور کر رہا تھا جب لنگا یا جینا کے کنارے وسطی ہندوستان راج پوت حکمرانوں کی ان گنت افواج محمود کے مقابلے میں کھڑی ہوں گی اور ان کی اگلی صفوں میں صرف ہاتھیوں کی تعداد اس قدر ہوگی کہ دشمن دہشت زدہ ہو کر بھاگ بکھے گا اور یہ لوگ جو آج دشمن کی فتوحات سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ مل گئے ہیں اور اپنے دیوتاؤں کا مذاق اڑانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، محمود کی شکست یقینی سمجھ کر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی پھر ہمارے ساتھ آئیں گے۔

ہندی سپاہی کے خلاف رہبر کا غم و غصہ نفرت اور تحارت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نندنہ کا قلعہ فتح ہونے کے بعد تمام قیدی پڑاؤ سے وہاں منتقل کر دیے گئے۔ اور محمود کی فوج نے کشمیر کا رخ کیا۔ رہبر کو قید ہونے کے بعد چند دن تک محمود کی فوج کے اس افسر کے متعلق جستجو رہی جو اپنی شکل و شیاہت اور جرأت و ہمت کے باعث اس کے دل پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا تھا لیکن وہ اُسے دوبارہ نظر نہ آیا۔

(۳)

رہبر نے ایک قیدی کی حیثیت سے چار سال نندنہ کے قلعے میں گزار دیے اور اس عرصے میں وہ ہندوستان کے مختلف حصوں اور ہندوستان سے دور شمال کے ممالک میں محمود کی فتوحات کی خبریں سنتا رہا۔

قلعہ میں قیدیوں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جو مسلمان علماء کی تبلیغ کے باعث اسلام قبول کر کے آزادی حاصل کر چکے تھے۔ بعض ایسے تھے جنہیں ندیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا جو عمر رسیدہ، مفلس یا نادار تھے انھیں کسی

معاوضہ یا شرط کے بغیر ہا کر دیا گیا تھا۔ قبول اسلام کے بعد آزاد ہونے والے قیدیوں کی اکثریت یہ سمجھ کر کہ ہندوستان میں صرف اسلام کی فتح ان کے مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے، محمود کی فوج میں شامل ہو چکی تھی۔

چوتھے سال نندنہ کے قلعے میں صرف ڈیڑھ سو ایسے قیدی باقی رہ گئے تھے جو ابھی تک اپنے مذہب پر قائم تھے اور جنہیں صاحب حیثیت ہونے کے باوجود فدیہ ادا کرنے کی شرط پر آزادی حاصل کرنا منظور نہ تھا۔

رنیر کی طرح یہ لوگ اس دن کے منتظر تھے جب ہندوستان کے جنوب اور مشرق سے بیسیوں راجاؤں کی ان گنت افواج مسلمانوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھیں گی اور وہ قلعے کے دروازے کھول کر ”دھرم کی بجے“ کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے ساتھ جا ملیں گے اور پھر غزنی ہی نہیں بلکہ وسط ایشیا تک ان لوگوں کا تعاقب کیا جائے گا۔“

یہ قلعہ اب قید خانے کی بجائے غزنی کے لشکر کے لیے اگلی چوکی کا کام دے رہا تھا۔ فالٹو گھوڑے اور ہاتھی یہاں رکھے جاتے تھے جن زخمیوں کو زیادہ دیر آرام کی ضرورت ہوتی، وہ بھی اس قلعے میں بھیج دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی ایسا راجہ یا اشراف میدان جنگ میں قید ہو جاتا جسے کسی زیادہ مہنہ و محنت پر رکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی تو اسے اس قلعے میں بھیج دیا جاتا۔

محمود کی تازہ فتوحات کے متعلق رنیر کے کالوں تک جو خبریں غیر ملکی یا ہندوستان کے نو مسلم سپاہیوں کی وساطت سے پہنچتی تھیں وہ ان پر اعتماد کرنے کا عادی نہ تھا لیکن جب کوئی نیا قیدی ان اطلاعات کی تصدیق کرتا تو وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔

قید سے چند ماہ بعد جب اس قلعے میں قیدیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی۔ رنیر نے یہ خبر سنی کہ محمود نے ڈیرہ گونی پور کے راجہ کو شکست دینے کے بعد تھانیسر کی

طرت پیش قدمی کی ہے۔ وہ اس خبر پر سراپیمہ ہونے کی بجائے خوش تھا۔ قیدیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے تھانیسر کے مندر میں چکر سوامی کے بت کی کرامات کے ان گنت افسانے نہیں سنے تھے۔ وہ آپس میں یہ کہا کرتے کہ محمود کو اس کی موت نے تھانیسر کی طرف بلا رہا ہے۔ مسلمانوں کی فوج چکر سوامی کے مندر کے قریب پہنچتے ہی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ خبر سننے ہی بہت سے قیدی اس عالم دین کے گرد جمع ہو گئے جو انہیں ہر روز اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ ایک قیدی نے کہا: ”آپ کہتے تھے کہ ہمارے دیوتا مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن آپ کے بادشاہ نے اب تک صرف ہمارے پھوٹے پھوٹے دیوتاؤں کی مورتیاں توڑی ہیں۔ اب وہ ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں سے ہمارے دھرم کا کوئی دشمن زندہ بچ کر واپس نہیں آ سکتا اور اگر آپ کے خدا نے اسے چکر سوامی کے غصے سے بچا لیا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔“

اسلام کے مبلغ نے مسکرا کر جواب دیا: ”تم چکر سوامی کے بت کو خدا کا شریک بناتے ہو لیکن چند دن تک تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ صرف پتھر کا ٹکڑا ہے۔“ چند دنوں کے بعد تھانیسر کے راجہ کا ایک رشتہ دار جنگی قیدی کی حیثیت سے اس قلعہ میں لایا گیا اور اس نے یہ بتایا کہ مسلمان چکر سوامی کے بت کو مندر سے اٹھا کر لے گئے ہیں تاکہ غزنی کے پورا ہوں پر اس کی نمائش کی جائے تو بہت سے قیدیوں نے کلمہ توحید پڑھ لیا۔ لیکن رنیر ان لوگوں میں سے تھا جو دیوتاؤں کی کرامت پر شبہ کرنے کی بجائے ان کے بھاریوں کو ہندوئی ادبے غیری کا طعنہ دیتے تھے۔

پھر وہ دن آئے جب محمود غزنوی کی افواج گنگا اور جہانکی وادیوں میں گھوڑے دوڑا رہی تھیں اور رنیر آئے دن ان کی کامیابیوں کی تازہ خبریں سننا اور اس کا یہ یقین تزلزل ہو رہا تھا کہ دیوتاؤں کی اس مقدس زمین کے پروردگار کی ہمت و غیرت محمود غزنوی کی فتوحات کے سیلاب کا رخ پھیر دے۔ اُسے توقع تھی کہ مسرہو کا

رکھنا کرو یا اور جب اس نے سنا کہ قنوج فتح ہو چکا ہے اور راجہ میدان چھوڑ کر باری کی طرف بھاگ گیا ہے تو دنیا اس کی نگاہوں میں تاریک ہو گئی۔ شام کے وقت جب قلعے کے پہرے دار قنوج کی فتح کی خبر سن کر مسرت کے نعرے بلند کر رہے تھے وہ ایک کونے میں بیٹھا اس کسن بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا جس کے تمام کھلونے ٹوٹ چکے ہوں۔

اس کے بعد اس نے بیچے بعد و گئے اسی کے راجہ چندر پال اور سردار کے راجہ چندر رائے کی شکستوں کی خبریں سنیں لیکن اب اُسے ان خبروں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قنوج کی شکست کے بعد کسی کی ہار جیت اس کے لیے بے معنی تھی۔ اب اس کی تمام دلچسپیاں اپنے بوڑھے باپ اور کسن بہن کی یاد تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ ”وہ کہاں ہیں؟ وہ کس حال میں ہیں؟ قنوج کی فتح کے بعد اُن پر کیا گزری ہوگی؟“ وہ صرف ان سوالات کے جواب جانا چاہتا تھا۔

(۴)

قرب و جوار کے بعض ہندو اور نو مسلم قیدیوں کے حالات دریافت کرنے قلعے میں آیا کرتے تھے۔ قیدیوں کو ان لوگوں کی وساطت سے اپنے عزیز و اقارب کو معین بھیجنے کی اجازت تھی۔ کئی قیدیوں کے رشتے دار ان کے متعلق اطلاع ہا کر آتے اور اُن کا فدیہ ادا کر کے اُنھیں آزاد کرا لیتے۔ چھ ماہ قبل رنیر کے پانچ ساتھیوں کے رشتہ دار فدیہ ادا کر کے اُنھیں رہا کر چکے تھے۔ تین مسلمان ہو جانے کے باعث رہا ہو چکے تھے اور چار کو اس لیے چھوڑ دیا گیا تھا کہ ان کا فدیہ ادا کرنے والا کوئی نہ تھا۔

رنیر کے لیے فدیہ ادا کرنا معمولی بات تھی۔ لیکن وہ ایک شکست خوردہ سپاہی

راجہ آخری دم تک لڑے گا لیکن وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُسے بادشہ کے راجہ ہرت سے امید تھی کہ وہ دیوتاؤں کا نام بلند کرے گا لیکن اس نے اپنے ایک لاکھ رنیر کے ساتھ کلمہ توحید پڑھ لیا۔

پھر جب مہابن کا حکمران کل چند محمود غزنوی کے مقابلہ پر آیا تو رنیر نے اپنی توقعات اس کے ساتھ وابستہ کر لیں لیکن چند دن کے بعد یہ خبر آئی کہ کل چند نے چاروں طرف سے محصور ہونے کے بعد خود کشی کر لی ہے۔

مہابن کی فتح کے بعد محمود غزنوی متھرا کی طرف بڑھا۔ چند دن کے بعد رنیر نے سنا کہ متھرا نے اپنے سوتے ہوئے دیوتاؤں کو جگانے کی ناکام کوشش کے بعد ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مختلف مندروں سے پانچ سو سونے کی اور دوسو چاندی کی مورتیاں جو صدیوں سے اپنی تقدیس کا خراج وصول کر رہی تھیں اُن لوگوں کے قبضے میں آگئی ہیں، جو صرف اُن کے وزن سے اُن کی قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اور پھر اُس خطہ زمین کی باری آئی جس کا ہر ذرہ رنیر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ چار سال قبل وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ جو قنوج جائے گا وہ واپس نہیں آسکتا۔ قنوج کے راجپوت پنجاب کے راجپوتوں سے مختلف ہیں، وہ دشمن کا راستہ روکنے کے لیے اپنی لاشوں کی دیواریں کھڑی کر دیں گے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے۔ بلکہ ان کے قدموں میں اپنی جانیں دے دیں گے لیکن اب اس کے احساسات مختلف تھے۔ گزشتہ چار سال کے واقعات کے پیش نظر وہ انتہائی اضطراب اور بے چینی کے بغیر قنوج کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ صبح و شام دُعا مانگا کرتا تھا۔ ”میرے وطن کے مقدس دیوتاؤں! میری قوم کی

کی حیثیت سے گھر لوٹنا ایک راجپوت کی غیرت کے منافی سمجھتا تھا۔ اس نے اس امید پر قید کو ترجیح دی کہ کسی دن اس کے دطن کے سپاہی دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔ اپنے باپ کے نام اس نے اپنے رہا ہونے والے ساتھیوں کو صرف یہ پیغام دیا تھا کہ میرا فدیہ ادا کرنے کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی دولت سے قنوج کی فوج میں چند سپاہیوں کا اضافہ کر دیں۔

لیکن اپنے راجہ کے فرار ہونے کی خبر سن کر اُس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تصورات کے پہاڑ تنکوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھے۔ اس کا پیغام سن کر اس کا باپ یقیناً خوش ہوا ہوگا اور اس نے اسی وقت راجہ کے پاس جا کر کہا ہوگا۔ ”ہمارا راج! اپنے بیٹے کی خواہش پر آپ کی فوج کے لیے اتنے ہاتھی اتنے گھوڑے اور اتنی تلواریں پیش کرتا ہوں۔ میرا بیٹا فدیہ دے کر یہاں آنے کی بجائے نندنہ کے قلعے کے دروازے پر آپ کا استقبال کرنا چاہتا ہے“ لیکن اب شاید میری طرح اس کی دنیا بھی بدل چکی ہوگی۔ وہ اپنے دل میں بار بار یہی کہتا ہوگا۔ ”مجھے قنوج یا اُس کے حکمران سے کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ دیوتاؤں کی مورتیوں کا مقام قنوج کے مندر ہیں یا غزنی کے بازاروں کے چوراہے۔ مجھے صرف اپنا بیٹا چاہیے“

کبھی کبھی دیوتاؤں کی طاقت و عظمت کے متعلق رنیر کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے لیکن اس کا ضمیر فوراً پکار اٹھتا۔ ”نہیں رنیر، تمہیں دیوتاؤں کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ وہ صرف اپنے بھاریوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ وہ ضرور بیدار ہوں گے اور دھرم کی رکشا کریں گے۔ محمود نے صرف ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں کو شکست نہیں دی بلکہ ان دیوتاؤں کو لٹکا دیا ہے جو زمین پر بھگوان کی مرضی پوری کرتے ہیں اور بھگوان کی مرضی یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے

دیوتاؤں کی مورتیوں کی تضحیک کرنے والے اس پوز دھرتی پر دیر تک من مانی کرتے رہیں۔ اس زمین سے کسی دن یقیناً وہ عظیم الشان قوت نمودار ہوگی جو ان دیوتاؤں کی مورتیوں کے ساتھ کھیلنے والے گستاخ ہاتھوں سے تلوار پھینک لے گی اور تمہیں اس دن کا انتظار کرنا چاہیے۔“ اس قسم کے خیالات سے رنیر کے دل کو قدرے تسکین ہو جاتی اور وہ انتہائی بے دکانہ سے دعا کرتا۔ ”میرے بھگوان اور میرے بھگوان کے دیوتاؤ! مجھے ہمت دے کہ میں انتہائی مصیبت میں بھی اپنے دھرم پر قائم رہ سکوں۔ میرے ڈگمگاتے ہوئے یقین کو سہارا دو۔“

لیکن ایسی دعاؤں کے بعد اس کے دل کی تسکین کے لمحات بہت مختصر ہوتے۔ گنگا اور جمنہ کے میدانوں میں محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد رنیر کی حالت اس شخص کی سی تھی جو طوفان میں کھڑا ہو کر چراغ روشن کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ قیدی بننے والے چار سال تک انتہائی صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان فتوحات کے بعد دیوتاؤں سے بد دل ہو چکے تھے۔ چوبیس قیدیوں نے منتر کی تسخیر کی خبر سننے ہی کلمہ تو حید پڑھ لیا تھا۔ باقی قیدیوں میں سے بھی اکثر ایسے تھے جو اسلام کی تبلیغ پہلے کی نسبت زیادہ توجہ سے سنا کرتے تھے۔

حال کی بے بسی اور مستقبل کے متعلق بڑھتی ہوئی مایوسی آہستہ آہستہ رنیر کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے موسمی بخار لے آلیا اور وہ کئی دن تک بستر پر پڑا رہا۔

(۵)

ایک دن رنیر بخار میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور قلعے کا حلیب جس کی دوائی پینے سے اس نے انکار کر دیا تھا، اس کے بستر کے گرد جمع ہونے والے

چل جاتے ہیں لیکن مابوس ہو کر اس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔“

رنیر نے اجنبی کی طرف دیکھا اور اضطرابی حالت میں اُٹھ کھڑے ہو گیا۔ اس کے دل میں نفرت اور حقارت کے اُبلتے ہوئے جذبات تھیں تبدیل ہو کر رہ گئے۔“
یہ وہی تھا جس نے اُسے چند سال قبل موت کے منہ سے چھین کر اس قلعے میں بھیجا تھا۔ یہ وہی تھا جس سے ایک ٹیلے پر مختصر سی ملاقات اس کے ذہن میں ایک دائمی جستجو چھوڑ گئی تھی۔

”یہ دوا نہیں پیتا“ طیب نے پہلے اس اجنبی اور پھر قلعے کے ناظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت کوشش کر چکا ہوں۔“

”لاؤ مجھے دو“ یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دوا کی پیالی قیدی کے ہاتھ سے پکڑ لی اور رنیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں ایک بار تم سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ یہ لو۔“

رنیر اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی نگاہوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے دوا کی طرف کوئی نہ دی۔

”دیکھو جب تک تم دوا نہ پیو گے میں یہی کھڑا ہوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دوا کی پیالی رنیر کے منہ سے لگا دی۔ رنیر نے اس کے ہاتھ سے پیالی پکڑ لی اور اس کے جی میں آئی کہ اُسے دیوار سے دے مارے لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک ثانیہ توقف کے بعد اس نے اچانک دوا کے چند گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتار لیے۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے طیب کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کی دوا بہت کڑوی تھی۔ میں خود بھی کڑوی دوا پیٹنے سے بہت گھبراتا ہوں۔“
قلعہ کے ناظم نے کہا۔ ”چلیے آپ کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔“

قیدیوں سے کہہ رہا تھا۔ ”تم اس ازخوان کو سمجھاؤ۔ کل سے اس نے میری کوئی دوا نہیں پی۔ پیریداروں نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے کھانے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ آج قید خانے کے ناظم شاید خود اُسے دیکھنے آئیں۔ تم سب میرے گواہ ہو کہ میں اپنی طرف سے اس کی جان بچانے کے لیے تمام جتن کر چکا ہوں۔“

ایک قیدی نے اُسکے بڑھ کر طیب کے ہاتھ سے دوا کی پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں ہم انھیں سمجھا لیں گے۔“ پھر وہ رنیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لیجیے مہاراج! آپ کا اس میں فائدہ ہے۔“

رنیر صلیبا۔ ”بھگوان کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔“

دوسرے قیدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”رنیر! ہم آپ کے دشمن نہیں۔ بیماری کی حالت میں انسان اپنا نفع نقصان نہیں سوچ سکتا۔ اُٹھیے! دوا پینے سے انکار نہ کیجیے۔“

رنیر نے غضب ناک ہو کر اس کا ہاتھ بھٹک دیا اور پہلے کی نسبت زیادہ بلند آواز میں چلا کر کہا۔ ”مجھے یہاں کسی کی دوستی کی ضرورت نہیں۔ مجھے مرنے دو۔ بھگوان کے لیے مجھے مرنے دو۔ موت میرے لیے اس زندگی سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتی۔“

اچانک کمرے کے دروازے کی طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ”یہ الفاظ ایک سپاہی کے نہیں ہو سکتے۔“ وہ لوگ جن کی نگاہیں رنیر پر مرکوز تھیں اچانک غمزدگی سے ایک بلند قامت اور بارعب آدمی کی طرف دیکھنے لگے جو دروازے کے پاس قلعے کے ناظم کے ساتھ کھڑا تھا۔ قیدی ایک طرف ہٹ گئے۔ اجنبی نے رنیر کے بستر کے قریب آ کر کہا۔ ”سپاہی مسکراتے ہوئے موت کے آغوش میں چلے

دبیر نے قدرے دوکھے پن سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی صحت سے کوئی دلچسپی نہیں۔
کمرے میں میرا دم گھٹتا تھا، اس لیے باہر نکل آیا۔“
”تو میرے خیال میں آپ کے لیے باہر کی فضا زیادہ خوشگوار ہوگی۔“ یہ کہہ کر ناظم
ایک سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم اپنا گھوڑا اٹھیں دے دو، یہ ہمارے ساتھ جائیں
گے۔“

سپاہی نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کی لگام دبیر کے ہاتھ میں
دینے کی کوشش لیکن اس نے ناظم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ کا شکریہ لیکن اس
وقت سواری کو جی نہیں چاہتا۔“
”آپ کی مرضی۔ لیکن اگر آپ کے دل میں کبھی اس کی خواہش پیدا ہو تو مجھے
ضرور بتائیں۔“ ناظم نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے ساتھی اس
کے پیچھے ہو لیے۔

اگلے دن ایک پرے دار نے دبیر کو اطلاع دی کہ ناظم قلعہ آپ کو بلا رہے ہیں۔
دبیر اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

ناظم اپنے دفتر کے سامنے ایک باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ دبیر اس کے قریب جا کر
کھڑا ہو گیا۔ ناظم نے ایک درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ ”یہاں بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج کمرے میں
بہت جلس ہے۔“

دبیر قدرے تذبذب کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناظم نے دوسری کرسی پر
اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نندنہ کی جنگ میں قنوج کے دستوں کے
سردار کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے؟“
”ہاں!“

اجنبی ناظم کے ساتھ کمرے سے باہر گیا تو طبیب نے دبیر سے کہا۔ ”میں شام
کو پھر آؤں گا۔ آپ تھوڑی دیر بعد دودھ پی لیں تو بہتر ہوگا۔“
”ٹھہریے!“ دبیر نے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“
”پوچھیے!“
”یہ کون تھا؟“

”یہ سلطان معظم کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں۔ قلعہ کے ناظم کچھ عرصہ کے لیے
درخت پر جا رہے ہیں اور یہ ان کی جگہ کام کریں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ قیدیوں
کے لیے خاص اختیارات لے کر آئے ہیں۔“
”لیکن ان کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی ملک کے باشندے ہیں۔“
”ہاں یہ تو مسلم ہیں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ یہ آپ کے ملک کے کسی راجہ کے
قریبی رشتہ دار ہیں۔“

(۶)

پندرہ دن بعد دبیر اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اس عرصہ میں قلعہ کا
نیا ناظم کئی بار اُسے دیکھنے کے لیے آچکا تھا۔ قیدیوں کو قلعہ کے ایک مخصوص رقبہ
کے سوا جہاں اسلحہ خانہ اور چند فوجی افسروں کے رہائشی کمرے تھے۔ ہر جگہ
گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ ایک دن دبیر علی الصباح اپنے کمرے سے نکل کر
صحن میں ٹہل رہا تھا کہ اُسے قلعہ کا نیا ناظم جو ہر صبح قلعہ سے باہر چند میل گھوڑے
پر گشت کرنے کا عادی تھا، چار سواروں کے ہمراہ اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔
دبیر کے قریب پہنچ کر ناظم نے اپنا گھوڑا روکا اور کہا۔ ”صبح کی سیر سے آپ کی صحت
پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔“

”اور آپ کے بہت سے ساتھی رہا ہو کر جا چکے ہیں؟“
”ہاں!“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ رہا ہونے کے لیے آپ کے نزدیک کون سی شرط ناقابل قبول تھی؟“

رنیر نے جواب دیا ”میں نے اپنے دشمنوں کی شرائط پر غور کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

ناظم مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا ”میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہاں چار سال اس امید پر گزار دیے ہیں کہ کسی دن ہندوستان کے راجے اپنی قوت کے بل بوتے پر آپ کو یہاں سے پھڑا کر لے جائیں گے۔“

رنیر نے کہا ”اور آپ مجھے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب مجھے قطعی مایوس ہو کر آپ سے آزادی کی بھیک مانگنی چاہیے۔“

ناظم نے اطمینان سے جواب دیا ”میں آپ کو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی جنگ کی طرح آپ کی قید بھی بے مقصد ہے اور جس جرأت پر آپ کو ناز ہے میں اُسے ہٹ دھرمی سمجھتا ہوں۔ آپ تصورات کے قلعوں میں بیٹھ کر اس قوت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ جسے قدرت نے ایک عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔“

رنیر نے کہا ”اگر مندروں پر حملے کر کے دلوناؤں کی مورتیاں توڑنا آپ کے نزدیک ایک عظیم مقصد ہے تو آپ یقیناً اپنی کارگزاری پر فخر کر سکتے ہیں۔“

ناظم نے جواب دیا ”جن بتوں کو انسانوں کے ہاتھوں نے تراشا ہے، وہ انسانوں کے ہاتھوں ہی سے لٹیں گے۔ کاش! آپ کو یہ علم ہوتا کہ برہمن کے ہاتھ میں ایک تراشا ہوا پتھر انسانیت کا کس قدر خطرناک دشمن بن جاتا ہے۔ آپ راجپوت

ہیں اور ان بتوں سے آپ کی محبت کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ انھوں نے آپ کو ان گنت انسانوں پر برتری عطا کی ہے۔ آپ نے ان کے بل بوتے پر صدیوں سے ان گنت انسانوں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم رکھا ہے۔ یہ بت ایک انسان کو برہمن اور کھشتری کی تقدیس عطا کرتے ہیں اور دوسرے انسان کو اچھوت اور شہور ہونے کی ذلت پر تالغ دہنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اس ملک میں ان بتوں کی شکست انسانیت کی فتح ہے۔ کاش! ان بتوں کے مندروں کی حفاظت کے لیے تلوار بلند کرنے سے پہلے آپ نے کسی اچھوت سے یہ پوچھا ہوتا کہ تمھاری سوکھی ہوئی ہڈیوں پر راجوں کے محلات کا بوجھ نیا دہ ہے یا ان مندروں کا؟ یا ایک دلش ہی سے یہ پوچھا ہوتا کہ تمھاری کمانی میں سب سے بڑا حصہ دار کون ہے؟ تلوار کی لوک سے لگان وصول کرنے والے کھشتری یا اپنے بتوں کے لیے خراج وصول کرنے والا برہمن۔“

رنیر نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا ”اگر میں غلطی پر نہیں تو کسی وقت آپ بھی راجپوت تھے۔ اگر دشمن کے مقابلے میں آپ کی ہمت جواب نہ دے جاتی تو شاید دیوناؤں کے متعلق آپ کے خیالات میں یہ تبدیلی نہ آتی۔“
”ہاں! میں راجپوت تھا لیکن حالات نے میری گردن کو انسانیت کی تعظیم کے سبلے جھکا دیا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد اچھوتوں کے طرفدار بن گئے ہیں؟“

”نہیں، میں انسانوں کے شکاریوں کے گروہ سے نکل کر انسانیت کے علمبرداروں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں۔“

”تو آپ محمود غزنوی اور اس کے سپاہیوں کو انسانیت کا علمبردار سمجھتے ہیں؟“

ذہنیت کے مسلمان نے بھی کسی قیدی سے وہ سلوک نہیں کیا ہوگا جو آپ شوروں کے ساتھ دار رکھتے ہیں۔ آپ کے لیے قید کے (یام یقیناً تلخ ہیں مگر میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ بہت جلد آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں قیدی آزاد ہو چکے ہیں لیکن ان اچھوتوں کی زندگی کی تلخیوں کا تصور کیجیے جو دلت کی گود میں آنکھیں کھولتے ہیں اور دلت کی گود میں مرجاتے ہیں۔ میں آپ سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں، فرض کیجیے اگر بے پال یا اند پال کی انواع غزنی تک پہنچ جائیں اور مسلمان مغلوب ہو جائے تو آپ لوگ جنگی قیدی تو درکنار عام مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ کیا یہ سلوک اس سلوک سے مختلف ہوتا جو برہمن سماج نے کول، دراوڑ اور بھیل اقوام کے ساتھ کیا ہے؟ کیا جن مورتیوں کے سامنے اچھوتوں کا بلی دان دیا جاتا ہے وہ غزنی میں نصب نہ کی جاتیں؟ کیا غزنی پر بے پال کی چڑھائی کے وقت اس ملک کے برہمنوں نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مسلمان لٹچھ ہیں اور انھیں اچھوتوں کی طرح مغلوب کرنا دھرم کی سیوا ہے؟“

رنیر نے لاجواب سا ہو کر کہا: ”آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

ناظم نے قدرے بے تکلف سا ہو کر کہا: ”تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں کوئی ایسی بات تسلیم کرنے کے لیے نہیں کہوں گا جس کی صداقت متعلق تمہارا اپنا ضمیر گواہی نہ دے۔ تمہارے ساتھ میری پہلی ملاقات بہت مختصر تھی۔ میں اسی رات ان دستوں سے جا ملا تھا جو بھیم پال کی رہی سہی فوج کو کشمیر میں رنج پال کی فوج کے ساتھ شامل ہونے سے روکنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مجھے اس طرف آنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا رہا۔ مجھے تمہاری جرأت، ہمت کا اعتراف تھا اور میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمہیں یقیناً ایک اعلیٰ وارفہ مقصد کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیتا اور اب بھی

”ہاں! مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کی فتوحات کے بعد اس دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہیں ہموار ہو جائیں گی جس کا مقصد انسانوں میں اونچ نیچ کی تفریق مٹانا ہے۔ جو ظالم کے ہاتھ سے تلوار چھیننا اور مظلوم کو سہارا دے کر اٹھانا ہے۔ ایسے دین کا مخالف ان لوگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتا جنہوں نے اپنے تمدن کی بنیاد چھوت اور اچھوت کی تفریق پر رکھی ہے اور جو اپنے قلعوں اور مندروں میں بیٹھ کر انسانوں پر خدائی کرتے ہیں۔ ان مندروں اور قلعوں کا ظلم توڑے بغیر ایسے دین کی تبلیغ کا راستہ صاف نہیں کیا جاسکتا جو برہمن اور شودر کو ایک ہی سطح پر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت میری باتیں آپ کے کانوں کو خوشگوار محسوس نہیں ہوں گی لیکن جس دن آپ ایک اونچی ذات کے فرد کی بجائے ایک عام انسان کی حیثیت سے سوچیں گے تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ محمود کی آمد ان گنت انسانوں کی بیکار کا جواب ہے۔“

رنیر نے کہا: ”ایک انسان کی حیثیت میں، میں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کہ میں ان لوگوں کی قید میں ہوں جو آپ کی نگاہ میں انسانیت کا بہترین نمونہ ہیں۔“

”میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ محمود غزنوی کا ہر سپاہی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جس ضابطہ اخلاق کی صداقت پر یہ لوگ مجموعی حیثیت میں ایمان رکھتے ہیں، اس پر دیا نند اسی سے عمل کرنے والا ہر شخص انسانیت کا بہترین نمونہ بن سکتا ہے لیکن ہے کہ ایک قیدی کی حیثیت سے آپ کے دل میں اس قلعے کے کسی پریدار کی بدسلوکی کے خلاف تنکایت پیدا ہوئی ہو لیکن آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس ملک کے کردڑوں انسان صدیوں پیشتر ہندو سماج کی تلوار سے مغلوب ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے شودر بن چکے ہیں اور برہمن آج بھی ان دیوتاؤں پر ایمان رکھتا ہے جو شودر دن کا بلی دان لے کر خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بدترین

رہو۔ ممکن ہے کہ جس صداقت نے مجھے قائل کیا ہے وہ تمہارے اندر بھی ایک انقلاب پیدا کر دے اور تم ایک شکست خوردہ سپاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کے مشعل بردار بن کر اپنے وطن واپس جاؤ۔ تم جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتے ہو۔ میری قیام گاہ کے دروازے ہر وقت تمہارے لیے کھلے ہیں۔“

رنیر زندگی کی جنگ میں شریک ہونے سے پہلے کئی برسوں سے یہ سُن چکا تھا کہ محمود کی فوج کے ساتھ ایسے جا دو گئے ہیں جن کی باتیں مفتوحہ علاقوں کے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے بدظن کر دیتی ہیں۔ چنانچہ قید ہونے کے بعد وہ اپنے دل میں یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب بھی اسلام کا کوئی مبلغ قیدیوں کے پاس آتا تو وہ اس کے وعظ پر توجہ دینے کی بجائے دل ہی دل میں دیوتاؤں کے بھجن گانے لگتا لیکن آج ناظم کی گفتگو کے دوران میں ان دیوتاؤں کا تصور بھی اُسے کوئی سہارا نہ دے سکا۔ ملاقات کے بعد جب وہ اپنے کمرے کا رخ کر رہا تھا تو ناظم کی گفتگو کے کئی فقرے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ اپنے ڈگمگاتے ہوئے یقین کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

باقی تمام دن وہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہا اور رات کا بیشتر حصہ بھی وہ اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا۔ ناظم کے یہ الفاظ کہ تمہاری جنگ کی طرح تمہاری قید بھی بے مقصد ہے۔ ایک فشر کی طرح اس کے دل میں اتر چکے تھے اور وہ یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے غیر معمولی عزم و ثبات کا مظاہرہ نہ کیا تو ایسی چند اور لائقوں کے بعد اس کے یقین کے قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ دیر تک بے چینی اور بیقراری سے کروٹیں بدلنے کے بعد اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں دوبارہ اس کے پاس نہیں جاؤں گا اور اگر اس نے مجھے بلانے کی کوشش کی تو میں صاف طور پر کہہ دوں گا کہ

مجھے یقین ہے کہ کسی دن میرا اور تمہارا راستہ ایک ہوگا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شاید مجھے تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کرنے کے مواقع بہت کم ملیں۔ کل ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ کالج کا راجہ ترلوچن پال کو اس کی کھوئی ہوئی سلطنت واپس دلانے کا وعدہ کر کے گوالیار اور دوسری ہمسایہ سلطنتوں کی مدد سے ہمارے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں مصروف ہے۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ یہ حکمران قنوج کے راجہ کو ہماری گزشتہ پیش قدمی کے وقت بھاگ چکے پریزدی کا طعنہ دے کر بدنام کر رہے ہیں اور اس کے اُمراء کو اس کے خلاف مشغول کر رہے ہیں۔ ان حالات میں سلطان شاید پیش قدمی کرنے میں تاخیر نہ کرے اور مجھے بھی اچانک یہاں سے جانا پڑے لیکن میں جانے سے پہلے تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر میں تمہارے متعلق اس بات کی ضمانت دے سکوں کہ تم آزاد ہونے کے بعد سلطان کے خلاف کسی جنگ میں حصہ نہیں لو گے تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہائی کے بارے میں میری یہ درخواست مان لی جائے گی۔“

”میرے وعدے پر آپ کو یقین آجائے گا؟“

”ہاں!“

”اور اگر میں ایسا وعدہ نہ کروں تو؟“

”اس صورت میں تمہیں کالج کے راجہ اور اس کے حامیوں کے خلاف ہماری ہم کے اختتام تک یہیں رہنا پڑے گا۔ اس عہد کے خاتمے پر گنگا اور جمنہ کے میدانوں میں کوئی حکمران ہمارے خلاف سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا اور مجھے اُمید ہے کہ پھر تمام جنگی قیدیوں کو بے ضرر سمجھ کر رہا کر دیا جائے گا۔ تمہارے متعلق میں اپنی ردائگی سے پہلے ہی یہ حکم تحریر کر جاؤں گا کہ تمہیں اس عہد کی کامیابی کے فوراً بعد رہا کر دیا جائے لیکن جب تک میں یہاں ہوں میری یہ خواہش ہے کہ تم مجھ سے ملنے

تھوڑی دیر اور انتظار کیوں نہ کیا۔

ناظم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”کل تمہارے جانے کے بعد میرے دل میں خیال آیا تھا کہ چند واقعات سے اگر میرے خیالات میں انقلاب نہ آگیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ میں بھی تمہاری طرح اپنے راجہ یا اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کرنے کے لیے نندن کی جنگ میں شریک ہوتا اور پھر اسی قلعہ میں ایک قیدی کی حیثیت میں تم سے متعارف ہوتا۔ اس صورت میں ہم دونوں ایک دوسرے سے جو باتیں کرتے رہ لیتے، ان باتوں سے مختلف ہوتیں جو کل میرے اور تمہارے درمیان ہوئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے یقیناً یہ پوچھتے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ تمہاری کتنی بہنیں ہیں؟ کتنے بھائی ہیں؟ تمہارے والدین کس حال میں ہیں؟ اور تمہیں کس کی یاد سب سے زیادہ ساتی ہے؟ اور آج میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم آؤ تو میں تم سے اسی قسم کے سوالات پوچھوں گا۔ اس قلعہ کے ناظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے۔ اور اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ایک انسان کی حیثیت سے میں بھی قید کی وہ صبر آزمائی اور بے بسی دیکھ چکا ہوں، جب کسی کی سنفہ اور اپنی سنانے کی خواہش دیواروں سے ٹکرا کر سرد ہو جایا کرتی ہے تو شاید تم مجھے اپنا راز دار بنانے میں، چمکا ہٹ محسوس نہیں کرو گے۔“

رنیر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”ایک انسان کی حیثیت میں مجھے آپ کے سوالات کا جواب دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میری داستان بہت مختصر ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ ماں مرجی ہے۔ باپ اور ایک بہن کے سوا مجھے اور کسی کی یاد نہیں ساتی لیکن آپ کو غلط فہمی نہ ہو، میں آپ کے پاس فریادے کر نہیں آیا۔ یہ صرف آپ کے سوالات کا جواب تھا۔“ رنیر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور وہ اپنی آنکھوں میں پھٹکتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس

تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے اسلاف کا دھرم چھوڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اگلے روز رنیر کے خیالات کچھ اور تھے۔ اس نے کچھ دیر قیدیوں کے ساتھ دل بٹلانے کی کوشش کی لیکن اُسے سکون نہ حاصل ہو سکا۔ اس کا ضمیر بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بزدلی۔ تمہیں اس پر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تمہارا دل ایک چٹان کی طرح مضبوط ہے اور کسی کے الفاظ کا جادو تمہارے عقیدے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اگر آج وہ بلائے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ وہ بہر حال ایک راجپوت ہے۔ اس کا چہرہ اس کی عالی ظرفی کی شہادت دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ تم کوئی ایسی بات کہہ سکو جس سے اس کی غیرت ہوش میں آجائے اور تم تو ہیں آمیز شرائط کے بغیر رہا کر دیے جاؤ۔ جب دوپہر تک اُسے کوئی بلانے کے لیے نہ آیا تو وہ مزید انتظار کیے بغیر ناظم کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں سے ایک اور آواز اٹھ رہی تھی۔ ”رنیر! تم اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم اپنی جرأت کا ثبوت دینے کے لیے نہیں بلکہ اپنی بے بسی کا مظاہرہ کرنے جا رہے ہو۔ تم اُسے ایک جادوگر نہیں بلکہ اپنا مونس و غماز سمجھتے ہو۔“

جب وہ ناظم کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ کاتب سے کوئی مراسلہ لکھوا رہا تھا۔ رنیر کی طرف دیکھتے ہی اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو میں ابھی فارغ ہوتا ہوں۔“

چند فقرے لکھوانے کے بعد اس نے کاتب کو رخصت کیا اور رنیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اچھا ہوا کہ تم آگے۔ ورنہ میں تھوڑی دیر بعد خود تمہیں بلانے والا تھا۔“

رنیر اس کے سامنے بیٹھ کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں نے

کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا اور وہ ناظم کو اپنے گھر اور اپنے گاؤں کے حالات بتانے میں تسکین محسوس کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس قدر بے تکلف ہو رہا تھا تاہم یہ قہقہے آنسوؤں کی نمی کے بغیر نہ تھے۔ بالآخر رنیر نے کہا اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا واقعہ ہے جس کے باعث آپ کے خیالات میں انقلاب آپکھا ہے۔ آپ کون سی جنگ میں قید ہوئے تھے؟

ناظم نے کہا ”میری داستان آپ کی سرگزشت سے مختلف بھی ہے اور طویل بھی۔ اگر آپ بہت جلد سو جانے کے عادی نہیں تو رات کو کھانا کھاتے ہی میرے پاس آجائیں۔ ہم دیر تک باتیں کریں گے۔“

آش

رات کے وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ رنیر نے کھانا کھاتے ہی ناظم کی قیام گاہ کا رخ کیا۔ ناظم کے ملازم نے اُسے یہ کہہ کر ایک کمرے میں بٹھا دیا کہ وہ نماز سے فارغ ہو کر ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ناظم کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے رنیر کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنی سرگزشت شروع کی:-

”عبدالواحد میرا اسلامی نام ہے۔ مسلمان ہونے سے پہلے میرا نام واسد بود تھا۔ کانگرہ میری جنم بھومی ہے اور میں ایسے والدین کا اکھوتا بیٹا ہوں جو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ میرا باپ نگر کوٹ کی فوج کا سیناپتی رہ چکا تھا اور نگر کوٹ سے چند کوس کے فاصلے پر ایک سرسبز وادی کی چند بستیاں ہماری جاگیر تھیں۔ میرے باپ کی موت کے بعد میرے چچا نے میری پرورش کی۔ وادی لی میرے چچا کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح عزت اور شہرت حاصل کروں۔ نگر کوٹ کے راجہ کی طرف سے ہمیں اپنی جاگیر میں ایک سو پچاس سوار اور چار سو بیادہ سپاہی رکھنے کا حکم تھا۔ اس لیے میرے دل میں ایک اچھا سپاہی بننے کی

کو بھی حقارت سے دیکھنے لگا جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

میرے گھر آنے سے چند ماہ بعد چچا کی صحت خراب رہنے لگی اور انھوں نے جاگیر اور فوج کا انتظام میرے سپرد کر دیا۔ اب میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میری زندگی اتنی خوشگوار نہیں جتنی کہ میں سمجھتا تھا۔ میری جاگیر پر کسی حکومتیں تھیں۔ میں راجہ کا جاگیردار تھا اور راجہ دہند کے ہمارا راجہ کا باگزار تھا۔ جاگیر کی آمدنی سے مجھے ایک طرف فوج کے اخراجات پورے کرنے پڑتے اور دوسری طرف ہر سال راجہ کے خزانے میں ایک بھاری رقم داخل کرنا پڑتی تھی تاکہ وہ دہند کے ہمارا راجہ کا خرچہ پورا کر سکے۔ لیکن نگر کوٹ میں ایک ایسی حکومت بھی تھی جس کے سامنے عوام جاگیردار، راجہ اور ہمارا راجہ یکساں بے بس تھے۔ یہ نگر کوٹ کے مندر کے پوجاریوں کی حکومت تھی۔

ہر سال لگان کی وصولی کے موقع پر نگر کوٹ کے پروہت کے نمائندے تمام جاگیرداروں کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جاگیردار لگان کی وصولی میں کوئی نرمی نہ برتیں تاکہ ان کے حصے کی رقم زیادہ سے زیادہ ہو۔ ان کے سامنے راجہ یا جاگیردار کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ جب پروہت کی طرف سے یہ اعلان ہوتا کہ اس سال مندر میں فلاں دیوتا کی چاندی اور سونے کی مورتی نصب کی جائے گی تو عوام پر مزید لگان عاید کر دیا جاتا اور یہ لوگ ان کے منہ سے سوکھی روٹی کے ٹوٹے بھی پھینک دیتے۔

مجھے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نگر کوٹ کے مندر میں میں نے جو انبار دیکھے تھے وہ دیوتاؤں کی برکت سے زیادہ برہمنوں کی سنگدلی کا نمونہ تھے لیکن مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ برہمن دھرم کے محافظ ہیں اور راجہ اور پوجا سب ان کی سیوا کے لیے ہیں۔

خواہش پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ مجھے مذہبی تعلیم دلانے کے لیے میرے چچا نے ایک پنڈت کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن مجھے کتابوں سے زیادہ سپاہیانہ کھیلوں سے دلچسپی تھی۔ مجھے گھوڑے پر سواری کرنے اور کھیلوں اور دباؤں میں تیرنے کا شوق تھا۔ ہمارے سماج میں ایک سردار کے بیٹے کا عام لوگوں بالخصوص بیچ ذات لوگوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنا برا سمجھا جاتا ہے لیکن میرے چچا نے میرے استاد کے احتجاج کے باوجود مجھے آس پاس کی لہنیوں میں گھومنے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ ولش ذات کے کسانوں اور چرواہوں کے لڑکے میرے ساتھ بہت بے تکلف تھے۔ ہماری جاگیر میں صرف ایک لہنی ایسی تھی۔ جہاں جانے سے چچا نے مجھے منع کر رکھا تھا اور یہ اچھوتوں کی لہنی تھی۔

جب میری عمر بارہ سال تھی تو نگر کوٹ کا راجہ ہمارے ہاں آیا۔ اس نے ہمارے سپاہیوں کا معائنہ کیا۔ میں نے چند کھیلوں میں حصہ لیا۔ راجہ میری نیزہ بازی اور تیر اندازی پر بہت خوش ہوا اور اس نے میرے چچا سے کہا: ”مجھے اُمید ہے کہ تمھارا بھتیجا اپنے باپ کا نام روشن کرے گا لیکن آپ کو اس کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اُسے چند سال کے لیے شہر بھیج دیں“ چنانچہ چچا نے مجھے نگر کوٹ کی اس پاٹھ شالہ میں بھیج دیا جہاں بڑے بڑے سرداروں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔

پاٹھ شالہ کے برہمنوں سے میں نے سب سے پہلی بات ہو سیکھی وہ نفرت تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ تم راجپوت ہو، برہمنوں اور کھشتریوں کے سوا ہر ذات کے انسانوں سے نفرت کرنا تمھارا فرض ہے۔ اچھوتوں کے قریب جانے کا خیال میرے دل میں کبھی پٹے بھی نہیں آیا تھا لیکن نگر کوٹ کا ماحول ایسا تھا کہ چار سال کے بعد جب میں تعلیم سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں ولش ذات کے ان نوجوانوں

تھی۔ تاہم کھلی وادی تک پہنچتے پہنچتے نگر کوٹ کے دو ہزار سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ دشمن اپنے مال مویشی کے علاوہ قیدیوں کو بھی چھڑا لے گیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک نگر کوٹ کے راجہ یا پردہت کو ان لوگوں پر کوئی منظم حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میرے باپ نے سینا پتی کی حیثیت سے نگر کوٹ کے راجہ سے زیادہ پردہت کو خوش کرنے کے لیے اپنی زندگی کے آخری سال ان لوگوں پر حملہ کیا اور انھوں نے کافی علاقہ فتح کر لیا لیکن سردیوں میں اس علاقے پر قبضہ رکھنا دشوار سمجھ کر انھوں نے راجہ اور پردہت کے ایما پر پہاڑی لوگوں کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ اگر وہ لگان دینے پر آمادہ ہوں تو ان کے ساتھ کوئی چھپر چھاڑ نہیں کی جائے گی۔ پہاڑی لوگوں نے یہ شرط مان لی اور نگر کوٹ کے راجہ کی افواج واپس آ گئیں۔ چند سال یہ لوگ باقاعدگی سے اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ دیتے رہے لیکن راجہ کے اہل کاروں اور مندر کے بجاویوں نے حسبِ عادت پھر لوٹ مار شروع کر دی اور ان لوگوں نے تنگ آ کر لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے یہ واقعات قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں ان کا میری داستان سے گہرا تعلق ہے۔ اپنی علالت کے ایام میں میرے چچا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میری شادی کر دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے نگر کوٹ کے ایک سردار کی لڑکی سے میری منگنی کر دی۔ اس سردار کا نام جگت رائن تھا اور وہ راجہ کا قریبی رشتہ دار تھا۔ میرے چچا اس رشتے سے بہت خوش تھے لیکن میری منگنی سے ڈیڑھ ہفتے بعد انھیں موت نے آیا :

(۲)

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے شمال مغربی علاقوں میں ہمیں سلطان محمود کی

شمال اور مشرق کے دشوار گزار پہاڑوں میں ایسی وادیاں تھیں جہاں کے باشندے ابھی تک بدھ مت کے پیرو تھے۔ یہ لوگ ایک مدت سے نگر کوٹ کے راجہ اور پردہت کی دوہری غلامی کا جو آثار دیکھ چکے تھے اور نگر کوٹ کے برہمنوں کی نگاہ میں یہ لوگ شودروں سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت تھے۔ نگر کوٹ کی فوج نے متعدد بار ان لوگوں پر حملے کیے تھے لیکن حملوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوٹ مار یا قتل و غارت ہوتا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر حملے کی اطلاع ملتے ہی برفانی پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے اور نگر کوٹ کی فوج لوٹ مار کے واپس آ جاتی۔ لوٹ کا مال زیادہ تر مویشیوں پر مشتمل ہوتا۔ جو لوگ قید ہوتے تھے، ان میں سے اکثر وہی قتل کر دیے جاتے تھے اور نگر کوٹ میں صرف ایسے نو عمر قیدی لائے جاتے تھے جنہیں کالی دیوی کی بھینٹ کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ نگر کوٹ کے مظالم نے ان لوگوں کو آہستہ آہستہ جنگجو بنا دیا۔ ایک دفعہ نگر کوٹ کے پانچ ہزار سپاہی شمال مشرق کے پہاڑوں میں لوٹ مار کرنے کے بعد واپس آ رہے تھے کہ انھیں ایک تنگ گھاٹی میں شام ہو گئی۔ فوج کے سردار کا خیال تھا کہ وہ رات کو چند میل کے فاصلے پر ایک کھلی وادی میں کام کریں گے۔ اس حملے میں نگر کوٹ کی فوج نے پہاڑی لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور کسی کو ان کی طرف سے جوابی حملے کی توقع نہ تھی لیکن سورج غروب ہوتے ہی دشمن نے جو فوج کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ پہاڑ کے دامن میں درختوں اور چھاڑیوں کے پیچھے تاک لگائے بیٹھا تھا اچانک تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ قریباً دو کوس تک فوج کے سامنے ایسا تنگ اور خطرناک راستہ تھا کہ دشمن کوئی نقصان اٹھائے بغیر صرف پتھر برسا کر سادی فوج کا صفایا کر سکتا تھا۔ لیکن یہ نگر کوٹ کی فوج کی خوش قسمتی تھی کہ جن لوگوں نے جوابی حملہ کیا تھا ان کی تعداد بہت تھوڑی

پردہت نے پھر راجہ کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ اس مہم کے لیے جاگیرداروں کی فوجیں کافی ہیں اور نگہ کوٹ کی باقاعدہ فوج کے سپاہی مندر کی حفاظت کے لیے رہنے چاہئیں، بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ راجہ کی باقاعدہ فوج کا نصف حصہ اس مہم میں جاگیرداروں کے سپاہیوں کے ساتھ شریک ہوا اور نصف مندر کی حفاظت کے لیے رہے۔

سینا پتی نے آٹھ ہزار سپاہیوں کی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ اس نے خود چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ بیدھام شرق کا رخ کیا اور دو ہزار سپاہی سردار جگت زائن کی راہنمائی میں دے کر اُسے حکم دیا کہ وہ شمال کی طرف سے چکر کاٹ کر مشرق کے برنائی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ جائے اور وہاں باقی فوج کا انتظار کرے۔ باقی دو ہزار فوج ایک اور سردار کے ماتحت دے کر اُسے جنوب کی طرف سے چکر کاٹ کر اُسی مقام تک پہنچنے کی ہدایت کی۔ میدانی علاقے میں بکھرے ہوئے دشمن کو گھیر کر تباہ کرنے کے لیے ایسی چال کامیاب ہو سکتی تھی لیکن پہاڑوں کے ایک لامتناہی سلسلہ میں ایسی چال سے کسی کامیابی کی امید رکھنا حماقت تھی۔

پہاڑی لوگ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے اور قدرت نے اُن کے لیے جگہ جگہ ناقابلِ تسخیر مورچے بنا رکھے تھے لیکن سماج کا بدبہ کچھ ایسا تھا کہ اُن لوگوں نے کسی جگہ بھی ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا۔ ہماری فوج میں صرف چند سردار اپنے ساتھ گھوڑے لائے تھے لیکن دشوار گزار پہاڑوں میں داخل ہوتے ہی گھوڑوں کو ایک محفوظ وادی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں اور میرے سپاہی سردار جگت زائن کے ماتحت تھے۔ اس کے دو بیٹے بھی اس مہم میں شریک تھے۔ ہماری کارگزاری دیکھنے کے لیے پردہت کا ایک بھائی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ چند دنوں تک ہم نے کسی قابلِ ذکر مزاحمت کا سامنا نہ کیا۔ جوہستیاں ہمارے راستے میں آتی تھیں وہ

قتوحات پریشان کر رہی تھیں۔ ایک دن راجہ کے حکم سے تمام سردار نگہ کوٹ میں جمع ہوئے اور وہاں دیہند کے ہمارا جو مدد بھیجنے کے سوال پر غور کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی پیش ہوا کہ پہاڑی لوگ جنہوں نے چند برس سے مالہ ادا کرنا بند کر دیا ہے۔ ان سے کیا سلوک ہونا چاہیے۔ بعض سرداروں کی رائے تھی کہ ہمیں پہلے محمود غزنوی کی فکر کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کا خطرہ ٹل جانے کے بعد ان لوگوں کو ہر وقت مغلوب کیا جاسکتا ہے لیکن مندر کے پردہت، راجہ کے سینا پتی اور بعض سرداروں کی رائے یہ تھی کہ ہمیں پہلے ان لوگوں کے ساتھ نبٹ لینا چاہیے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ ان لوگوں کو چند سال کی خاموشی کے بعد پہاڑی لوگوں پر فوج کشی کا اس دقت خیال کیوں نہ آیا جب کہ دیہند کے ہمارا جو مدد دینا اشد ضروری ہے لیکن جب حقیقت کا پتہ چلا تو میری حیرانی جاتی رہی۔ سینا پتی مسلمانوں کی بہادری کے قصے سن چکا تھا اور وہ ایک طاقتور دشمن کے سامنے جانے سے گھبراتا تھا۔ کیونکہ دیہند کے تازہ حالات کے باعث اُسے آرام سے گھر بیٹھنا مشکل نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے لیے ایک آسان محاذ منتخب کرنا چاہتا تھا۔

پردہت کو مندر کی بے حساب دولت کی فکر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عام حالات میں محمود شاید اس دور افتادہ پہاڑی علاقے کا رخ نہ کرے لیکن نگہ کوٹ کی فوج اگر دیہند بھیجی گئی تو شکست کی صورت میں یہ بعید از قیاس نہیں کہ محمود نگہ کوٹ تک اس فوج کا پیچھا کرے۔ سرداروں کی اکثریت نے بھی گھر سے دور جا کر بڑے خطرے کا سامنا کرنے پر گھر کے قریب ایک معمولی خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔

راجہ نے مجھ کو پردہت اور اس کے حامیوں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا لیکن اس کی آخری کوشش یہ تھی کہ نگہ کوٹ کا قریباً ہر سپاہی اس جنگ میں حصہ لے تاکہ یہ فوج اس مہم سے فارغ ہو کر جلد دیہند کی مدد کے لیے جاسکے لیکن

جگہ پہنچے جہاں لکڑی کا پل بنا کر ندی کو عبور کیا جاسکتا تھا۔ لکڑی کی وہاں کمی نہ تھی چنانچہ اگلے دن ہم پل بنا کر دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ میں نے احتیاطاً جگت نرائن کو مشورہ دیا کہ اس پل کی حفاظت کے لیے چند آدمیوں کا پرہ بٹھانا ضروری ہے ممکن ہے ہمیں کسی خطرے کے وقت اس کی ضرورت پڑے۔ جگت نرائن نے کچھ دیر بحث کرنے کے بعد میں تیر انداز پل کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیے اور انھیں حکم دیا کہ وہ کل تک اس پل کی حفاظت کریں اور پھر باقی فوج کے ساتھ آئیں۔

جگت نرائن کے اندازے کے مطابق ہماری آخری منزل جہاں پہنچ کر ہمیں باقی فوج کا انتظار کرنا تھا۔ اس مقام سے پچاس کوس دور تھی۔ لیکن پل سے تھوڑی دور آگے ہم چلنے کی بجائے رینگ رہے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ بلند پہاڑ تھا اور بائیں ہاتھ ندی تھی۔ براہ راست پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنا ناممکن اور اس کے دامن میں ندی کے ساتھ ساتھ چلنا بھی بے حد مشکل تھا۔ دو پہر تک ہم نے بشکل دو کوس فاصلہ طے کیا اور اس کے بعد پہاڑ کی ڈھلوان ایسی تھی کہ چٹائیں کاٹ کاٹ کر راستہ بنانے کی ضرورت تھی۔ میں نے جگت نرائن کو مشورہ دیا کہ ہمیں واپس مڑ کر کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہیے لیکن اس نے جواب دیا: ”اب ہمارے راستے میں ہر جگہ ایسے پہاڑ آئیں گے“

میں نے کہا ”اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو بہتر ہے کہ ہم واپس مڑ کر ندی کے پار کسی کھلی جگہ پڑاؤ ڈال لیں اور فوج کے چند دستے راستہ بنانے کے کام پر لگا دیے جائیں۔ راستہ تیار ہو جانے کے بعد فوج کو کوچ کا حکم دینا بہتر ہوگا۔ ورنہ ان حالات میں اگر دشمن کسی جگہ گھات لگائے بیٹھا ہو تو وہ صرف پتھر برساکر ہماری فوج کو تباہ کر سکتا ہے۔“

لیکن جگت نرائن ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ہر غلطی کو صحیح ثابت کرنے

عام طور پر خالی ہوتی تھیں لیکن کوئی عورت، بچہ یا بوڑھا نظر آ جاتا تو ہمارے سپاہی ان پر تلواروں کی تیزی آزمایاتے لیکن یہ کھیل مجھے اس وقت بھی پسند نہ تھا جب میرا دل دھرم کے ان دشمنوں کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دن ہم نے ایک نہایت پر فضا دادی میں قیام کیا۔ چند سپاہی کسی اُجڑی ہوئی بستی سے دو عورتیں اور تین بچوں کو کپڑے لائے۔ جگت نرائن نے انھیں درختوں سے بندھوا دیا اور فوج کے چیدہ چیدہ آدمیوں کو نشانہ بازی کی دعوت دی۔ میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے بگڑ کر کہا: ”تم عورت بننے جا رہے ہو اسد بھائی دشمنوں کے خلاف ایک راجپوت کا دل پتھر سے زیادہ سخت ہونا چاہیے۔“

میں نے جواب دیا: ”ابھی تک میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ یہ بے بس عورتیں اور بچے ہمارے دشمن ہیں۔“

وہ بولا: ”تمہارا خیال ہے کہ ہم یہاں پتھروں کے خلاف لڑنے آئے ہیں دیکھو میری طرف“ اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی کمان کا تیر چھوڑ دیا۔ یہ تیر ایک پتھر کے سینے میں لگا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کمانوں سے سنسناتے ہوئے تیر نکلے اور بچوں اور عورتوں کی چیخیں ان گنت قسموں میں دب کر رہ گئیں۔ جگت نرائن، اس کے بیٹے اور چند سردار فائن خانہ سُسکا ہٹوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ اس واقعے سے کہیں زیادہ المناک تھا اور میں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔

ایک دن ایک دادی کے گھنے جنگل میں ہم پر دشمن نے حملہ کیا لیکن ہم نے انھیں بہت جلد پساکر دیا۔ اگلے دن ہم ایک ندی کے سامنے کھڑے تھے جو دروند پہاڑوں کے درمیان ایک گہری کھڈ بناتی تھی۔ دن بھر کی تلاش کے بعد ہم ایک ایسی

رہا تھا لیکن اسے شاید خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، بالآخر سپاہیوں کو یہ احساس ہوا کہ اب پیچھے مڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن اس وقت تک تین چار سو آدمی کھڑے گر چکے تھے۔

جس خطرناک راستے پر ہم کانپ کانپ کر پاؤں رکھتے تھے، اب واپسی پر ہم وہاں بھاگ رہے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ جگہ جگہ پہاڑ کا دامن درختوں اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا اور دشمن بیشتر مقامات پر ہمیں اچھی طرح دیکھے بغیر اندھا دھند پتھر برسار رہا تھا لیکن ہر جگہ سپاہیوں کی افرا تفری کا یہ عالم تھا کہ جتنے سپاہی پتھروں سے ہلاک ہو رہے تھے۔ ان سے کہیں زیادہ ایک دوسرے سے دھکے سے کھڑے گر رہے تھے۔ بچوں بچوں ہم پل کے قریب پہنچ رہے تھے، پتھروں کی بارش کم ہوتی جا رہی تھی لیکن پل سے کوئی آدھ کوس کے فاصلے پر ہمارے سر پر جگہ جگہ ننگی چٹانیں تھیں اور چند آدمی ان چٹانوں پر ہمارے منتظر تھے اور پتھروں کے علاوہ تیر بھی برسار رہے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں چار پانچ سو گز کے اندر ہمارا نقصان بچنے تمام راستے سے لیا تھا۔ ایک تیر میرے بازو پر لگا لیکن اس وقت میرے لیے ایسے زخموں کا احساس کرنا بھی مشکل تھا۔ اس خطرناک مقام سے آگے پل تک ہمارا راستہ کافی کشادہ تھا اور اوپر کی ڈھلوان بھی نسبتاً کم خطرناک تھی۔ اکا دکا پتھر کہیں کہیں اب بھی گر رہے تھے لیکن اس طوفان کے بعد یہ ہمارے لیے زیادہ پریشانی کا باعث نہ تھے لیکن ابھی تک ہر سپاہی کی یہ خواہش تھی کہ وہ پل عبور کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جائے۔ جنگت زائن کا ایک بیٹا میری آنکھوں کے سامنے پتھر سے گھائل ہو کر کھڑے گرا تھا اور دوسرے کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اپنے راستے کے آخری موڑ پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ دشمن کے پچاس ساٹھ آدمی پل پر حملہ کر رہے ہیں اور ندی کے دوسرے کنارے مورچوں میں بیٹھے ہوئے

کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ میں نے یہ دشوار گزار راستہ منتخب ہی اس لیے کیا ہے کہ دشمن اس طرف سے بے پروا ہو کر کسی اور راستے پر پہرہ دے رہا ہوگا۔

میں نے کہا۔ یہ ممکن ہے کہ دشمن کے کسی آدمی نے ہمیں ندی پر پل بناتے ہوئے دیکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے یہ خبر دوسروں تک پہنچادی ہو اور وہ عقب کے کسی آسان راستے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکے ہوں۔

جنگت زائن نے بگڑ کر کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرتا، اگر تمہاری ہمت جواب دے چکی ہے تو تم واپس جاسکتے ہو، جب ہم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے تو تمہیں اطلاع بھیج دی جائے گی کہ اب کوئی خطرہ نہیں، اس لیے تشریف لے آؤ۔“ اپنے ہونے والے خسر کے منہ سے یہ الفاظ میرے لیے ناقابل برداشت تھے۔ میں نے بگڑ کر کہا۔ ”جب بہادری دکھانے کا وقت آئے گا تو آپ مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکیں گے۔“

جنگت زائن کچھ کنسا چاہتا تھا کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پہاڑ کی بلندی سے ایک خوفناک آواز سنائی دی اور سپاہی جو ایک لمبی قطار میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے، مبہوت ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرے خدشات صحیح نکلے ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص اپنے پاؤں کے نیچے چپہ بھر زمین کو غیر محفوظ سمجھ کر دوسرے کو دھکیل کر اس کی جگہ پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ رہے تھے اور جو آگے تھے وہ پیچھے سمٹ رہے تھے۔ جو پتھروں کی لپیٹ میں آگئے، وہ ندی کے آغوش میں پہنچ گئے لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے غصہ و ہشت کی وجہ سے ندی میں پھلانگیں لگا دیں۔ جنگت زائن ایک درخت سے چبٹ کر پوری قوت کے ساتھ چلا رہا

ہمارے تیر انداز جو پل کی حفاظت پر متعین تھے انھیں دودھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم نے کسی توقف کے بغیر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ سراپہ ہو کر بیچے بیٹے لیکن میں چند سپاہیوں کے ساتھ ان کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اب پل سے آگے کچھ دور تک پہاڑ کی ڈھلان ناقابل گزر تھی اور سامنے سے تیروں کی بارش میں ان لوگوں کے لیے پل عبور کرنا مشکل تھا۔ کیوں کہ پل پر سے مشکل بیک وقت دو آدمی گزر سکتے تھے۔ دشمن نے یہ سمجھ کر کہ وہ ہمارے زرخے میں آچکا ہے، جان توڑ مقابلہ کیا لیکن پندرہ بیس آدمیوں کے سوا جن میں سے بعض ہمارا گھیرا توڑ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور بعض نے مایوسی کی حالت میں ندی میں پھلانگیں لگا دیں۔ ہم نے کسی کو بچ نکلنے کا موقع نہ دیا تاہم ان میں سے ایک آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل ہم اپنی نصف فوج ضائع کر چکے تھے۔

جنگ نرائن اپنے حواس میں نہ تھا اور پاگلوں کی طرح اپنے بیٹوں کو آدائیں دے رہا تھا اور فوج انتہائی غیر منظم حالت میں پل عبور کر رہی تھی۔ مجھے پل کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے میں بھاگ کر پل کے قریب آکھڑا ہوا۔ میری جتن بکار سے سپاہیوں کی افزائری قدرے کم ہو گئی لیکن ابھی دوسو سپاہی اسی طرف تھے کہ ہم پہاڑ کے دامن سے تیروں کی بارش ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے سینکڑوں آدمی غعرے لگاتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ اس نازک مرحلے پر بچاس ساتھ تو جواؤں نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے آگے بڑھ کر دشمن کا راستہ روک لیا۔ میری دان اور کندھے پر تلواروں کے دو زخم آئے اور میرے کسی ساتھی مارے گئے، لیکن ہم نے دشمن کو پل کے قریب نہ آنے دیا۔ تھوڑی دیر میں باقی فوج پل پر سے گزر گئی اور میرے ساتھ پندرہ یا بیس آدمی رہ گئے۔ ہم لوٹے ہوئے ایلٹ پہاڑ

پل کی طرف ہٹا رہے تھے لیکن دشمن کے ایک سخت حملے نے ہمارے پاؤں اکھاڑ دیے اور میرے ساتھیوں نے بیک وقت بھاگ کر پل عبور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی پل پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ پل ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً ندی میں پھلانگ لگا دی۔ اس ندی سے بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ پل سے گزرنے والے بعض آدمی مجھ سے آگے جا چکے تھے اور چند ابھی ان گرتے ہوئے شہتیروں کے ساتھ چھٹے ہوئے تھے۔ جن کے سرے ایک طرف سے ابھی تک مضبوط رستوں سے پل کے ساتھ بندھے ہوئے تھے لیکن پانی کے ایک ریلے نے ان شہتیروں کو بھی اپنے آغوش میں لے لیا۔ ہم دشمن کے پتھروں اور تیروں کی زد میں تھے لیکن یا تو دوسرے کنارے سے ہمارے سپاہیوں کے تیروں کی بارش نے ان لوگوں کو منتشر کر دیا تھا اور یا ان لوگوں کے جنگی آئین ہم سے مختلف تھے۔ اور انھوں نے ہماری موت یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھ روک لیے تھے۔

میں ایک بھنور میں پھنس کر چند غوطے کھانے کے بعد اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو چکا تھا۔ قدرت نے میری مدد کی اور میں چند لمحات موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک بہتے ہوئے شہتیر کے ساتھ لپٹ گیا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ میرا یہ سہارا عارضی ثابت ہوگا اور تند و تیز موجیں مجھے کسی چٹان پر پہنچ دیں گی لیکن ندی کا پاٹ بند ریج تنگ اور پانی کی شوریدگی نسبتاً کم ہوتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کناروں کی بلندی زیادہ ہوتی گئی۔ اب مجھے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کی خبر نہ تھی۔ یہ منظر اس قدر ہدیت ناک تھا کہ برسوں کے بعد آج بھی اس کے تصور سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شہتیر مجھے متعدد بار کبھی ایک اور کبھی دوسرے کنارے کے قریب لے گیا لیکن میں ان سیدھی دیواروں پر چڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دل میں کبھی یہ خیال آتا تھا کہ اچانک کسی مقام

دھکیلتا ہوا اس سل کے قریب لے گیا۔ زندہ رہنے کی امید نے میرے منہ حال جسم میں ایک نئی قوت پیدا کر دی اور میں شہر چھوڑ کر سل پر چڑھ گیا۔
عبدالواحد نے یہاں تک کہہ کر قدرے توقف کے بعد رنیر کی طرف دیکھا اور بولا۔
”میں پھر تفصیلات میں چلا گیا۔ آپ اکٹا تو نہیں گئے؟“

رنیر نے چونک کر جواب دیا ”نہیں نہیں، ایسی داستان میں ساری رات بیٹھ کر سن سکتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں خود موت کے منہ سے بچ کر نکلا ہوں۔“

عبدالواحد نے دوبارہ اپنی سرگزشت شروع کرتے ہوئے کہا ”کچھ دیر سل پر بیٹھا میں اپنے گرد و پیش کے متعلق سوچتا رہا۔ سل پر چھوٹے چھوٹے گڑھے جو پانی بھرنے کے مشکوک کی رگڑ سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور سل سے اوپر گھسی ہوئی میڑھیاں اس جگہ انسانوں کی آمد و رفت کی گواہی دے رہی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ میں اس راستے سے باہر نکلتے ہی کسی بستی کے قریب پہنچ جاؤں گا لیکن اس علاقے کی کسی بستی کا تصور میرے لیے کم خطرناک نہ تھا۔ اوپر فضا کا رنگ بتا رہا تھا کہ شام ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ سردی سے سُن اور زخموں سے منہ حال ہونے کے باعث مجھ میں چند قدم چلنے کی ہمت نہ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ اندیشہ تھا کہ شام ہو جانے سے پہلے اگر میں نے کوئی جائے پناہ تلاش نہ کی تو میں رات بھر سردی میں ٹھہر کر مر جاؤں گا۔ بالآخر میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور چٹان میں تراشے ہوئے زینوں پر چڑھنے لگا۔ چند قدم اٹھانے کے بعد ٹانگ اور بازو کے زخموں کی ناقابل برداشت تکلیف کے باعث میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ میں نے ابھی پندرہ بیس قدم اٹھائے تھے کہ مجھے کچھ دور سے ایک آواز سنائی دی۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت

پرندی کا پاٹ کشادہ ہو جائے گا لیکن اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ میں کنارے پر لگنے کی بجائے پانی کی سطح سے اُبھرے ہوئے مہیب پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر پاش ہو جاؤں اور یا پھر ندی اچانک کسی نشیب پر ایک آبشار میں تبدیل ہو جائے اور یہ میری آخری منزل ہو۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ میں کتنی دور آ چکا ہوں۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ زخموں کی تکلیف نے مجھے بے جان سا بنا دیا تھا اور مجھے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر میں تھوڑی دیر اور پانی میں رہا تو کسی اور حادثے کا سامنا کیے بغیر ہی ختم ہو جاؤں۔ ایک جگہ ندی کا پاٹ کچھ کشادہ نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بلندی سے گرتے ہوئے پانی کا شور سنائی دینے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ ندی کے سامنے ایک بلند چٹان آگئی ہے اور اس نے پانی کے بہاؤ کا رخ یک دم بدل دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں میں ایک گول دارے کی شکل کی ایک چھوٹی سی جھیل میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے جھیل کی بجائے ایک بہت بڑا کتواں کہوں تو زیادہ صحیح ہو گا۔ ندی کا پانی ایک مہیب گرداب کی شکل میں اس کنوئیں کے اندر چکر لگانے کے بعد اچانک دائیں ہاتھ ایک کھڈ میں کرتا تھا۔ صرف پانی کا شور سُن کر ہی میرے لیے اس کھڈ کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ میں گرداب میں پھنس کر بلند کناروں کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا ہوا ہر ثانیہ آبشار کے قریب جا رہا تھا لیکن ایک جگہ مجھے کنارے کی چٹان سے آگے نکلی ہوئی ایک سل دکھائی دی جو پانی کی سطح سے بالشت بھر اونچی تھی۔ اس سل سے اوپر چند چھوٹے چھوٹے زیتے بنے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے چٹان کے اندر ایک ٹگاف نظر آ رہا تھا۔

(۳)

تدرت مجھے موت کے منہ سے پھینکنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ گرداب کا چکر شہر کو

بہی اس طرف آ رہا ہے؟“
وہ بولی، ”نہیں، لیکن اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں ندی میں چھلانگ لگا دوں گی؟“

مجھ میں اب کھڑا نہ ہونے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے سُل سے اوپر ایک زینے پر بیٹھنے ہوئے لڑکی سے پوچھا، ”تمھاری بستی یہاں سے کتنی دور ہے؟“
اس نے جواب دیا، ”بہت نزدیک ہے۔“
”میں نے کہا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ شام تک بستی کے کسی لوگ یہاں سے

پانی لینے آئیں گے۔“
”نہیں، بستی خالی ہو چکی ہے۔ لوگ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے ہیں۔“
میں نے کہا، ”تم صرف بیچ بول کر اپنی جان بچا سکتی ہو۔ میرا وعدہ ایک راجپوت کا وعدہ ہے۔“

اس نے جواب دیا، ”میں سچ بول رہی ہوں۔“
میں نے کہا، ”میں یہ کیسے مان سکتا ہوں کہ بستی کے لوگ تمھاری عمر کی ایک لڑکی کو تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں۔“

لڑکی نے جواب دیا، ”میں اپنے دادا کے ساتھ ہوں۔ وہ اندھا ہے۔ میں اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میرا بھائی بھی ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر وہ آ جاتا تو شاید ہم بھی دادا کو لے کر کہیں نکل جاتے۔“

لڑکی کے الفاظ سے زیادہ اس کے آنسوؤں نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ تاہم مجھے پوری طرح اطمینان نہ ہوا۔ میں نے کہا، ”تم شام تک یہاں رہو گی، اگر کوئی اس طرف آیا تو میں تمھیں ندی میں پھینک دوں گا اور اگر تمھاری باتیں درست ثابت ہوئیں تو میں یہاں سے کچھ دور تک تمھارے ساتھ جاؤں گا۔“

کھڑا رہا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی دھیمی لے میں گنگنا تا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے میں نے جلدی سے اپنا خنجر بھی نکال لیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ کہنے والا مجھے اوپر سے دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دے گا اور اُن کی آن میں اس کے کئی مددگار جمع ہو جائیں گے۔ اس لیے میں اگر دوبارہ بیچے پہنچ جاؤں تو اس پر آسانی کے ساتھ بے خبری کی حالت میں حملہ کر سکوں گا۔ چنانچہ میں دوبارہ بڑی شکل سے اسی جگہ پہنچا اور تنگ گزرگاہ سے ایک طرف پٹان کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہر لمحہ میری تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔

گنگنا نے والے کی آواز قریب آتی گئی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ کسی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی آواز ہے۔ لیکن ان حالات میں میرے لیے ایک بچہ بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ بالآخر ایک لڑکی مٹکا اٹھائے نمودار ہوئی اور میری طرف دیکھ کر بغیر آگے بڑھ کر سُل کے کنارے بیٹھ گئی اور زانو کے بل آگے جھک کر منگے میں پانی بھرنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ مٹکا اٹھا کر واپس مڑتے وقت وہ مجھے ضرور دیکھ لے گی اور میں اُسے آسانی کے ساتھ دھکا دے کر خوفناک گرداب میں پھینک سکوں گا لیکن سماج کے دیوتاؤں کا بھاری ہونے کے باوجود میری ہمت جواب دے گئی۔ میں سُل کے کنارے سے ہٹ کر زینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے منگے کو پانی سے نکال کر سُل پر رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مٹا اس نے میری طرف اور ایک ہلکی سی چیخ کے بعد مہوت سی رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔

میں نے اپنا خنجر نیچے کرتے ہوئے کہا، ”درو نہیں، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اگر تم نے شور مچایا تو میں تم پر ہاتھ اٹھانے سے دریغ نہیں کروں گا۔“
لڑکی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، ”تم... تم کون ہو؟“
میں نے کہا، ”تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔ تمھارے پیچھے کوئی اور

میں نے جواب دینے کی بجائے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بولی۔ ”تم رات یہاں نہیں گزار سکتے، میرے ساتھ آؤ۔“

میں کچھ کے بغیر اس کے پیچھے چل دیا۔ چڑھائی بہت سخت تھی اور میں بڑی مشکل سے سنبھل سنبھل کر پاؤں اٹھا رہا تھا۔ ہر چند وہ بیس قدم کے بعد میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تازہ دم ہونے کے لیے بیٹھ جاتا اور وہ رک کر میرا انتظار کرنے لگتی۔ تھوڑی دیر میں تنگ تار یکف راستہ طے کرنے کے ہم کھلی جگہ پہنچ گئے۔ میرے بائیں ہاتھ سرسبز پہاڑ تھا۔ دائیں ہاتھ نیچے وہ تاریک کھڈ تھی جس میں آبشار گرتی تھی اور سامنے پہاڑ کے نشیب میں چڑھ کے درمیان چند چھوٹی بڑیاں دکھائی دے رہی تھیں لیکن اب مجھ میں چلنے کی ہمت نہ تھی۔ میں سرسبز گھاس پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ لڑکی گھڑا نیچے رکھ کر میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”ادھر دیکھو وہ ہماری بستی ہے۔ ذرا ہمت سے کام لیجیے۔ میں حیران ہوں کہ آپ اس حالت میں وہاں کیا کر رہے تھے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میں ندی میں بہتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور شاید کسی دیوتا کا انتظار کر رہا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد میں پھر اٹھ کر چلنے لگا۔ جوں جوں میں بستی کے قریب ہو رہا تھا۔ میرے خدشات دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کسی دشمن کا ہاتھ نہیں۔ بستی سے باہر ایک نیچھٹ اور لاغر بوڑھا درد بھری آواز میں ”آشا! آشا!“ پکارتا ہوا ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے آواز دی۔ ”بابا! میں آگئی ہوں!“

بوڑھے نے ہاتھ پھیلا کر بے اختیار آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! بہت دیر لگائی تم نے، اگر تم تھوڑی دیر اور نہ آتیں تو میں شاید بھٹکتا ہوا کسی کھڈ میں جا گرتا۔“

میرے ان الفاظ نے لڑکی کا خوف لغزت اور حقارت میں بدل دیا۔ وہ تن کر بولی۔ ”نہیں، تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن میں تمہیں اپنے دادا کے پاس لے کر نہیں جاؤں گی، میں اُسے ایسی جگہ چھوڑ کر آئی ہوں جہاں سے تم اُسے تلاش نہیں کر سکتے۔ میں نے سوچا اگر میں نے تھوڑی دیر اور کوئی جائے پناہ تلاش نہ کی تو رات ہو جائے گی اور میری زندگی یہیں ختم ہو جائے گی۔ اگر میں تاریکی باہر نکلا تو میرے لیے اپنے ارد گرد کا جائزہ لینا مشکل ہو گا۔ پھر اگر میں نے کوئی راستہ تلاش کر بھی لیا تو چلنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ لڑکی میری آخری امید تھی۔ اس کی مدد کے بغیر میرے لیے اگلی صبح کا سورج دیکھنے کا امکان نہ تھا۔ بے بسی کے احساس نے میرے نسلی غور کے قلعے سہار کر دیے تھے اور لڑکی کی نگاہیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ میری جسمانی تکلیف کا اندازہ لگا چکی ہے۔ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم نگر کوٹ کی فوج کے سپاہی ہو۔ میں تم سے دھم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ تمہارے دیوتا تمہارے ہاتھوں پر بے کس انسانوں کا خون دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم میری جان لینے کا فیصلہ کر چکے ہو تو جلدی کرو، تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ لیکن اگر دیوتاؤں کی پوجا کے باوجود انسانیت تمہیں ایک عورت پر ہاتھ اٹھانے سے روکتی ہے تو میرا راستہ چھوڑ دو۔ یہ علاقہ دندوں سے خالی نہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی بستی کے راستے پر کئی شیر اور پھیٹے پہرے دینے لگتے ہیں۔“

میں نے اپنا خنجر پھینک دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور اس کا راستہ چھوڑ کر کہا۔ ”تم جاسکتی ہو۔“

میری یہ حرکت اس کے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہی۔ اس نے قدرے تذبذب کے بعد گھڑا اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور زمین پر پاؤں رکھنے کے بعد مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم زخمی ہو۔“

بوجھ محسوس کرتے ہوئے بوڑھے سے کہا: ”آپ جلتے ہیں، میں کون ہوں؟“

اس نے اطمینان سے جواب دیا: ”مجھے معلوم ہے۔“

میں نے کہا: ”آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حالات مجھے اس حالت میں یہاں نہ لے آتے تو اب تک میری تلوار ان پہاڑوں میں کئی انسانوں کا خون بہا چکی ہوتی۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن میں تمہیں جرم نہیں سمجھتا۔ تم نے جس سماج کی گود میں آنکھ کھولی ہے وہ صرف تمہیں تلوار سے دار کرنا سکھاتا ہے۔ انسانیت کی پکار سننے کے لیے کان نہیں دے سکتا۔ تم ان دیوتاؤں کے سپاہی ہو جو اپنے بچاؤوں کے سینوں سے دل نکال بیٹھتے ہیں اور اس کی جگہ پتھر رکھ دیتے ہیں۔“

میں نے کہا: ”اور آپ اس پتھر کے دل والے انسان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟ وہ بولا: ”نہیں بیٹا! پتھر کا دل تو اسی وقت چکنا چور ہو گیا تھا جب تمہارے ہاتھوں نے آتش پر وار کرنے سے انکار کر دیا۔ اب میں تمہارے سینے میں ایک انسان کے دل کی دھڑکنیں سن رہا ہوں لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتا تو بھی تمہاری تیار داری ہمارا فرض تھا۔ تم اس اڑی ہوئی بستی میں ایک دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پناہ گزین کی حیثیت سے آئے ہو۔ کاش میری آنکھیں ہوتی اور میں تمہاری خدمت کر سکتا۔“

اس کے بعد میں بوڑھے سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس بستی کے کچھ لوگ نگر کوٹ کی افواج کی پیش قدمی روکنے کے لیے جنوب کی طرف جا چکے تھے کہ شمال کی جانب سے نگر کوٹ کی ایک اور فوج کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ چنانچہ بستی کے لوگ خوفزدہ ہو کر جنگل کی طرف بھاگ نکلے اور صرف ایسے لوگ یہاں رہ گئے جن کے عزیز جنوب میں محاذ پر گئے ہوئے تھے، لیکن جب ان لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ نگر کوٹ کی فوج ندی پر پل تعمیر کر کے آگے

لڑکی نے مجھے چھوڑ کر بوڑھے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے ایک جھونپڑی کی طرف لے گئی اور میں پاس ہی سوکھی ہوئی گھاس کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں کھولیں تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں وہاں سے اُن کی جھونپڑی تک کیسے پہنچا۔ رات کے پچھلے پہر مجھے ہوش آیا تو میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میرے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں آگ سلگ رہی تھی۔ میرے قریب دوسری چار پائی پر کوئی اور سو رہا تھا۔ میں نے شدت کی پیاس محسوس کرتے ہوئے پانی مانگا۔ آتشا جو شاید ساری رات نہیں سوئی تھی۔ میری آواز سننے ہی برابر کے کمرے سے نکلی اور مجھے پانی دیتے ہوئے بولی: ”آپ رات کے بھوکے ہیں، میں نے آپ کے لیے دوڑھ رکھ چھوڑا تھا۔ ابھی گرم کرتی ہوں۔“ وہ دوڑھ گرم کرنے بیٹھ گئی اور میرا دل شرم اور ندامت کے بوجھ سے پسا جا رہا تھا۔ بوڑھا جو میرے قریب لیٹا ہوا تھا اور اس نے میرا بستر ٹٹولنے کے بعد میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”تمہارا بخار ابھی کم نہیں ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جوانی کے زخم بہت جلد بھر جاتے ہیں۔“

تیسرے دن میرا بخار قدرے کم ہو چکا اور میں کسی حد تک اطمینان سے اپنے محسنوں کے ساتھ باتیں کر سکتا تھا۔ بوڑھے نے مجھ سے ابھی تک کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا تھا جس کا جواب دینا میرے لیے تکلیف دہ ہوتا۔ غالباً آتشا اُسے میرے متعلق یہ بتا چکی تھی کہ میں ان کے بدترین دشمنوں کی فوج کا ایک سپاہی ہوں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ میں کب اور کیسے زخمی ہوا ہوں۔ میں اس کے لیے صرف ایک بے بس انسان تھا۔

اسی دن جب آتشا ندی سے پانی لینے گئی تو میں نے اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت

پانی لانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ آشا کو اب وہاں نہیں چاہیے۔
 آشا نے مسکرا کر کہا۔ ”درندے انسان پر انتہائی بھوک کی حالت میں حملہ کرتے
 ہیں اور اب اس پاس اتنے مولیشی ہیں کہ کوئی درندہ بھوکا نہیں رہا ہوگا۔“
 بوڑھا اٹھ کر لاکھی کے سہارے باہر نکلا اور تھوڑی دیر میں اندر آ کر کہنے لگا۔
 ”آشا کو اب وہاں نہیں جانا پڑے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ کل تک بارش ضرور ہو جائے
 گی۔“

میں نے لیٹے لیٹے کہا۔ ”باہر بادل تو معلوم نہیں ہوتے۔“

وہ بولا۔ ”ہو اتنا رہی ہے کہ بادل ابھی اُجھائیں گے۔“

شام کے قریب میں بادلوں کی گرج سن رہا تھا اور آشا کہہ رہی تھی۔ ”میرے
 بابا کی باتیں کبھی جھوٹی نہیں ہوتیں۔“

تھوڑی دیر بعد میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا موسلا دھار بارش کی آواز سن کر اس
 لیے خوش ہو رہا تھا کہ آشا کو اب پانی لانے کے لیے ندی پر نہیں جانا پڑے گا۔

ان حالات میں میرے دل میں کسی بد صورت لڑکی کے لیے بھی غایت درجہ
 کا اُفس پیدا ہو جانا یقینی تھا اور آشا کی شکل و صورت تو ایسی تھی کہ اگر میں اُسے کہیں
 راہ چلتے بھی دیکھ لیتا تو بھی میری نگاہیں ٹکر بھر بھٹکتی رہتیں۔ میں اس کے چہرے پر
 ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر یوں محسوس کرتا کہ بستی کی اُداس اور مغموم فضا میں مُسرت
 کے مقہور سے لبریز ہو گئی ہیں لیکن یہ مسکراہٹیں تار یک بادلوں سے گزرنے

والے چاند کی طرح عارضی ہوتیں، اس کا چہرہ عام طور پر مغموم رہتا اور اُس کے
 غم کی وجہ اس کے بھائی کی غیر حاضری تھی۔ آشا کے انتظار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر
 صبح اس کے حصے کا کھانا رکھ چھوڑتی اور جب شام ہو جاتی تو بھائی کے لیے رکھی
 ہوئی باسی ردی خود کھا لیتی اور اپنے حصے کا کھانا اُس کے لیے سنبھال کر رکھ لیتی

بڑھنا چاہتی ہے تو وہ بھی راتوں رات روتی ہو گئے۔ بوڑھے نے آشا کو سمجھایا تھا
 کہ وہ بھی ان لوگوں کے ہمراہ چلی جائے لیکن اس نے اپنے اندھے بابا کو چھوڑ کر بھاگ
 گواہ نہ کیا۔ اب یہ دونوں یہاں پر آشا کے بھائی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے
 بوڑھے کو ندی عبور کرنے کے بعد جو لڑائی ہوئی، اُس کے حالات سنائے تو اُس
 نے کہا۔ ”مجھے اُمید نہیں کہ اس جنگ میں ہماری بستی کے کسی آدمی نے حصہ لیا
 ہو۔ جن جوانوں میں لڑنے کی ہمت تھی، وہ پہلے ہی جنوب کی طرف جا چکے ہیں۔ یہ
 لوگ جنھوں نے اس درجہ بہادری سے تمھاری فوج کا مقابلہ کیا ہے۔ شمال اور مشرق
 کی بستیوں سے آئے ہوں گے۔“

بستی کے لوگ فرار ہوتے وقت اپنے بہت سے مولیشی چھوڑ گئے تھے یہ مولیشی
 اُدھر اُدھر چرنے کے بعد شام کے قریب بستی میں جمع ہو جاتے اور آشا اُنھیں
 درندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے رات کے وقت چند گھروں میں بند کر دیتی اور
 علی الصبح چھوڑ دیتی لیکن درندے بعض دفعہ دن کے وقت بھی بستی کے اُس پاس
 دو چاد مولیشی ہلاک کر دیتے۔ ان حالات میں آشا کا پانی لینے ندی پر جانا خطرے سے
 خالی نہ تھا لیکن بارش نہ ہونے کے باعث بستی کے قریب ایک چھوٹا سا چشمہ
 سوکھا پڑا تھا اور وہ جو ہر جس میں بستی کے لوگ مولیشیوں کے لیے پانی جمع رکھے
 تھے، متعفن ہو گیا تھا اور اس کا پانی انتہائی عجوبہ کی حالت میں بھی پینے کے
 قابل نہ تھا۔

آشا پانی لے کر آئی تو بہت بدحواس ہو رہی تھی۔ ہم نے وہ پوچھی تو اُس
 نے بتایا کہ جب وہ پانی لے کر واپس آ رہی تھی تو راستے سے تھوڑی دور ایک شیر
 ایک گائے کو پھاڑ کر اس کا گوشت لُٹچ رہا تھا۔
 میں نے کہا یہ ہم اس پانی سے تین چار دن گزاریں گے۔ اس کے بعد میں خود

تھی کہ شاید وہ رات کو کسی دقت آجائے۔

(۴)

ہوں جو دن گزر رہے تھے میرا یہ اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جگت نرائن اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ضرور کوئی نیا محاذ منتخب کرے گا۔ وہ اس بستی سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ اگر وہ اس طرف آنکلا تو خالی جھوٹروں کو بھی آگ لگانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اپنے لڑکوں کی موت نے اسے پاگل بنا دیا ہو گا۔ یہ ممکن نہیں کہ میری مداخلت سے وہ آشا اور اُس کے اندھے دادا پر اپنا غصہ نکالنے سے باز رہ سکے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میری طرف سے بغاوت کی صورت میں میرے اپنے سپاہی میرا ساتھ دیں لیکن اس کا انجام کیا ہو گا؟ اگر بغاوت کی دھمکی سے جگت نرائن اور اس کے ساتھ باقی سردار آشا اور اس کے دادا پر ہاتھ اٹھانے سے باز آ بھی گئے تو بالآخر یہ معاملہ پر دہشت اور راجہ کے سامنے پیش ہو گا۔ یہ قیدیوں کی حالت میں وہاں پیش ہوں اور جو لوگ اس جنگ میں مارے گئے ہیں۔ وہ سب ان بے گناہوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سزا کا مطالبہ کریں گے۔ نگر کوٹ میں میرا کوئی دوست نہ ہو گا۔

ساتویں روز میں بستر سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ آشا علی الصباح اپنے مکان سے باہر ایک گائے کا دودھ دودھ رہی تھی۔ میں اپنے بستر سے اُٹھ کر باہر نکلا اور اس کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دودھ دودھ کر اُٹھی تو میں نے کہا۔ ”آشا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دودھ کا برتن میرے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیسے؟“ میں نے کہا۔ ”آشا تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ

نگر کوٹ کی فوج جنوب یا شمال سے اس طرف ضرور آئے گی۔“ وہ بولی۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے اندھے دادا کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں؟“

”نہیں آشا! تمہارے دادا کی مدد کے لیے میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن آپ چلنے کے قابل نہیں ہوئے اور اگر آپ اس قابل ہوتے بھی تو ہم سندر کا انتظار کیسے بغیر کیسے جاسکتے ہیں۔“ سندر اُس لڑکی کے بھائی کا نام تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا کر پھر اس بستی میں واپس آ جاؤں گا اور جب تمہارا بھائی آئے گا تو اسے تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔“

وہ بولی۔ ”لیکن ابھی آپ اچھی طرح چل نہیں سکتے۔ پھر آپ خود یہ کہتے ہیں کہ نگر کوٹ کی فوج بر فانی پہاڑوں تک ہمارے لوگوں کا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن ہے کسی جنگ میں ہم اپنے آدمیوں کو تلاش کر لیں۔ لیکن جب آپ کی فوج اس طرف جائے گی تو لوگ وہاں بھی اس بستی کی طرح ہمیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ بابا میرا ہاتھ پکڑ کر بھی چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا اور ہم اگر آپ کی فوج کے ہاتھوں سے بچ بھی گئے تو تنہا جنگل میں بھٹکے ہوئے درندوں کا شکار ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میں اس صورت میں تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن تمہارا یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ اگر بھگوان کو منظور ہو تو تمہارا بھائی تم سے آٹے کا لیکن تم ایک عورت ہو۔ تم نے دیکھا ہے کہ چیتے کس بے دردی کے ساتھ مویشیوں کو ہلاک کرتے ہیں، وہ لوگ جنہیں میں جانتا ہوں چیتوں سے زیادہ بے رحم ہیں

چھینے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد آرام سے بیٹھ جاتے ہیں لیکن ہمارے سماج کے بیٹوں کے دلوں سے انسانوں کے خون کی پراسں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر مجھے صرت اس بات کا یقین ہوتا کہ میں اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچا سکوں گا تو میں تمہیں یہ مشورہ نہ دیتا۔ لیکن تمہارا واسطہ بھیڑیوں سے ہے۔ انسانوں سے نہیں۔ جب تمہارا بھائی آئے گا تو باقی بستی کی طرح اپنا گھر خالی دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ تم بستی کے لوگوں کے ساتھ جا چکی ہو۔ میں پھر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں لے گا میں تمہارا ساتھ رہوں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے ساتھ رہوں۔

اپنی جان بچاؤ آتشا اگر اپنے لیے نہیں تو میرے لیے :

آخری الفاظ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ دیے۔ آتشا نے بغور میری طرف دیکھا اور اپنے آنسو پر ہنچتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے میری جان کی قیمت بہت بڑھا دی۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تو ہم کل صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل چلیں۔“

وہ بولی یہ اتنی جلدی نہ کیجیے، ابھی آپ نہیں چل سکیں گے۔“

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میری فکر نہ کر۔ اگر میری ٹانگ کی تکلیف بڑھ گئی تو ہم ابتدائی منزل بس ذرا آرام سے طے کر لیں گے۔ میں ابھی تمہارے دادا سے بات کرتا ہوں۔“

ہم اُٹھ کر اندر جانے کو بٹھے کہ آتشا اچانک بدحواس سی ہو کر ”بھیا! بھیا!“ کہتی ہوئی ایک طرف بھاگنے لگی۔ کوئی بیس چالیس قدم دور ایک نوجوان دلوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ بُری طرح زخمی ہے۔ میں بھی بھاگ کر آگے بڑھا اور ہم اُسے سہارا دے کر مکان کی طرف لے آئے۔ آتشا کا دادا باہر نکل کر چلا رہا تھا۔ آتشا! آتشا! کہاں ہے

تمہارا بھیا! اور سندر خجف آواز میں آتشا سے کہہ رہا تھا۔ آتشا تم بھاگ جاؤ، مجھے چھوڑ دو۔ اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو۔ آتشا تم بھاگ جاؤ۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔“ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر وہ ایک زوردار جھٹکے سے اپنے آپ کو ہمدی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے چلا یا۔

وہ مشرق اور جنوب کی طرف سے اس بستی کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں۔ تم ندی کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف جنگل میں پہنچ جاؤ۔ وہاں چند ساتھی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب جلدی کرو۔ سوچنے کا وقت نہیں، بابا آتشا کو سمجھاؤ۔ ان

الفاظ کے ساتھ سندر کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ منہ کے بل گر پڑا میں نے جلدی سے اُسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکا تھا۔ پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر نکلی ہوئی انٹڑیوں کو ہاتھوں کا سہارا دے کر

یہاں تک پہنچنا انسان کی قوت سے بعید تھا۔ آتشا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی، تھوڑی دیر کے لیے میں بھی مہوت سا ہو کر اس خوش وضع نوجوان کی لاش دیکھتا رہا لیکن اچانک میں نے ایک جھرجھری

کی آواز ایک ہاتھ سے آتشا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے دادا کا ہاتھ پکڑ کر ندی کی طرف چل دیا۔ آتشا اضطرابی حالت میں چند قدم اٹھانے کے بعد رُک گئی اور اس نے چلا کر کہا۔ ”نہیں میں اپنے بھائی کی لاش چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ بوڑھا بھی

زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”بابا یہ آتشا کی جان بچانے کا آخری موقع ہے بھگوان کے لیے اپنے پوتے کی آخری خواہش پوری کرنے سے انکار نہ کرو۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”اگر تم آتشا کی جان بچا سکتے ہو تو اُسے لے جاؤ۔ اب میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اب میری ٹانگوں میں میرا بوجھ اٹھانے کی ہمت

نہیں رہی۔ آتشا بیٹا، جاؤ۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

پتھرائی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی ان آدمیوں کے ساتھ چل پڑی اور میں ایک لمبے ہوئے مسافر کی طرح بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۵)

والہی پر انتہائی کوشش کے باوجود میری رفتار بہت ٹھست تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے فوج کے چند دستے بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ چند سپاہی مجھے دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے جگت نرائن کے ماتحت لڑنے والی فوج کے حالات پوچھنے لگے۔ میں کوئی جواب دیے بغیر آٹا کے گھر کی طرف بڑھا۔ سندر کی لاش کے قریب اس کے دادا کی لاش پڑی تھی لیکن یہ دونوں لاشیں اس حد تک مسخ کر دی گئیں تھیں کہ میرے لیے ان کا پہچانا مشکل تھا۔ ایک سردار آگے بڑھ کر بے اختیار میرے ساتھ لپٹ گیا اور کہنے لگا۔ ”بھگوان کی کرپا ہے کہ تم زندہ ہو۔ ہم نے تمہارے متعلق بہت بُری خبر سنی تھی۔ کہاں سے آ رہے ہو تم؟ جگت نرائن نے ہمیں پیغام بھیجا تھا کہ دشمن اس علاقے میں جمع ہو رہا ہے، لیکن اس بستی میں ہمیں ایک لاش اور ایک اندھے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ہم نے بستی پر حملہ کرنے سے پہلے دشمن کے بے پہاڑ کی طرف جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نیچے جنگل کی طرف بھاگ گئے ہوں گے۔“

میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے کہا۔ اس اندھے کو مارنے میں کیا فائدہ تھا؟

اس نے کہا۔ ”ارے یار وہ کبخت بڑا ضدی تھا۔ ہم اس سے بستی کے لوگوں کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ ہمیں پاگلوں کی طرح گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹکڑا مارا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ شاید پہلے ہی سرنے

میں آٹا کو پکڑ کر کھینچنے لگا اور وہ ڈھاڑیں مارتی ہوئی میرے ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد زندہ رہنے کی خواہش اس کے ہر زخم پر غالب آ چکی تھی اور وہ میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ مجھے کچھ دیر اپنی جسمانی تکلیف کا احساس نہ ہوا۔ لیکن کوئی آدھ کو س چلنے کے بعد میری ہمت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ندی کے کنارے کنارے پہاڑ کے نشیب میں کوئی ایک کوس فاصلہ طے کیا اور ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ اب آٹا میرا ساتھ دینے کی بجائے میری راہنمائی کر رہی تھی۔ اچانک گھنے درختوں کی اوٹ سے پانچ مسلح فوجیوں نمودار ہوئے اور ہمارا استدروک کر کھڑے ہو گئے۔ یہ وہی تھے جن کا آٹا کے بھائی نے پتہ دیا تھا۔ ایک فوجیوں نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اپنی کلہاڑی بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں آٹا کو تمہارے پاس پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔ اب باتوں کا وقت نہیں، آٹا میرے متعلق یہ بتا سکے گی کہ میں تمہارا دشمن نہیں۔ تم اب اسے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔“ پھر میں نے آٹا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آٹا اب میرے لیے تمہارے ساتھ بھاگنا مشکل ہے۔ میں اب بستی کی طرف واپس جاتا ہوں ممکن ہے میں تمہارے بابا کی جان بچا سکوں۔“

ایک فوجیوں نے سندر کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”سندر مر چکا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شمال کی طرف سے نگر کوٹ کی دوسری فوج نیچے کے کسی مقام سے ندی عبور کر کے اس طرف نہ آ رہی ہو۔ اس لیے دن کے وقت تمہارے لیے ندی کے کنارے چلنے کی بجائے جنگل میں چھپ کر چلنا بہتر ہوگا۔“

آٹا جیسے خواب کی حالت میں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر

موقع مل گیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جنگل میں ہیں تو ہم انھیں پھیلنے کی طرح گھیر کر مار سکیں گے۔ ہمارے سیناپتی ان لوگوں کے ساتھ بٹنا جانتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہم نے دشمن کو کسی ٹکستیں دینے کے بعد اس پہاڑ کے پیچھے کی کوس وسیع علاقہ صاف کر دیا ہے۔

سردار یہ سمجھ کر کہ میں جنگل نرائن کی شکست کے ذکر سے پرہیز کیا ہوں، مجھے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے اپنی فتوحات کی تفصیلات سنا رہا تھا لیکن میرے خیالات کہیں اور تھے۔ میں صرف آتشا کے متعلق سوچ رہا تھا اور انتہائی عاجزی کے ساتھ بھگوان سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ جنگل نرائن کی فوج کے جنگل میں داخل ہونے سے پہلے کہیں دور نکل جائے۔ میں ان دیوتاؤں

کو بھی آتشا کی مدد کے لیے بلا رہا تھا جن کی تقدیر کے متعلق میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو چکے تھے لیکن میری دعا قبول نہ ہوئی۔ شام سے کچھ دیر پہلے جنگل نرائن اپنی فوج کے ساتھ اس بستی میں پہنچ گیا۔ آتشا اُس کے قیدیوں کے ساتھ تھی۔ مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ میں اس کے سامنے جا سکوں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس وقت دیوتاؤں سے کام لیا تو آتشا کو بچانے کے لیے سے امکانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے میں نے کسی گدیہ نہ بتایا کہ میں آتشا کو جانتا ہوں اور جب میں موت کے قریب تھا تو اُس نے مجھے پناہ دی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے سوالات کے جواب میں میں نے انھیں صرف یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں نے ندی سے نکلنے کے بعد چند دن پاس ہی ایک غار میں گزارے ہیں اور اُس پاس بھگنے والے ان مویشیوں کے دودھ پر گزارہ کرتا رہا ہوں جنھیں پہاڑی لوگ بھاگتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جنگل نرائن مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن جب اُس

کے لیے کسی بہانے کا منتظر تھا لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ ”میں زخمی تھا اور یہاں پاس ہی ایک جگہ چھپا ہوا تھا۔“

وہ بولا۔ ”تو آپ کو یہ خبر نہیں کہ سردار جنگل نرائن کی فوج یہاں کب پہنچے گی؟ ہمیں سیناپتی نے یہ ہدایت کی تھی کہ ہم یہاں ان کا انتظار کریں۔ اپنی اطلاع کے مطابق انھیں آج ہی یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ سیناپتی خود بھی اس طرف آ رہے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ آپ کی فوج کی تباہی نے ہمارے تمام ارادے بدل دیے اور ہمیں وہ کامیابی جس کی اُمید تھی نصیب نہیں ہو سکی۔“

میں نے نفرت اور حقارت کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا ”کیا ایک اندھے کو مار دینا آپ کے نزدیک کامیابی نہیں؟“

سردار نے کہا ”اگر آپ کا مطلب ہے کہ بستی کے لوگ ہماری کسی بے تدبیری کے باعث بچ گئے ہیں تو یہ غلط ہے۔ ہمیں صرف جنوب اور مشرق کی طرف سے اس بستی کے گرد گھیر ڈالنے کی ہدایت کی گئی تھی اور اس طرف سے ہم نے دشمن کے لیے فرار ہونے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ سردار جنگل نرائن نے ہمیں اطلاع بھیجی تھی کہ وہ نیچے کے کسی صحت ام سے ندی عبور کر کے دشمن کے لیے مغرب کے جنگل میں پناہ لینے کے تمام راستے بند کر دے گا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ دشمن نے کسی جگہ پل بنا کر ندی عبور کر لی ہے اور وہ سردار جنگل نرائن کی پہلے خبری سے فائدہ اٹھا کر شمال کی طرف کہیں دور نکل گیا ہے۔ دوسری یہ کہ انھوں نے اپنی اطلاع کے مطابق ندی عبور کر کے مغرب کے جنگل کی طرف دشمن کے فرار ہونے کا راستہ بند نہیں کیا اور دشمن کو بھاگنے کا

سیوا کے لیے بھیج دیا جائے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جنگل میں ہم نے ایک لڑکی کو پکڑا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور پروہت کے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی ہمیں شیوجی کے مندر میں ضرورت ہے۔ تم نے قیدیوں کو دیکھا ہے نا؟“

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ آسنا کے سوا کسی اور کی طرف نہیں لیکن میں نے جواب دیا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں لیکن وہ ان میں سے نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے کہیں ندی میں چھلانگ نہ لگا دی ہو۔“

جگت نرائن نے کہا ”تو جہر یہ تمہارا تصور ہوگا۔ تم نے اُسے بنا دیا ہوگا کہ ہم لوگ بہت ظالم ہیں اور اپنے قیدیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں!“ میں نے عقارت کے ساتھ جواب دیا۔ ”ہاں میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ شیوجی کے مندر میں دیوداسیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔“

جگت نرائن غصے سے کانپتے ہوئے چلایا۔ ”خاموش رہو۔ مجھے بار بار اس بات کا احساس نہ دلاؤ کہ میں نے تمہیں ایک سپاہی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اگر تمہارا دل اس قدر نازک ہے تو تم واپس جاسکتے ہو۔ ویسے اب تم اس قابل نہیں ہو کہ کسی جنگ میں حصہ لے سکو۔ اپنے بیٹوں کی موت کے بعد میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، تم ان پیچھوں کی طرف ذرا دی کرو۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا تو پھر بھی آپ مجھے یہی جواب دیتے؟“

جگت نرائن نے عقارت سے جواب دیا۔ ”اگر تمہاری جگہ میرا بیٹا ہوتا تو ان لوگوں کی مدر سے زندہ رہنے کی بجائے ندی میں ڈوب جانا بہتر سمجھتا۔“ میں انتہائی مایوسی کی حالت میں جھونپڑی سے باہر نکل رہا تھا کہ جگت نرائن

نے یہ کہا کہ میں نے تمہارے آدمیوں سے تمہارے سر کے ہر بال کے بدلے ایک پلچھ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی قسم لی تھی، تو میرا دل بیٹھ گیا۔

(۶۱)

رات کے وقت جب جگت نرائن ایک بھونپڑی میں آرام کر رہا تھا میں اس کے پاس پہنچا اور اُسے اپنی سرگزشت سنائی لیکن احتیاطاً آستیا اُس کے دادا کا ذکر چھپانے کی بجائے، میں نے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا کہ میں ندی کے کنارے مر رہا تھا کہ ایک لڑکی اس طرف آنکلی اور وہ میری حالت پر رحم کھا کر مجھے اس اجڑی ہوئی بستی میں لے آئی اور میری تیمارداری کرتی رہی۔

جگت نرائن نے مجھ سے سوال کیا۔ ”وہ لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ فوج کی آند سے پہلے کہیں روپوش ہو گئی تھی اور میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ اگر وہ کہیں پکڑی جائے تو آپ مجھ پر اُس کے احسانات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی جان بچانے کی کوشش کریں۔“

جگت نرائن نے اپنے تیور بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، تمہاری جان دیوتاؤں نے بچائی ہے۔ دیوتا اگر چاہیں تو وہ ایک پھوکو کوڑنک مارنے سے مارنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ دیوتا چاہتے تھے کہ تم دھرم کی سیوا کے لیے زندہ رہو، اس لیے انھوں نے ایک ڈائن کی بیٹی کے دل میں تمہارے لیے تھوڑی دیر کے لیے رحم ڈال دیا لیکن میں تمہیں مایوس نہیں کرتا۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ آگئی تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اُسے مندر کی

نے مجھے آواز دے کر دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرا قیاس غلط نہیں تو تم اس لڑکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔“
”کون سی بات؟“ میں نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد جگت نرائن نے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اور بولا۔ ”میرے پاس آنے سے پہلے تمہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکی کہاں ہے اور تم اس کا پتہ دینے سے پہلے میرے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اگر میرا یہ خیال غلط نہیں تو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے اُسے کہاں چھپا رکھا ہے لیکن تم سے یہ غرور کہوں گا کہ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تم نے ایک علیحدہ لڑکی کو بھاگنے میں مدد دی ہے تو تم نگر کوٹ کے کسی سپاہی کو اپنا دست نہیں پاؤ گے۔ تمہارے لیے یہ لوگ اُن سوراہوں کو بھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جو دھرم کے ان دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔“

میں اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ لے کر وہاں سے نکلا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر میں صبح سے پہلے آشا کو قید سے چھڑانے کی کوئی تدبیر نہ کر سکا تو کل تک باقی فوج پہنچ جائے گی اور میرے لیے آشا کی مدد کرنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ ہر لحظہ میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل گہج گہجے تھے۔ میں اس جھونپڑی کی طرف بڑھا جہاں قیدیوں کو جمع کیا گیا تھا۔ پیریداروں میں سے چند میرے اپنے آدمی تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے لیکن مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ وہ میرے لیے دلوانا کا عتاب مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میں کسی کو اپنا راز دار بنانے سے

پہلے اس کا دل ٹولنا ضروری سمجھتا تھا۔ ایک نوجوان جس کا نام بنسی داس تھا۔ میری فوج کے ایک دستے کا افسر تھا اور میں اس کے متعلق جانتا تھا کہ حملے کے آغاز میں جگت نرائن کے حکم پر غور توں اور بچوں کے قتل پر وہ بہت برگشتہ تھا۔ چنانچہ پہرے داروں میں سے کسی کے ساتھ بات کرنے کی بجائے میں نے اُسے تلاش کیا اور اُسے ایک طرف لے جا کر اپنی تمام سرگزشت سُنا دی۔ بنسی داس نے کسی تذبذب کے بغیر آشا کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا۔ کچھ دیر بحث کرنے کے بعد ہم ایک تجویز پر متفق ہو گئے۔ بنسی داس مجھے فوج کے بڑے اوڑھے کچھ فاصلے پر ایک جگہ بٹھا کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے دستے کے آٹھ ایسے آدمیوں کو میرے پاس لے آیا، جن کے متعلق ہمیں یقین تھا کہ وہ کوئی سوال پوچھے بغیر ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ان آدمیوں کو میں نے بتایا کہ ہمیں فوج میں ایک خطرناک سازش کا علم ہوا ہے اس لیے سردار جگت نرائن کی خواہش ہے کہ چند آدمیوں کو چپکے سے گرفتار کر لیا جائے اس کے بعد بنسی داس قیدیوں کے پہرے داروں کے پاس گیا۔ پیریداروں کی ٹوٹی کا افسر جگت نرائن کا اپنا آدمی تھا۔ بنسی داس نے اُسے بتایا کہ سردار جگت نرائن مجھے بڑے اوڑھے گشت کرتے ہوئے ملے ہیں اور وہ تمہیں بلاتے ہیں۔ پیریداروں کا افسر بنسی داس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم کچھ فاصلے پر اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ پیریداروں کا افسر کہہ رہا تھا۔ ”سردار بہت تھکے ہوئے تھے۔ مجھے اخلو نے شام کے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ میں بہت جلد سو جاؤں گا۔ اس طرف اُجاڑ میں وہ کیا کر رہے ہیں۔“ اور بنسی داس اُسے سمجھا رہا تھا کہ آگے کئی جھونپڑیاں ہیں اور سردار ایک جھونپڑی سے باہر کھڑا واسدیلو کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم ڈرتے کیوں ہو۔

بنسی داس کے آخری الفاظ کا اگر ثابت ہوئے اور پیریداروں کے افسر

کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا اور بولا: ”میں قیدیوں کے بھاگنے کا راستہ صاف کر چکا ہوں لیکن آتشا کے متعلق میں ایک افسوس ناک خبر لے کر آیا ہوں۔“

میرا دل بیٹھ گیا اور میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: ”بھگوان کے لیے بتاؤ کیا ہوا۔“

اس نے کہا: ”ابھی پردہت کے بھائی نے دو بھائیوں کو بھیجا تھا اور وہ آتشا کو اس کے پاس لے گئے ہیں۔ میں اگر کوئی مزاحمت کرتا تو یہ تمام کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔“

میں نے ہنسی داس کو سمجھایا کہ میں آتشا کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کر دوں گا اور تم تھوڑی دیر انتظار کے بعد تمام قیدیوں کو رہا کر دو اور انھیں یہ بھی سمجھا دو کہ ان کا ایک ساتھ چلنے کی بجائے جنگل یا پہاڑ کی طرف منتشر ہو جانا بہتر ہوگا۔ تمھارے لیے بھی بھاگ بھگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر کبھی وقت آیا تو شاید میں تمھیں اس احسان کا بدلہ دے سکوں۔ لیکن اگر میں تمھارے احسان کا بدلہ نہ بھی دے سکا تو تمھیں یہ اطمینان رہے گا کہ تم نے بھگوان کی مرضی پوری کی ہے۔ اس کی نگاہ میں تمھارا اور مجھ کا دیوتاؤں سے ادب بچا ہوگا۔“

ہنسی داس نے جواب دیا: ”میں آخری وقت تک تمھارے ساتھ ہوں۔ آپ تھوڑی دیر پردہت کے بھائی کی قیام گاہ سے باہر میرا انتظار کریں۔ میں قیدیوں کو رہا کرتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ وہ جھونپڑی تلاش کر سکیں گے؟“

میں نے جواب دیا: ”وہاں میں آنکھیں باندھ کر جاسکتا ہوں۔ وہ ظالم اُسی گھر میں ٹھہرا ہے جہاں مجھے پناہ ملی تھی۔“

نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: ”اسے یاد دلاتا کون ہے؟“

خوش قسمتی سے تاریکی میں وہ ہم میں سے ہر ایک کو جگت نہ لے سکا تھا۔ سپاہیوں نے میرے اشارے پر عمل کیا اور اسے آن کی آن میں رستوں میں جکڑ دیا گیا۔ ایک سپاہی نے اس کی گردن پر خنجر رکھتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر تم نے شور مچایا تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔

ہنسی داس پھر تاریکی میں غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر میں دروازے پر بھاریوں کو لے آیا اور انھیں باندھنے کے بعد ان کی جگہ اپنے دو آدمی ساتھ لے گیا۔ ہم نے ان پر دروازے کے منہ پر احتیاطاً کپڑے باندھ دیے تاکہ وہ کسی کے ساتھ بات نہ کر سکیں۔ اب ہنسی داس کی اطلاع کے مطابق باقی پیریداروں میں سے چار ہمارے اپنے آدمی تھے اور تین دوسرے سرداروں کی فوج سے تعلق رکھتے تھے۔

اب ہمارا یہ تجویز یہ تھی کہ ہنسی داس خود پہرے داروں کے انصر کی جگہ لے لے گا اور آدھی رات دوسرے دستوں کے تین پہرے داروں کو بھی کسی نہ کسی بہانے وہاں سے رخصت کر دے گا۔ اس کے بعد وہ مجھے اطلاع دے گا۔ ہنسی داس کو آخری بار رخصت کرنے سے پہلے میں نے اُسے دوسرے آدمیوں سے علیحدہ کر کے سمجھایا کہ وہ آتشا سے ملے اور اسے میری طرف سے یہ پیغام دے کہ وہ قیدیوں کو آدھی رات کے قریب بھاگنے کے لیے تیار رکھے۔ ہنسی داس کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ مجھے اس بات پر قدرے اطمینان ہوا کہ باقی فوج جو باہر پڑی ہوئی تھی، اب جھونپڑیوں کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گی۔ میں نے ایک سپاہی سے اس کے ہتھیار لے لیے اور انتہائی بے قراری کے ساتھ ہنسی داس کے پیغام کا انتظار کرنے لگا۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں اُسے دیکھتے ہی

(۷)

تھوڑی دیر بعد میں آشا کے گھر کی دیوار کے قریب ایک درخت کے نیچے کھڑا
 پردہست کے بھائی کے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ ”تم دیوانی ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی
 کہ میں نے تمہیں جنگل میں گرفتار ہوتے وقت دیکھ لیا تھا۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی
 کو زندہ رہنا چاہیے اور میں تمہیں جو زندگی عطا کر سکتا ہوں۔ اس پر نگر کوٹ میں
 ادنیٰ ذات کی ہزاروں لڑکیاں رشک کریں گی۔ تم اس جنگل سے نکل کر اس
 مندر کی سیر کر دگی جو راجوں کے محلوں سے زیادہ عالی شان ہے اور جس کے بچاؤ
 سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھاتے ہیں۔ پس اس پردہست کا بھائی ہوں،
 جس کے سامنے نگر کوٹ کا راجہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ میں تمہیں شدھ کر کے
 اپنے گھر میں جگہ دوں گا۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ مجھے تمہارا قیدیوں کے
 ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔ دیکھو میں نے یہ سمجھ کر کہ تمہیں بھوک ہوگی اپنا کھانا
 تمہارے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔ دیکھو مجھے ناراض کرنے کا مطلب یہ ہوگا
 کہ کالی دیوی کے سامنے دوسرے قیدیوں کی طرح تمہارا بھی بلیڈاں دیا جائے۔“
 آشا کی آواز سنائی دی۔ ”ذلیل کہتے! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم مجھے
 مار سکتے ہو، میری عزت نہیں چھین سکتے۔ مجھے چھوڑ دو، ورنہ میں شور مچاؤں گی۔“
 پردہست کے بھائی نے کہا۔ ”تم اگر چلاؤ بھی تو اس وقت کسی کو اس جھونپڑی
 کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ اس وقت نگر کوٹ کا راجہ بھی یہاں ہو تو وہ
 تمہاری چیخوں پر توجہ دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔“
 آشا چلا رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مرنے کے لیے
 تیار ہوں۔“
 میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور میں آگے بڑھ کر جھونپڑی سے

اندہ داخل ہونے کو تھا کہ مجھے گشت کرنے والے سپاہیوں کی ایک ٹولی کی چابُسنائی
 دی اور میں پھر درخت کے ساتھ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ آشا کی چیخ پکار سن کر سپاہی
 بھاگ کر آگے بڑھے اور ایک سپاہی دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ”ہماراج! ہماراج!“
 کہہ کر آوازیں دینے لگا۔ اندر سے پردہست کا بھائی گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ چلا آیا۔
 ”گدھا کہیں کا، بھاگ جایاں سے، ورنہ میں تمہاری کھال اتروا دوں گا۔“

سپاہی رفوچکر ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی
 لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ پردہست کا بھائی آشا سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ یا تم نے؟
 تمہاری چیخیں بے فائدہ ہیں۔ اب اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور خود سے میری
 باتیں سنو۔“

مجھے معلوم تھا کہ دروازہ کافی مضبوط ہے اور معمولی دھکے کے ساتھ اُسے توڑنا
 ممکن نہیں، لیکن قدرت نے میری مدد کی اور اچانک ایک طرف سپاہیوں کی چیخ اور
 پکار سنائی دینے لگی۔ میں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔ ”ہماراج! ہماراج!“
 دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ اپنی جان بچائیے!“

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ پردہست کے بھائی نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر
 بھاگنا اور میں نے اس کے سینے پر تلوار کی لوک رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے شور
 کیا تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔“

پردہست کا بھائی اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور میں نے جھونپڑی میں داخل ہوتے
 ہی دوسرے ہاتھ سے پردہست کے بھائی کے منہ پر ایک گھونسا سید کر دیا۔
 پردہست کا بھائی گر پڑا اور آتشیں اسکیاں لیتی ہوئی مجھ سے پیٹ گئی۔ پردہست
 کے بھائی گوبے، موش دیکھ کر میں نے اُسے باندھنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور
 کٹڑی کی مشعل کرے کے ایک کونے میں جل رہی تھی، بجھا کر آشا کے ساتھ باہر

جائیں گی۔ ٹانگ میں ہر لمحہ بڑھتے ہوئے درد نے مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے پہلے بنسی داس سے وعدہ لیا کہ وہ میرا ہر حکم مانے گا اور پھر آشا کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آشا یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ اس لیے آگے بنسی داس تمہارا ساتھ دے گا۔“

آشانے جواب دیا: ”آپ کے سوا مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ساتھ جان دیں گے۔“

میں نے کہا: ”آشا میرا کہا مانو، مجھے اپنے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں ایک سردار ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے میں اپنے سپاہیوں کے بل بوتے پر فوج کے ہر سردار کے ساتھ ٹکڑے سکتا ہوں لیکن اگر تم پکڑی گئیں تو تمہاری حمایت کے لیے میرے سپاہی بھی تلواریں نہیں اٹھائیں گے۔ آشا! میں تم سے ضرور ملوں گا، لیکن اگر تم پکڑی گئیں تو میں تمہارے سامنے اپنے سینے میں خنجر گھونپ لوں گا۔ میرا کہا مانو آشا! مجھے کوئی خطرہ نہیں۔“ یہ ایک فریب تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان واقعات کے بعد کوئی میری حمایت کے لیے انگلی تک نہیں اٹھائے گا لیکن آشا پر میری باتیں اثر کیے بغیر نہ رہیں۔

اس نے رُسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”مجھے آپ کا حکم ماننے سے انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن یاد رکھیے! مجھے آپ کے بغیر زندگی کے ایک لمحے کی بھی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا: ”ہم بہت جلد ملیں گے۔ آشا جاؤ۔“

وہ بنسی داس کے ساتھ چل پڑی۔ بجلی کی چمک میں میں نے چند قدم دود اس کی آخری جھلک دیکھی اور پھر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد بارش ختم

نکل آیا۔ اتنی دیر میں بنسی داس پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے قیدیوں کو بھگا دیا ہے لیکن پڑاؤ سے باہر نکلنے سے پہلے گشت لگانے والے پرے داروں کی کسی ٹولی نے انھیں دیکھ کر شور مچا دیا۔ اب بہت سے سپاہی جنگل کی طرف ان کا پیچھا کر رہے ہیں اور باقی فوج افراد قفری کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہی ہے اکثر سپاہی یہ سمجھ رہے ہیں کہ دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے لیے سنبھلنے جنگل کی بجائے پہاڑ کا راستہ بہتر ہوگا۔

چنانچہ ہم پہاڑ کی طرف چل دیے، بجلی کی چمک میں ہم کبھی کبھی اپنی منزل کا راستہ دیکھ لیتے تھے۔ سپاہی بدحواسی کی حالت میں شور مچاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ افراد قفری کا یہ عالم تھا کہ اگر ہم تینوں قیدی ہوتے تو بھی شاید ہماری کوئی پروا نہ کرتا۔ ہم کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر پڑاؤ سے نکل گئے۔ ٹھوڑی دیر بعد آشار کا شور سن کر میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم اس مقام کے قریب پہنچ چکے ہیں جہاں آشا کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ میں وہ پگڈنڈی بھی دیکھ چکا تھا جو آشار کے قریب جاتی تھی اور ہم اس پگڈنڈی کو پھوڑ کر سیدھے پہاڑ کی طرف جا رہے تھے۔ اب تک ایک غیر معمولی عزم نے مجھے اپنی جسمانی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن اطمینان کا سانس لیتے ہی میری ہمت جوا ب دینے لگی۔ دن کے وقت آشا کو جنگل تک پہنچانے کی جدوجہد میں میری ٹانگ کا زخم دوبارہ خراب ہو چکا تھا اور اب میں چڑھائی کے باعث سخت درد محسوس کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ احساس بہت تلخ تھا کہ میں زیادہ دیر تک آشا اور بنسی داس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا اور اگر میں گرتا سنبھلا ان کے ساتھ چلا رہا تو صبح تک ہم زیادہ دور نہیں جاسکیں گے۔ سپاہی صبح کی روشنی میں ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے اور صرف میری وجہ سے دوا اور جانیں ضائع ہو

دھو رہا ہوگا اور لوگ کالی دیوی کی بجائے نعرے لگا رہے ہوں گے۔

میں نے سوچا کہ اگر موت ہی میرے مقدر میں ہے تو میں کالی دیوی کے مندر میں پہنچنے کا انتظار کیوں کروں؟ میں اس کے غلیظ پاؤں میں جان دینے کی بجائے اس آتش میں کیوں نہ کود جاؤں؟ میں اُس وقت کے لیے کیوں زندہ رہوں جس کا ہر لمحہ میرے لیے موت سے زیادہ بھیانک ہوگا۔ میں اُٹھ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے ایک قدم آگے بڑھ کر میں مہیب کھڈ کی گہرائی میں پہنچ سکتا تھا۔ یہ دنیا جس میں چند دن قبل میرے لیے سب کچھ تھا۔ اب بے حقیقت بن چکی تھی لیکن ایک تصور ایسا بھی تھا جس نے ابھی تک میرا دامن پکڑ رکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ”آشا! آشا! پکار رہی تھیں۔ میں نے کانپتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور ایک پاؤں سے پتھر کا کنارہ اٹھولنے لگا لیکن اچانک پیچھے سے ایک آواز آئی اور اس نے میرے ہاتھ پاؤں زندگی کی ان زنجیروں میں جکڑ دیے جنہیں میں قریباً ٹوڑ چکا تھا۔ یہ آتش کی آواز تھی۔ وہ میرا نام پکارتی ہوئی آگے بڑھی اور میرا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگی۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس کھڈ میں کود کر دوسرے کنارے پہنچنا چاہتے تھے۔ آپ کو اس کی گہرائی کا علم نہیں۔ اس جگہ تو اگر درخت پھینک دیا جائے تو آتش کا پانی اُسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

”آشا! تم داپس کیوں آئیں؟ میں نے اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”دراصل تو تمہیں یہ کیسے یقین ہو گیا تھا کہ میں تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ مجھے بھوٹی تسلیاں دینے کی ضرورت نہ تھی۔“

میں بولا۔ ”تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ آشا اب بھی وقت ہے کہ تم

گئی اور پھلی رات کا چاند نمودار ہونے لگا۔ انتہائی بے بسی کے احساس نے مجھے اپنے گمراہ پیش سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن تھوڑی دیر سنانے کے بعد نہ معلوم کیوں میرے دل میں اس چٹان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ جہاں قدم رکھنے کے بعد میں اپنی دنیا سے نکل کر آتش کی دنیا میں پہنچ گیا جہاں سے تنگ و تاریک راستہ نیچے ندی کی طرف جاتا تھا۔ میں دوبارہ سانس لینے کے لیے چٹان کے کنارے بیٹھ گیا اور نیچے آتش کا منظر دیکھنے لگا لیکن اب اس منظر میں میرے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ زندگی کے ساتھ میرا رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں بیٹھ کے بل لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان پر چاند اور ستارے دکھ کر میرے دل میں اس وقت یہ خیال آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر قبل فضا میں مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اب قدرت نے تاریک بادلوں کی جگہ چاند ستاروں کی قندیلیں روشن کر دی ہیں لیکن اس ملک پر صدیوں سے مہیب تاریکیاں مسلط ہیں اور نہ معلوم کب تک ان تاریکیوں میں گھرے ہوئے انسانوں کی نگاہیں روشنی کی تلاش میں بھٹکتی رہیں گی۔ کیا اس سرزمین سے ان دیوتاؤں کا طلسم نہیں ٹوٹے گا۔ جنہوں نے ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے نفرت اور حقارت کا بیج بویا ہے؟

میں اپنے انجام کا تصور کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی میں پکڑا جاؤں گا۔ میرے خلاف گواہی دینے کے لیے کئی آدمی موجود ہوں گے۔ پردہت کا بھائی ہوش میں آتے ہی جو بیچ و پکار شروع کرے گا، وہ نگر کوٹ کے ہر سپاہی کو میرے خون کا پیا سا بنادے گا۔ میرے اپنے آدمی مجھے پاگل سمجھیں گے لیکن مجھے قتل کرنے کی بجائے وہ زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے اور نگر کوٹ میں کالی دیوی کے سامنے میرا میدان دیا جائے گا۔ میرا خون کالی دیوی کے پاؤں

بھاگ جاؤ، ہنسی داس کہاں ہے؟“

آشائے اطمینان کے ساتھ کہا: ”ہنسی داس اب دور جا چکا ہے۔“

میں نے کہا: ”مجھے اس سے توقع نہ تھی کہ وہ تمہیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔“
وہ بولی: ”اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ میں خود اس کی نگاہوں سے چھپ کر آگئی ہوں۔“

میں نے درد بھری آواز میں کہا: ”لیکن کیوں؟ اس بے وقوف نے تمہیں یہ بتایا ہوگا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔“

آشائے جواب دیا: ”اُسے یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ رو رہا تھا اور اُس کے آنسو مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھے۔“

میں نے نڈھال سا ہو کر پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”آشا میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن تم نے واپس آکر میرے لیے موت کا تصور بہت ہیبت ناک بنا دیا ہے اگر تم تھوڑی دیر اور مجھے آواز نہ دینیں تو میں اس کھڑکی کو دگیا ہوتا۔ اس اُمید پر نہیں کہ میں بچ کر دوسرے کنارے پہنچ جاؤں گا بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ میری لاش ان بھڑبھڑوں کے ہاتھ نہیں آئے گی۔“

آشائے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: ”مجھے صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ آپ کہیں بھگوان کی مرضی کے خلاف جانے کی کوشش نہ کریں۔“

میں نے چلا کر کہا: ”تمہارے خیال میں میرے بھگوان کی مرضی یہی ہے کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے اُن لوگوں کی قید میں جاتا ہوا دیکھوں اور پھر کالی دیوی کے سامنے میرا بیلداں دیا جائے؟“

”نہیں۔“ وہ بولی: ”آپ کا بھگوان آپ کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ اس دن ندی سے بچ کر نہ نکلتے۔ میرے بابا نے کہا تھا کہ بھگوان آپ

سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔“

میں نے کہا: ”تم بچلی ہو آشا۔ اگر انھوں نے مجھے زندہ رکھا تو بھی میرے لیے نگر کوٹ کے قید خانے کی بدترین کوٹھری ہوگی۔ تم سے دوبارہ ملنے کی امید یہیں شاید باقی عمر وہاں گزارنا بھی گوارا کر لیتا لیکن تمہارے ساتھ وہ لوگ جو سلوک کریں گے اس کا تصور مجھے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنے پر آمادہ کرنا ہے گا۔“

آشائے جواب دیا: ”وہ میری زندگی میں مجھے ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ خود کشی نہیں کریں گے۔ میں اگر مر بھی گئی تو کسی اور روپ میں آکر آپ کو تلاش کر دوں گی۔“

میں نے آشا کو بہت سمجھایا کہ اب بھی تمہارے لیے جان بچانے کا موقع ہے لیکن وہ میری التجائیں سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ مشرق سے صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں فوج ہماری باقاعدہ تلاش شروع کر دے گی۔ آشائے اب میرے لیے زندگی کا ساتھ چھوڑنا مشکل بنا دیا تھا۔ میں اس کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا اور میری حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو آندھیلوں میں چراغ جلا رہا ہو۔ کبھی میں سوچ رہا تھا کہ فوج جنگل کی طرف چلی جائے گی اور کوئی اس طرف توجہ نہیں دے گا اور کبھی میں اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے رہا تھا کہ سینا پتی اس بستی کی طرف آئے گی بجائے کوئی اور مجاز منتخب کرے گا، اور فوج کو اپنے پاس بلا لے گا۔ میں اس قسم کی مویوم امیدوں کا سہارا لے کر اٹھا اور آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے تنگ راستے سے ندی کی طرف اترنے لگا۔ آشار کے قریب وہ ریل جسے میں نے ندی کے پانی کی سطح سے دہالشت اوپر دیکھا تھا اب پانی میں ڈوب چکی تھی۔ ہم اوپر کے زینے پر بیٹھ گئے۔ کمزوری، تھکاوٹ اور ٹانگ کے زخم کے باعث میرا برا حال تھا اور آشا میرے سر کو اپنے بازوؤں

کا سہارا دے رہی تھی۔

میں نے کہا: ”آشا! تمہیں اس بات کی اُمید ہے کہ وہ اس طرف نہیں آئیں گے؟“

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھے صرف یہ اُمید ہے کہ آپ زندہ رہیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد صبح کی روشنی اس تاریک گوشے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ اچانک مجھے ادھر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور میں نے تلوار سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا: ”آشا! تم یہیں رہو۔ ممکن ہے وہ میرا اپنا آدمی ہو۔“ میں چند نیلے ادھر چڑھا اور ایک موڑ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جو نبی ایک سپاہی میرے قریب پہنچا۔ میں نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔ یہ وہی تھا جسے جگت نرائن نے رات کے وقت قیدیوں کے پرے داروں کا افسر مقرر کیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا اور میری تلوار اُس کے آریا ہو گئی۔ اس کا ایک اور سپاہی شور مچاتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ میں لاش کو جلدی سے ایک طرف دھکیل کر ادھر چڑھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ کچھ دیر میں جم کر لڑنا دھالیسکن اس کی تندی اور تیزی میری کمزوری پر غالب آنے لگی اور میں اس کے واروں کا ہوا اُلٹے پاؤں نیچے اترنے لگا اور سے کئی آدمیوں کی چیخ بکار سنائی دے رہی تھی۔ آخری زینے کے قریب پہنچ کر میں نے بد مقابل پر پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا اور اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر کے کونے سے پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ میری تلوار کی آخری ضرب نے اُسے موت کے آغوش میں سلا دیا۔ اب میں نے مڑ کر آشا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن آشا وہاں نہ تھی۔ اس کی اڈھنی زینے پر پڑی تھی اور وہ چند قدم دورندی کے

تیز دھارے میں بہتی ہوئی چلا رہی تھی۔ ”واسدو! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم میرے پیچھے نہ آنا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔“

آشا آن کی آن میں آٹا رکنے قریب پہنچ گئی اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ اب مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ اب مجھے زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری رہی سہی حسیات انتقام کے ایک نہ ختم ہونے والے جذبے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میں دیوانہ وار جیٹا ہوا ادھر چڑھنے لگا۔ آٹھ دس آدمی ایک قطار میں نیچے اتر رہے تھے۔ میں نے سب سے آگے آنے والے کو ایک ہی وار میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باقی مجھے تنگ جگہ میں خطرناک سمجھ کر اُلٹے پاؤں بھاگ نکلے۔ تھوڑی دیر میں میں چٹان کے ادھر کھلی جگہ میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں کوئی پچاس آدمیوں نے میرے گرد گھیر ڈال لیا۔ ان آدمیوں میں سردار جگت نرائن بھی تھا۔ وہ چلا چلا کر مجھے زندہ گرفتار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں چاروں طرف اندھا دھند گھٹے کر رہا تھا اور سپاہی بھڑوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بالآخر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا اور وہ مجھے فوراً قتل کرنے کی بجائے کوئی عبرتناک سزا دینے کے لیے گرفتار کر کے لے گئے۔

چند دن بعد میں نگر کوٹ کے قید خانے میں تھا۔ ایک ہفتہ قید رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ کالی دیوی کے سامنے میرا بی دانا دیا جائے گا۔ لیکن دو ہفتے اور گزر گئے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ سلطان محمود نے دہند پر حملہ کر دیا ہے اور نگر کوٹ کی فوج دہند کے ہمارا جہ کی مدد کے لیے چلی گئی ہے۔ اس فوج کے ساتھ بروہت اور راجہ بھی جا چکے ہیں اور ان کی دلچسپی پر میرے بلیدان کی تباہی مقرر کی جائے گی۔

عبدالواحد نے مسکرا کر کہا یہ زندگی جب کسی مقصد سے آشنا ہوتی ہے تو ہر انسان چٹان بن جاتا ہے۔

رنیر نے سوال کیا یہ آزاد ہونے کے بعد آپ دوبارہ اس بستی میں گئے تھے؟
عبدالواحد نے جواب دیا "میں کئی بار وہاں جا چکا ہوں۔ وہ اُبڑی ہوئی بستی پھر آباد ہو چکی ہے لیکن آشا کا گھر خالی پڑا ہے۔ پہاڑ کے توہم پرست لوگ اس گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آشا کی روح ہر رات اس گھر کا طواف کرتی ہے۔ میں ان توہمات کا قائل نہیں اور میں وہیں قیام کرتا ہوں تاہم رات کی تنہائی میں لیٹے لیٹے مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس گھر کی دیواریں بسکیاں لے رہی ہیں اور جب میں اس ندی کی طرف جاتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آشا مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ آتشا کے نہ ختم ہونے والے داگ سے مجھے "آشا آشا!" کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔"

رنیر نے پوچھا "آپ کے ان ساتھیوں کا کیا بنا جنہوں نے قیدیوں کو آزاد کرانے میں آپ کا ساتھ دیا تھا؟"

عبدالواحد نے جواب دیا "وہ سب میرے ساتھ قید تھے اور رہا ہونے کے بعد میری طرح محمود کی فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔ بستی داس اس بستی میں پہاڑی لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نگر کوٹ کی فتح کے بعد جب وہاں گیا تھا تو اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اب وہ بھی محمود کی فوج میں ہے۔"

رنیر نے پوچھا "آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ آشا دوبارہ کسی روپ میں آپ سے ملے گی؟"

"نہیں" عبدالواحد نے جواب دیا "آشا اپنی موت کے بعد میرے لیے ایک مقصد چھوڑ گئی ہے اور میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتا۔"

وہند کے راجہ ادداس کے بعد نگر کوٹ میں کالی دیوی کے بھاریوں کی شکست میرے نزدیک آشا کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

(۸)

نگر کوٹ کی فتح کے بعد سلطان محمود نے مجھے قید سے رہا کیا اور میں اُسے اس ملک میں ایک نئی روشنی کا مشعل بردار سمجھ کر اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ میرے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ سلطان محمود کی فوج میں شامل ہو گئے جن کی نگاہوں سے نگر کوٹ کے مندر کے بتوں کی شکست کے باعث توہمات کا پردہ اُٹھ چکا تھا۔

محمود غزنوی نے میرا نام عبدالواحد رکھا۔ وہ میرا محسن ہے لیکن اگر اس کے احسانات صرف میری ذات تک محدود ہوتے تو میں اس کی جنگوں میں حصہ لینے کی بجائے اپنی زندگی کسی گوشہ تنہائی میں تنہائی میں بسر کر دیتا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مجھے اس بات کی پوری آزادی تھی کہ میں جہاں جی چاہے اپنی باقی زندگی بسر کروں لیکن میں اُسے اس ملک میں ستم رسیدہ انسانیت کا محسن سمجھتا ہوں۔ قدرت نے اُسے ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ مقصد مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تمہارے احساسات بھی میرے احساسات سے مختلف نہ ہوتے۔"

رنیر نے گردن اٹھا کر عبدالواحد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اس نے انتہائی منموم لہجہ میں کہا "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو زندہ نہ رہتا۔ آپ انسان نہیں، ایک چٹان ہیں۔"

رنیر کے لیے یہ دن انتہائی اضطراب کے دن تھے۔ عبدالواحد کے یہ الفاظ ہر رات اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے کہ تمہاری جنگ کی طرح تمہاری قید بھی بے مقصد ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ وہ عبدالواحد کے سامنے اس بات کا اعتراف کرے کہ مجھے اب برہمنوں کے سماج یا قنوج کے حکمران کی فتح یا شکست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف ایک بار اپنے پتا اور بہن کو دیکھنا چاہتا ہوں اگر مجھے آزاد کر دیا جائے تو میں یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شرکت نہیں کروں گا۔ رنیر کا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ عبدالواحد یہ سُننے ہی اس کی رہائی کا حکم صادر کر دے گا لیکن اس کے ساتھ ہی رنیر کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ عبدالواحد اس کے دل کی ہر بات جانتا ہے۔ وہ اس کی درخواست کے بغیر اس کی رہائی کے لیے دیہند کے گورنر کے پاس سفارش بھیج چکا ہے اور اس احساس نے رنیر کو ملتی ہوئی کی اجازت نہ دی ہے۔

(۹)

ایک دن رنیر اپنی کھڑی سے باہر ٹہل رہا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر اُسے اطلاع دی کہ قلعے کے ناظم آپ کو بلا رہے ہیں۔ رنیر سپاہی کے ساتھ چل دیا۔ عبدالواحد اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ رنیر کو دیکھ کر مسکرایا اور اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھے، میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں“

ایک ثانیہ کے رنیر کی رنگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آگیا اور اس نے اپنی دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”دیہند کے گورنر کا جواب آگیا ہے؟“

کرتے اکثر یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی روح مجھے دیکھ رہی۔“ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رنیر نے عبدالواحد سے رخصت لے کر اپنی کھڑی کا رخ کیا۔ باقی رات اس نے بستر پر کر ڈھیں بدلنے گزار دی۔ اگلی شام رنیر بن بلائے اس کے پاس چلا گیا۔ اس کے بعد ہر روز کم از کم ایک بار عبدالواحد کی قیام گاہ پر دستک دینا اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ چند اور ملاقاتوں کے بعد رنیر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تصورات میں ایک بہت بڑا انقلاب آچکا ہے۔ تاہم پرانے بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا میں پاؤں رکھنے کے لیے اُسے ایک زبردست جھکے کی ضرورت تھی۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو ریل کے تیز دھارے میں بہ نکلنے کے خوف سے کنارے پر آگئی ہوئی گھاس کے تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ تنکے ایک ایک کسے کے ٹوٹ رہے تھے اور وہ ہر آن یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی سرکش لہر اُس کا آخری سہارا پھینک کر اُسے ایک ایسی منزل کی طرف لے جائے گی جہاں سے لوٹ کر نہ اصل کی طرف آنا اس کے بس میں نہ ہو گا۔ دریا کے اس ساحل پر اس کی ہنسنی اور مسکراتی ہوئی دنیا آباد تھی اور ان گنت آرزوئیں اور اُمیدیں اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔ اس کا باپ، اس کی بہن اور اس کے بچپن کے ساتھی اُسے یہ پیغام دے رہے تھے۔ ”رنیر! اس سیلاب میں بہ نکلنے سے بچنے کی کوشش کرو، تم سماج کو جھٹلا سکتے ہو، دیوتاؤں کی عظمت سے انکار کر سکتے ہو لیکن ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ یہ درست ہے کہ نگر کوٹ کے مخصوص حالات نے ایک انسان کو سماج کا دشمن بنا دیا ہے لیکن قنوج نگر کوٹ نہیں اور تم عبدالواحد نہیں بن سکتے، تمہاری دنیا اس کی دنیا سے مختلف ہے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ تم اگر ہمارے پاس نہیں آ سکتے تو ہمیں اپنے ساتھ لے چلو“

جب تمھارا بھائی آزاد ہو کر قنوج کی فوج کے ساتھ واپس آئے گا تو لوگ مہاراجہ سے زیادہ اس کا سواگت کریں گے لیکن یہ ایک خواب تھا اور قنوج کی شکست کے بعد پتا ہی کو اس خواب کی تعبیر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی۔ ایک راجپوت کا رسمی اور ظاہری غرور اب بھی انھیں زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن میں ان کا چہرہ دیکھ کر ان کے دل کی پکار سن رہی ہوں۔ میں ان سے مشورہ کیے بغیر شنبونا تھ کو بھیج رہی ہوں اور جو کچھ میرے پاس تھا، میں نے اس کے حوالے کر دیا ہے۔ اگر یہ آپ کے فدیہ کے لیے کافی ہو تو بھگوان کے لیے قید سے آزاد ہوتے ہی گھر چلے آئیں۔ میرے اور شنبونا تھ کے سوا یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہوگی کہ آپ کو فدیہ دے کر چھڑایا گیا ہے۔ میں نے پتا ہی کو بھی نہیں بتایا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بُرا مانیں گے بلکہ اس لیے کہ آپ کا انتظار انھیں سخت بے چین رکھے گا۔ اب بھی ان کا یہ حال ہے کہ وہ یہاں تنہائی میں اپنے دل سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ رات کے وقت بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگتے ہیں اور لو کر دن کو آوازیں دیتے ہیں کہ دروازہ کھولو۔ میں نے رنیر کی آواز سنی ہے۔

جان سے پیارے بھیا! اپنے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھ سکتی ہوں کہ میں ہر سانس کے ساتھ آپ کا نام لیا کرتی ہوں۔ آپ کو یاد ہے کہ بچپن میں جب کبھی آپ گھر میں دیر سے آیا کرتے تھے تو میں سونے کی بجائے اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ آپ کبھی کبھی زینے سے اوپر چڑھنے کی بجائے کچھ اونچے

عبدالواحد نے جواب دیا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا لیکن اطمینان رکھو تم بہت جلد اپنے گھر جاسکو گے۔ اس وقت میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بلایا ہے۔

رنیر کا دل بیٹھ گیا اور وہ پتھر مردہ سا ہو کر عبدالواحد کی طرف دیکھنے لگا۔ عبدالواحد نے ریشم کے ایک پھوٹے سے رومال میں لپٹا ہوا خط میز سے اٹھایا اور رنیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پہلے اسے پڑھ لو۔ یہ خط تمہارے گھر سے آیا ہے۔ رنیر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رومال اتار کر کاغذ کی تہیں کھولیں اور خط پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ یہ خط اس کی بہن شکنتلا نے لکھا تھا اور اس کا مضمون یہ تھا۔

”میرے پیارے بھیا!

میں شنبونا تھ کو آپ کی تلاش میں بھیج رہی ہوں۔ بھگوان کرے کہ وہ آپ تک پہنچ جائے۔ مندر کے قلعے سے رہا ہونے والے قیدیوں کی زبانی آپ کا حال معلوم ہوا۔ اگر آپ پتا ہی کو فدیہ بھیجنے سے منع نہ کرتے تو وہ آپ کا فدیہ لے کر خود مندر پہنچ جاتے لیکن آپ کے پیغام نے انھیں ایک باپ کی محبت کو ایک راجپوت کے رسمی اور ظاہری غرور کی بھینٹ کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کا پیغام ملنے پر وہ بظاہر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ ہر ایک سے کہتے تھے کہ مجھے اپنے رنیر سے یہی توقع تھی لیکن میں جانتی تھی کہ ان کا دل ایک ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے پسا جا رہا ہے۔ وہ مجھے تسلی دینے کے لیے کہا کرتے تھے کہ عنقریب قنوج کی فوج کے ساتھ کئی اور راجوں اور مہاراجوں کے لشکر دشمن پر چڑھائی کریں گے اور

”رنیر گھبراؤ نہیں، تم اپنی بہن کو جلد دیکھ سکو گے۔“

شبنونا تھ داروغے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک چھر برے بدن کا ادھر لڑکا آدمی تھا۔ رنیر اُسے دیکھتے ہی اٹھ کر آگے بڑھا۔ شبنونا تھ نے جھک کر اس کے پاؤں پھونکنے کی کوشش کی لیکن رنیر نے اُسے بازو سے پکڑ کر گلے لگالیا۔ شدت احساس کے باعث چند ثانیے دونوں کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ رنیر کی آنکھوں میں آنسو پھلک رہے تھے اور شبنونا تھ بڑی مشکل سے سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک شبنونا تھ رنیر کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھا اور اس نے اپنی پگڑی جو اس کے قد قدامت کے تناسب سے کافی بڑی معلوم ہوتی تھی، اتار کر عبد الواحد کے پاؤں پر رکھ دی۔

”ہمارا ج! ہمارا ج!!“ اس نے ہاتھ باندھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”مذنب کے لوگ کہتے ہیں کہ آپ دروغنا ہیں۔“

عبد الواحد نے پگڑی اٹھا کر دوبارہ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا: ”مذنب کے لوگ غلط کہتے ہیں، بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ اطمینان سے بات کرو۔ مجھے صرف ایک انسان سمجھو۔“

شبنونا تھ قدرے تذبذب کے بعد زمین پر بیٹھ گیا۔ عبد الواحد نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہاں بیٹھو۔“

شبنونا تھ نے نیاز مندی سے کہا: ”نہیں ہمارا ج! ایک نوکر آپ کے برابر بیٹھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

”نہیں تم ہمارے ہمان ہو۔“ یہ کہتے ہوئے عبد الواحد نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ شبنونا تھ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نگاہیں رنیر سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ جب عبد الواحد کے

کے مدد خت کو سیڑھی بنا کر کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آجایا کرتے تھے۔ میں جان بوجھ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی اور آپ مجھے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کرتے تھے: ”بھلا میں کون ہوں؟“ اور میں جان بوجھ کر اپنی سسلیوں کا نام لیا کرتی تھی۔ میں اب بھی سونے سے پہلے اکثر اسی جگہ بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ کاش! آپ آجائیں! آپ کبھی کبھی اپنی ننھی شکنتلا کے قہقروں سے چڑھایا کرتے تھے اور اب تو میں ہنسنا بھی بھول گئی ہوں، کبھی میں آپ کو گھڑتے دیکھ کر چھپ جایا کرتی تھی اور آپ میری تلاش میں کونہ کونہ چھان مارتے تھے اور اب میں ساڑھے چار برس سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔“

آپ کی ننھی بہن

شکنتلا!

خط ختم کرتے ہی رنیر کی آنکھوں میں پھلکتے ہوئے آنسو بہ نکلے۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر اُس نے عبد الواحد کی طرف دیکھا اور خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ میری بہن کا خط ہے! آپ اسے پڑھ سکتے ہیں؟“

عبد الواحد نے خط پڑھنے کے بعد دوبارہ رنیر کے ہاتھ میں دے دیا اور ایک سیاہی کو آواز دے کر اندر بلائے کے بعد کہا: ”داروغہ سے کوئی قہقروں سے جو آؤی آیا ہے اُسے ساتھ لے کر میرے پاس آجائے۔“ پھر اُس نے قلم اٹھایا اور کچھ لکھتے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ کو ایک سراسلے کی صورت میں تہ کر کے اس کے ارد گرد دھاگہ لپیٹتے ہوئے رنیر کی طرف دیکھا اور کہا:

میرے پاس امانت رہیں گے۔ یہاں سے واپس جاتے وقت مجھ سے لے لینا لیکن اگر تم شہر کی بجائے ہمارے پاس رہنا چاہو تو انھیں اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔“

شہبونا نے دوبارہ ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: ”انھیں ٹھکرائیے نہیں ہمارا“

اس زلیور سے چار ہاتھی خریدے جاسکتے ہیں کنگن کے ہیرے اور مالا کے موتی سب اصلی ہیں۔ آپ نندنہ کے کسی بھوہری کو بلا کر دکھالیں اگر ان میں کوئی چیر نقلی ثابت ہو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دیجیے۔ پھر بھی اگر یہ زلیور زلیور کی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے کافی نہ ہوں تو اسے گھر جانے کا موقع دیجیے۔ آپ جس قدر اور مانگتے ہیں یہ گھر پہنچتے ہی بھیج دیں گے اور میں اتنی دیر آپ کی قید میں رہنے کے لیے تیار ہوں۔“

”میرے خیال میں زلیور اپنی آزادی کی قیمت ادا کر چکا ہے۔“ یہ کہنے کے بعد عبدالواحد نے میز سے مراسلہ اٹھایا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ اسی وقت یہ مراسلہ ایک ذمہ دار آدمی کو دے کر دیہند کے گورنر کی طرف روانہ کر دیں۔ میں نے اس سے قبل بھی ایک ضروری خط بھیجا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ دیہند کے گورنر شاید گشت پر گئے ہوتے ہیں۔ آپ اچھی کویہ ہدایت کریں کہ وہ یہ مراسلہ دیہند کے دفتر کے سپرد کرنے کی بجائے بذات خود گورنر کے پاس پہنچے اور ان سے جواب حاصل کیے بغیر واپس نہ آئے۔“

داروغہ مراسلہ لے کر باہر نکل گیا۔ عبدالواحد نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے زلیور کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آج سے آپ دونوں میرے مہمان ہیں اور جب تک میرے مکتوب کا جواب نہیں آتا، آپ اسی جگہ قیام کریں گے۔ میں نے دیہند کے گورنر کو دوبارہ آپ کی رہائی کے لیے لکھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس خط کا جواب بہت جلد آجائے گا۔ اب آپ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے

اشارے سے زلیور بھی اس کے قریب بیٹھ گیا تو شہبونا نے اضطرابی حالت میں دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”شہبونا نے بیٹھ جاؤ۔“ زلیور نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ شہبونا نے بادل ناخوہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کرسی سے اٹھ کر بھاگ نکلنے کے لیے صرف ایک اشارے کا منتظر ہے۔

عبدالواحد نے کہا: ”تم زلیور کے گھر سے آئے ہو؟“

”ہاں ہمارا ج! اگر جان کی امان ہو تو عرض کروں۔“

عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”یہاں تمھاری جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“

شہبونا نے اپنی کمر کے ساتھ بندھا ہوا پٹکا کھولا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پھیلی نکالی کہ عبدالواحد کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”ہمارا ج! میں یہ آپ کی سیوا میں لایا ہوں، بھگوان کے لیے زلیور کو چھوڑ دیجیے۔“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”یہ پھیلی تم اپنے پاس رکھو۔ ہمیں شاید اُس کی ضرورت نہ پڑے۔“

”ہمارا ج! دیکھ تو لیجیے، اس کا وزن زیادہ نہیں لیکن قیمت بہت زیادہ ہے۔ ہمارا ج! دیکھیے نا۔“ شہبونا نے یہ کہہ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھیلی کھولی اور چند چھوٹے چھوٹے زیورات کے علاوہ موتیوں کی ایک مالا اور سنہری کنگن جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے نکال کر عبدالواحد کے سامنے رکھ دیے۔

اپنی بہن کے زیورات دیکھ کر زلیور کا دل بھر آیا اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ عبدالواحد نے شہبونا سے خالی پھیلی پکڑ لی اور زیورات میز سے اٹھا کر دوبارہ اس میں ڈالنے کے بعد شہبونا نے کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”یہ زیورات

باتیں کر سکتے ہیں۔“

”میرا گھوڑا؟“ شنبونا تھنے بدحواس ہو کر کہا۔

”ہاں!“ نوکر نے جواب دیا۔ ”آقا نے کہا ہے کہ اگر آپ اپنا گھوڑا یا کوئی اور

سامان سرائے میں چھوڑ آئے ہوں تو یہاں لے آئیں۔“

شنبونا تھنے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”گھوڑا میں نے بیچ دیا ہے۔“

لیکن جب نوکر چلا گیا تو اس نے رنیر کی طرف متوجہ ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”ہمارا ج! سچی بات یہ ہے کہ میں گھوڑے کی بجائے گدھے پر سوار ہو کر آیا

تھا۔ اپنا گھوڑا میں نے ان لوگوں کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی چھوڑ

دیا تھا۔ راستے میں چوروں اور ڈاکوؤں کے خوف سے میں نے ایک بھکاری کا

لباس پہن رکھا تھا۔ اگر میں گھوڑے پر ہوتا تو شاید راستے میں کئی جگہ میری تلاشی

لی جاتی۔ مجھے گدھے پر دیکھ کر کسی کو اس بات کا شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ میرے پاس

اتنی دولت ہے۔ گدھے کے عوض میں نے نندنہ کے قریب ایک بستی سے نئے

کپڑے لے لیے تھے۔“

پانچ دن کے بعد علی الصباح عبدالواحد کا نوکر رنیر اور شنبونا تھنے کے کمرے

میں داخل ہوا اور اس نے رنیر کو کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گھڑی اور ایک تلوار

پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ سفر کے لیے یہ لباس پہن لیں۔ آقا نے کہا ہے کہ وہ

نماز سے فارغ ہو کر آپ کو قلعے کے دروازے پر ملیں گے۔ یہ تلوار بھی انھوں

نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔ آپ تیار ہو جائیں میں ابھی آکر آپ کو قلعے کے

دردازے کی طرف سے جاؤں گا۔“

رنیر رات کے وقت سونے سے پہلے اپنے میزبان کی زبانی خوش خبری

سُن چکا تھا کہ دیہند کے گورنر کی طرف سے اس کی رہائی کا حکم آچکا ہے اور وہ صبح

ہوتے ہی اپنے گھر کا رخ کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے شنبونا تھنے کو رات کے

عبدالواحد نے ایک نوکر کو آواز دی اور وہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں رنیر اور شنبونا تھنے کو بالائی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں لے گیا۔ شنبونا تھنے کی بدحواسی پہلے ہی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس نئی عزت افزائی نے اُسے اور زیادہ بدحواس بنا دیا۔ جب نوکر انھیں کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلا تو وہ پھر ایک بار ہاتھ باندھ کر رنیر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”ہمارا ج! میرا تصور معاف کیجیے۔ جب اس نے شیر کی طرح آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا تو میں ڈر گیا تھا۔ ورنہ میں آپ کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ وہ مجھ سے بگڑ کر آپ کے خلاف نہ ہو جائے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اُسے میرے ساتھ ایسا مذاق کرنے کی کیا سوچھی۔ کاش آپ نے اُسے بتا دیا ہوتا کہ میں ایک دانش ہوں اور میرا خاندان چار پشتوں سے آپ کی سیوا کر رہا ہے۔“

رنیر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں شنبونا تھنے! اس قلعے میں داخل ہونے کے بعد تمھاری جون بدل گئی ہے۔ آج کے بعد تم دنیا کے ہر انسان کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکو گے۔ وہ بُت جنھوں نے انسانوں کے درمیان نفرت و مخالفت کی دیواریں کھڑی کی تھیں، ٹوٹ رہے ہیں۔“

رنیر کا آخری فقرہ شنبونا تھنے کے دماغ کی سطح سے بلند تھا۔ وہ صرف یہ سمجھ سکا کہ اُسے دنیا میں ہر انسان کے ساتھ برابری کا دعویٰ کرنے کا مسودہ دیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”نہیں ہمارا ج! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں آپ کا داس ہوں۔“

عبدالواحد کا نوکر دوبارہ آیا اور اس نے شنبونا تھنے سے پوچھا۔ ”آپ کا گھوڑا

کہاں ہے؟“

سے باہر ہو کر کچھ نہیں کیا۔ وہیہند کے حاکم کو میں نے جو خط لکھا تھا۔ اس میں میں نے ان زیورات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ تاہم انھوں نے آپ کو فد یہ کے بغیر دیا کر دینے کے متعلق میری درخواست مان لی ہے۔“

دنبیر نے کہا۔ ”پھر بھی میرے لیے کم از کم ان گھوڑوں کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔“

”یہ گھوڑے میری ذاتی ملکیت ہیں۔ انھیں ایک دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجیے۔“ یہ کہتے ہوئے عبدالواحد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دنبیر اور شبیونا تھ گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

تیسرے پہر ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب صبح ہونے والی ہے۔
دنبیر نے جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ نوکر دوبارہ آیا اور انھیں اپنے ساتھ لے کر قلعے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے کے سامنے ایک سپاہی در گھوڑے لیے کھڑا تھا۔

شبیونا تھ کے لیے انتظار کا ہر لمحہ پریشان کن تھا۔ وہ دبی زبان سے بار بار کہہ رہا تھا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔ دیکھیے اب تو سوج بھی نکلنے والا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں ان لوگوں کا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے۔“ اور دنبیر اُسے ہر بار یہی کہتا تھا۔ ”گھبراؤ نہیں شبیونا تھ! وہ آتے ہی ہوں گے۔“

عبدالواحد قلعے کے داروغہ اور چند افسروں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ایک کونے سے نمودار ہوا۔ دنبیر کے قریب پہنچ کر عبدالواحد نے اُسے زیورات کی بھین اور ایک مراسلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کی امانت ہے اور یہ مراسلہ آپ کی رہائی کے متعلق ہے۔ اس میں راستے کی تمام چوکیوں کے افسروں کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ میری دعائیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں گی۔ اب آپ دیر نہ کریں۔ آپ کے گھوڑے تیار ہیں۔“

دنبیر نے تشکر اور احسانندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے محسن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں تا عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا لیکن میری ایک التجا قبول کیجیے۔ میں اب خوشی کے ساتھ اپنا فدیہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جتنی رقم کا مطالبہ کریں میں گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ اس وقت تک یہ زیورات جو میری بہن نے بھیجے ہیں، آپ کے پاس رہیں گے۔“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کے لیے اپنے اختیارات

ہوتے دور چلے گئے۔

رام ناٹھ ایک کھلتے ہوئے سالوے رنگ کا نوجوان روپ دتی کے پاس کھڑا
مُسکرا رہا تھا۔ اس کا درد میانہ لیکن سینہ غیر معمولی طور پر کشادہ تھا۔ وہ بولا: ”آج
دیوی نے اپنے بچاری کی بھینٹ ٹھکرا دی ہے۔“
روپ دتی نے گردن اٹھا کر رام ناٹھ کی طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ اور
خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

رُوپ دتی

”روپا! روپا!“ رام ناٹھ نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا: ”کیا ہوا؟ تم رورہی ہو
کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟“

روپا نے اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ”رام ناٹھ! تم میری
ایک بات مانو گے؟“

رام ناٹھ نے بیتاب سا ہو کر جواب دیا: ”تمہارے آنسو مجھ سے ہر بات
منوا سکتے ہیں روپا۔ کو!“

وہ بولی: ”اگر میں تم سے یہ کہوں کہ آئندہ تم میرے پاس نہ آیا کرو تو؟“
رام ناٹھ نے جواب دیا: ”دیوی اپنے بچاری کو موت کا حکم دے سکتی ہے،
اُسے پوجا کرنے سے نہیں روک سکتی۔“

روپ دتی نے گھٹی ہوئی آوازیں کہا: ”مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات کا
مناق اڑاؤ گے لیکن یہ سب میرا قصور ہے، کاش! میں تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتا
دیتی۔“

رام ناٹھ نے اور زیادہ مضطرب ہو کر کہا: ”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ دنیا کی
کوئی طاقت ہمارے درمیان نہیں آسکتی۔“

روپ دتی نے کہا: ”میں بہت جلد ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں تم نہیں پہنچ

روپ دتی دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی، اُسے دور سے کسی کے گانے
کی آواز سنائی دی اور اس کے ہاتھ اچانک رک گئے۔ آواز آہستہ آہستہ قریب
آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ روپ دتی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی
تھیں۔ اس آواز کی مٹھاس سے اس کے کان آشنا تھے۔ اس سے قبل جب بھی
وہ یہ آواز سنتی تھی تو بے تاب سی ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑا کرتی تھی لیکن
آج اُس کی حالت مختلف تھی۔ آج اس کا دل مسرت سے اچھلنے کی بجائے خوف
سے لرز رہا تھا۔ یہ آواز اُسے بہادوں، نغموں، مسکراہٹوں اور قہقروں کی اس
دنیا کی طرف کھینچ رہی تھی جسے وہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والی تھی۔ وہ اپنے
دل میں بادبادک یہ کہہ رہی تھی: ”رام ناٹھ! کاش! تم میرے پاس نہ آؤ۔“

گانے والا اچانک خاموش ہو گیا۔ روپ دتی کو اس کے پاؤں کی آہٹ
سنائی دینے لگی۔ روپ دتی میں اپنی گردن اٹھانے یا پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت
نہ تھی لیکن جب کسی نے جنگلی گلاب کے پھول اس کی جھولی میں ڈال کر وہ اٹھ
کر کھڑی ہو گئی۔ چند پھول دریا میں گر پڑے اور اُن کی آں میں پانی کی سطح پر بہتے

سکو گے۔ ہمارے لیے ایک دوسرے کو بھول جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔
 رام ناٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا یہ میرے ساتھ مذاق نہ کرو
 روپا اگر تم آکاش پر چڑھ جاؤ تو میں وہاں بھی تمہارا پیچھا کروں گا۔ تم میری ہو اور تمہیں
 مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اگر تمہارے ماموں کسی اور کے ساتھ تمہارا رشتہ کرنا
 چاہتے ہیں تو میں آج ہی اپنے پتا کو ان کے پاس بھیجتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ
 وہ تمہارے ماموں کو منا سکیں گے۔“

روپا وتی نے کہا۔ ”آج جو کچھ میں بتانا چاہتی ہوں اس کے بعد تمہیں معلوم
 ہو جائے گا کہ میرے معاملے میں تم، تمہارے پتا جی اور میرے ماموں سب بے بس
 ہیں۔ میں سومنات کے مندر میں ایک داسی بن کر جا رہی ہوں۔ میرے ماموں اگر
 کوشش کریں گے تو بھی مجھے نہیں روک سکتے۔ میری ماں میری پیدائش سے دو دن
 بعد مر گئی تھی، اس دن سومنات کے مندر کا ایک بھجاری ہمارے گاؤں میں آیا ہوا
 تھا اور میرے پتانے اس کے سامنے یہ منت مانی تھی کہ اگر میری بچی زندہ رہی تو میں
 اُسے سومنات کے مندر کی بھینٹ کر دوں گا۔ میں ایک سال کی تھی کہ میرے پتا بھی چل
 بسے۔ میرے ماموں کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ مجھے میرے چچا کے گھر سے
 اپنے پاس لے آئے۔ میرے ماموں کو معلوم تھا کہ میرے پتا مجھے سومنات کے مندر
 کی بھینٹ کر چکے ہیں لیکن وہ اس راز کو چھپانا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی یہ
 نہیں بتایا تھا لیکن پچھلے سال میرے چچا ہمارے پاس آئے اور ان کی زبانی معلوم
 ہوا کہ میرا اصلی گھر سومنات کا مندر ہے۔ یہ میرا پاپ تھا کہ میں نے اسی وقت
 تمہیں یہ نہ بتا دیا۔ دراصل میں تمہیں دھوکا دینے کی بجائے اپنے آپ کو دھوکا دے
 رہی تھی۔ میرے ماموں کہا کرتے تھے کہ ہر سال ہزاروں لوگ اپنے بچوں کو سومنا
 کی بھینٹ کرتے ہیں لیکن ایسی لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جنہیں بڑی ہونے پر مندر

کی سیوا کے قابل سمجھا جاتا ہے اور میں اسی امید پر جی رہی تھی کہ سومنات کے بھجاری
 مجھے بھی ہزاروں لڑکیوں کی طرح ٹھکر کر چلے جائیں گے اور ہمارے درمیان وہ
 دیوار حائل نہ ہوگی جسے آج تک کوئی نہیں گراسکا لیکن بھگوان کو یہ منظور نہیں۔
 پر سوں جب بھجاری سومنات کا لگان وصول کرنے کے لیے آئے تو میرا چچا بھی
 آپہنچا اور انھیں لے کر ہمارے گھر آگیا۔ اس سال میرے چچا کے دو بیل مر گئے
 ہیں اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میرے اب تک سومنات نہ جانے کی وجہ سے
 دیوانا ناراض ہو گئے ہیں۔ بھجاریوں نے پرسوں مجھے دیکھتے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ وہ
 داپسی پر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

آن کی آن میں رام ناٹھ کے سپنوں کی حسین دنیا ویران ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے
 ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آج
 یا چند دن اور میں تمہارے پاس نہ آتا تو تم مجھے دیکھنے بغیر چلی جاتیں۔“
 روپا وتی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں کبھی یہ گوارا نہ کرتی کہ میری وجہ سے
 تم سے شوبھی ہمارا راج خفا ہو جائیں۔ اُن کا غصہ پہاڑوں کو بھسم کر ڈالتا ہے۔ رام
 ناٹھ! مجھ سے وعدہ کر دو کہ تم میرا پیچھا نہیں کرو گے۔“

رام ناٹھ نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”روپا! میں اس بات
 سے ہرگز پریشان نہیں کہ تم سومنات جا رہی ہو۔ دولت ہر مشکل آسان کر سکتی
 ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سومنات کی بعض داسیوں کو شادی کی اجازت بھی مل
 جاتی ہے بشرطیکہ ان سے شادی کرنے والے سونے چاندی سے بھجاریوں کی
 جھولیاں بھر دیں۔ میں آج تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں گوالیار کے واحد کی فوج
 میں بھرتی ہو کر جا رہا ہوں اور اب آئندہ ایک غریب کسان کے بیٹے کی حیثیت
 سے تمہارے پاس نہیں آؤں گا، بلکہ میرے بازو میرے لیے ترقی کے بہت سے

دانتے کھول چکے ہوں گے۔ میری خواہش تھی کہ کسی دن میں ہاتھی پر سوار ہو کر تمہارے ماموں کے گھر آؤں اور ان کے سامنے تمہارے لیے اپنی جھولی پھیلاؤں لیکن اب اگر تم سومانات کے مندر میں جا رہی ہو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں بہت جلد وہاں آؤں گا اور تمہیں حاصل کرنے کے لیے اگر مجھے کسی راجہ کے تاج کے ہیرے بھی لوچنے پڑے تو دریغ نہیں کروں گا۔“

روپ وقتی نے جواب دیا۔ ”تم ان لڑکیوں کی باتیں کر رہے ہو جو وہاں اپنی خوشی سے تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں اور جن کے والدین انہیں اس امید پر وہاں بھیجتے ہیں کہ ان کی شہرت میں اضافہ ہو اور بڑے بڑے سردار اور ریلے ان کے طلبگار بن جائیں لیکن میں شوچی کی بھینٹ ہوں اور وہاں جانے کے بعد میرے لیے باہر کی دنیا کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ میری زندگی کا مقصد صرف مندر کی سیوا ہوگا، بچاری کہتے تھے کہ مجھ جیسی لڑکیاں ہی سومان کی دیویاں بنتی ہیں اور تم جانتے ہو کہ سومانات کی دیوی کی طرف ہندوستان کا بڑے سے بڑا راجہ بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے لیے مر چکی ہوں گی۔“

رام ناٹھ ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نہیں میں سومانات کا بچاری بن کر وہاں آؤں گا۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا کہ ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لیے زندہ ہیں۔ میں تمام عمر اس امید پر سومانات کے دیوتاؤں کے آگے بھیجے گا تاہم وہاں گا کہ وہ کسی دن خوش ہو کر ہمیں اپنی اُچڑی ہوئی دنیا بسانے کی اجازت دے دیں گے۔“

”روپا! روپا!“ کسی نے گھنے درختوں کی اوٹ سے آواز دی۔
روپ وقتی نے گھبرا کر آہستہ سے کہا۔ ”رام ناٹھ جاؤ، بھگوان کے لیے جاؤ،

میں نے ماموں سے وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ کبھی تم سے بات نہیں کروں گی۔“
”مجھے ابھی تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم سومانات چلی گئیں تو میں بھی جلد وہاں آؤں گا اور جو باتیں ہم انسانوں کے سامنے نہیں کہہ سکتے وہ دیوتاؤں کے سامنے کہیں گے؟“ رام ناٹھ یہ کہہ کر پاس ہی چند جھاڑیوں کے نیچے چھپ گیا۔

روپ وقتی نے جلدی سے ایک کپڑا اٹھا کر پھوٹتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
”کیا ہے ماموں! میں یہاں ہوں۔“

ایک عمر رسیدہ آدمی نے درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوتے ہوئے کہا۔
”بیٹی بہت دیر کر دی تم نے۔ اب جلدی گھر چلو!“
”ابھی چلتی ہوں ماموں، صرف ایک کپڑا رہ گیا ہے۔“
”اچھا جلدی کرو۔“ روپ وقتی کا ماموں یہ کہہ کر اس سے چند قدم دُور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد روپ وقتی اور اس کا ماموں اپنے گھر کا رخ کر رہے تھے اور رام ناٹھ گھنے درختوں سے باہر نکل کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کھیت عبور کر کے ایک بستی میں روپوش ہو گئے تو رام ناٹھ بھی اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔
(۲)

رام ناٹھ کا باپ گوبی چند ایک معمولی حیثیت کا زمیندار تھا۔ اس کا گاؤں دریا کے کنارے اس بیس میل لمبے اور پندرہ میل چوڑے سرسبز و شاداب علاقے میں تھا جو سومانات کے مندر کی جاگیر تھا۔ سومانات کے مندر کو ایسی جاگیریں ہندوستان کے طول و عرض میں کئی ریاستوں کے حکمرانوں نے عطا کر رکھی تھیں۔ گوالیار کے اس سرسبز علاقے کی بستیوں پر راجہ کی حکومت برائے نام تھی،

کرتا تھا لیکن برہمنوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کی آمدنی کیا ہے۔ وہ اس کے منہ سے روٹی کا ٹوالہ پھینکنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اپنی وضع و آرائی قائم رکھنے کے لیے گویا چند ہر دوسرے یا تیسرے سال ایک آدھ کھیت بیچنے پر مجبور ہو جاتا۔ تمام ہندوؤں کی طرح وہ بھی سومنات کے مندر کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن وہ اس بات سے بہت کڑھتا تھا کہ ہزاروں انسانوں کے خون اور پسینے کی کمائی چند بھاریوں کی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ وہ انھیں ظالم، لیٹھے اور ڈاکو کہا کرتا تھا۔ سومنات کے بھاریوں کو ایسے الفاظ سے یاد کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن لوگ گویا چند کا احترام کرتے تھے۔ وہ طبعاً فیاض تھا۔ اگر کسی کے مویشی مر جاتے یا فصل تباہ ہو جاتی تو وہ اپنی زمین بیچ کر اس کی مدد کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ اگر بھاری کسی مفکوک الحال کسان کو لگان کی عدم ادائیگی کی صورت میں پکڑ کر سپاہیوں کے حوالے کر دیتے تو وہ گویا چند ہی کو اپنا آخری سہارا سمجھتا۔ ان حالات میں گویا چند کا ہر قدم عزت کی طرف تھا۔ دل کی وسعت اور مسائل کی تنگی نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا لیکن لوگ اس کے چڑچڑے پن سے بھی پیار کرتے تھے۔ اس کے نزدیک سومنات کے مندر کا بت دنیا کی سب سے زیادہ واجب التحظیم شے تھی اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت انسان وہ لوگ تھے جو سومنات کی مورتی کے نام پر اس کی بستی میں لگان وصول کرنے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح جانوروں میں وہ جس قدر گائے کو چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ ہاتھی سے نفرت کرتا تھا۔ خصوصاً اس دن سے تو اس کی نفرت جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی، جب بھاریوں نے اس کے کھیتوں میں آٹھ ساتھی چھوڑ دیے تھے اور تین دن میں اس کی آدھی فصل برباد ہو گئی تھی۔ لوگ ہاتھی کو دیوتا کہتے تھے

اصلی اقتدار ان برہمنوں کے ہاتھ میں تھا جو سومنات کے پردہت کے نمائندوں کی حیثیت سے کسانوں اور زمینداروں سے لگان وصول کرتے تھے۔ ہر سال مندر کے بھاری ہاتھیوں پر سوار ہو کر آتے اور لگان کی جمع شدہ رقم وصول کر کے لے جاتے۔ لگان کی شرح مقرر نہ تھی۔ سومنات کے نمائندے لوگوں کو دلوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ اگر کوئی ادائیگی میں تاخیر کرتا تو اس کے مال، مویشی ضبط کر لیے جاتے تھے۔ بھاریوں کے قیام کے دوران میں ان کے ہاتھیوں کو لوگوں کے کھیتوں میں چرنے اور ان کی فصلیں تباہ برباد کرنے کی عام اجازت تھی۔ پچاس ساٹھ مسلح آدمی سومنات کے پردہت کی طرف سے اس علاقے پر متعین تھے۔ لوگ سومنات کے بھاریوں کے اشارے پر ہر وقت لگان نہ ادا کرنے والے کسانوں کو ڈرلے، دھمکانے، پیٹنے یا بے عزت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سومنات کے بھاریوں کی بڑھتی ہوئی ہوس سے تنگ آ کر ان بستیوں کے عوام اکثر ان پر اسے دقتوں کو یاد کیا کرتے تھے جب ان کے آباد اجداد سومنات کے پردہت کی بجائے اپنے حکمرانوں کو لگان ادا کرتے تھے اور وہ اتنے خوشحال تھے کہ اپنی خوشی سے ہر سال ہزاروں روپیہ سومنات کے مندر کو دان کر دیتے تھے۔

رام ناٹھ کا باپ گویا چند خاص طور پر اس زمانے کا ذکر کیا کرتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے پر سومنات کے بھاریوں کے تسلط سے پہلے اس کے دادا کے قبضہ میں ایک سالم گاؤں تھا لیکن جب یہ علاقہ سومنات کے مندر کی جاگیر بن گیا تو لگان وصول کرنے والے برہمنوں کی لوٹ کھسوٹ نے اسے چند ہی سالوں میں قلاش بنا دیا۔

جب گویا چند نے ہوش سنبھالا تو اس کے قبضے میں صرف چند کھیت تھے وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح کاشتکاروں سے صرف اپنا جائز حصہ لینے پر اکتفا

کارناموں کے صلے میں راجہ کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں ملتی تھیں۔ گوپنی چند نے بھی اسی امید پر اپنے بیٹے کو چند سال ایک پنڈت سے تعلیم دلوانے کے بعد تیر اندازی، تیغ زنی اور شہسواری کی مشق کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ آس پاس کی بستیوں میں کئی آدمی ایسے تھے جو اپنی جوانی کے دن راجہ کی فوج میں گزرا چکے تھے۔ رام ناتھ ان لوگوں کے پاس جا کر فنون سپہ گری سیکھا کرتا تھا۔ دیہاتی میلوں میں کشتیاں ہوتیں تو رام ناتھ بھی ان میں حصہ لیتا۔ اپنی جوانی کے آغاز ہی میں وہ اپنے علاقے کے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑ چکا تھا۔ گوپنی چند کو اپنے بیٹے کی شہ زوری پر ناز تھا لیکن اس کی ایک خصلت اُسے سخت ناپسند تھی اور وہ یہ کہ رام ناتھ کو موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کے لینے یہ بات ایک گالی سے کم نہ تھی کہ اس کا بیٹا بہت اچھا گاتا اور گیت بناتا ہے۔

رام ناتھ کے گیت بہت مشہور تھے اور آس پاس کی بستیوں کے چرواہے اور کسان رام ناتھ کے گیتوں کو اسی کے سرور میں گانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ روپ دتی کو اتنی گیتوں نے رام ناتھ کی طرف متوجہ کیا تھا۔

گوپنی چند کے چند کھیت روپ دتی کے ماموں کے کھیتوں سے ملنے تھے۔ رام ناتھ کبھی کبھی اپنے کاشتکاروں کا ہاتھ بٹانے کے لیے چلا جاتا۔ ایک دن ایک کاشتکار بیمار تھا اور رام ناتھ اس کی جگہ ہل چلانے کے لیے چلا گیا۔ اُس کے قریب دوسرے کھیت میں روپ دتی کا ماموں ہل چلا رہا تھا۔ رام ناتھ نے کچھ دیر آہستہ آہستہ لنگھانے کے بعد اپنے گرد و پیش سے بے پردا ہو کر بلند آواز سے گانا شروع کر دیا۔ روپ دتی کے ماموں کی طرح آس پاس کے دوسرے کسان بھی اُس کی ٹھہری آواز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ روپ دتی اپنے ماموں کے لیے کھانا لے کر آئی اور کچھ دیر دم بخود ہو کر رام ناتھ کا راگ سنتی رہی۔ روپ دتی کے

لیکن گوپنی چند کہا کرتا تھا کہ اگر دیوتاؤں کا کام فصلیں برباد کرنا ہے تو بے شک ہاتھی بہت بڑا دیوتا ہے۔ گاؤں کے زندہ دل لوگ کبھی کبھی اُسے گھیر لیتے اور کہتے ”بابا! آپ ہاتھی سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟ گوپنی چند یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا اور کہتا ”بیٹا! اگر تمہاری فصل تیار کھڑی ہو اور ہاتھی اُسے اپنی سونڈ سے روندنا شروع کر دیں تو میں دیکھوں کہ تم اٹھیں کس زبان سے دیوتا کہتے ہو۔ بھگوان کی قسم! دیوتا تو درکنار میں ہاتھی کو جانوروں میں بھی شمار نہیں کرتا۔“ شمال میں محمود کے ابتدائی حملوں کے باعث ہندوستان کے راجاؤں کی افواج کے ساتھ ان کے ہاتھیوں کا بھی چرہ چاہونے لگا اور لوگوں کی نگاہوں میں ہاتھیوں کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ گوپنی چند کو کچھ عرصہ گینش دیوتا کے متعلق اپنی نفرت اور عقارت کے اظہار میں ضبط سے کام لینا پڑا لیکن جب ہندوستان کی پلے دپلے شکستوں کی اطلاعات کے ساتھ اس قسم کی خبریں بھی آنے لگیں کہ فلاں جنگ میں دشمن نے ہمارے اتنے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا ہے اور فلاں لڑائی میں ہاتھیوں نے بدحواس ہو کر ہماری اپنی صفیں روند ڈالی ہیں تو گوپنی چند کا پارہ پھرتیز ہونے لگا۔ وہ اکثر یہ کہا کرتا ”بھگوان کی قسم! یہ دیوتا ہمارا ستیاناس کر کے چھوڑے گا۔ اس جانور کا سرفعالی ہے اور عقل کی جگہ بھگوان نے اُسے ناک عطا کر رکھی ہے۔ ہمارے لیے دو مصیبتیں ہیں۔ سومات مہاراج کے پیادوں کی توندیں اور ہاتھی کی ناک“

رام ناتھ کے مستقبل کے متعلق گوپنی چند کو ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ رام ناتھ سپاہی بنے اور اگر اُسے راجہ کی فوج میں کوئی بڑا عہدہ مل جائے تو وہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ آباد ہو جائے جو سومات کے پیادوں کی لوٹ مار سے محفوظ ہو۔ ان دنوں سپاہیوں کو اپنے بسا دارانہ

پھر خاموش ہو گئی۔

ایک لڑکی چند مویشیوں کو ہانکتی ہوئی درختوں کی اوٹ سے نمودار ہوئی اور رام ناتھ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ روپ دیتی تھی۔ جب مویشیوں کو پانی پلانے کے بعد وہ واپس جانے لگی تو رام ناتھ نے قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا: ”دیکھو جی! تمہیں میرے شعر بگاڑنے کا کوئی حق نہیں؟“

روپ دیتی نے مڑ کر رام ناتھ کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور کچھ کہے بغیر اپنے مویشیوں کو ہانکتی ہوئی درختوں میں روپوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد رام ناتھ پھر اس کے گانے کی آواز سُن رہا تھا اور اب وہ ایک مصرعے کی بجائے دونوں مصرعے بگاڑ کر گارہی تھی۔

یہ ابتدا تھی اور چھ ماہ کے بعد وہ اسی دریا کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا عہد باندھ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دریائے ستلج سے آگے محدود غزنوی کی فتوحات کے باعث ہندوستان کے تمام راجے مستقبل کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کر رہے تھے۔ رام ناتھ کے بہت سے ہم عمر گویا ر کی فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے تھے۔ ایک سپاہی کی حیثیت میں نام پیدا کرنے کی خواہش تو رام ناتھ کے دل میں پہلے ہی موجود تھی۔ اب روپ دیتی کی محبت نے اپنے مستقبل کے متعلق اس کے عزائم اور زیادہ بلند کر دیے تھے لیکن اپنی ماں کی طویل علالت کے باعث وہ گھر چھوڑ کر نہ جاسکا۔ قریباً چار ماہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد رام ناتھ کی ماں چل بسی اور اس کی وفات سے تین مہینے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گیا لیکن جانے سے پہلے روپ دیتی سے آخری ملاقات کے بعد اس کے تصورات کے محلِ مسمار ہو چکے تھے۔ اب وہ صرف

ماموں سے رام ناتھ کو آواز دے کر کہا: ”آؤ بھئی کھانا کھا لو۔“

رام ناتھ نے بل رد کرتے ہوئے جواب دیا: ”کھانا تو میں کھا کر آیا تھا۔ اگر لسی ہے تو آتا ہوں۔“

”آؤ لسی بہت ہے۔“

رام ناتھ ہل چھوڑ کر ان کے قریب جا بیٹھا۔ روپ دیتی نے اُسے لسی کا کٹورا بھر دیا۔ رام ناتھ نے لسی پینے کے بعد جب خالی کٹورا واپس کیا تو روپ دیتی نے پوچھا: ”اور دوں؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

روپ دیتی کے ماموں نے کہا: ”پی لو بھئی لسی بہت ہے۔ تم جیسے جوان آدمی کا ایک کٹورے میں کیا بنتا ہے؟“

”اچھا لائیے!“

روپ دیتی نے مسکراتے ہوئے دوسرا کٹورا پیش کیا۔ لسی پینے کے بعد رام ناتھ نے روپ دیتی کے ماموں کے ساتھ ادھر ادھر کی چند باتیں کیں اور اٹھ کر چل دیا۔ لیکن دیر تک اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی کی تصویر ناچتی رہی۔ چند دن تک وہ روپ دیتی کو دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

ایک صبح وہ دریا میں نہانے کے بعد کپڑے پہن رہا تھا کہ چند قدم دور درختوں کی اوٹ میں کوئی ہلکے ہلکے سروں میں گانا ہوا سنائی دیا۔ یہ کسی عورت کی دلکش آواز تھی اور گیت وہی تھا جو چند دن قبل رام ناتھ نے ہل چلاتے ہوئے گایا تھا۔ گانے والی ایک مصرع کہہ کر اچانک خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دوسرے مصرعے کو کچھ رام ناتھ اور کچھ اپنے الفاظ کے ساتھ ایک بگڑی ہوئی صورت میں پورا کر دیا۔ رام ناتھ نے جھمکنے جھمکنے اصنی مصرع پڑھا اور گانے والی

اپنے باپ کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لیے جا رہا تھا۔
(۳)

رام ناٹھ کو گھر سے گئے دو سال گزر چکے تھے۔ اس غصہ میں محمود غزنوی کی فتوحات کا سیلاب گنگا اور جمنہ کے میدانوں کا رخ کر چکا تھا۔ جنوب مشرقی ہندوستان کے عوام کو انداز میں یہ اطمینان تھا کہ مہاراجہ تنوج کی قیادت میں باقی راجاؤں کی متحدہ افواج آگے بڑھ کر دشمن کا منہ پھیر دیں گی لیکن محمود کی تیز فداوی نے اُن کے دل میں یہ خدشات پیدا کر دیے کہ اس لشکرِ ہزار کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی غزنی کی افواج راستے کے شہروں اور قلعوں کی مزاحمت کو کچلتی ہوئی تنوج اور کالنجر تک پہنچ جائیں گی۔ متھرا کے برہمنوں کو یہ یقین تھا کہ وطن کا ہر سپاہی اس مقدس شہر کی دیوار کے نیچے کٹ مرے گا اور دشمن کو ان عظیم الشان مندروں کے قریب نہیں آنے دے گا۔ جنھیں تمام راجے اور مہاراجے صدیوں سے خراج دے رہے ہیں۔ سرسوا سے لے کر گوالبیار اور کالنجر تک ہر مندر کے پجاری "متھرا کو بچاؤ" کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ جب محمود غزنوی سرسوا کے حکمران کو شکست دینے کے بعد برن کی طرف بڑھا تو متھرا کے برہمن راجوں کو سستے ہوئے قرب و حور کی ریاستوں میں پھیل گئے اور عوام سے متھرا کی حفاظت کے لیے جانی اور مالی قربانی کی اپیل کرنے لگے۔

دوسری ریاستوں کی طرح گوالبیار کے باشندوں پر بھی متھرا کے برہمنوں کی چیخ پکار نے اثر کیا۔ سینکڑوں نوجوان رضا کارانہ طور پر متھرا کی حفاظت کے لیے روانہ ہو گئے اور عوام نے ان رضا کاروں کی اعانت کے لیے دل کھول کر چند دیے۔ چند برہمن گوپی چند کے گاؤں میں بھی پہنچے اور انھوں نے ارد گرد کی بستیوں کے چیدہ چیدہ لوگوں کو جمع کر کے مدد کے لیے اپیل کی۔ متھرا کے برہمنوں کی

باہن سپہ متاثر ہو کر اس علاقے سے بھی کئی نوجوان متھرا جانے کے بلے تیار ہو گئے۔ لیکن جب گھوڑے اور اسلحہ فراہم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو لوگوں نے یہ عذر پیش کیا کہ عنقریب سومات لے پجاری لگان وصول کرنے کے لیے آنے والے ہیں اور وہ کسی کو ایک کوڑی بھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر ان کا خوف نہ ہو تو اس علاقے کا ہر آدمی اپنا پیٹ کاٹ کر بھی متھرا کی حفاظت کرنے والے رضا کاروں کی مدد کے لیے تیار ہے۔ متھرا کے برہمنوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ سومات کے مند کی جاگیریں تمام ریاستوں میں ہیں اور ان جاگیروں کے اکثر زمیندار اور کان ایسے ہیں جنھوں نے اپنی ساری پونجی متھرا کے مقدس شہر کی حفاظت کے لیے پیش کر دی ہے۔ سومات کا مندر یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ اس لیے اس کے پر دہت کو محمود غزنوی سے کوئی خدشہ نہیں لیکن متھرا پہنچنے میں محمود غزنوی کو دیر نہیں لگے گی۔ اگر ہم نے متھرا میں دشمن کے دانت کٹھے نہ کیے تو وہ دن دور نہیں جب ان کے گھوڑے ان بستیوں میں دوڑ رہے ہوں گے۔

گوپی چند نے ان برہمنوں کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "بھائیو! دشمن کے راستے میں متھرا ہمارا سب سے بڑا موردِ چر ہے۔ متھرا کی شکست ہندو دھرم کی شکست ہوگی۔ اگر سومات کے پجاری اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ انھیں دشمن کو گنگا اور جمنہ کی پور دھرتی پر دیکھ کر بھی ہوش نہیں آتا تو ہمیں ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے جب وہ آئیں گے تو ہم ان سے کہہ سکیں گے کہ جب تک ہماری اپنی آزادی خطرے میں ہے ہم تمھیں لگان نہیں دے سکتے۔ ہم اپنے راجہ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان لوگوں کو ہم پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے جو ہمارے خون اور پسینے کی کمائی سے اپنے تونڈیں بڑھا رہے ہیں اور اگر راجہ نے ہماری چیخ پکار نہ سنی تو ہم اپنی حفاظت خود کریں گے۔ متھرا کے برہمن اپنے لیے کچھ مانگتے تو میں

ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں۔

کوئی بیس دن بعد متھرا کے برہمنوں کا وفد اس علاقے کی رہی سہی دولت سمیٹنے کے علاوہ متھرا کی حفاظت کے لیے ایک ہزار رضا کار روانہ کر چکا تھا۔ اس وفد کی روانگی سے ایک ماہ بعد جب سومنات کے پجاری لگان وصول کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے علاقے کے کسانوں اور زمینداروں میں عام بغاوت کے آثار دیکھ کر گواہوں کے راجہ سے شکایت کی۔ راجہ نے اپنے ایک وزیر کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ وزیر نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد راجہ کو یہ رپورٹ پیش کی کہ لوگوں نے غلطی مزد کی ہے لیکن ان کی نیت بُری نہ تھی۔ تاہم انھیں تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے سومنات کا لگان ادا کرنے میں کوتاہی کی تو حکومت انھیں سزا دیتے کے لیے سومنات کے پجاریوں کی مدد کرے گی۔ اس سال ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ اس لیے انھیں معاف کر دینا چاہیے۔ راجہ نے پجاریوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے خزانے سے ایک معقول رقم ادا کر دی۔ یہ رقم اس علاقے کے لگان کی رقم سے کم نہ تھی لیکن سومنات کے پجاریوں کی نگاہ میں یہ جرأت قابلِ معافی نہ تھی۔ واپس جاتے ہوئے انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کو یہ مشورہ دیا کہ تم یہیں رہ کر ہمارے خلاف متھرا کے برہمنوں کی تبلیغ کا اثر نازل کرنے کی کوشش نہ کرو۔

ان واقعات سے چند دن بعد علاقے کے لوگوں نے یہ خبر سنی کہ سلطان محمود کی افواج برن اور ہماچن کی تسخیر کے بعد متھرا کا محاصرہ کر چکی ہیں۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ سلطان متھرا پر قبضہ کر چکا ہے۔ یہ خبر سن کر سب سے زیادہ صدمہ گوبی چند کو ہوا۔ سومنات کے وہ پجاری جو ابھی تک اس علاقے میں تھے، ہر گاؤں کے لوگوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ متھرا کے برہمنوں نے سومنات کے دیوتا کو نادامی کیا تھا اور اب انھیں اس پاپ کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ سومنات کا دیوتا ہر اس شخص کو

یقیناً انھیں یہ جواب دیتا کہ ہم سومنات کی رعایا ہیں اور ہمارے پاس تمھارے لیے ایک کوڑی بھی نہیں لیکن اب اگر میں تمھارے حفاظت کے لیے اپنی ساری پونجی لٹانے کے لیے تیار ہوں تو میری قربانی کا مقصد ہندو دھرم کے ناموس اور اپنی عزت و آزادی کی حفاظت ہے۔ سومنات کے پجاریوں کے متعلق بہت سے لوگوں کے احساسات گوبی چند سے مختلف نہ تھے لیکن بھری محفل میں ایسے خیالات کے اظہار کی جرأت صرف گوبی چند ہی کر سکتا تھا۔

گوبی چند کی تقریر کے بعد بستی کے لوگ اپنے گھروں سے ردِ پیہ اور جن کے پال ردِ پیہ نہ تھا وہ غلہ لالا کر متھرا کے برہمنوں کے قدموں میں ڈھیر کر رہے تھے۔ عورتیں اپنے زیور اتار کر انھیں پیش کر رہی تھیں۔ گوبی چند نے اپنا غلہ بیچ کر سومنات کے لیے لگان کی جو رقم جمع کی تھی، وہ سب متھرا کے برہمنوں کی نذر کر دی۔ اس کے علاوہ گھر میں اس کی بیوی کا زیور پڑا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ زیور کسی دن اس کے پیٹ کی دھن پہنے گی لیکن اس نے بستی کے ہر آدمی سے سبقت لے جانے کے لیے یہ زیور بھی متھرا کے برہمنوں کو پیش کر دیا۔ اس کے بعد گوبی چند نے اس وفد کے ساتھ علاقے کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے اور مندروں کی طرح متھرا کے مندروں کے پجاری بھی سومنات کے پجاریوں کے اثر و اقتدار سے جھلے تھے۔ انھوں نے گوبی چند جیسے منہ پھٹ آدمی کے تعاون سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سومنات کے پجاریوں کے خلاف جو باتیں وہ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتے تھے وہ گوبی چند کے منہ سے کھلوانے لگے۔ گوبی چند کو اسانے کے لیے ان کا صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ اس زمانے میں ایسے نڈر اور صاف کو آدمی کا دم غنیمت ہے اور گوبی چند اپنی ہر تقریر میں اپنی دلیری اور صاف گوئی کا ایک نیا ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھ لیتا۔ بعض بستیوں کے لوگ گوبی چند کو ٹوکنے لیکن وہ اپنے ہر معترض کو یہ جواب دیتا کہ تم بزدل

کچھ نہیں۔

لیکن اب کوئی گویا چند کی باتوں پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گاؤں کی عورتیں اپنے مردوں کو اس کے ساتھ باتیں کرنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ نو عمر لڑکے جو اس کی گالیوں پر ہنسا کرتے تھے، اب اسے بات پر ٹوکا کرتے تھے اور بوڑھے اُسے سمجھایا کرتے تھے۔ ”بھائی! اب اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہارے خلاف سومنات کے پروہت تک شکایات پہنچ چکی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم سب کی شامت نہ آجائے۔“ متھرا کی حفاظت کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے والے رضا کاروں میں سے بعض گرفتار ہو چکے تھے اور ان کے خویش و اقارب اس تباہی کی تمام ذمہ داری گویا چند کے سر تقویٰ پتے تھے۔ جو بچ کر آگئے تھے وہ بھی گویا چند سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔

ان حالات میں گاؤں کے ہر آدمی سے گویا چند کی نفرت و مہارت جنوں کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اب وہ انتہائی بے چینی کے ساتھ رام ناتھ کی داپسی کا انتظار کر رہا تھا اور اس کی تمام دلچسپیاں رام ناتھ کی یاد تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ رام ناتھ اپنی ملازمت کے پہلے ہی سال راجہ کی فوج میں نیزہ بازوں کے ایک دستے کا افسر بن چکا تھا۔ اگلے سال وہ چند ہفتوں کی رخصت پر گھر آیا تو ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار تھا۔ روپ دتی اس کی غیر حاضری میں سومنات جا چکی تھی۔ روپ دتی کے دائمی جدائی کے تصور سے رام ناتھ کو اپنے گرد و پیش کی ہر شے اُداس اور مغموم دکھائی دیتی تھی۔ اس کے سادہ جیات کے وہ تار لٹوٹ چکے تھے جو ان دلکش فضاؤں کو نعمتوں سے لبریز کر دیا کرتے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے ایک دائمی مسکراہٹ چھن چکی تھی اور اس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں ہر وقت یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وہ کسی کھوئی ہوئی شے کا متلاشی ہے۔

مزارے گا جو اس سے مزہ موڑ کر دوسرے دیوتاؤں کی سیوا کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ تمام مندر نابود ہو جائیں گے اور وہ تمام مورتیاں توڑ دی جائیں گی جن کے پجاری سومنات کے پجاریوں کی عزت نہیں کرتے اور جن ریاستوں کے راجوں نے ہماری جاگیروں سے اپنی فوجی ضروریات کے لیے چندہ جمع کیا ہے یا کسی اور مندر کے بجائیں کو چندہ جمع کرنے کی اجازت دی ہے، ان سب کا حشر بہت بُرا ہوگا۔ اب اس ملک کی نجات اس میں ہے کہ تمام ریاستوں کے حکمران اور عوام اور تمام مندروں کے پروہت اور پجاری سومنات کی تعظیم کے لیے سر جھکا دیں۔

ایسی باتیں سن کر علانے کے وہ لوگ جنہیں گویا چند نے اپنا ہم خیال بنایا تھا، تائب ہو چکے تھے۔ اکثر اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے اپنے مویشی بیچ بیچ کر سومنات کے پجاریوں کو نذرانے پیش کر رہے تھے اور جو کسی حد تک ضدی تھے۔ انھوں نے قنوج کے راجہ کی شکست کے بعد توبہ کر لی۔ گویا چند اپنی ہٹ پر قائم رہا لیکن اب اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ جو اس کی جرأت اور بے باکی کی تعریف کیا کرتے تھے، اب اس کے ساتھ بات کرتے بھی گھبراتے تھے۔ وہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ انسان ایک دوسرے کے دشمن ہو سکتے ہیں لیکن بھگوان کے دیوتا ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سومنات کے پجاری ہمارے ساتھ خفا ہوں اور سومنات کے دیوتا کی مورتی متھرا، مہابن، قنوج اور آسامی کے مندروں سے انتقام لے۔ ہماری قربانی کا مقصد ان شہروں میں بھگوان کے دیوتاؤں کے مندروں اور ان کی مورتیوں کی حفاظت تھا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سومنات کا دیوتا ہم سے خوش ہونے کی بجائے خفا ہو چکا ہے۔ ہماری شکست کا باعث ہمارے حکمرانوں کی بزدلی اور مختلف مندروں کے پجاریوں کے باہمی عناد کے سوا

ہے جس کے بارے میں کچھ ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ فوج کے ایک بڑے عہدیدار سے ملا تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بیٹا زندہ ہے لیکن ابھی ہم تمہیں یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں ہے۔ اگر تم اُسے کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہو تو خط لکھ کر مجھے دے دو۔“ گوپی چند نے ایک خط لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:-

میری آنکھوں کے تارے!

مجھے تمہارے متعلق مدت سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اب میرے لیے گاؤں میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ بھگوان کے لیے چند دن کی چھٹی لے کر آؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ یا مجھے اپنا پتہ بھیج دتا کہ میں خود آ جاؤں۔“

تمہارا باپ

گوپی چند

گوپی چند اپنے گاؤں میں واپس آ کر انتہائی بے تابی سے اپنے بیٹے کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ چند دنوں کے بعد ملک میں یہ افواہ گرم تھی کہ سلطان محمود کے گزشتہ حملے کے دوران میں قنوج کے ہمارا جہ کی پسپائی کے باعث ہمسایہ ریاستوں کے بہت سے حکمران اس کے خلاف ہو چکے ہیں۔ یہ حکمران راجہ گنڈا کی دھوکے پر کانٹے ہوئے تھے اور انھوں نے قنوج کے حکمران کو یہ پیغام تھا کہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلنے کے بعد تمہارا تخت پر بیٹھے رہنا راجپوتوں کی توہین ہے۔ اس لیے اگر تم تخت سے دستبردار ہو جاؤ تو بہتر، ورنہ ہم زبردستی تمہیں تخت سے اتار دیں گے۔

پھر یہ خبر مشہور ہوئی کہ گوالیار اور دوسری کئی ریاستوں کی افواج کا انجرا کے

کبھی کبھی گوپی چند اس سے پوچھتا۔ ”بیٹا! تم پریشان کیوں ہو؟“
”کچھ نہیں پتا جی!“ وہ چونک کر جواب دیتا۔ ”میں کچھ سوچ رہا تھا۔“
”کیا سوچ رہے تھے بیٹا!“

”کچھ نہیں پتا جی!“ رام ناتھ کوئی بہانہ کر کے اٹھتا اور چپکے سے باہر نکل جاتا۔ ایک شام رام ناتھ اکیلے دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ کئی بار روپ دتی سے مل چکا تھا۔ اس نے گانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ گوپی چند اُسے تلاش کرتا ہوا وہاں آ نکلا۔
”یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا!“ گوپی چند نے پوچھا۔

”کچھ نہیں پتا جی۔ یونہی پھرتے پھرتے یہاں آ کر بیٹھ گیا ہوں۔“

گوپی چند اس کے قریب بیٹھ گیا۔ باپ اور بیٹا کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر گوپی چند نے کہا۔ ”بیٹا لوگ کہتے ہیں کہ تم نے گانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”ہاں پتا جی! آپ کو گانے سے نفرت ہو تھی۔“

گوپی چند نے کہا۔ ”میں تمہارے گانے سے صرف اس وقت تک چڑتا تھا جب تک تم سپاہی نہیں بنے تھے اور اب تو میں خود تمہارا گانا سننا چاہتا ہوں۔“
”پتا جی! اب میں گانا نہیں سکتا۔ اب میں شاید کبھی نہ گاسکوں۔ چلیے گھر چلیں۔“
رام ناتھ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

رام ناتھ کو زیادہ دن گھر میں ٹھہرنے کا موقع نہ ملا۔ لنگا اور جمنہ کے میدانوں کی طرف محمود غزنوی کی پیش قدمی کی اطلاع سننے ہی وہ واپس چلا گیا۔ اُس کے بعد کئی مہینے گوپی چند کو اُس کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔ محمود غزنوی کی واپسی کے بعد گوپی چند نے اُسے ملنے کے لیے گوالیار کی راجدھانی کا رخ کیا لیکن وہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا گوالیار کی فوج کے ساتھ کسی ایسی مہم پر جا چکا

رام ناتھ چند ٹاپے پھٹی پھٹی نگاہوں — چرواہے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے قدرے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کیوں بچا! کیا بات ہے؟“
چرواہے نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”گاؤں میں سومات کے بھاری آئے ہوئے ہیں اور.....“

”بھگوان کے لینے جلدی کو۔“ رام ناتھ نے بے چین ہو کر کہا۔
”انھوں نے تمھارے پتا کو گرفتار کر لیا ہے۔“
”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں بھوٹے نہیں کتنا۔ سومات کے بھاری لگان جمع کرنے آئے ہوئے ہیں۔“
انھوں نے تمھارے پتا کی تمام جائداد چھین کر نیلام کر دی ہے اور گھر کو آگ لگا دی ہے۔ تمھارے پتانے آپے سے باہر ہو کر ایک بھاری کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ اب سپاہیوں نے اُسے باندھ رکھا ہے اور دوپہر سے اُسے پیٹ رہے ہیں وہ کئی بار بے ہوش ہو چکا ہے اور جب بھی ہوش میں آتا ہے سومات کے پروہت اور بھاریوں کو گالیاں دینی شروع کر دیتا ہے۔ بھگوان کے لیے تم وہاں نہ جاؤ۔ ان کے ساتھ پوری فوج ہے۔“

رام ناتھ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کچھ کے بغیر لگام کھینچ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا بچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور چرواہے نے گھبرا کر لگام چھوڑ دی۔

گوپی چند چوپال کے سامنے ایک کھلی جگہ منہ کے بل پڑا ہوا تھا ایک سپاہی بید کی چھڑی لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سومات کے دو بھاری ایک طرف چار پائیموں پر اور کوئی چالیس سلج آدمی بھاریوں کے آس پاس زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ ارد گرد کھڑے تھے۔ ایک بھاری چارپائی سے اُٹھ کر آگے بڑھا

ولسہد کی راہنمائی میں قنوج کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔

کوئی ایک ماہ بعد قنوج کا حکمران اپنے بیٹے اور فوج کے بڑے بڑے عہدیدار کی غداری کے باعث میدان میں شکست کھانے کے بعد مارا گیا اور حملہ کرنے والے راجوں نے قنوج کی نئی راجدھانی باری پر قبضہ کر کے اس کے بیٹے ترلوچن پال کو تخت پر بٹھا دیا۔

گوپی چند اب یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا بیٹا گوالیار کی فوج کے ساتھ جس مہم پر گیا ہوا تھا وہ یہی تھی۔ چنانچہ اب وہ زیادہ بیقراری سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔
(۴)

دن ڈھلے گوپی چند کے گاؤں کا ایک بوڑھا دریا کے قریب مویشی چرا رہا تھا کہ اسے دور سے ایک سریٹ سوار آتا دکھائی دیا۔ سوار قریب پہنچا تو چرواہا اُسے پہچانتے ہی بھاگ کر گپٹہ بندھی میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے چلایا۔
”ٹھہرو! ٹھہرو!“

سوار نے دونوں ہاتھوں سے لگام کھینچ کر گھوڑا روکنے کی کوشش کی لیکن تیز رفتار گھوڑا رکتے رکتے کسی گز آگے نکل گیا اور چرواہے کو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کر ایک طرف ہٹنا پڑا۔

یہ رام ناتھ تھا۔ وہ گھوڑے کی لگام موڑ کر چرواہے کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا۔ ”رام ناتھ! بھگوان کے لیے آگے نہ جاؤ، یہیں سے واپس ہو جاؤ۔“

اسے یہ ترلوچن پال دینند کا وہ شکست خوردہ حکمران نہیں جو ابھی تک اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا بلکہ قنوج اور باری کے مہاراجہ کا ولیعہد تھا۔

سے لوگوں سے سوال کیا لیکن گاؤں کے آدمی جواب دینے کی بجائے تہذیب اور پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تو بھاری نے رام ناتھ کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ ”تم کون ہو؟“

رام ناتھ نے گردن اٹھا کر بھاری کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ دانتوں میں دبالیے۔

بھاری نے دوسری بار گہرتی ہوئی آوازیں اپنا سوال دہرایا تو رام ناتھ لاش کو زمیں پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور کانپتی ہوئی آوازیں بولا۔ ”اسے کس نے مارا ہے؟“

رام ناتھ کی آنکھوں میں آگ کے شعلوں نے بھاری کو پریشان کر دیا۔ تاہم اُس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس سوال کا جواب ابھی مل جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہو کون اور تمہیں ایسے پیچھے آدمی کے ساتھ ہمدردی جتانے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

”پیچھے تم ہو۔“ رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ ایک کٹا بھاری کے منہ پر رسید کیا۔ بھاری بھر کم بھاری لٹکھڑاتا ہوا پیٹھ کے بل جاگرا اور اس کے گرتے ہی اٹھ مسلح سپاہی جو وہاں موجود تھے ”پکڑ لو، مار دو“ کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اتنی دیر میں رام ناتھ اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ ان سپاہیوں نے آج تک اپنے بازوؤں کی قوت صرف ہاتھ جوڑنے والے لوگوں پر آزمائی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنی زنگ آلود تلواروں کی جواب میں ایک چمکتی ہوئی تلوار دیکھ رہے تھے۔

رام ناتھ کو مدافعت کے لیے پیچھے ہٹنے کی بجائے حملے کے لیے تیار دیکھ کر وہ چند قدم دلاؤں کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

دوسرا بھاری چلایا۔ ”بزدلو! دیکھتے کیا ہو؟“

سپاہیوں نے بادل خواستہ آگے بڑھ کر رام ناتھ کو گھیرے میں لینے کی کوشش

اور اُس نے گویں چند کو اپنے پاؤں سے چند ٹھوکریں مارنے کے بعد جھک کر اُس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”یہ مر چکا ہے۔“

گاؤں کے لوگ جو ابھی تک خاموش کھڑے تھے۔ سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ چند آدمی ڈرتے گویں چند کی لاش کی طرف بڑھے لیکن بھاری نے گرجتی ہوئی آوازیں کہا۔ ”آگے مت آؤ، وہیں کھڑے رہو۔“

لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے لیکن ایک عمر رسیدہ کسان نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اب رات ہونے والی ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس لاش کو ٹھکانے لگا دیں۔“

بھاری نے جواب دیا۔ ”یہ لاش اس وقت تک یہیں رہے گی جب تک اس علاقے کے تمام لوگ اسے دیکھ نہیں لیتے۔“

عمر رسیدہ آدمی کچھ اور سکھ بغير پیچھے ہٹ گیا اور گاؤں کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنے اپنے گھر کا رخ کر رہے تھے۔ سپاہی لوگوں کی فصلوں میں چرنے والے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لیے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھاریوں کے گرد صرف ان کے اٹھ سپاہی اور گاؤں کے پندرہ بیس آدمی رہ گئے تھے۔

رام ناتھ نے چوپال کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا ردکا۔ گاؤں کے لوگوں نے ”رام ناتھ آگیا، رام ناتھ آگیا!“ کی صدائیں بلند کیں۔ اس نے گھوڑے سے کود کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگتا ہوا اپنے باپ کی لاش کی طرف بڑھا۔ اس کے گھوڑے اور لباس نے تھوڑی دیر کے لیے بھاریوں اور ان کے سپاہیوں کو مرعوب کر دیا۔ گاؤں کے ایک نوجوان نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ رام ناتھ ”بتا جی! بتا جی!“ کہتے ہوئے اپنے باپ کی لاش کو دبیں سے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ کون ہے؟“ ایک بھاری نے چارپائی سے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے گاؤں

کی لیکن اس نے پہلے حملے ہی میں یکے بعد دیگرے دو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تیسرا سپاہی بدحواس ہو کر اُلٹے پاؤں بھاگا لیکن اس نے زمیں پر پڑے ہوئے پجاری کے ساتھ ٹھوکر کھائی اور پیٹھ کے بل گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن رام ناتھ کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ دوبارہ حرکت نہ کر سکا۔ باقی سپاہی ادھر ادھر بھاگ کر اپنے ان ساتھیوں کو آوازیں دے رہے تھے جو کھیتوں میں اپنے گھوڑے اکٹھے کر رہے تھے۔ دوسرا پجاری بدحواس ہو کر پاس ہی ایک درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپنا گھر

ایک پہرات گئے رہبر اور شنبو ناتھ چاند کی روشنی میں تھوڑی دور اپنی منزل مقصود دیکھ رہے تھے۔ تھکے ہوئے گھوڑے گردنیں جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ بگڑتلی کے آس پاس سینڈ کون اور جھینگروں نے اپنا نہ ختم ہونے والا راگ شروع کر رکھا تھا۔ رہبر کا رُواں رُواں اپنے وطن کی زمین کی ممک سے سرشار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی گردن پر تھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست! مجھے تمھاری بھوک اور تھکاوٹ کا علم ہے لیکن اب ہماری منزل دور نہیں!“

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک گھنے باغ میں داخل ہوئے اور رہبر کے دل دماغ پر ایک بار پھر ماضی کے حسین و غریب نقوش ابھرنے لگے۔ یہ وہی باغ تھا جہاں وہ بچپن میں کھیلا اور قہقہہ لگایا کرتے تھے۔ یہ قہقہے اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

باغ عبور کرنے کے بعد وہ اپنے قلعہ تما محل کی چار دیواری دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں اور آنکھوں میں تشکر کے آنسو چھلک رہے تھے۔ محل کے اندر کامل سکوت تھا۔ بالائی منزل کے ایک کمرے کے درپے

گاؤں کے لوگ چلا رہے تھے۔ ”رام ناتھ اب بھاگ جاؤ۔ سپاہی کھیتوں سے اپنے گھوڑے بچانے کے لیے گئے ہوئے ہیں، وہ ابھی آجائیں۔ جلدی کرو۔“ لیکن رام ناتھ اب نیچے پڑے ہوئے پجاری کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کی تلوار کی نوک پجاری کے سینے پر تھی اور پجاری ہاتھ باندھ کر چلا رہا تھا۔ ”دیا کرو ہمارا راج! میں سومات کا پجاری ہوں، ہمارا راج! ہمارا راج!“

رام ناتھ نے اس کے منہ پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ ”بزدل! وہ میرا باپ تھا۔“

گاؤں کے لوگوں نے بھاگ کر پجاری کو بچانے کی کوشش کی لیکن رام ناتھ کی تلوار اس کے سینے کے آد پار ہو چکی تھی اور وہ خود بھاگ کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سومات کے پجاریوں کے جاں نثار سپاہی اس کی تلاش میں نکلے تو رام ناتھ دو کوس دور رات کی تاریکی میں پناہ لے چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد آنے والی ہر نئی صبح کی روشنی اُسے یہ پیغام دیتی تھی کہ موت سائے کی طرح اُس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ دیوتاؤں کی سرزمین میں سومات کے پجاری کے قاتل کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

نہیں، اس طرح وہ ڈر جائے گی۔ میں کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھوں گا۔ پھر اگر وہ جاگ رہی ہوگی تو میں درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر اُسے آہستہ سے آواز دوں گا۔ وہ پریشان ہو کر دیکھے گی اور پھر میرے لیے اپنے قہقہے رد کننا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں پتاجی کے کمرے میں جائیں گے۔“

اپنے باپ کے متعلق سوچتے ہوئے رنیر کو ایک بار پھر طرح طرح کے خدشات پریشان کرنے لگے۔ اپنے وطن کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے وہ قنوج کے اندر دنی انقلاب کی خبر سن چکا تھا اور اس نے آخری منزل انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ طے کی تھی۔ اگرچہ اسے شبو ناٹھ کی باتوں سے یہ یقین ہو چکا تھا کہ سلطان محمود کے ہاتھوں قنوج کی شکست کے باعث اس کا باپ قنوج کے شاہی خاندان سے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے تمام راجاؤں سے مایوس اور متنفذ ہو چکا ہے اور اس نے قنوج کے حکمران اور اس کی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا ہوگا۔ تاہم کبھی کبھی نامعلوم سے خدشات اس کے دل میں ابھرتے تھے۔

محل کے دوسرے کونے سے ایک پریدار نمودار ہوا۔ رنیر درخت کے ساتھ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار رنیر کے دل میں اُسے آواز دینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن وہ ابھی تذبذب کی حالت میں تھا کہ پریدار بیر دنی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔ پریدار کی چال رنیر کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ محل کے کین سکون دامینان کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ جامن کے درخت پر چڑھتا ہوا دشمن کھڑکی کے سامنے جا پہنچا۔

درخت کی شاخ پر کھڑا ہو کر وہ کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر بھاگنے لگا۔ کھڑکی کے سامنے صرف دو قدم کے فاصلے پر ایک عورت سفید چادر اوڑھے بیٹنگ برسر رہی تھی۔ اس کا سر چادر سے باہر تھا لیکن اس کے چہرے کا بیشتر حصہ

سے جس کا بیشتر حصہ صحن کے ایک تناور درخت کی شاخوں نے چھپا رکھا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔ شبو ناٹھ نے درپچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”ادھر دیکھیے، شکنتلا کے کمرے میں دیا جل رہا ہے۔ وہ جاگ رہی ہوگی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کی غیر حاضری میں ایک رات اس نے سپنا دیکھا تھا کہ آپ کھڑکی کے راستے اُس کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ رات کو کبھی اپنے کمرے کا دیا نہیں بجھاتی۔“

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ پھاٹک کا رخ کر رہے تھے۔ اچانک رنیر نے اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا: ”ٹھہر، شبو! اس وقت اگر ہم نے پھاٹک پر آوازیں دیں تو نوکر شور مچا کر سارا گادوں جمع کر لیں گے۔ میں سب سے پہلے شکنتلا اور پتاجی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو۔ دیکھوں آج شکنتلا مجھے پہچانتی بھی ہے یا نہیں۔“

شبو ناٹھ نے کہا: ”اگر آپ کے بال سفید ہو چکے ہوتے تو بھی شکنتلا آپ کو پہچان لیتی۔“

رنیر اپنا گھوڑا دیوار کے قریب لے گیا۔ پھر زین پر کھڑا ہو کر دیوار پر چڑھ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد صحن میں کود پڑا۔ کشادہ صحن طے کر کے وہ رہائشی مکان کے کچھ پاڑے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کونے پر ایک جامن کے درخت کے نیچے لگا اور اُپر دیکھنے لگا۔ بالائی منزل کے کمرے کے درپچھے سے ابھی تک روشنی آرہی تھی۔ رنیر کے دل کی دھڑکنیں ہر لمحہ تیز ہو رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا: ”شکنتلا پہلے مجھے پور سمجھے گی۔ پھر بھیا! بھیا! کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ جائے گی اور میں

کہوں گا۔ بگلی! تم خواب دیکھ رہی ہو۔“ پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا: ”نہیں! میں دبے پاؤں اندر داخل ہو کر اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لوں گا لیکن

ہوئی آواز میں کہا: ”اگر تم چور یا ڈاکو نہیں تو اس دقت یہاں کیا لینے آئے ہو، یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں شور مچاؤں گی۔“

رنیر نے کہا: ”میں خوشی سے آپ کو شور مچانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن اگر آپ کسی اور کو آواز دینے کی بجائے میری بہن کو یہاں بلا سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔“ لڑکی کی پریشانی غصے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے کہا: ”تم اگر چور نہیں تو دلوانے ضرور ہو۔ اگر مجھے اپنی بدنامی کا ڈر نہ ہو تو ابھی شور مچا کر گھر کے تمام آدمیوں کو جگا دوں۔“

”بہت اچھا! چلیے شور۔“ رنیر نے اطمینان سے جواب دیا۔

لڑکی کا اضطراب ایک بار پھر خوف میں تبدیل ہونے لگا۔ وہ بولی: ”تمہیں اپنی جان کا خوف نہیں؟“

”بالکل نہیں۔“

”آخر تم کیا چاہتے ہو؟ تم کون ہو؟ اور اس دقت میرے کمرے میں.....؟“

”جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آپ کون ہیں؟ میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“

”موت کے لیے تم میرے کمرے کے سوا کوئی اور جگہ تلاش نہیں کر سکتے؟“

”نہیں، اب مجھے زندگی اور موت کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش نہیں۔“

لڑکی اضطراب کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ رنیر نے غصے کی حالت میں آج تک کسی کا چہرہ اس قدر جاذب نگاہ نہیں دیکھا تھا۔ اچانک لڑکی کی نگاہ اپنی کلائیوں پر مرکوز ہو گئی۔ ان میں چمکنے ہوئے کنگن دیکھ کر اس کا غصہ حیرانی میں تبدیل ہو گیا اور قدرے توقف کے بعد اس نے طعنانہ لہجے میں کہا: ”تم صرف ایک لڑکی کو بدنام کرنے کے لیے موت قبول کرنا چاہتے ہو۔ آخر

بازوقوں میں مچھا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت ہاتھ سر سے اوپر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور کلائیوں میں باریک طلائی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

”شکنتلا!“ رنیر نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے آواز دی لیکن سونے والی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہنے کے بعد اس نے شکنتلا کو جگانے کے ارادے سے اپنا ہاتھ بستر کی طرف بڑھایا لیکن پھر کچھ سوچ کر اچانک ڈک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اپنی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی زیورات کی تھیلی اتاری اور تمام زیورات نکال کر سونے والی کے تیکے کے قریب رکھ دیے۔ پھر اس نے ایک کنگن اٹھایا اور آہستہ سے اس کی ایک کلائی میں ڈال دیا لیکن اس کے بعد جب وہ دوسرا کنگن اٹھا کر دوسرے ہاتھ کی کلائی میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا تو سونے والی نے اچانک اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کمرے سے بدل کر انتہائی بدحواسی اور خوف کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چلا نا چاہتی تھی لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

رنیر بھی چند ثانیے متحیر سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ شکنتلا نہ تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ معاذ رنیر کے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ کوئی شکنتلا کی سہیلی ہے اور ہمارے گھر مہمان آئی ہے۔ اس خیال سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”ڈریے نہیں۔“ اس نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ آپ کون ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میری بہن کی سہیلیوں میں آپ کی شکل کی کوئی لڑکی نہ تھی۔“

لڑکی کا خوف اضطراب اور پریشانی میں تبدیل ہونے لگا اور اس نے سہی

حادثے کا سامنا کرنے والا ہے۔ وہ رہبر کی طرف دیکھ کر بار بار اپنے دل میں یہ الفاظ دہرا رہی تھی۔ کاش! تم یہاں نہ آتے۔ کاش! میں یہاں نہ ہوتی۔
 رہبر نے اس کے چہرے پر حزن و غم کے آثار دیکھ کر سوال کیا۔ ”میرے پتاجی اور شکنتلا کیسے ہیں؟“

لڑکی نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”وہ یہاں نہیں ہیں اور اگر تم بھی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھتے ہو تو بھگوان کے لیے یہاں سے بھاگ جاؤ۔“
 رہبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ درنہ آپ کا حکم ماننے سے انکار نہ کرتا۔“

”میں سچ کہتی ہوں، تمہارا باپ اور بہن یہاں نہیں ہیں۔“
 ”کہاں ہیں وہ؟“

”بھگوان کے لیے اہمستہ بولو، میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ اگر آپ موہن چند کے بیٹے ہیں تو اس مکان کی چار دیواری کے اندر آپ کی زندگی محفوظ نہیں۔“

رہبر نے دروازے کی طرف بڑھ کر کڑی پر ہاتھ ڈالتے ہوئے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہ غلط میری برداشت سے باہر ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ان مکان سے باہر میں اپنی زندگی کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا ہوں؟“

”ٹھہریے! بھگوان کے لیے! اس طرف نہ جایے۔“ لڑکی نے یہ کہتے ہوئے بھاگ کر رہبر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لڑکی کی اس حرکت نے رہبر کا اطمینان متزلزل کر دیا تاہم اس نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں آپ اپنی پریشانی کا کافی بدلہ لے چکی ہیں۔ اب اور غلطی نہ کیجیے۔“

میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“
 لڑکی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رہبر نے قدرے متاثر ہو کر کہا۔ ”معاف کیجیے میں غلطی سے اس کمرے میں آگیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری یہ حرکت ایک مہمان کی پریشانی کا باعث ہوگی۔“

”مہمان! کس کی مہمان؟ یہ میرا اپنا گھر ہے۔“
 ”اچھا یہ آپ ہی کا گھر سہی لیکن یہ بتائیے کہ شکنتلا کہاں ہے۔ میں کسی اور کو جگانے سے پہلے اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“
 ”آپ موہن چند کی بیٹی کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“
 ”ہاں! میں اس کا بھائی ہوں۔“

لڑکی کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا اور اس نے ڈبئی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم مسلمانوں کی قید میں تھے؟“

”ہاں، میں ابھی یہاں پہنچا ہوں اور درخت پر چڑھ کر اس کھڑکی کے رستے داخل ہوا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میں شکنتلا کو پریشان کر دوں گا لیکن شکنتلا کے بھتیجے کی پریشانی بھگوان نے آپ کی قسمت میں لکھی تھی۔ اب میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ شکنتلا کے کمرے تک میری رہنمائی کریں ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میں آپ کی طرح کسی اور مہمان کو پریشان نہ کر دوں۔“

لڑکی کا دل اب خوف یا غصے کی بجائے مروت اور ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے اب چوڑا ڈاکو یا کسی پاگل انسان کی بجائے ایک ایسا نوجوان کھڑا تھا جس کی صورت دیوتاؤں سے ملتی تھی۔ وہ رہبر کے متعلق سن چکی تھی اور اس کے لیے یہ تصور کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ نوجوان جو پانچ سال قید رہنے کے بعد آج اپنی بہن اور باپ سے ملنے کی آرزو لے کر آیا ہے کسی المناک

میں اس کی بکواس سن چکا ہوں۔ پھر وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر چلا یا۔ بزدلو! تم کیا دیکھ رہے ہو، پکڑ لو اسے۔“

چار مسلح آدمی ”گھیر لو، پکڑ لو“ کے نعرے لگاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور محل کے پچھلے حصے سے بھی اسی قسم کے نعرے سنائی دینے لگے۔ لڑکی ہراسے میں ایک عورت کے ساتھ لپٹ کر چلا رہی تھی۔ ”ماتا جی، پتا جی کو روکو۔ وہ بے قہو ہے۔ اس نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔“

رنیر کے لیے اب اس موقع سے متعلق سوچنے کا وقت نہ تھا۔ وہ کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر تذبذب کی حالت میں کھڑا اپنے سامنے تلواریں دیکھ رہا تھا۔

قوی ہیکل آدمی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور رنیر کے گرد مسلح آدمیوں کا گھیراؤ بننے لگا۔ رنیر فطرتاً نڈر تھا لیکن اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ قوی ہیکل آدمی نے کہا۔ ”تلوار پھینک دو، تم لڑ کر اپنی جان نہیں بچا سکتے۔“

تلوار کا کھیل میرے لیے نیا نہیں لیکن کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرا دشمن کون ہے؟ رنیر نے یہ کہتے ہوئے اپنی تلوار پھینک دی۔

قوی ہیکل آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جھگوان کا شکر ہے کہ تم خود ہی یہاں پہنچ گئے۔ ورنہ مجھے ساری عمر تمھاری تلاش رہتی۔“

تھوڑی دیر کے بعد رنیرنگی تلواروں کے پرے میں محل کے اس دروازے کا رخ کر رہا تھا جو دریا کی سمت کھلتا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر سپاہیوں نے رنیر کے دونوں ہاتھ ایک مضبوط رے سے باندھ دیے۔

قوی ہیکل آدمی نے کہا۔ ”اب اسے جلدی دریا کے پار لے جاؤ۔ صبح ہونے

لڑکی نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”مجھے جھگوان کی سوگند میں تم سے مذاق نہیں کرتی۔ میرا کہا نافذ اور جس راستے آئے ہو اسی راستے واپس چلے جاؤ۔ اب یہ گھر تمھارے لیے نذر کے قلعے سے کم خطرناک نہیں۔ جاؤ! جلدی کرو!“ وہ رنیر کو کھڑکی کی طرف کھینچنے لگی لیکن وہ بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے دروازے کو دھکے دیتے ہوئے آوازیں دیں۔ ”نرمل! نرمل! دروازہ کھولو!“ لڑکی سر راہ التجا بن کر رنیر کی طرف دیکھنے لگی۔

”نرمل! دروازہ کھولو!“ کسی نے اور زیادہ کراہت آواز میں کہا۔

لڑکی سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیا ہے پتا جی؟“

کوئی پوری قوت سے چلا یا۔ ”دروازہ کھولو!“

”کھولتی ہوں پتا جی!“ یہ کہہ کر لڑکی رنیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی تمام قوت گویائی سمٹ کر نگاہوں میں آچکی تھی۔ رنیر نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اب صورت حال اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ جھٹک کر جلدی سے کینڈی کھول دی۔ اچانک دھماکے کے ساتھ دونوں کو اڑھلے اور رنیر کے سامنے ایک قوی ہیکل آدمی تنگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چند اور مسلح آدمی تھے۔ لڑکی ”پتا جی، پتا جی!“ کہتی ہوئی بھاگ کر قوی ہیکل آدمی کے ساتھ لپٹ گئی اور رنیر نے اضطرابی حالت میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار نکال لی۔

”پتا جی! اس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ یہ چور نہیں، یہ موہن چند کا بیٹا ہے۔ یہ اپنی بہن کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔“

عمر رسیدہ آدمی نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو پھراتے ہوئے لڑکی کو ہراسے کی طرف دھکیل دیا اور چلا کر کہا۔ ”تم خاموش رہو۔ میں جانتا ہوں یہ کون ہے۔“

ان کا رہنما معلوم ہوتا تھا۔ کشتی سے پانی نکالنے والوں کے قریب جا کر کہا ”بھئی جلدی کر ویر ہو رہی ہے۔“

ان میں سے ایک سپاہی نے جواب دیا ”کشتی کا پیندا بہت خراب ہے میرے خیال میں ہم سب کا اس پر سوار ہونا خطرناک ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ آدھے آدمی ایک بار اور آدھے آدمی دوسرے پھیرے میں پار جائیں۔ ویسے بھی یہ کشتی پانچ چھ آدمیوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔“

سپاہی نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا ”ٹھیک ہے تم ان چار آدمیوں کو لے کر چلے جاؤ اور انھیں دوسرے کنارے چھوڑ کر جلدی واپس آ جاؤ۔ پھر ہم قیدی کے ساتھ آ جائیں گے لیکن دیر نہ ہو۔“

دوسرے سپاہی نے چپو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئی اور باقی تین پریدار ورنیر کے قریب بیٹھ گئے۔ اپنے پریداروں کی تعداد میں کمی دیکھ کر بھی ورنیر کی مایوسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بے بسی کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف اُسے موت کی تازی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”قدرت کا یہ مذاق کس قدر عجیب ہے۔ کیا اسی وقت کے انتظار میں میں نے پانچ سال ایک قیدی کی حیثیت سے گزارے ہیں کیا اسی وقت کے لیے میں ہر شام اور ہر صبح زندہ رہنے کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ میں موت سے بے تکلیف ہونے کے لیے نذرۂ کے میدان تک جا نکلا تھا لیکن وہ اس محل کی چار دیواری میں چھپ کر میرا انتظار کر رہی تھی۔ جسے میں اپنے لیے دنیا کے ہر قلعے سے زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ میں اس دشمن کی قید سے رہا ہو کر آیا ہوں جو قلعہ تک اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ چکا ہے اور آج میں ایک ایسے دشمن کے ہاتھوں مارا جا رہا ہوں جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں۔ شکستہ کہاں ہے؟ پتا جی کہاں ہیں؟

سے پہلے اُسے ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔ گاؤں کے کسی آدمی کو اس واقعہ کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ اگر دریا کے پار کوئی اسے دیکھ لے تو یہی کہنا کہ یہ ایک چور ہے۔ اگر تم سے کوئی غفلت ہوئی تو میں تم سب کو پھانسی دے دوں گا۔“

نرملہ چند قدم دور اپنی ماں کے ساتھ کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ جب سپاہی ورنیر کو باہر لے گئے تو وہ بھاگ کر اپنے باپ کے قریب پہنچی اور سسکیاں بلیے ہوئے بولی ”پتا جی! یہ باپ ہے۔ بہت بڑا باپ ہے۔ بھگوان کے لیے سپاہیوں کو روکیے۔“

نرملہ کے باپ نے کہا۔ ”بے وقوف نہ ہو نرملہ! ایک سانپ کے بچے کا سر کچلنا کوئی باپ نہیں۔ سو ہی چند کے بیٹے کی زندگی میں ہم اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے۔ تم بھگوان کا شکر کر دو کہ وہ میری زندگی میں ہی یہاں آ گیا۔“

”نہیں نہیں، پتا جی! یہ باپ نہ کیجیے۔“

”خاموش رہو! میں اپنے بدترین دشمن کے بیٹے کے لیے تمھارے یہ آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔ چلو اپنے کمرے میں۔“

(۲)

آٹھ پہرے داروں کی حراست میں ورنیر محل سے نکل کر گھنے سرکندوں اور بھاڑیوں میں سے گزرنے کے بعد دریا کے کنارے پہنچا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی کشتی کھڑی تھی۔ پریداروں نے ورنیر کو کشتی کے پاس زمین پر بٹھا کر اس کے پاؤں میں دستاؤال دیا۔ تین پریدار ورنیر کے پاس کھڑے رہے اور باقی پانچ کشتی میں بھرا ہوا پانی نکال کر باہر پھینکے گئے۔ یہ سب ورنیر کے لیے اجنبی تھے۔ تھوڑی دیر بعد ورنیر کے گرد پہرہ دینے والوں میں سے ایک سپاہی نے جو

نے اس کی لاش نہیں دیکھی۔“

رنیر نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا، ”میرے باپ کو بے کراں نے قتل کیا ہے؟“
 ”ہاں!“ سپاہی نے جواب دیا، ”لیکن اب ایسی باتوں سے کیا فائدہ۔ بہتر ہے
 کہ اب تم بھگو ان کو یاد کر دو۔“

رنیر کی اداس اور مغموم نگاہیں خاموش فضا میں بھٹک رہی تھیں اور اس کا ضمیر
 ان دیوتاؤں کی بے بسی کا تسخّر اڑ رہا تھا، جن کی تقدیس پر اپنی جان تک قربان کسے
 کا عزم لے کر وہ پانچ سال قبل اپنے گھر سے نکلا تھا۔ اچانک اس کے دل میں بے کراں
 سے انتقام لینے کے لیے زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہونے لگی۔ اس وقت اس کا
 زخم خوردہ ضمیر پگھلا اٹھا۔ ”رنیر! تم اس دنیا میں تنہا نہیں ہو۔ اس ملک کے
 کروڑوں انسان تم سے زیادہ مظلوم ہیں اور بے کراں بھی تنہا نہیں۔ اس ملک کا ہر
 باشندہ دوسروں پر غالب آنے کے بعد بے کراں بن جاتا ہے۔ اس سمندر کی ہر
 بڑی کھلی چھوٹی کچھلیوں کو نگل جاتی ہے۔ یہ سماج صرف اچھوتوں کا دشمن نہیں بلکہ
 ہر اس انسان کا دشمن ہے جو کسی کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس سماج
 کے دیوتا ہر اس ظالم اور جابر انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں جو دوسروں کی گردن
 پر سوار ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔ دیوتاؤں کے پجاری جو ہر سال تمہارے باپ سے
 دان لینے کے لیے آتے تھے، اب بے کراں سے دان لینے آیا کریں گے۔ تمہاری
 جنگ اور قید دلوں بے مقصد تھیں اور اب تمہاری موت بھی بے مقصد ہے۔
 تمہارا خون اس مٹی پر گرنے والا ہے جو ان گنت مظلوموں اور بے گناہوں کا خون
 جذب کر چکی ہے۔“

رنیر انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اُسے کوئی تیس قدم کے فاصلے
 پر سرکٹوں اور بھاڑیلوں میں کوئی متحرک شے دکھائی دی۔ چند ثانیہ خود سے دیکھنے

کیا میں اب بھی کوئی پسند دیکھ رہا ہوں۔“

اچانک وہ اپنے پیریداروں کی طرف متوجہ ہو کر چلا اٹھا۔ بھائیو! میں تم سے
 صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

پیریدار خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رنیر نے کہا، ”میں جانتا ہوں
 کہ تم مجھے قتل کرنے پر مجبور ہو۔ اپنے سردار کا حکم ماننا تھا اور فرض ہے۔ میں تم سے
 رحم کی درخواست نہیں کرتا لیکن مرنے سے پہلے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ
 تمہارا سردار جس نے میرے قتل کا حکم دیا ہے کون ہے؟“

پیریدار کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ پھر
 ان میں سے ایک نے جواب دیا، ”ہم نہیں صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے سردار کا
 نام بے کراں ہے اور اس کے محل میں رات کے وقت چودوں کی طرح داخل ہونے
 کے بعد تم اس سے بہتر سلوک کے حق دار نہیں تھے۔“

بے کراں کا نام سننے کے بعد رنیر کی نگاہوں سے تمام پردے ہٹ گئے،
 اب اس کے لیے کوئی بات معتمد نہ تھی۔ وہ چند ثانیہ خاموش رہا اور پھر گھٹی ہوئی
 آوازیں بولا، ”میں سردار موہن چند کا بیٹا ہوں اور تم سے اپنے پتا اور بہن کا
 حال پوچھنا چاہتا ہوں۔“

ایک پیریدار نے جواب دیا، ”وہ مر چکے ہیں۔“

رنیر کے منہ سے دیر تک بات نہ نکل سکی۔ اب زندگی اور موت دونوں اس
 کے لیے بے حقیقت بن چکی تھیں۔

دوسرے سپاہی نے کہا، ”تمہارے باپ کے متعلق تو ہم یقین کے ساتھ
 کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں لیکن تمہاری بہن کے متعلق بھگو ان بہتر
 جانتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں کو دگئی تھی لیکن کسی

ریت پر ریٹکتے ہوئے آدمیوں کی ٹولی اب بہت قریب آچکی تھی پریداروں کی باتیں ختم ہو چکی تھیں اور اب ان کی خاموشی رنیر کے لیے پریشان کن تھی۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ جھارڈیوں میں چھپ کر آتے والے لوگ قدرت نے اس کی مدد کے لیے بھیجے ہیں لیکن اُسے اندیشہ تھا کہ اگر پرے داران کی آمد سے باخبر ہو گئے تو سب سے پہلے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ اپنے مددگاروں کو اچانک حملے کا موقع دینے کے لیے پریداروں کو بانوں میں مصروف رکھنا ضروری تھا۔ رنیر نے انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: ”تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کی فوج عنقریب دوبارہ اس ملک پر حملہ کرنے والی ہے اور اب واپس جانے کی بجائے وہ اس ملک پر قبضہ کر کے حکومت کریں گے۔“

پریدار جواب دینے کی بجائے پریشانی کی حالت میں اس کا منہ دیکھنے لگے۔ رنیر نے پھر کہا: ”جب وہ اس علاقے میں آئیں گے تو بے کمرش جیسے لوگ جس قدر ظالم ہیں اسی قدر بزدل ثابت ہوں گے۔“

پریداروں کے افسر نے کہا: ”تم سمجھتے ہو کہ موت تو آ رہی ہے، اس سے زیادہ کوئی تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اگر تم نے ہمارے سردار کی شان میں کوئی گستاخی کی تو میں ابھی تمہاری زبان کاٹ ڈالوں گا۔“

رنیر نے کہا: ”تمہارا سردار اگر احمق نہیں تھا تو اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ایک لامل میں گھس آیا تھا۔ میرے پچاس آدمی محل کے بڑے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک محل پر قبضہ کر کے بے کمرش کو پھانسی دے چکے ہوں گے اور تم اپنے سردار سے بھی زیادہ بیوقوف ہو۔ اس وقت تمہارا بیچہ دائیں اور بائیں میرے آدمی کھڑے ہیں۔ انکھیں کھول کر دیکھو۔“

پریدار سکتے کے عالم میں اپنے گرد دس مسلح آدمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان

کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ کوئی انسان زمین پر ریٹنگ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی مایوسی کی بھیانک تارکیوں میں اُسے امید کی ہلکی سی کرن نظر آنے لگی۔ اجنبی چند قدم ریٹکنے کے بعد رگ گیا اور گردن اٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھنے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کر کے بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ رنیر کے پرے دارکشی کے انتظار میں دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اجنبی قدرے توقف کے بعد دوبارہ زمین پر ریٹ گیا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی رنیر کو اس کے چند قدم پیچھے آٹھ دس اور آدمی اسی طرح زمین پر ریٹ گئے ہوئے دکھائی دیے اُس کا خون جو تھوڑی دیر پہلے منجمد ہو چکا تھا، اب تیزی سے اس کے رگ وریشے میں دوڑ رہا تھا۔ زندگی دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے سینے سے لگانے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

اچانک پریداروں کا افسر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ٹکٹکی باندھ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”کیسٹ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ اب صبح ہونے والی ہے اور سردار بے چینی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہم قیدی کو پہلے لے جاتے تو بہتر تھا۔“

دوسرے پریدار نے کہا: ”مجھے آپ کی ناراضگی کا ڈر تھا، ورنہ میں اسی وقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ قیدی کو یہیں ختم کر کے لاش پہلے پھیرے میں پار بھیج دی جائے۔“ افسر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: ”واہ واہ کیا عقل کی بات کہی ہے تم نے، اگر اُسے یہیں قتل کرنا ہوتا تو تمام آدمیوں کو دوسرے کنارے لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ سردار کا حکم ہے کہ قیدی کو دوسرے کنارے لے جا کر ٹھکانے لگایا جائے۔ تم نہیں جانتے سردار بہت دد کی سوچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر افسر بے چینی سے ٹپکنے لگا۔

پہچان چکا ہوں۔“ اس کے بعد رہبر نے بعد دیگرے اپنے گاؤں والوں کے نام لینے لگا وہ باری باری اس کے ساتھ بغلیگر ہونے لگے۔ صرف چار آدمی ایسے تھے جن کی بجائے اس نے دوسرے آدمیوں کے نام لیے۔ سب سے آخر میں اس نے رام ناتھ کا نام لیا لیکن وہ بغلیگر ہونے کی بجائے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا ج! اب باتوں کا وقت نہیں۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے کوسوں دور نکل جانا چاہیے۔ میں گھوڑے یہاں سے تھوڑے فاصلے پر چھوڑ آیا ہوں۔ چلیے!“

رہبر نے کہا۔ ”ابھی نہیں، ابھی تھوڑا سا کام باقی ہے۔ تم سب یہیں رہو۔ میرے ساتھ صرف تین آدمی آئیں۔ شبو ناتھ! تم ان قیدیوں کے سامنے جا کر ایسی باتیں کرو جن سے ان پر یہ ظاہر ہو کہ یہ لوگ اس گاؤں کے نہیں بلکہ نندنہ سے میرے ساتھ آئے ہیں اور جو آدمی ان کے پاس کھڑے ہیں انھیں الگ لے جا کر اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ ان کے سامنے بالکل خاموش رہیں اور تم میں سے کوئی جا کر ہمارے گھوڑے یہاں لے آئے۔“

(۳)

تھوڑی دیر بعد رہبر اور اس کے تین ساتھی دیا کے کنارے بیٹھے واپس آئے والی کشتی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کشتی قریب آئی تو رہبر کے ساتھیوں نے اس کا اشارہ پاتے ہی منہ دوسری طرف کر لیا۔ رہبر اٹھ کر آگے بڑھا اور گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑا ہو گیا۔ جب کشتی اور قریب آگئی تو اس نے جھک کر اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ کشتی میں صرف ایک آدمی سوار تھا کشتی جب چار پانچ قدم کے فاصلے پر آگئی تو رہبر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کشتی چلائے والے نے رہبر کو پہچان لیا اور اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر فوراً کشتی کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی آن میں رہبر کشتی میں سوار ہو چکا تھا

ڈھانٹوں میں پھپھے ہوئے تھے۔ رہبر کو انھیں دیکھے بغیر اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اس کے گاؤں کے آدمی ہیں اور ان میں سے ایک شبو ناتھ ضرور ہے۔ رہبر نے حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”انھیں کچھ نہ کہو، یہ بے چارے ڈر رہے ہیں۔“

رہبر کی چال کامیاب تھی، حملہ کرنے والوں نے پریداروں کی سرانمگی سے فائدہ اٹھا کر انھیں تنگ گھیرے میں لے لیا اور انھوں نے شور مچانے یا مزاحمت کرنے کی بجائے اپنی تلواریں ان کے حوالے کر دیں۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر رہبر کے ہاتھ اور پاؤں کی ریتیاں کاٹ ڈالیں۔ رہبر نے اٹھ کر ایک آدمی کے ہاتھ سے تلوار پکڑ لی اور بدحواس پریداروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم اگر اپنی جانے پسندنا چاہتے ہو تو خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے آؤ۔“

پہرے داروں کے افسر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا ج! ہم پر دیا کریں۔“ رہبر نے اپنے مددگاروں سے کہا۔ ”انھیں جھاڑیوں میں لے جا کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی شور مچانے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دو۔“

یہ آدمی پریداروں کو پکڑ کر جھاڑیوں میں لے گئے اور ان کی پکڑیوں اور دھڑیلوں سے انھیں اچھی طرح جکڑ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ رہبر نے دو آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ تلواریں لیے ان کے سر پر کھڑے رہیں۔ پھر وہ باقی مددگاروں کو ساتھ لے کر دوبارہ کنارے کی طرف آگیا۔

وہ قیدیوں سے ذرا دور آکر رکا اور اپنے مددگاروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں تم میں سے کسی کو پہچان نہ لیں، اس لیے میں نے ان کے سامنے تم سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن تمہارے چہرے دیکھ کر بغیر میں تم سب کو

کرنا چاہتا ہوں۔“

عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا۔ شام کے قریب جب بے کرشن کے آدمیوں نے محل پر حملہ کیا تھا تو چند آدمی مکان کی چھت پر کھڑے پیردنی دیوار پھانڈنے کی کوشش کرنے والوں پر تیر برسا رہے تھے اور باقی محل کے دونوں دروازوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ شکستہ تلوار ہاتھ میں لیے محل کی چار دیواری کے اندر چاروں طرف بھاگ بھاگ کر سپاہیوں کو جوش دلاد ہی تھی۔ سورج غروب ہونے تک محل کے مٹی بھر پر بیادوں نے انہیں روکے رکھا۔ ہمیں یہ امید تھی کہ گاؤں کے لوگ ہماری مدد کیلئے آئیں گے لیکن بے کرشن کی فوج کا ایک دستہ گاؤں پر بھی حملہ کر چکا تھا اور گاؤں کے لوگوں نے جو آپ کے پتا جی کی موت کے باعث جی ہار چکے تھے۔ معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ سورج غروب ہوتے ہی دشمن نے محل کے چاروں طرف سے بلے بول دیا اور پہلے حملے ہی میں کئی آدمی دیوار پھانڈ کر محل کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے ہمارے سپاہیوں کو ایک طرف دھکیل کر بڑا دروازہ کھول دیا، چند سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے لیکن باقی ابھی تک اندرونی دیواروں کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں آدمیوں کی چیخ اور پکار کے درمیان کبھی کبھی شکستہ کی آواز بھی سنائی دیتی تھی جو آدمی چھت پر سے تیر برسا رہے تھے ہمارے ساتھ آئے اور ہم نے ایک زبرداد حملے سے دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیے لیکن ہماری تعداد ہر لمحہ کم ہو رہی تھی۔ دشمن نے ہمیں جلد مغلوب کر لیا۔ میں زخمی ہونے کے بعد مشرقی دروازے کی طرف بھاگا۔ وہاں ہمارے چند آدمی ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اور دشمن کا گردہ جو شاید تاریکی میں حملہ کرنے سے گھبرا رہا تھا کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں لٹکا رہا تھا۔ میں تاریکی میں دشمن کی نگاہوں سے بچتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملا۔ تھوڑی دیر بعد

اور اس کے دونوں ہاتھ کشتی کے پریشانہ حال علاج کی گردن پر تھے۔

رنیر کے ساتھی بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے کشتی کے دستے کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ رنیر نے اُس کی پگڑی اس کے منہ میں ٹھونس دی اور اُسے اندھا ٹٹا دیا۔ اس کے بعد اُس نے نیچے اتر کر کشتی کو گہرے پانی کی طرف دھکیل دیا۔

رنیر کے باقی ساتھی جو تھوڑی دور چھپ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بھاگ کر اس کے ساتھ آئے۔ رنیر نے اُن سے پوچھا۔ اس وقت محل میں کتنے پہریدار ہوں گے؟“

ایک عمر سیدہ آدمی نے جو رنیر کے باپ کا پرانا نوکر تھا، جواب دیا۔ محل میں پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے لیکن گاؤں میں بے کرشن کے قریباً ڈیڑھ سو سپاہی رہتے ہیں۔ بے کرشن نے محل پر قبضہ کرنے کے بعد گاؤں کے بہت سے لوگوں کو نکال دیا تھا اور ان کے گھر اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیے ہیں۔ ہم نے صرف آپ کی خاطر یہ خطرہ مول لینے کی جرات کی ہے۔ بھگوان کے لیے آپ محل پر حملہ کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور اپنی جان کی فکر کریں۔ بے کرشن صبح ہوتے ہی اس علاقے کا چپہ پتہ چھان مارے گا۔“

رنیر نے کہا۔ میں تم لوگوں کی جانیں خطرے میں نہیں ڈال سکتا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد دوبارہ آؤں گا۔ اب میں صرف اپنے پتا اور شکستہ کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔“

دیہاتی مغموم لگا ہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رنیر نے کہا ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے کرشن کے آدمی مجھے پتا جی کے متعلق یہ بتا چکے ہیں کہ وہ قتل ہو چکے ہیں لیکن میں شکستہ کے بارے میں معلوم

اس کے پاس آئے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کی صحت ٹھیک نہ تھی۔ پھر بھی وہ صبح سویرے دو نوکرؤں کو ہمراہ لے کر وہاں چلے گئے جن میں ایک میرا بھتیجا بی بیال تھا۔ سردار انوپ چند کے باغ میں اُسی کے پروہست اور علاقے کے سرداروں کے علاوہ باہر کے چند آدمیوں کے ساتھ بے کرشن بھی موجود تھا۔

پروہست اور علاقے کے سرداروں نے آپ کے پتا کو مہاراجہ کے خلاف راہکار کی سازش میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور جواب دیا ”مسلمانوں کے خلاف ہمارے راجہ نے جو بزدلی دکھائی ہے اس کا مجھے افسوس نہیں لیکن میں باپ کے خلاف اس کے بیٹے کی سازش میں حصہ نہیں لے سکتا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کالنجراور گوالیار کی فوجیں ہمارے وطن پر چڑھائی کریں گی۔ راہکار اگر اپنے باپ کی گدی پر بیٹھنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی یہ اس کی کامیابی نہیں بلکہ کالنجراور کے راجہ کی فتح ہوگی۔ راہکار اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوگا۔ آپ اپنے راجہ کو بزدلی کا طعنہ دے سکتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جب مسلمانوں نے حملہ کیا تھا تو کالنجراور گوالیار کی فوجیں کہاں چھپ گئی تھیں۔ اگر ان میں زیادہ غیرت تھی تو وہ گھر میں بیٹھے تماشا دیکھنے کی بجائے ہمارے راجہ کی مدد کے لیے کیوں نہ آئے“

”آپ کے پتانے یہ بھی کہا۔“ اس وقت بے کرشن جیسا آدمی بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وطن کی عزت و آزادی کا سودا ہو چکا ہے۔ پہلے اس نے مہابن کے راجہ کی شہ پر ملک میں بغاوت کرانے کی کوشش کی تھی اور اب یہ ہمیں کالنجراور گوالیار کے راجاؤں کا ظلم بنانا چاہتا ہے۔ ”یہ سن کر بے کرشن خاموش نہ رہ سکا اور اس نے پتا کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ آپ کے

شکنتلا بھی دو آدمیوں کے ہمراہ آسم کے درختوں میں چھپتی ہوئی دہاں پہنچ گئی۔ میں نے تاریکی میں اس کی آواز پہچانتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے سمجھایا کہ تم باہر نکل جاؤ اب ہم بازی ہار چکے ہیں۔ اس کو نے کے سوا باقی سارے محل پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اتنے میں دشمن کے کسی آدمی نے بلند آواز میں کہا ”اب تم آٹھ دس آدمیوں کی لڑائی بے فائدہ ہے۔ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو“ لیکن ہم ہتھیار ڈالنے کی بجائے دروازہ کھولی کر باہر نکل آئے۔

دروازے سے باہر دشمن کے چند آدمی ہماری تاکہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہم پر تیربر سائے۔ ہمارے چند ساتھی وہیں ڈھیر ہو گئے لیکن اُس کے بعد دشمن نے ہمارا تعاقب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ شکنتلا میرے ساتھ باہر نکلی تھی لیکن اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ پھمن نے کسی کو دیا میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا لیکن وہ وٹوئی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شکنتلا تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھی تیراک تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے دریا عبور کر لیا ہوگا۔ میں اپنے زخموں کی وجہ سے اگلے دن تک دریا کے کنارے جھاڑیوں میں پڑا رہا۔ اس کے بعد بے کرشن کے آدمی مجھے پکڑ کر اُس کے پاس لے گئے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی اور لڑکی کو میرے بڑھاپے پر ترس آگیا اور ان کی سفارشوں سے میری جان بچ گئی۔“

زمیر نے سوال کیا۔ ”پھمن کہاں ہے؟“

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ ”وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں جا چکا ہے۔“

زمیر نے سوال کیا۔ ”پتا جی محل پر حملے سے پہلے قتل ہو چکے تھے؟“

”ہاں! انھیں دیا کے پار سردار انوپ چند کے گاؤں میں قتل کیا گیا تھا۔ سردار

انوپ چند نے انھیں یہ پیغام بھیجا تھا کہ اُسی کا پروہست اور علاقے کے سردار

گھوڑے بھی وہیں لے آؤ۔“

دوبارہ قیدیوں کے پاس جا کر رنیر نے اپنے گھوڑے کا رسا کھول کر اس کا ایک سرا زین کے ساتھ باندھا اور دوسرے سے دو قیدیوں کے ہاتھ باندھ دیے اور تیسرے قیدی کو اس نے شنبونا تھ کے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔

اس کے بعد وہ دیہاتیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”اب تم جاؤ اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باقی فوج کے ساتھ جا لو۔ ان قیدیوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر میں تمہارے ساتھ آملوں گا اور دیکھو سرحد عبور کرنے سے پہلے تمہارے لیے دیہاتیوں کا لباس ہی ٹھیک رہے گا۔ اب جاؤ!“

دیہاتی بھائیوں میں دوپوش ہو گئے اور رنیر اور شنبونا تھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تین قیدی ان کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ اُن کا رخ دریا کے کنارے شمال کی طرف تھا۔

افنی مشرق پر صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ یہ لوگ کوئی دو کوس فاصلہ طے کر چکے تھے۔ باتیں ہاتھ ایک گھنے جنگل میں داخل ہونے کے بعد رنیر نے گھوڑا رکھا اور نیچے اتر کر یکے بعد دیگرے تین قیدیوں کو گھوڑے سے فاصلے پر باندھ دیا۔

دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اُسے اپنی منزل مقصود کا علم نہ تھا وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ صبح کی روشنی میں یہ جنگل اس کے لیے زیادہ محفوظ ہے۔ شنبونا تھ نے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

رنیر نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ ”تم بتا جاؤ اور شکنتلا کے متعلق سن چکے ہو؟“

”ہاں میں سب کچھ سن چکا ہوں۔“

پتانے طیش میں آکر تلوار نکال لی۔ بچے کرشن پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ آپ کے پتا تھوڑی دیر لڑنے کے بعد زخمی ہو کر گر پڑے اور بچے کرشن نے انہیں دوبارہ اٹھنے کا موقع نہ دیا۔ انوپ چند کے اشارے سے اس کے آدمیوں نے ان کے لوگوں پر حملہ کر دیا جو قریب ہی گھوڑوں کے پاس کھڑے تھے۔ کالو مارا گیا لیکن بچے دیال گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ آیا۔

”اس واقعے سے اٹھارہ دن بعد ہم نے مہاراجہ کے قتل اور راجکمار کے گدی پر بیٹھنے کی خبر سنی۔ پھر دس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ بچے کرشن نے نئے راجہ سے اپنی پرانی جاگیر پر قبضہ کرنے کی اجازت لے کر ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔“

رنیر نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ بچے کرشن کے آدمی شکنتلا کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے؟“

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ ”ہاں ابچے کرشن نے شکنتلا کی تلاش سے باہر ہو کر اس کا پتہ دینے والے کے لیے انعام مقرر کیا تھا، لیکن کسی کو اس کا سراغ نہیں ملا۔“

ایک دیہاتی نے کہا۔ ”مہاراج! اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ آپ جلدی کریں۔“

رنیر نے کہا۔ ”میں قیدیوں کو کچھ دور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ انہیں کسی ایسی جگہ چھوڑنا ضروری ہے جہاں دیر تک انہیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔ اس طرح ہمیں کافی وقت مل جائے گا۔ اب مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں قیدیوں کے سامنے تمہیں ایسی ہدایات دوں گا جن سے ان پر یہ ظاہر ہو کہ تم ہمارے ساتھ آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی جا رہے ہو لیکن تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ مجھ سے رخصت ہوتے ہی سیدھے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ اب میرے ساتھ آؤ اور

رنیر نے اپنا گھوڑا بکے ہوئے کہا۔ ”شعبو! تم اپنا گھوڑا وہاں لے جانے کی بجائے جنگل میں چھوڑ دو۔ تمہارے لیے چند دن لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر رہنا بہتر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جے کرشن ہماری تلاش میں یہ تمام علاقہ پھان مارے گا۔“

شعبو نا تھنے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔ میں بھیس بدل کر لوگوں کی نگاہوں کو دھوکا دینا سیکھ چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے متعلق پریشانی ہے۔“

رنیر نے کہا۔ ”میں سیدھا سردار پورن چند کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بتا جی کا پرانا دوست ہے، اگر وہ کوئی اور مدد دے سکا تو کم از کم مجھے تازہ دم گھوڑا دینے سے انکار نہیں کرے گا۔ اس کے بعد میں گوالیار جاؤں گا۔ وہاں کے ایک سردار کا بیٹا میرے ساتھ نندنہ کے قلعے میں قید تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے میں گوالیار کے راجہ کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کر سکوں گا۔“

شعبو نا تھنے کہا۔ ”تو وقت ضائع نہ کیجیے۔ پورن چند کا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے اور آپ کا گھوڑا جواب دے چکا ہے۔“

رنیر اور شعبو نا تھ یہاں سے جدا ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ اور خطرے سے دور ہو گئے۔

رنیر نے کہا۔ ”اب شکنتلا کی تلاش کے سوا میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں میں اُسے جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں میں تلاش کر دوں گا، میں اُسے جھونپڑوں، محلوں اور مندروں میں ڈھونڈ دوں گا۔ مجھے ہر وقت شکنتلا کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں گی اور میں کبھی چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

شعبو نا تھ نے کہا۔ ”آپ میری ایک بات مانیں گے؟“

”وہ کیا؟“

”دیکھیے، شکنتلا اگر آس پاس ہوتی تو علاقے کے لوگ اب تک اُسے ڈھونڈ نکالتے۔ وہ ضرور کہیں دور جا چکی ہے۔ آپ پڑوس کی ریاستوں میں اُسے تلاش کریں اور تمام راجاؤں اور بڑے بڑے راجپوت سرداروں سے ملیں۔ آپ کے پتا کو کون نہیں جانتا، پھر آپ نے پانچ سال مسلمانوں کی قید میں گزارے ہیں۔ ملک کے ہر راجہ اور سردار کے دل میں آپ کی عزت ہوگی۔ وہ آپ کی ضرور مدد کریں گے۔ ممکن ہے کہ شکنتلا ان میں سے کسی کی پناہ میں ہو لیکن قنوج اور باری میں آپ آزادی سے نہیں پھر سکتے۔ جے کرشن کے آدمی ہر وقت آپ کی کھوج میں ہوں گے۔ اپنے دلیں میں ایک سادھو کا بھیس بدل کر میں اُسے تلاش کر دوں گا۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہوگا۔ اس جنگل سے آگے ایک گاؤں ہے جہاں میرے ماموں زاد بھائی رہتے ہیں۔ اگر مجھے شکنتلا کا کوئی پتہ چلا تو میں اُن کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

رنیر نے مڑ بھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شعبو نا تھ! ابھی میرا دماغ کام نہیں کرتا۔“

جنگل عبور کرنے کے بعد رنیر اور شعبو نا تھ اپنے سامنے ایک چھوٹی سی بستی دیکھ رہے تھے۔ شعبو نا تھ نے کہا۔ ”وہ میرے ماموں کے لڑکوں کا گاؤں ہے۔“

”تم نے گاؤں کے آدمیوں کو کہیں یہ تو نہیں بتا دیا کہ میرے نوکر ایک آدمی کو قتل کرنے کے لیے پیادے گئے ہیں؟“

”نہیں مہاراج!“

”سچ کہو۔“

”سچ کہتا ہوں مہاراج۔“

”تم خود پارکیوں نہیں گئے؟“

”مہاراج! آپ نے حکم دیا تھا کہ میں اسی کنارے سے دیکھ فوراً واپس آ جاؤں۔“

”کشتی ڈوب تو نہیں گئی؟“

”مہاراج! میں یہ سکنے کو ہی تھا۔ کشتی بہت خراب تھی۔ اگلے نو آدمیوں کا اس پر سوار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔“

”اے مرمت کیوں نہیں کرایا گیا۔ میں نے پیادے لال سے کہا تھا کہ وہ کشتی کو فوراً ٹھیک کر آئے۔“

”مہاراج! اس نے بڑھتی کو میرے سامنے کہا تھا لیکن ابھی تک اس نے کچھ نہیں کیا۔“

”بلاؤ بڑھتی کو۔ جلدی کرو۔“

نوکر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور بے کراشی نے اضطراب کی حالت میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چار اور نوکر محل میں داخل ہوئے۔ بے کراشی کے قریب کھڑے ہونے والے نوکروں میں سے ایک نے کہا۔ ”مہاراج! وہ آگئے!“

بے کراشی چھٹی گھنٹا ہوا آگے بڑھا اور گرتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟“

تلاش

جے کرشن محل کے کشادہ صحن میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی پھڑی تھی۔ چند نوکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ جے کرشن نے غضب ناک بیگاہوں سے ایک نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے انھیں گاؤں میں بھی تلاش کیا ہے؟“

”ہاں مہاراج! گاؤں کے کسی آدمی نے انھیں نہیں دیکھا۔“

”اگر کشتی بھی اس کنارے پر نہیں تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ گھرے ابھی تک دریا کے پار بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”لیکن مہاراج! سمجھے اس کنارے پر بھی کوئی کشتی دکھائی نہیں دی۔“

جے کرشن نے جلا کر کہا۔ ”تو پھر کشتی کہاں گئی؟“

نوکر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میرا خیال ہے کہ انھوں نے دوسرے کنارے پہنچ کر کشتی کو کسی چیز سے باندھنے کی بجائے کھلا چھوڑ دیا ہوگا اور وہ بہہ گئی ہوگی۔ میں نے پچھلے گھاٹ سے گاؤں والوں کی کشتی میں ایک آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی پتہ کر کے آجائے گا۔“

ایک نوکر بولا "مہاراج! ہم اس پار کشتی....."

جے کرشن نے اسے اپنا فقرہ پورا کرنے کی مہلت نہ دی اور چلا کر کہا "بد سائن! یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم اس کشتی پر گئے تھے لیکن تم نے اتنی دیر کیوں کی؟ اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"معلوم نہیں مہاراج! ہم نے پار پہنچتے ہی کشتی بھیج دی تھی۔"

"کہاں"

"اس پار مہاراج!"

"اس پار اُس پار۔ کیا بک رہے ہو تم؟"

سپاہی نے بدحواس ہو کر کہا "مہاراج! ہم ان کے لیے کشتی بھیج کر انتظار کرتے رہے لیکن بھگوان جانے وہ کیوں نہ آئے اور کشتی کہاں غائب ہو گئی۔"

اس مرتبہ جے کرشن نے چلانے کی بجائے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے آگے بڑھ کر سپاہی کو دو تین چھڑیاں برسید کر دیں اور اس کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہر کر بولا "اور تم میری طرف آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو، کہتے کیوں نہیں، کس کا انتظار کرتے رہے تم اور کون نہیں آیا؟"

دوسرے نے سہمی ہوئی آوازیں کہا "مہاراج! دریا کے کنارے پہنچ کر پائے لال نے سوچا کہ ہم تمام آدمیوں کا ایک ہی پھیرے میں پار جانا ٹھیک نہیں، اس لیے اس نے بھگت رام کے ساتھ ہم چار آدمیوں کو پہلے بھیج دیا۔ ہم نے پار پہنچتے ہی بھگت رام کو کشتی پر واپس بھیج دیا تاکہ باقی آدمیوں کو لے آئے، لیکن وہ نہ آئے انھوں نے کشتی بھی واپس نہ بھیجی اور ہم دریا کے پار ان کا انتظار کرتے رہے۔ کافی دیر بعد مجھے اس پار کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی جہیز ہتی ہوئی نظر آئی۔"

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ شاید کشتی نیچے کی طرف جا رہی ہے لیکن ان کا خیال تھا کہ وہ کشتی نہیں کچھ اندر ہے۔"

جے کرشن نے پوچھا "اب تک تم نے قیدی کو قتل کیا ہے یا نہیں؟"

"مہاراج! قیدی، پیادے لال، جے چند اور متی رام کے ساتھ اس کنارے پر تھا۔"

"میں پوچھتا ہوں تم قیدی کو تین آدمیوں کی حفاظت میں چھوڑ کر کیوں گئے؟"

"مہاراج! یہ پیادے لال کا حکم تھا اور قیدی رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہ تھا۔"

جے کرشن نے غصے سے کانپتے اور چھڑی گھماتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم سب گدھے ہو۔ میں تم سب کو پھانسی پر لٹکا دوں گا اور اب تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ اور انھیں دریا کے اُس پاس ہر جگہ تلاش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ رنیر محل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے چند ساتھیوں کو باہر کھڑا کر آیا ہو اور اُسے پیادے لال سے چھڑا کر لے گئے ہوں۔ اگر تمہیں قیدی کی لاش نہ ملی تو پیادے لال اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں فردِ طنی چاہیں۔ جاؤ انھیں تلاش کرو۔"

نوکر بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے اور جے کرشن نے پھر اسی طرح ٹھٹھنا شروع کر دیا۔ رنیر کے بچ بچنے کے تصور سے اس کا غصہ اور اضطراب خوف میں تبدیل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھگت رام شرقی دروازے سے نمودار ہوا اور جے کرشن اُسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر چلایا "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ گویا کہاں ہے؟"

"مہاراج!" اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا "انھوں نے مجھے باندھ کر کشتی میں ڈال دیا تھا اور مجھے یہاں سے تین چار کوس نیچے ایک چرواہے نے کشتی سے

مہاراج وہ پیارے لال، سینا رام اور بے چند کے سوا ادکون ہو سکتے تھے؟
 ”پاجی، نمک حرام، میں انھیں کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ میرا گھوڑا تیار
 کرو اور گاؤں میں میرے تمام سپاہیوں کو حکم دو کہ وہ اپنے گھوڑوں پر فودا یہاں
 پہنچ جائیں۔“

(۳)

جے کرشن محل سے باہر سواروں کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف سمتوں کو
 روانہ کر کے خود تیس سواروں کی معیت میں شمال کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں سے کوئی
 ڈیڑھ کوس دور اُسے پیارے لال اور اس کے دو ساتھی اپنی طرف آتے دکھائی
 دیے۔ جے کرشن نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے ان کی آن میں
 ان کے گرد گھیر ڈال دیا۔

”قیدی کہاں ہے؟“ جے کرشن نے ان کے قریب اپنا گھوڑا دسکتے ہوئے
 کہا۔

”مہاراج! قیدی جا چکا ہے۔“

”کہاں!“

”جہاں اس کی فرج تھی مہاراج!“

جے کرشن نے گھوڑے سے کود کر پیارے لال کو مید کی پھڑی سے بے تحاشا
 پینا شروع کر دیا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ”مہاراج! دیا کیجیے، ہم بے قصور ہیں۔ اس کے
 ساتھ ایک پورا لشکر تھا۔ مہاراج! وہ بہت تھے۔ وہ گاؤں پر حملہ کرنے
 کے لیے آئے تھے۔ ہائے مرگیا۔ بھگوان کے لیے معاف کر دیجیے۔ مہاراج! چند
 اور ستیادام سے پوچھ لیجیے۔“ اب جے کرشن بے چند اور ستیادام پر لوٹ پڑا۔ جب

نکالا ہے۔“

”تمہیں کس نے باندھ کر کشتی میں ڈالا تھا؟“

”قیدی نے مہاراج!“

”کہاں؟ کب؟“

”مہاراج! میں پہلے ان چار آدمیوں کو کشتی پر لے کر دوسرے کنارے“

جے کرشن نے تکرار اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بکواس میں باریبار نہیں

سننا چاہتا تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔“

”میں آپ ہی کے سوال کا جواب دے رہا ہوں مہاراج! پیارے نے مجھے

کہا کہ کشتی خراب ہے اس لیے پہلے....“

جے کرشن نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان تمہارا استغیا ناس
 کرے۔ اچھا بکتے رہو۔“

بھگت رام نے کہا۔ ”مہاراج! میں نے پہلے ان چار آدمیوں کو پار پہنچا دیا۔ پھر
 جب میں پیارے لال، جے چند، ستیادام اور قیدی کو لینے آیا تو انھوں نے مل کر
 میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور کشتی کو گھرے پانی میں دھکیل دیا۔“

”انھوں نے، کس نے؟“

”مہاراج! پہلے مجھ پر قیدی نے حملہ کیا۔ پھر وہ بھی اپنے منہ ڈھاٹوں میں چھپا
 کر اس کے ساتھ مل گئے۔“

”کون! پیارے لال اور اس کے ساتھی؟“

”ہاں مہاراج! وہاں اور تو کوئی تھا ہی نہیں۔ قیدی مزے سے پانی میں کھڑا
 منہ دھو رہا تھا اور وہ کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب قیدی نے مجھ پر حملہ کیا تو
 وہ بھی بھاگ کر آگے۔ ڈھاٹوں کی وجہ سے میں ان کی شکلیں تو نہیں دیکھ سکا لیکن

پیارے لال نے جواب دیا: ”مہاراج! ہم نے آٹھ دس آدمیوں سے زیادہ نہیں دیکھے لیکن اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے۔“ جے کرشن چلایا۔ ”تم بالکل گدھے ہو۔ اس نے تمہیں اوبھانے کے لیے یہ بات کہی ہوگی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی دُور سے ایک فوج لے کر آیا ہو اور نندنہ سے لے کر یہاں تک راستے میں کسی کو خیر نہ ہوئی ہو۔ پھر اگر اس کے پاس اتنی فوج تھی تو اس نے محل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے ساتھ صرف وہی آدمی ہوں گے جو تم نے دیکھے ہیں۔“

ایک سوار نے کہا: ”مہاراج! آپ تسلی رکھیں، ہم انہیں ابھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

لیکن جے کرشن صرف اپنی قوت کے بل بوتے پر جنگل میں پاؤں رکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے چند سواروں کو اس پاس کے سرداروں کی طرف یہ پیغام دے کر روانہ کیا کہ ”محمود غزنوی کے چند جاسوس جنگل میں پھیسے ہوئے ہیں۔ اس لیے تم سب اپنی اپنی فوج لے کر پہنچ جاؤ۔“ اس کے بعد اس نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم صرف ابھی جنگل کے ارد گرد پہرہ دیتے رہو۔ وہ لوگ اگر اب تک جنگل عبور نہیں کر چکے تو رات سے پہلے باہر نہیں نکلیں گے۔ اتنی دیر میں یہاں تمام علاقوں کے آدمی جمع ہو جائیں گے اور ہم اگر آج شام تک نہیں توکل پو پھٹتے ہی جنگل میں ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اگر تم میں سے کسی کی غفلت کے باعث وہ لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں سخت سزا دوں گا۔ تم جنگل کے آس پاس ہر کسان اور ہر چرواہے سے اس کا پتہ دریافت کرتے رہو۔ میں احتیاط کے طور پر گاؤں اور محل کی حفاظت کا انتظام کر کے واپس آتا ہوں اور پیارے لال تم میری بات کان کھول کر سن لو اگر اب تم نے کوئی بیوقوفی کی تو میں تمہیں اسی جنگل

اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو پیارے لال نے اس کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا: ”مہاراج! ددیا کے کنارے ہم پر ان کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ ہم نوا میں بھی نہ نکال سکے۔ وہ ہمیں گرفتار کر کے جنگل میں لے گئے اور وہاں ہمیں درختوں سے باندھ دیا۔ ہمارے منہ پر کپڑے باندھ دیے گئے تھے تاکہ ہم کسی کو آواز نہ دے سکیں۔ ابھی ایک چرواہا اس طرف آنکلا اور اس نے ہمیں آزاد کیا۔“

”تم بھوٹ بولتے ہو، تم اس کے ساتھ مل گئے تھے اور اسے بھگا دینے کے بعد اب تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ میں تم سب کو زندہ زین پر گاڑ دوں گا۔ سچ کو تم نے قیدی کو کہاں بچھپایا ہے؟“

”مہاراج! بھگوان کی سوگند! میں سچ کہتا ہوں۔ آپ چرواہے سے پوچھ لیں۔ وہ ابھی تک وہیں ہو گا۔“

جے کرشن نے قدرے توقف کے بعد پوچھا: ”اگر تم سچ کہتے ہو تو بتاؤ قیدی کس طرف گیا ہے؟“

”مہاراج! ان کے پاس گھوڑے تھے اور وہ جنگل میں روپوش ہو گئے ہیں۔ ہمیں گرفتار کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ تم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باقی فوج کے ساتھ جا ملو۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ اور ایک اور آدمی ہمیں گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر جنگل کی طرف لے گئے۔ مہاراج! اگر اس کی فوج کہیں نہیں جا چکی تو جنگل میں ہوگی۔ مہاراج! وہ اس علاقے میں دیہاتیوں کا بھیس بدل کر پھر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی وقت اچانک ہم پر حملہ نہ کر دیں۔“

جے کرشن نے سوال کیا: ”تمہارے خیال میں اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوں گے؟“

کے کسی درخت پر لٹکا دوں گا۔ تم کسی سے گھوڑا لے لو اور ابھی دو تین سواروں کے ساتھ جنگل کی دوسری طرف پہنچ کر اس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو خبردار کرو اور انھیں یہ بتاؤ کہ میں رنیر اور اس کے ساتھیوں کو زندہ پکڑنے یا قتل کرنے والے کی جھوٹی سونے چاندی سے بھردوں گا؟

(۳)

دن ڈھلے پیارے لال اور بھگت رام جنگل کے قریب ایک کھیت میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے دائیں اور بائیں دیہات کے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ادھر ادھر چکر لگا رہی تھیں۔ پیارے لال نے بھگت رام سے کہا۔ ”بھگت رام! ہماری مصیبت کی دوسری رات شروع ہونے والی ہے۔“

بھگت رام بولا۔ ”یہ رات تو یہ بھی گزر جائے گی لیکن مجھے صرف اس بات کا ڈر ہے کہ اگر صبح کو بھی ان کا پتہ نہ چلا تو تمھارا کیا بنے گا؟“

”اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگل میں ٹھہرے ہی نہ ہوں۔“ بھگت رام نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ دیہاتیوں کے بھیس میں نکل جائیں اور کسی کو ان پر شک نہ ہو۔ آج رات کے وقت جنگل کے چاروں طرف پرا دینا آسان کام نہیں۔“

”تمھارا مطلب یہ ہے کہ مجھے آئندہ اس علاقے کے ہر آدمی کی غلطی کی سزا ملا کرے گی۔“

”دوست بات یہ ہے کہ تمھیں سردار کے سامنے رنیر کی فوج کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب تمھیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ رنیر کے ساتھ سچے ایک فوج تھی۔“

پیارے لال بے کمرش کے تمام نوکروں سے زیادہ معتبر تھا اور عام حالات میں وہ باقی نوکروں سے ایسی باتیں سن کر آپس سے باہر ہو جایا کرتا تھا لیکن گزشتہ چھ پر کے واقعات سے اس کے مزاج میں ایک غیر متوقع تبدیلی آچکی تھی۔ بھگت رام کے طنز پر اس نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”بھگت رام! تمھیں خوش نہیں ہونا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اگر سردار مجھے دن میں بیس مرتبہ برا بھلا کہے گا تو چھ سات بار تمھاری شامت بھی آئے گی۔“

بھگت رام خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک دیہاتی کو آواز دے کر پوچھا۔ ”ارے بھائی! یہاں کہیں پانی ہے یا نہیں؟“ دیہاتی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”پانی کے لیے آپ کو ندی پر جانا پڑے گا۔“

”ندی کتنی دور ہے؟“ اس نے سوال کیا۔ ”زیادہ دور نہیں۔ میرے خیال میں آدھ کو س سے بھی کم ہوگی۔“ پیارے لال نے اُسٹھے ہوئے کہا۔ ”یار پیاس سے تو میرا بھی بُرا حال ہو رہا ہے چلو، ہم گھوڑوں پر جلد واپس آجائیں گے۔ ابھی وقت ہے، ورنہ ہمیں ساری رات یہاں سے ہلنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

بھگت رام نے اُٹھ کر اپنے گھوڑے کی لگام سنبھالی اور دیہاتی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”دیکھو، تم چوکس رہو۔ اگر کوئی ہمارے متعلق پوچھے تو کہہ دینا کہ ہم جنگل کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر میں پیارے لال اور بھگت رام گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہ نیچے اتر کر پانی پینے کے بعد گھوڑوں پر سوار ہوئے تھے کہ سامنے کے کنارے سرکنڈوں میں ایک اجنبی آدمی دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی تھی جو بڑی مشکل سے آہستہ

چڑا سینہ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ کر آیا ہے یا لڑنے جا رہا ہے۔ اُس کی پکڑی کا رنگ شاید گلابی تھا۔

”تم نے اس کے ساتھ کسی اور کو بھی دیکھا ہے؟“

”نہیں!“

”تم نے اُسے کس وقت دیکھا تھا؟“

”دوپہر سے کچھ دیر بعد“

”تم نے اس سے پہلے یا اس کے بعد اپنے راستے میں کسی جگہ ایسے آدمیوں کی ٹولی تو نہیں دیکھی جنہوں نے اپنے منہ پر ڈھالے باندھ رکھے ہوں؟“

”نہیں!“

بھگت رام نے کہا: ”تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم خود اُس کے ساتھ نہیں تھے؟“

اجنبی اس سوال کے جواب میں پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پیارے لال نے گرج کر کہا: ”دیکھو! اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو بتاؤ زہیر کہاں ہے؟“

”زہیر کون؟“ اجنبی نے اور زیادہ بدحواس ہو کر کہا۔

پیارے لال نے پھر پوچھا: ”رات کے وقت تم اس کے ساتھ تھے۔ تم نے اپنے منہ پر ڈھانا باندھ رکھا تھا اور اب تم ہمیں دھوکا دے کر کسی اور طرف بھیجنا چاہتے ہو تاکہ وہ بچ کر نکل جائے لیکن یاد رکھو! اگر وہ صحیح سلامت نکل گیا تو ہم تمہیں زندہ جلادیں گے۔“

اجنبی اب یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ دو پاگل آدمیوں کے درمیان کھڑا ہے اور بولنا شاید اس کے لیے سودمند ثابت نہ ہو لیکن جب پیارے لال اور بھگت رام نیچے آکر کھڑے ہوئے اس کے ہاتھ باندھنے لگے تو وہ بلبلا اٹھا۔ ”بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ

آہستہ اجنبی کے پیچھے قدم اٹھا رہا تھا۔ پیارے لال اور اس کا ساتھی واپس مڑنے کی بجائے وہیں ٹھہر کر اجنبی کی طرف دیکھنے لگے۔ گھوڑے کی چال اُس کی جھوک پیاس اور تھکاوٹ کی آئینہ دار تھی۔ ندی کے قریب پہنچ کر اس نے چند قدم تیز سے اٹھائے اور پانی میں منہ ڈال دیا۔

پیارے لال نے اپنے ساتھی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں گھوڑوں کو اڑا لگا کر ندی کے پار پہنچ گئے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ پیارے لال نے اجنبی سے سوال کیا۔

”مہاراج! میں بہت دور سے آیا ہوں۔“

بھگت رام نے کہا: ”تمہارا گھوڑا بہت تھکا ہوا ہے؟“

اجنبی نے جواب دیا: ”یہ گھوڑا میرا نہیں۔ مجھے راستے میں ملا ہے۔ یہ گر پڑا تھا۔ اس کا سوار اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا رات کے وقت اسے درندے مار ڈالیں گے۔ اس لیے بڑی مشکل سے ساتھ لے آیا ہوں۔ ابھی مجھے دو کوس اور اگے جانا ہے۔“

پیارے لال نے پوچھا: ”تمہیں یہ گھوڑا یہاں سے کتنی دیر ملا تھا؟“

”مہاراج! یہاں سے کوئی آٹھ کوس دور ایک پہاڑی ہے۔ میں اس پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا کہ مجھے نیچے سے ایک سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا گھوڑا چلتے چلتے اچانک گر پڑا۔ سوار نے اُسے اٹھایا۔ لیکن جب وہ دوبارہ سوار ہوا تو گھوڑے میں چلنے کی ہمت نہ تھی۔ سوار مجبوراً اتر کر پیدل چل پڑا۔ میں نے اُسے آواز دی کہ اپنا گھوڑا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔“

پیارے لال نے سوال کیا: ”تم اس سوار کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”ہاں! وہ ایک خوب صورت جوان تھا۔ سفید رنگ، مجھ سے ذرا لمبا تھا۔“

گھوڑے نے نیچے گھسٹنا اور بے کرشن کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا: "مہاراج! ہم نے ان کا ایک ساتھی پکڑ لیا ہے۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ میں اُن کا ساتھی نہیں ہوں۔"

"تم اسے کہاں سے لائے ہو؟" بے کرشن نے سوال کیا۔

"مہاراج! یہ ہمیں ندی کے کنارے ملا تھا۔"

بے کرشن چلا اٹھا۔ "میں نے تمہیں ہدایت کی تھی کہ تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔" بھگت رام نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مہاراج! اگر ہم نے کوئی غلطی کی ہو تو ہمیں آپ بعد میں بھی سزا دے سکتے ہیں لیکن یہ آدمی کہتا ہے کہ رنیر اُسے آٹھ نوکوس دور ملا ہے۔ ممکن ہے یہ جھوٹ کہتا ہو لیکن اگر سچ کہتا ہے تو رنیر کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔"

پیارے لال نے کہا: "مہاراج! ہم اُسے آپ کے پاس اس لیے لے آئے ہیں کہ آپ اسے سچ بولنے پر مجبور کر سکیں گے۔"

بے کرشن نے کہا: "تم خاموش رہو۔ بھگت رام کو بات کرنے دو۔"

بھگت رام نے مختصراً اپنی سرگزشت سنا دی تو بے کرشن نے قیدی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بتاؤ رنیر اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟ اگر تم سچ کو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، ورنہ میں تمہیں سو درج عذاب ہونے سے پہلے تمہیں ذبحہ جلا دوں گا۔"

قیدی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مہاراج! میں یہ نہیں جانتا کہ رنیر کون ہے۔"

قیدی اپنی سرگزشت سنا رہا تھا کہ چند اور سوار وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں چند ایسے سردار اور زمیندار بھی تھے جو آس پاس کے دیہات سے بے کرشن

دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے تم سے کوئی بھوٹی بات نہیں کہی۔ میں اپنی سسرال سے واپس آ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ وہاں تک چلنے کے لیے تیار ہوں۔ اس گاؤں کے لوگ گواہی دیں گے کہ میں صبح کے وقت وہاں سے روانہ ہوا تھا میں نے صرف اس گھوڑے پر ترس کھانے کی غلطی کی ہے۔ مجھے معاف کر دو، مجھے چھوڑ دو۔ اگر تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے تو میں خوشی سے تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے باندھنے کی ضرورت نہیں۔"

لیکن انھوں نے اس کی حیجھک کی پروا نہ کی اور اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ پھر بھگت رام اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پیارے لال نے اجنبی کو مہارا دے کر اس کے پیچھے بٹھا دیا۔

(۴)

جنگل کا محاصرہ کرنے والے آدمیوں کی تعداد میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ قریب ہوار کی بستیوں کے سردار اور زمیندار بے کرشن کی مدد کے لیے پہنچ رہے تھے۔ بے کرشن اپنے محل کی حفاظت کے انتظامات سے فارغ ہو کر واپس آ چکا تھا۔ بعض سرداروں کی رائے تھی کہ وہ فوراً جنگل میں پھپھے ہوئے آدمیوں کی تلاش شروع کر دیں۔ لیکن بے کرشن دریا کے پار پہنچنے والے سرداروں اور ان کے آدمیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چند با اثر زمینداروں اور سرداروں کے ساتھ جنگل کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیہاتی آدمیوں کو یہ تلقین کر رہا تھا کہ وہ ہوشیار رہیں اچانک پیارے لال اور بھگت رام کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے گھوڑا رکھا اور چلا کر بولا: "تم کہاں گئے تھے؟"

پیارے لال نے اپنے گھوڑے سے کود کر قیدی کو جلدی سے بھگت رام کے

زنیر نے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں سردار موہن چند کا بیٹا ہوں۔“

پورن چند یہ سنتے ہی زنیر کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا اور اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”اوہو! میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو۔ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟“

گزشتہ آٹھ پر کے واقعات نے زنیر کو کافی محتاط بنا دیا تھا۔ بوڑھے سردار کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اس نے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ لانے ہوئے کہا۔ ”میں نندنہ سے آیا ہوں۔ آپ کے گاؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ آپ کو دیکھتا جاؤں۔“

”تم نے بہت اچھا کیا لیکن.....“ سردار نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے پھر اپنی نگاہیں زنیر کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

زنیر نے کہا۔ ”معاف کیجیے! میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن یہاں سے تھوڑی دور میرے گھوڑے نے دم توڑ دیا تھا۔ اب مجھے ایک تازہ دم گھوڑے کی ضرورت ہے۔“

سردار نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ ”گھوڑا تمہیں مل جائے گا لیکن تمہارا اپنے گاؤں جانا ٹھیک نہیں۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے کہ میں رات کے وقت سفر کرنے کی بجائے پچھلے پر یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ویسے بھی ایک طویل سفر کے بعد میری ہمت جواب دے چکی ہے۔“

پورن چند بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زنیر کا جھوک اور تھکاوٹ سے مڑھایا ہوا ہنرہ دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور نوکروں کو فوراً کھانا لانے کا حکم

کی مدد کے لیے آئے تھے۔ ایک سردار نے قیدی کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور اپنا گھوڑا بڑھلتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ہمارے گاؤں کا آدمی ہے۔“

جے کرشن نے پیارے لال اور بھگت رام کی طرف دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

بھگت رام بولا۔ ”مہاراج! ہم ایک بے گناہ کو سزا دلانے کی نیت سے آپ کے پاس نہیں لائے لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد آپ یہ ضرور مان لیں کہ زنیر دور جا چکا ہے اور اب کسی ناخیر کے بغیر اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔“

قیدی سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جے کرشن اور اُس کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا چند سوار زنیر کا پیچھا کریں اور باقی جنگل میں داخل ہو کر اس کے ساتھیوں کی تلاش شروع کر دیں۔

پیارے لال اور بھگت رام کے ہمراہ دس سوار مغرب کی طرف روانہ ہو گئے اور وہی شخص جسے وہ پکڑ کر لائے تھے اُن کی راہنمائی کر رہا تھا اور بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش میں اس گھوڑے کو ہاتھ نہ لگاتا۔

(۵)

سردار پورن چند ایک عافیت پسند آدمی تھا۔ غروب آفتاب سے تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر میں بیٹھا اپنے پالتو طوطے سے دل بہلا رہا تھا تو نوکر نے اُسے آکر کہا کہ ایک مہمان آیا ہے اور وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ پورن چند اپنے دل پر جبر کر کے اٹھا اور مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ اُسے پریشان کرنے کے لیے نوکر کا یہی کہہ دینا کافی تھا کہ اُسے فوراً ملنا چاہتا ہے۔

اس نے زنیر کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

ذیاب۔

تھوڑی دیر بعد رنیر اپنے میزبان کے رہائشی مکان کے ایک کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا اور پورن چند بالا خانے کے ایک کمرے میں اپنی بیوی سے کمرہ رہا تھا۔ بھگوان کا شکریہ ہے کہ میرے نوکروں میں سے کسی نے اُسے نہیں پہچانا۔ درجہ کفر بہت ذلیل آدمی ہے۔ اگر اُسے پتہ چل جائے کہ موہن چند کا لڑکا میرے ہاں ٹھہرا تھا تو وہ عمر بھر کے لیے میرا دشمن بن جائے گا۔ اب مجھے اس بات کی پریشانی ہے کہ میں صبح اُسے کیسے بتاؤں گا کہ تمہارا گھر برباد ہو چکا ہے۔ کھانا کھاتے وقت میں نے کسی بار ارادہ کیا لیکن اس کی صورت دیکھ کر مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ تمام حالات جاننے کے بعد بھی سنا پند اپنے گاؤں جانے سے باز نہ آئے۔ کاش! میں اُس کی مدد کر سکتا لیکن بے کرشن جیسے آدمی کے ساتھ دشمنی مول لینا ہمارے سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔“

بیوی نے کہا: ”آپ نکر نہ کریں۔ میں اُسے سمجھا دوں گی کہ وہ چپکے سے کسی طرز نکل جائے۔“

علی الصباح سردار پورن چند اور اس کی بیوی رنیر کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ سردار کی بیوی نے کہا: ”آپ اس کے لیے گھوڑا تیار کر دیں۔ میں اُسے جگا کر سمجھاتی ہوں۔“

پورن چند نیچے اتر کر ایک کھلے صحن میں داخل ہوا تو ایک نوکر نے آگے بڑھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: ”ہمارا راج ارات کے وقت جب آپ سو رہے تھے تو ایک سوار یہاں آیا تھا اور اس نے ہم سے پوچھا تھا کہ وہ مکان جو تمہارے سردار کے پاس ٹھہرا ہوا ہے کون ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں نہیں جانتا۔ پھر وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن میں نے آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ

مجھ دراصل ماسی آدمی سے کام ہے جو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ وہ مکان خانے کی بجائے گھر کے اندر ٹھہرا ہوا ہے اور میں اس وقت وہاں نہیں جا سکتا۔ تم رات ہمارے پاس بسر کرو۔ صبح اس سے مل لینا لیکن اس نے کہا کہ مجھے بہت دور جانا ہے۔ جب وہ باہر نکل گیا تو میں نے پھاٹک سے بھانگ کر باہر دیکھا۔ تھوڑی دور دو اور سوار کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے پھر ایک طرف نکل گئے۔ مجھے ان پر شک ہوا اور میں نے تمام نوکروں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد گاؤں کا چکر لگایا اور گاؤں والوں کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ رات کے وقت ہوشیار رہیں۔ گاؤں کے چند آدمیوں نے مجھے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے تین سوار ان سے پوچھ رہے تھے کہ تم نے اس گاؤں میں کسی اجنبی کو تو نہیں دیکھا؟“

”تم نے بہت بُرا کیا۔ مجھے فوراً خبر کر دینی چاہیے تھی۔ اب جلد اصطبل سے ایک گھوڑا لے آؤ۔“ یہ کہہ کر پورن چند بھاگتا ہوا رنیر کے کمرے میں پہنچا اور ہانپتے ہوئے کہا: ”رنیر! تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ رات کے وقت چند سوار تمہاری تلاش میں آئے تھے۔ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔“

سردار کی بیوی نے آگے بڑھ کر کہا: ”رنیر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ بے کرشن کے آدمی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں لیکن اب رنیر کی جان بچانا ہمارا فرض ہے۔“

پورن چند نے رنیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم اپنے گاؤں گئے تھے؟“

”ہاں! میں موت کے منہ سے نکل کر آیا ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ بے کرشن کے آدمی میری تلاش میں یہاں تک آپہنچے ہیں۔“

”اگر تم بے کرشن کے ہاتھ سے بچ کر نکل آئے ہو تو یقین رکھو کہ اب تک

اس کے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دور ایک موڑ سے آگے دو تنگ گلیاں نکلتی تھیں۔
 رنیر کو ایک گلی میں گھوڑوں کی ٹاپ سنا دی تو وہ فوراً دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔
 تھوڑی دیر بعد جب وہ اس گلی سے نکل کر ایک کھلی جگہ پہنچا تو سامنے تین سوار
 کانوں میں تیر چڑھائے کھڑے تھے۔ اس نے ذہن کے ساتھ لپٹ کر تیروں
 کی زد سے بچنے کی کوشش کی۔ دو تیر اس کے اوپر سے نکل گئے اور ایک تیر اس
 کے کندھے کے قریب بازو کی جگہ چھیدا ہوا گزر گیا۔ پھر آن کی آن میں ایک سوار
 اس کی زد میں آ گیا۔ رنیر نے تلوار کے ایک ہی وار سے اُسے گھوڑے سے نیچے
 لٹھکا دیا۔ اس کے دو ساتھی ابھی تلواریں سونت رہے تھے کہ رنیر آگے نکل گیا
 پھر گلی اور گاؤں کے مختلف کونوں سے کوئی تیس سوار اس کا پیچھا کر رہے تھے۔
 قریباً دو کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد رنیر کا گھوڑا اتنا تھک کر رہا کہ
 اسے کافی دور نکل گیا تھا۔ کوئی آدھ کوس اور طے کرنے کے بعد اُسے دائیں اور
 بائیں اُسے دو چھوٹی چھوٹی بستیاں دکھائی دیں۔ سامنے ایک وسیع جنگل تھا اور
 یہی جگہ اس کی آخری امید تھی۔ وہ ایک بستی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک
 آٹھ سواروں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی۔ رنیر نے گڈ بڈی چھوڑ کر ایک طرف بکٹنے
 کی کوشش کی لیکن انھوں نے جلدی سے اس کا راستہ روک لیا۔ اب رنیر کے
 لیے کھلے میدان میں ان سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ گاؤں کی طرف
 مڑا اور ایک گھنے باغ میں سے ہوتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا۔ سواروں کی نئی ٹولی
 ابھی تک اس کے پیچھے تھی اور دائیں اور بائیں طرف سے اسے گھیرے میں لینے کی
 کوشش کر رہی تھی۔ جنگل کا وہ حصہ جہاں گھنے درخت اور بھاڑیاں رنیر کو اپنی
 پناہ میں لے سکتی تھیں، ابھی کچھ دور تھا۔ دو سوار رنیر کے دائیں ہاتھ سے چسکر
 لگاتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے اور انھوں نے اچانک مڑ کر اس پر حملہ

اس کے آدمی اس گاؤں کو محاصرے میں لے چکے ہوں گے۔ اگر تم آتے ہی مجھے نام
 واقعات بتا دیتے تو میں نے اس وقت تک تمہیں یہاں سے کوسوں دور پہنچا دیا ہوتا۔
 اب میرے ساتھ آؤ۔“

(۴)

رنیر کچھ کہے بغیر سردار کے پیچھے چل دیا۔ اصطبل کے سامنے نوکر گھوڑا لیے
 کھڑا تھا۔ رنیر نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور اپنے میزبان سے کہا: میں
 عمر بھر آپ کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکوں گا۔“
 ”میں ایک راجپوت کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ بھگوان کے لیے اب جاؤ، یہ
 باتوں کا وقت نہیں۔ اگر راستے میں کوئی تمھارا پیچھا کرے تو تم جنوب مشرق کی طرف
 جنگل میں پہنچنے کی کوشش کرنا۔“

رنیر نے گھوڑے کی رکاب پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ گاؤں میں کتوں کے بھونکنے
 کی آوازیں اور اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کی ٹاپ سنا دی دینے لگی۔ ایک آدمی پھاٹک
 کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے کہا: ”مہاراج! مسلح سواروں کی ایک ٹولی
 محل کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ چند آدمی پھاٹک پر کھڑے ہیں اور وہ دروازہ کھولنے
 کے لیے کہہ رہے ہیں۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ
 محل پر دھاوا بولنے والے ہیں۔“

”شاید وہ آگے ہیں۔“ پورن چند نے بدحواس ہو کر کہا۔

رنیر نے کسی توقف کے بغیر نیام سے تلوار نکالتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔
 جوبلی سے باہر نکلتے ہی اُسے اپنے بائیں ہاتھ ایک گلی میں چند سوار دکھائی دیے۔
 اس نے گھوڑے کو دائیں ہاتھ کی تنگ گلی کی طرف موڑ لیا۔ سوار شور مچاتے ہوئے

”سرا خیال ہے کہ باقی آدمی جنگل میں داخل ہونے سے پہلے کافی دیر سوچیں گے۔ ہم میرے پیچھے آؤ۔“ تاکہ کہہ کر اجنبی ایک طرف چل دیا اور رہبر کوئی سوال پوچھے بغیر اس کے پیچھے ہو گیا۔ تھوڑی دور ایک گھوڑا درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا! اجنبی نے گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔

کوئی آدھ کو س فاصلہ طے کرنے کے بعد اجنبی نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی اور مرکز رہبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”تمہارا گھوڑا بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب اسے اطمینان سے چلنے دو!“

کر دیا۔ رہبر نے ایک سوار کو مارا کر آیا اور دوسرا خود فرزدہ ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اتنی دیر میں باقی سات سوار اس کے گرد گھبرا ڈال کر ایک دوسرے کو پھیل کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔

ایک سوار نے کہا: ”اب تم بچ کر نہیں جا سکتے۔ تلوار پھینک دو۔“
”تم میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو مجھے تلوار پھینکنا ہوا دیکھیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے رہبر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک طرف حملہ کر دیا۔ اس کی زد میں آنے والا سوار اپنا گھوڑا بھگا کر ایک طرف ہٹ گیا اور رہبر چند گز آگے نکل گیا۔ سوار ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے پھر اس کا تعاقب کرنے لگے۔
ایک سوار نے رہبر کے قریب پہنچ کر پہلو سے نیزہ مارنے کی کوشش کی، لیکن سامنے کسی جھاڑی کی اوٹ سے ایک سنسانا ہوا تیرا آیا اور سوار کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے چند اور تیرائے اور تین اور سوار گھائل ہو گئے۔ باقی سواروں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں اور جیتھتے چلائے جنگل سے باہر نکل گئے۔ اتنی دیر میں یہے کرشن کا باقی لشکر جنگل کے قریب پہنچ چکا تھا اور پیارے لال اس لشکر کے سالار کی حیثیت سے یہ خبر سن رہا تھا کہ دشمن تنہا نہیں۔ اس جنگل کے ہر درخت کے پیچھے اس کے تیر انداز چھپے ہوئے ہیں۔

رہبر اپنا گھوڑا روک کر حیرت و استعجاب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان کمان ہاتھ میں لیے ایک جھاڑی سے نمودار ہوا اور مسکراتا ہوا رہبر کی طرف بڑھا۔

”تمہارے پیچھے اور کتنے آدمی ہیں؟“ نوجوان نے سوال کیا۔

”کوئی تیس چالیس کے قریب ہوں گے۔“ رہبر نے جواب دیا۔

نیا ساسا مٹی

کوئی منزل نہیں۔ جس کی تمام دلچسپیاں صرف زندہ رہنے تک محدود ہیں۔ صرف موت کا خوف میرا دائمی رفیق ہے اور اپنی زندگی کے اُداس، مغموم اور نہ ختم ہونے والے راستوں پر مجھے کوئی ساتھی نہیں ملے گا۔ جنگل میں اپنے دشمنوں سے پیچھا پھڑانے کے بعد جب آپ میرے پیچھے چل دیے تو ہر آن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ آپ کسی جگہ اچانک اپنا گھوڑا رد کر کہیں گے کہ میں فلاں شہر یا فلاں بستی کی طرف جا رہا ہوں۔ آپ کا چہرہ مغموم ہونے کے باوجود بھی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ آپ کی دنیا سیری دنیا سے مختلف ہے۔ آپ کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہیں۔ کسی عالی شان محل میں آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اتنے آدمی ایک معمولی آدمی کے دشمن نہیں ہوتے۔ آپ کے دشمنوں کی طرح آپ کے دوست بھی بہت ہوں گے۔ بہر حال میں آپ کی عارضی رفاقت میں بھی ایک لذت محسوس کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے راستے میں آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کچھ دیر اور میرے ساتھ چلتے رہیں اور اب آپ کی آپ بستی سننے کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن اگر آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

دنیر نے کہا: ”میں اس ملاقات کو محض ایک حادثہ نہیں سمجھتا۔ شاید قدرت نے اپنے کسی نامعلوم مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیں مختلف سمتوں سے دھکیل کر ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے اور شاید ہمارے لیے اپنی اپنی منزل اور راستہ متعین کرنے کے لیے کچھ عرصہ ایک دوسرے کی رفاقت ضروری ہو۔ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور وہ واقعات کیا ہیں جنہوں نے آپ کو میرا ساتھی بنا دیا ہے؟“

دوپہر کے وقت دنیر اور اس کا ساتھی جنگل عبور کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑے جو تھکاوڑ اور جھوک سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ندی کے آس پاس اُگی ہوئی گھاس چر رہے تھے۔ دنیر کی سرگزشت سننے کے بعد اجنبی نے اس سے سوال کیا: ”اب آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

دنیر نے جواب دیا: ”میری منزل کوئی نہیں۔ اس وقت زندہ رہنے کی خواہش مجھے کہیں دور لے جانا چاہتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ آپ کو دیکھنے کے بعد اب تک میں نے یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور اس وقت بھی اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھتے تو میرے دل میں یہ خیال نہ آتا۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور مجھے سوچے سمجھے بغیر آپ کے پیچھے چلنا چاہیے۔“

اجنبی نے فوراً سے دنیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ عجیب بات ہے۔ میں کئی دلوں سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ دنیا میں ایک ایسا انسان ہوں جس کا

اجنبی نے وزیر کے سوالات کے جواب میں اپنی سرگزشت سنا دی،

(۲)

یہ اجنبی رام ناتھ تھا، جس نے اپنے باپ کے قتل پر غصے سے مغلوب ہو کر ایک برہمن پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی، جسے سومنات کا بھاری ہونے کی حیثیت سے بڑے بڑے راجے واجب التعظیم خیال کرتے تھے۔ اپنے گاؤں سے فرار ہونے کے بعد رام ناتھ کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ سومنات کے بھاریوں کا عتاب مول لینے والے انسان کے لیے دیوتاؤں کی مقدس سرزمین میں کوئی جگہ نہیں۔ سومنات کی عظمت کا خوف لوگوں کے دلوں میں پہلے بھی کم نہ تھا لیکن محمود غزنوی کے ہاتھوں کئی مندروں کی تسخیر کے بعد ملک کے طول و عرض میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ان مندروں کی شکست کی وجہ یہ ہے کہ سونا کا دیوتا باقی تمام دیوتاؤں اور ان کے بھاریوں سے نادان ہو چکا ہے اور اُسے خوش کیے بغیر ہندوستان کے برہمن سردار اور راجے محمود غزنوی کو شکست نہیں دے سکتے۔

گو الیاد کے عوام کے لیے یہ خبر انتہائی پریشان کن تھی کہ ایک سنگ دل سپاہی نے سومنات کے ایک بھاری کو ہلاک کر دیا ہے۔ گو الیاد کا راجہ بھی اس واقعے کو کم پریشان نہ تھا۔ اُس نے یہ خبر سنے ہی سومنات کے بڑے پردہت کے عتاب سے بچنے کے لیے اس کی خدمات میں بیش قیمت تحائف بھیج دیے تھے اور ہمسایہ راجاؤں کی ملامت اور اپنی رعایا کے غم و غصہ کے پیش نظر یہ اعلان کر دیا تھا کہ سومنات کے بھاری کے قاتل کو زندہ پکڑنے یا گرفتار کرنے والے کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔

رام ناتھ کو آٹھ دن کے بعد اپنے گاؤں سے کسی کوس دور ایک چھوٹی سی

بستی میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ سومنات کے بھاری کی موت کی خبر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی ہے۔ اب اُسے فوراً گو الیاد کی سرحد عبور کرنے کی فکر ہوئی۔ شہروں اور بستیوں کے قریب جاتے ہوئے اُسے ہمیشہ اس بات کا خطرہ رہتا کہ اس کا کوئی نہ کوئی جان پہچان والا اچانک اُس کی طرف دیکھتے ہی چلا اُٹھے گا۔ یہ رام ناتھ ہے۔ میں جانتا ہوں، اسے پکڑ لو۔

ایک شام وہ سرحد کے قریب رات گزارنے کی نیت سے ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ گاؤں کے دھرم شالہ میں چند اور مسافر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان نے ہورام ناتھ کے ساتھ فوج میں رہ چکا تھا اسے دروازے پر دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ”آپ یہاں کیسے آئے؟“ نوجوان نے حیران ہو کر کہا۔

رام ناتھ نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں متھرا جا رہا ہوں۔ وہاں میں نے ہنومان جی کے مندر میں منت مانی تھی۔“

نوجوان نے کہا۔ ”یہ عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ وہاں میرے چند رشتہ دار ہیں۔ مسلمانوں کے حملے کے بعد ان کے متعلق کوئی خبر نہیں آئی۔ آپ کا گاؤں سومنات کی جاگیر میں ہے نا؟“

”ہاں!“ رام ناتھ نے قدرے پریشان ہو کر جواب دیا۔

”تو آپ نے یہ خبر سنی ہوگی کہ اس علاقے میں کسی نے سومنات کے ایک بھاری کو قتل کر دیا ہے۔“

رام ناتھ نے اور زیادہ پریشان ہو کر جواب دیا۔ ”میں نے راستے میں یہ خبر سنی تھی۔“ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے آپ پر شک نہیں کیا۔ میں تو ایک گاؤں میں پھنس گیا تھا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

خطرے سے خالی نہیں لیکن شاید کچھ عرصہ کے بعد لوگ ہجاری کے قتل کا واقعہ بھول جاتیں اور وہ وہاں جا سکے۔

ہمایہ کے دامن کی کسی دور افتادہ ریاست میں پناہ لینے کی نیت سے رام ناتھ نے شمال مشرق کا رخ کیا۔ ایک مرتبہ اسے ایک جنگل کے قریب رات ہو گئی اور اس نے ایک چرواہے کی جھونپڑی میں پناہ لی۔ اگلی صبح وہ جنگل کے ساتھ ساتھ مشرق کا رخ کر رہا تھا کہ اسے چند سوار ایک اور سوار کا تعاقب کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے جنگل میں داخل ہو کر ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جب سوار قریب آ گئے تو وہ جلدی سے گھوڑے سے اتر ا اور اسے کچھ درد رختوں میں باندھ دیا۔ پھر وہ واپس آ کر جنگل کے کنارے ایک بھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ یہ درنیر کی خوش قسمت تھی کہ وہ جنگل میں داخل ہوتے ہی اس طرف آ نکلا جاتا۔ رام ناتھ بیٹھا ہوا تھا اور جب اس پر آخری حملہ ہونے والا تھا تو اس کے دشمن رام ناتھ کے تیروں کی زد میں آ چکے تھے۔ ابتدا میں رام ناتھ ان لوگوں کی لڑائی میں مداخلت کی بجائے صرف چھپ کر یہ تماشا دیکھنا چاہتا تھا لیکن جب یہ لڑائی انتہائی مرطے پر پہنچ گئی تو اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ میری مداخلت ایک بہادر نوجوان کی جان بچا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر فوراً تیر چلانے شروع کر دیے۔

رام ناتھ کی سرگزشت سننے کے بعد درنیر نے کہا: ”تو آپ نے صرف اس لیے میری مدد کی ہے کہ میں اکیلا تھا اور میرے دشمن زیادہ تھے۔“

”ہاں! لیکن اس سے زیادہ مجھے آپ کی ہمت اور جرأت نے متاثر کیا تھا اگر آپ دشمن کے کہنے پر ہتھیار پھینک دیتے تو میں شاید آپ کی مدد کرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کرتا لیکن جب آپ نے انتہائی مایوسی کی حالت

”میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں سے گزر رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ اسے پکڑ لو یہ سومنات کے ہجاری کا قاتل ہے۔ چند آدمی میرے گرد جمع ہو گئے۔ خوش قسمتی سے ان میں سے ایک ہماری فوج کا سپاہی نکل آیا جو مجھ سے صرف ایک دن پہلے چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے لوگوں کو سمجھا کر میری جان چھڑائی بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے کے سردار نے لوگوں کو بلا کر سرحد کی طرف جانے والے ہر شخص کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی تھی اور لوگوں نے اس کی نڈبانی قاتل کا جو حلیہ سنا تھا وہ مجھ سے ملتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرا رنگ زیادہ سالنالا تھا۔“

رام ناتھ نے کہا: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھتے تو زیادہ شک کرتے کیونکہ میرا رنگ زیادہ سالنالا نہیں۔“

نوجوان نے غور سے رام ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”ہاں آپ کو دیکھ کر وہ زیادہ شک کرتے۔ آپ کا سینہ بھی زیادہ کشادہ ہے اور قد بھی مجھ سے ذرا لمبا ہے اور.....“

”اور میرا نام بھی قاتل کے نام سے ملتا ہے۔“ رام ناتھ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہ رات رام ناتھ نے جنگل میں گزاری۔ اگلے دن اس نے دریائے جمن عبور کیا اور قنوج کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اب اس کا خطرہ نسبتاً کم ہو چکا تھا۔ لیکن اسے اطمینان نصیب نہ ہو سکا۔ رات کے وقت وہ کساؤں یا چرواہوں کی کسی چھوٹی سی بستی میں ٹھہر جاتا اور دن بھر ویرانوں اور جنگلوں میں بھٹکتا رہتا۔ ان تلخ آیام میں صرف روپ دیتی ہی اس کا آخری سہارا تھی۔ تنہائی میں وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔ کہ زندگی کی ناہمواری اور دشوار گزار راہوں سے گزرنے کے بعد کیا وہ کسی دن اس کے پاس پہنچ سکے گا۔ سرمدست سومنات کے مندر کا رخ کرنا

کی تلاش میں ہودہ یہاں سے سینکڑوں دور سومات کے مندر میں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی لیکن جب تک ایک پجاری کی موت کا قصہ پرانا نہیں ہو جاتا، تم وہاں نہیں جاسکتے اور اس طرح نہ جانے کتنی مدت گزر جائے لیکن تمہیں بالوں نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے نہیں کہہ لیا ہے کہ تمہاری جگہ خود سومات جاؤں گا اور اگر وہاں دتی کو میں وہاں سے لانے میں کامیاب نہ بھی ہو سکا تو بھی اتنا ضرور معلوم ہو جائے گا کہ مستقبل میں تمہاری کامیابی اور ناکامی کے امکانات کیا ہیں لیکن میرے حالات اس کے برعکس ہیں۔ میرے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں ایک ایسی منزل کا راہی ہوں جس کا راستہ متعین نہیں۔ کاش مجھے صرف اتنا معلوم ہوتا کہ تسکنا کہاں ہے؟ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ جے کرشن کے خوف سے قنوج کی حدود سے باہر نکل گئی ہوگی اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے گاؤں کے حالات ضرور معلوم کرتی رہے گی۔ اگر میں اپنے گاؤں اور اپنے محل پر قبضہ کر سکوں تو اس کا پتہ لگانا میرے لیے مشکل نہ ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہی یہاں پہنچ جائے گی۔ اس مقصد کے لیے جے کرشن اور اس کے حلیف سرداروں کو مغلوب کرنا ضروری ہے لیکن میرے یہ ارادے ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ قنوج کا نیا حکمران جے کرشن کی پشت پر ہے۔ اس صورت میں جے کرشن کو وہی طاقت مغلوب کر سکتی ہے جو قنوج کی نئی حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہو۔ ارج میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں جو میری روح کی آواز اور میرے دل کی پکار ہے۔ شاید تم اسے سننے کے بعد محسوس کرو کہ تم نے مجھے اپنا دوست اور بھائی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میری آخری امید محمود غزنوی ہے۔“

رنبیر یہاں تک کہ کہ خاموش رہنے کے بعد اچانک اٹھ کر بیٹھنے ہوئے جواب دیا کہ اس کا گلابا نے کی کوشش کرے گا لیکن جب وہ اطمینان سے لیٹا ہوا تو رنبیر

میں بھی حوصلہ نہ ہارا اور زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اپنے دشمنوں پر لوٹ پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ آپ کی مدد نہ کرنا انتہائی بزدلی ہے۔“

”آپ نے ایک ایسے آدمی کی جان بچائی ہے جو کبھی کسی کا احسان نہیں بھولا آج سے آپ میرے بھائی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے رنبیر نے اپنا ہاتھ رام ناتھ کی طرف بڑھا دیا اور رام ناتھ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”آپ کا چھوٹا بھائی۔“

قنوج کی شمالی سرحد عبور کرنے کے بعد رنبیر اور رام ناتھ چند دن ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ دیہاتی لوگ بیرونی حملوں کے باعث اپنے وطن کے ہر سپاہی کی آؤ بھگت کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لیے راستے کی ہر بستی کے سرکہ وہ آدمی اُن کا خیر مقدم کرتے تھے۔ رام ناتھ نے قنوج کی ملازمت کے آخری چند مہینوں کی تنخواہ سے سونے اور چاندی کے چند سکے بچا رکھے تھے اور یہ چھوٹی سی رقم ابھی تک اس کے پاس تھی۔ رنبیر تسکنا کے زیورات کی بھیلی کھو بیٹھنے کے بعد ہتی دست تھا۔

(۳)

رنبیر سونے جاگتے اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اپنی بہن کے خیال میں کھویا رہتا تھا۔ ایک روز وہ ایک چھوٹی سی بستی کے چودھری کے گمان تھے۔ رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد جب وہ ایک تنگ کمرے میں چارپائیوں پر لیٹ گئے تو رام ناتھ نے سوال کیا۔ ”اب ہم خطرے کی حدود سے بہت دور آچکے ہیں۔ صبح آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

رنبیر نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک اٹھ کر بیٹھنے ہوئے جواب دیا۔ ”رام ناتھ! حالات نے ہم دونوں کو ایک ہی کشتی میں ڈال دیا ہے۔ تم جس

کیا چکا ہے اور پروہت کی مرضی کے بغیر اگر ہندوستان کے تمام راجے اُسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کریں تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میرے اور روپ ورتی کے درمیان پروہت کی مرضی امد مند کی ناقابل تسخیر دیواریں حائل ہیں۔ کبھی میں یہ سوچا کرتا تھا کہ ایک دن میں راجہ کا سپہ سالار بنوں گا اور پروہت کے سامنے سونے اور جواہرات کا انبار لگا کر یہ کہوں گا کہ میں روپ ورتی کی آزادی کی قیمت ادا کرنے آیا ہوں لیکن اب میری آخری امید یہی ہے کہ قدرت کی اُن جانی اور ان دیکھی قوت میری راہ کی مشکلات دور کر دے گی۔ جس دن آپ واسدیو کا قصہ سنا رہے تھے میں یہ سوچ رہا تھا، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ محمود غزنوی کو راستہ دکھانے والی قوت جسے وہ خدا کے نام سے یاد کرتا ہے کسی دن سومات کی طرف اس کے گھوڑے کی باگ پھیر دے۔ رنیر میں تمہارے ساتھ ہوں؟

نے کہا یہ کئی دن سے میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔ قدرت نے اُسے جو کام سونپا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ کالج کے راجہ نے جو حالات پیدا کر دیے ہیں اُن کے متعلق میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میری فریاد اُسے متاثر کر سکے گی لیکن اُس کی فوج میں عبدالواحد جیسے لوگ موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور مدد کریں گے۔ تم یہ کہو گے کہ میں اپنے وطن کے ساتھ غداری کر رہا ہوں لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے۔ وطن کی خدمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے بے کرشن جیسے درندوں سے پاک کیا جائے۔ تم مجھے سماج کا دشمن کہو گے لیکن میری نگاہوں میں سماج کا ظلم ٹوٹ چکا ہے جو انسانوں کو بھڑوں اور بھڑیلوں کے گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ رام ناتھ! میں محمود غزنوی کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ اگر میری یہ آرزو پوری ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ سکنتلا کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی اور اس کے بعد میں تمہارے لیے سومات جانے کا وعدہ پورا کر سکوں گا۔ اگر سکنتلا کے بارے میں بالوسی ہوئی تو بھی میں سومات ضرور جاؤں گا لیکن اس وقت میں تمہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور نہیں کروں گا۔

رام ناتھ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری زبان سے میرے دل کی آواز نکل رہی ہے۔ محمود صرف تمہارا ہی نہیں، میرا بھی آخری سہارا ہے۔ میں فوراً سومات کا رخ کرنے سے اس لیے نہیں گھبراتا کہ مجھے موت کا خوف ہے۔ میرے نزدیک اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں رہی اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ سومات کے جن پجاریوں نے مجھ صرف ایک ثانیہ کے لیے دیکھا ہے وہ مجھے دوبارہ دیکھتے ہی پہچان لیں۔ میری جھجک کی وجہ اور ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ روپ ورتی اُن لڑکوں میں سے نہیں جو اپنی خوشی سے سومات کے مندر میں داخل ہوتی ہیں اور اپنی مرضی سے واپس آجاتی ہیں۔ اُسے اس کی پیدائش سے پہلے سومات کی بھینٹ

رہت کے کنارے

سے روک سکتا ہے۔ اس نے دریا کے کنارے تھوڑی دودھٹ کر پڑا ڈال دیا اور جنوب میں اپنے حلیف راجاؤں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ دشمن کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ کے لیے یہ مہتمم نہایت موزوں ہے، اگر دشمن دریا عبور کرنے کی جرأت کرے تو اس کے سامنے کنارے کے ساتھ ساتھ نیراندازوں اور جنگی ہاتھیوں کی ناقابلِ تغیر دیواریں کھڑی کی جاسکتی ہیں اور اگر وہ ہمت ہار کر لوٹ جائے تو بھی ہماری ہی فتح ہوگی۔ اس کی پسپائی ہمارے ملک کے لوگوں میں ایک نیا عزم بیدار کر دے گی۔ ترلوچن پال کے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلطان محمود کے تیز رفتار دستوں کے سوا باقی فوج ابھی کئی منزلیں پیچھے تھی اور اس کا یہ خیال تھا کہ سلطان دریا عبور کرنے سے پہلے ان کا انتظار ضرور کرے گا۔ ترلوچن پال کے ہمراہ بیس ہزار سپاہی اور قریباً تین سو ہاتھی تھے۔ ان کے ساتھ وہ سلطان کی پوری فوج کو کئی دن تک دریا عبور کرنے سے روک سکتا تھا۔

سلطان محمود ایک سفید گھوڑے پر سوار دریا کے کنارے ایک ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹیلے سے نیچے اس کے سپاہی صفیں درست کر رہے تھے۔ چند افسر اور سپاہی ٹیلے کی چوٹی سے لے کر نیچے تک سلطان کے دائیں، بائیں اور پیچھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے سلطان اور فوج کے مختلف دستوں کے درمیان پیام رسانی کا کام دے رہے تھے سلطان اپنے قریب کھڑے ہونے والے افسروں میں سے کسی کو کوئی حکم دیتا اور ان کی آن میں یہ حکم مینمہ، میسرہ یا عقب کے دستوں تک جا پہنچتا۔ پھر اچانک کئی صفوں کی ترتیب بدل جاتی۔ آٹھ ہزار جاں باز دریا کی طوفانی موجوں سے کھیلنے کے لیے امیر لشکر کے اشارے کے منتظر تھے۔

ترلوچن پال کی فوج کے سوار کبھی کبھی اپنے پڑاؤ سے نکل کر دریا کے دوسرے

نہر کی ٹکست کے بعد راجہ ترلوچن پال نے اپنی رہی سہی فوج کے ساتھ کوہ شوالک میں ڈیرے ڈال دیے لیکن سلطان محمود کی فوج کی خبر سننے ہی وہ فوج کے نئے حکمران اور کالنجرا گوالیار کے ہماراجوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی نیت سے جنوب کی طرف بھاگ نکلا۔ سلطان محمود ایک حیرت انگیز رفتار سے اس کا تعاقب کرتا ہوا دریا کے کنارے جا پہنچا لیکن اس سے قبل ترلوچن پال کی فوج دریا عبور کر چکی تھی۔

کوہ شوالک سے دریا کے رہت کے طویل سفر میں راستے کے کسی سردار اور چھوٹے چھوٹے راجے ترلوچن پال کی فوج کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ تاہم وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر کسی میدان میں محمود کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اب اس کی فوج اور دشمن کے درمیان دریا حائل ہو چکا تھا اور اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ کسی خطرے کا سامنا کیے بغیر محمود کو کئی دن تک دریا عبور کرنے

لے فوج کے نئے حکمران کا نام بھی ترلوچن پال تھا۔

کی دیکھ بھال پر متعین تھا۔ ان پر تیر ہر سادہ تھا۔ سلطان جس قدر بہادری کا قدردان تھا اسی قدر حکم عدولی کے معاملے میں سخت گیر تھا لیکن اس موقع پر اس نے غیر متوقع ضبط سے کام لیا اور اپنے گرد جمع ہونے والے افسروں کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا ”آگے بڑھو!“ ان کی آن میں فوج کے بعض سپاہی مشکیزوں کے ساتھ اور باقی گھوڑوں سمیت دریا میں کود پڑے۔ سلطان نے خود بھی ٹیلے سے نیچے اتر کر دریا میں ڈال دیا۔

آٹھ سرفروش جنھوں نے مشکیزوں کے سہارے دریا عبور کرنے میں سبقت کی تھی، دشمن کی تیروں کی زد میں آچکے تھے۔ اچانک دوسرے سوار جو بظاہر ہندو فوج کے سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور انھوں نے دریا عبور کرنے والے ترکمانوں کی طرف توجہ دینے کی بجائے تیر اندازوں کے مورچے پر حملہ کر دیا اور پانچ آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے باقی تیر انداز انتہائی سرابیمگی کی حالت میں بھاگ نکلے۔ ہندو سواروں کے چند اور دستے جو دریا اور پڑاؤ کے درمیان پھیلے ہوئے تھے۔ آگے بڑھے لیکن دریا عبور کرنے والے لشکر کی جرأت و ہمت سے مرعوب ہو کر وہ مقابلہ کیے بغیر پیچھے ہٹ گئے۔

آٹھ ترکمان دریا عبور کرتے ہی اپنے ہندی مددگاروں کے گرد جمع ہو گئے ان میں سے ایک نے اپنے سر سے کھال کی ٹوپی اتار کر ایک سوار کو پیش کرتے ہوئے ملی جلی ہندی اور فارسی میں کہا ”ہم نہیں جانتے کہ تم کون ہو لیکن ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ مجھے ڈھپنہ کہ ہمارے ساتھ بھی تمہیں پہچاننے میں غلطی نہ کریں۔ اس لیے اپنی یگڑی کی جگہ یہ ٹوپی ہیں لو۔“ ایک ترکمان نے اس کی تقلید کی اور اپنی ٹوپی اتار کر دوسرے سوار کو

کنارے نمودار ہوتے اور سلطان کے سپاہیوں کو لکھانے اور ہاتھوں کے اشارے سے انھیں دوبارہ عبور کرنے کی دعوت دینے کے بعد جنگل میں ردپوش ہو جاتے۔ سلطان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اپنے جانبازوں کو فوج کی بشارت دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ ایک دریا کا سکون، جو شور مچاتی ہوئی پہاڑی ندیوں اور آبشاروں کو اپنے آسٹھٹس میں لیتا ہوا گزرنا ہے۔ گزشتہ تیس سال میں وہ کئی دریاؤں کی گہرائیوں اور پہاڑیوں کی بندلیوں اور صحراؤں کی دستوں کے سامنے ایک انسان کے ناقابلِ تغیر عزم و ہمت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اس کا چہرہ سمندر کی اس چٹان کی طرح تھا جس کے ساتھ ان گنت لہریں ٹکرا چکی ہوں لیکن اس کی نگاہوں میں ابھی تک عتاب کی تیزی اور شیر کا جبروت تھا۔

ترلوچن پال کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس فوج کو وہ دریا کے پار روکنا چاہتا ہے اس کا ہر سپاہی آنے والی رات دریا کے دوسرے کنارے گزارنے کا عزم کر چکا ہے۔

سلطان نے اپنے ایک افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”ہم ظہر کی نماز دیا کے پار ادا کریں گے“ اور ان کی آن میں یہ الفاظ فوج کے ہر افسر اور ہر سپاہی کے کانوں تک پہنچ گئے۔

(۲)

دشمن پر حملے کے لیے سلطان کے حکم کا انتظار کرنے کی بجائے ترکمانوں کے ایک دستے کے آٹھ سرفروش ہو اسے بھرے ہوئے مشکیزوں کے سہارے تیرتے ہوئے مجدھار میں پہنچ چکے تھے۔ دشمن کا ایک دستہ جو دوسرے کنارے

پیش کر دی۔

ان سواروں میں سے ایک رنیر اور دوسرا رام ناتھ تھا۔ ترکمانوں کی ٹوپیاں پہننے کے بعد دریا عبور کرنے والی فوج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رام ناتھ نے اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”بھگوان کی قسم! یہ انسان نہیں۔ آج کے بعد اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ لشکرِ سمندر کی سطح پر دوڑ کر کسی دوسرے ملک پہنچ گیا ہے تو میں تعجب نہیں کروں گا۔“

دریا کے کنارے گھنے درختوں کے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپیں، ہاتھیوں کی چنگاڑ اور آدمیوں کی چیخ اور پکار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ترلوچن پال کی ساری فوج اس غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے حرکت میں آ چکی ہے لیکن اتنی دیر میں سلطان کی فوج کے کئی دستے دریا عبور کر چکے تھے۔

رنیر کو اپنے قریب درختوں کے پیچھے سے پانچ ہاتھیوں کا ایک دستہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہاتھیوں کا رخ رنیر کے دائیں ہاتھ سپاہیوں کے اس گردہ کی طرف تھا جنہیں دریا عبور کرنے کے بعد ابھی کنارے پر پادری جمانے کا ہونا نہیں ملا تھا۔ بعض سپاہی ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور بعض نے کنارے کے پھول کی آڑ لے کر ہاتھیوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ دو ہاتھی بدحواس ہو کر داہلے مڑے اور اپنے عقب میں پیش قدمی کرنے والے تیراندازوں کو روندتے ہوئے نکل گئے لیکن تین ہاتھی بدستور آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک ہاتھی پتھروں کی آڑ سے نیر برسانے والے آدمیوں کے قریب آچکا تھا۔ چند سپاہی اُلٹے پاؤں بھاگے ہوئے دیا میں کود پڑے اور باقی ادھر ادھر ہٹ گئے لیکن تین جو سب سے آگے تھے اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ایک ہاتھی ان کے تیروں سے زخمی ہونے کے بعد عقب ناک ہو کر اپنی سونڈ بلند کیے چیخا چنگھاڑتا آگے بڑھا۔ ایک آدمی نے

ایک پتھر کی آڑ سے نکل کر تلوار سونت لی اور ہاتھی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہلاکت یقینی سمجھ کر رنیر نے اچانک گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیزہ بلند کرتے ہوئے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس کا نیزہ ہاتھی کی سونڈ میں الجھ کر رہ گیا۔ ہاتھی نے ایک دل ہلا دینے والی چیخ کے ساتھ رنیر پر حملہ کیا، رنیر نے گھوڑے کو ایک طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن بدحواس گھوڑا بے سنج پا ہو کر گر پڑا۔ رنیر ایک طرف لڑھک کر اُس کے نیچے آنے سے بچ گیا لیکن ابھی وہ اٹھ کر سنبھلنے نہ پایا تھا کہ دوبارہ ہاتھی کی زد میں آ گیا۔ رام ناتھ نے اُسے پہچانے کے لیے حملہ کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ایک اور سپاہی نے تلوار کے بھر پور وار سے ہاتھی کی سونڈ کاٹ دی۔ پھر رام ناتھ کا نیزہ بھی ہاتھی کی آنکھ پر آ کر لگا اور وہ ایک جھک کاٹنے کے بعد بھاگ نکلا۔ اتنی دیر میں ترکمان آگے بڑھ کر باقی دو ہاتھیوں کا منہ پھیر چکے تھے۔

ترلوچن پال کی فوج میں قرباتین سوا ہاتھی تھے لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اپنی فوج کو منظم کر کے حملہ کرتا۔ سلطان کی فوج دریا عبور کر چکی تھی۔ ہاتھیوں کے منتشر دستے ساری فوج میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ دشمن کی بجائے اپنی ہی فوج میں تباہی مچا رہے تھے۔

سلطان کی فوج نے ان کی آن میں پوری تنظیم کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ سلطان کی قیادت میں ترک اور افغان سواروں کے چند دستے آندھی کے تیسرے جھونکے کی طرح دشمن کی فوج کو درمیان سے چیرتے ہوئے عقب میں جا پہنچے، اس کے ساتھ ہی باقی سوار ترلوچن پال کی فوج کے دائیں اور بائیں بازو پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان کی فوج کے ہندی سپاہیوں کے دستے ساتھ ہاتھیوں کی ایک قطار کے سامنے آچکے تھے۔ ہر ہاتھی کی ہودج میں دو دو تیرانداز بیٹھے ہوئے تھے جو بے تحاشا تیر برسا رہے تھے۔ رنیر اور رام ناتھ سلطان کی فوج کے ہندی دستوں

رام ناتھ تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عبدالواحد ان کے قریب آ بیٹھا۔ رنیر نے رام ناتھ سے اس کا تعارف کرایا اور پھر عبدالواحد کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی اور اپنے ساتھی کی سرگزشت سنا دی۔

عبدالواحد نے رنیر سے چند اور سوالات پوچھے۔ پھر اس نے ہاتھ سے بالشت بھر میں صاف کی اور اپنے خنجر کی لوک سے چند کیریں کھینچنے کے بعد کہا: ”میر قنوج کا فتنہ ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کا گاؤں کس جگہ واقع ہے؟“

رنیر نے ایک جگہ انگلی دکھتے ہوئے جواب دیا: ”قریباً اس جگہ“

عبدالواحد نے کہا: ”یہ مقام ہمارے راتے سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اگر مجھے آج شام سلطان معظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو ممکن ہے کہ سونے سے پہلے آپ کو کوئی اچھی خبر سنا سکوں۔ سر دست آپ یہ اطمینان رکھیں کہ اگر اب نہیں تو اس مہم کے خاتمے پر آپ کے گاؤں ضرور جائیں گے۔“

رنیر کے لیے عبدالواحد کے چہرے کا خلوص اس کے الفاظ سے کہیں زیادہ مؤثر تھا۔

عبدالواحد نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: ”ممکن ہے کہ سلطان معظم آپ کو بھی باریابی کا موقع دیں اور گوالیار، کالنجر اور قنوج کی فوجی قوت کے متعلق آپ سے سوالات پوچھیں۔ اگر آپ کسی سوال کا جواب دینا اپنے ضمیر کے خلاف سمجھیں تو بے شک جواب نہ دیں۔ آپ کو مجبور نہیں کیا جائے گا لیکن کوئی غلط جواب نہ دیں۔ کیونکہ سلطان کی معلومات آپ کی نسبت بہر حال زیادہ ہوں گی۔

میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ رنیر کے دوست ہیں۔“

رام ناتھ نے کہا: ”رنیر کے دوست کی حیثیت سے میں بھی آپ کی کشتی میں

میں شامل ہو چکے تھے۔ ہاتھیوں کی قطار جو ان دستوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس قدر منظم تھی کہ سامنے سے حملہ کر کے ان کا منہ پھیر دینا ناممکن تھا۔ ہندی سپاہی ہاتھیوں پر تیر برساتے ہوئے اُلٹے پاؤں دریا کی طرف پھٹنے لگے اور ان کے سالار نے انہیں دائیں ہاتھ سمت کر دریا کا کنارہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ یہ دیکھ کر فیل بانوں نے ہاتھیوں کا رخ بھی اسی طرف پھرنے کی کوشش کی لیکن ہندی دستوں کے سالار نے اچانک ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے کے بعد دائیں ہاتھ مڑ کر ہاتھیوں کے عھت میں پیش قدمی کرنے والے دستوں پر حملہ کر دیا اور کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر انہیں تتر بتر کر دیا۔

اس کے بعد ہندی سپاہی ہاتھیوں کو تین اطراف سے گھیر کر دریا کی طرف ہانک رہے تھے۔ رنیر نے ان کے سالار کی طرف دیکھا اور اس کا دل سترت سے اچھلنے لگا۔ یہ عبدالواحد تھا۔ رنیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور عبدالواحد کے قریب جا پہنچا اور اس کی زرہ میں اٹکا ہوا تیر کھینچ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

عبدالواحد اُسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا: ”میرے دوست! میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔“

میدان جنگ کے باقی بھٹوں میں بھی ترلوچن پال کی فوج منتشر ہو رہی تھی ترلوچن پال زخمی ہونے کے بعد میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان کے چند دستوں نے اس کے مستقر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں مالی غنیمت کے ہاتھیوں کی تعداد دس سو ستر تھی۔

(۳)

کچھ دیر بعد سلطان کی فوج دریا کے کنارے ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی اور رنیر اور

ترک جرنیل نے کسی تمہید کے بغیر کہا: ”میں آپ کو دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ دو سوار جنھوں نے ہمارے آٹھ جواؤں کو دریا عبور کرنے کے بعد دشمن کے تیر اندازوں سے بچایا تھا، ہندی تھے۔ ایک لوجوان نے مجھے بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے سے بچایا تھا۔ شاید آپ کو ان کا پتہ ہو۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ اچانک اس کی نگاہ رنیر پر پڑی اور اس نے کہا: ”اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ تم ہی تھے۔“

ترک جرنیل نے رنیر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اور گرم ہوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد رام ناتھ کی طرف متوجہ ہوا: ”اچھا تو یہ تمہارا ساتھی ہے؟“ پھر عبدالواحد کی طرف دیکھ کر بولا: ”مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان لوجواؤں کو ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی دریا کے پار بھیج چکے ہیں؟“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”یہ میرے دستوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان میں سے ایک قنوج کے رہنے والے ہیں اور دوسرے گوالیار سے آئے ہیں۔ حالات نے ان دونوں کو ہمارا رفیق بنا دیا ہے۔“

”پھر تو مجھے ان کا اور زیادہ شکر گزار ہونا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے جرنیل نے رنیر اور رام ناتھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور اپنے خیمہ کی طرف چل دیا۔ ”میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر عبدالواحد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جرنیل کے ساتھ جا ملا۔

(۴)

اگلی صبح رنیر اور رام ناتھ، سلطان محمود کے خیمے کے سامنے کھڑے تھے۔ عبدالواحد رات کے وقت انھیں یہ بتا چکا تھا کہ سلطان معظم نے صبح کی نماز کے

سوار ہو چکا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں سلطان میری صاف گوئی پر برہم نہ ہو جائے۔ فرض کیجیے اگر میں یہ کہہ دوں کہ صرف کالجیہ کا راجہ آپ کے ہر سپاہی کے تھاپے میں دس سپاہی میدان میں لاسکتا ہے اور سلطان اگر قنوج کے بعد کالجیہ کا رخ کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہر قدم فتح کی بجائے تباہی کی طرف ہوگا تو اس ملاقات کے بعد مجھے کتنی دیر زندہ رہنے کی اجازت دی جائے گی؟“

عبدالواحد مسکرایا: ”اس بارے میں تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ سلطان کی معلومات تمھاری معلومات سے زیادہ ہوں گی۔ ایک اور دس کی نسبت سلطان کو پریشان نہیں کر سکتی۔ شبہ از جب پرواز کے لیے پر کھوٹا ہے تو وہ کپوتروں اور مرغابیوں کی تعداد سے مرعوب نہیں ہوتا۔ معاف کیجیے میں ہندی سپاہیوں کو حقیر نہیں سمجھتا۔ میں راجپوتوں کی بہادری کا معترف ہوں لیکن ہماری فتح کا راز اس اصول کی برتری میں ہے جو زمانے کے ہر اصول پر حاوی ہے ہم اپنی تلواروں کی تیزی اور بازوؤں کی طاقت سے زیادہ اپنے ضمیر کی روشنی کو اپنی فتوحات کا ضامن سمجھتے ہیں۔ ہماری طاقت کا سرچشمہ اسلام ہے۔ جب تک ہمارا مقصد ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا ہمارا ہر قدم فتح کی طرف اٹھے گا۔ جو لوگ کل ہمارے راستے میں کھڑے تھے، آج ہمارے جھنڈے تلے لڑ رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل قنوج، گوالیار اور کالجیہ کے سپاہی ہمارے رفیق نہیں ہوں گے؟“

عبدالواحد کی گفتگو کے دوران میں قنوج کے چند افسر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک ترک جرنیل چند افسروں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اس طرف آنکلا اور عبدالواحد کو دیکھ کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ایک افسر نے عبدالواحد کو جرنیل کی طرف متوجہ کیا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سے گزشت سنی ہے اور تمھاری بہن کی تلاش اپنے فرائض میں شامل کر چکا ہوں۔“

رنیر نے لشکر کے جذبات سے مغلوب ہو کر سلطان کی طرف دیکھا اور دوبارہ گردن جھکاتے ہوئے کہا: ”عالی جاہ! مجھے یہی امید تھی۔“

سلطان نے عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”عبدالواحد اگر تمہیں یقین ہے کہ تم اپنی مہم سے فارغ ہو کر بروقت ہمارے ساتھ آلو گے تو آج ہی روانہ ہو جاؤ۔ باقی فوج بھی بہت جلد پہنچ جائے گی اور میں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے فوج کاٹخ کر دل گا۔“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”عالی جاہ! آپ مجھے اپنے راستے میں منتظر پائیں گے۔“

سلطان نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: ”اور میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

رام ناتھ کی خاموشی پر عبدالواحد نے ترجمان کے فرائض ادا کرتے ہوئے کہا: ”عالی جاہ! یہاں پہنچنے سے قبل یہ نوجوان گوالیار کے راجہ کی فوج میں ملازم تھا۔ اس کے باپ کو سومات کے بیجاریوں نے قتل کیا تھا اور یہ ایک بیجاری کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس ملک کے ہر ہندو کو اپنا دشمن بنا چکا ہے۔“

”سومات“ کا لفظ سن کر سلطان زیادہ دلچسپی کے ساتھ رام ناتھ کی طرف دیکھنے لگا اور اُس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا: ”تم نے سومات کا مندر دیکھا ہے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”نہیں عالی جاہ! امیر گاؤں گوالیار میں سومات کے مندر کی جاگیر کا حصہ ہے اور سومات کے بیجاریوں نے میرے بپا کو لگان ادا نہ

بعد فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کا اجلاس بلایا ہے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپ سے ملاقات کریں گے۔

رنیر اور رام ناتھ دیر تک باہر کھڑے رہے۔ بالآخر اُمراء کی مجلس برخواست ہوئی اور وہ سلطان کے خیمے سے نکل کر اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔ ایک افسر خیمے سے نکلتے ہی سیدھا رنیر اور رام ناتھ کی طرف بڑھا اور اُن کے قریب آ کر بولا: ”سلطان معظم ابھی تمہیں ملاقات کے لیے بلائیں گے۔ عبدالواحد ابھی تک خیمے کے اندر ہے۔“

یہ وہی ترک جرنیل تھا جو ایک دن قبل رنیر اور رام ناتھ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ رنیر اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ عبدالواحد خیمے سے باہر نکلا اور اس نے قریب آ کر کہا: ”آئیے۔“

رنیر اور رام ناتھ عبدالواحد کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ سلطان خیمے کے درمیان کھڑا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ ایک کاتب قالین پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ رنیر اوہام ناتھ ہندو رسم کے مطابق ہاتھ باندھ کر آداب بجالائے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

عبدالواحد نے فارسی زبان میں کہا: ”عالی جاہ! یہ رنیر ہے اور یہ رام ناتھ ہے میں ان دونوں کے متعلق آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔“

سلطان نے رنیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ”تو یہ وہ نوجوان ہے جو ہماری قید میں تھا۔“

”ہاں عالی جاہ!“ عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”قید کے زمانے میں یہ فارسی زبان سیکھ چکا ہے۔“

سلطان نے براہ راست رنیر سے مخاطب ہو کر کہا: ”نوجوان میں نے تمھاری

ہے کہ جنوبی ہندوستان کے آخری کونے تک تمام راجے اور سردار جمع ہو جائیں گے۔
سومناٹ کے دیوتا کی بدولت فتح کی اُمید لاکھوں انسانوں کو مندر کی چار دیواری
کے نیچے جائیں دینے پر آمادہ کر دے گی۔“

سلطان نے کہا: ”اور وہ دن تمہاری موتیوں پر انسان کے اعتماد کا آخری دن
ہوگا، پھر سومناٹ کے کھنڈروں سے وہ انسانیت نمودار ہوگی جو اپنے مجبور حقیقی
کو پہچان سکے گی۔ سومناٹ کفر کی تاریکیوں کا آخری مسکن ہے اور تاریکیوں کے
آغوش میں آنکھ کھولنے والے یقیناً اس کی حفاظت کے لیے آئیں گے لیکن وہ
ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ میں اس دن کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں اور شاید
وہ دن دور نہ ہو۔“ سلطان بظاہر رام ناتھ سے مخاطب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہے۔ عبدالواحد نے اس مرحلہ پر مترجم کے فرائض
ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”سومناٹ بتوں کا آخری مسکن۔ سومناٹ تاریکیوں کی آماجگاہ۔“

سلطان نے قدرے توقف کے بعد دہی زبان سے یہ الفاظ دہرائے اور
عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”عبدالواحد! اب تم جا سکتے ہو اور دیکھو جب
تک یہ نوجوان ہمارے مہمان ہیں۔ ان کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔“
خیمے سے باہر نکلتے ہی زبیر نے عبدالواحد سے سوال کیا: ”آپ کون سی مہم
پر جا رہے ہیں؟“

”تمہیں معلوم نہیں؟“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ.....؟“

”ہاں!“ عبدالواحد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”ہم تمہارے
گاؤں جا رہے ہیں۔“

کسٹھ کے جرم میں قتل کیا تھا۔“

سلطان نے کہا: ”میں نے سنا ہے کہ باقی ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی سورت
کے مندر کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر رکھی ہیں۔“

”ہاں عالی جاہ! سومناٹ ایک مندر نہیں بلکہ ایک سلطنت ہے ہندوستان
کی سب سے بڑی سلطنت۔ سومناٹ کا پر وہت ہندوستان کے ہر حکمران سے
خزراج وصول کرتا ہے۔ راجے اور مہاراجے اس کے قدموں میں سبز جھکاتے
ہیں۔“

”اس کی وجہ؟“ سلطان نے سوال کیا۔

”اس کی وجہ سومناٹ کے بیجاریوں کی طاقت اور دولت ہے اور ہمیں طاقت
اور دولت کی پوجا کرنا سکھایا گیا ہے۔“

سلطان مسکرایا۔ ”میں نے سنا ہے سومناٹ کے بیجاری یہ کہتے ہیں کہ میری
فتوحات کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مندروں کے بتوں اور ایل کے بیجاریوں
سے سومناٹ کا بت خانا ہو چکا ہے؟“

”ہاں عالی جاہ! وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آپ سومناٹ کی طرف بڑے آزاد
سے بڑھیں گے تو آپ کا ہر قدم فتح کی بجائے تباہی کی طرف ہوگا۔“
”میں یہ بھی سُن چکا ہوں اور یہ میرے لیے ایک دعوت ہے لیکن کیا سومناٹ
کے بیجاریوں کی خود اعتمادی کا باعث یہ نہیں کہ وہ مجھ سے دور رہیں؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”عالی جاہ! اگر آپ خنہانہ تو میں یہ کہوں گا کہ اُن
کی خود اعتمادی کی وجہ صرف یہی نہیں۔ اگر وہ محض اپنی قوت کے بل بوتے پر بھی
سومناٹ کو ناقابلِ تسخیر سمجھیں تو اُسے اُن کی نادانی یا حماقت نہیں سمجھنا چاہیے۔ انہیں
یہ یقین ہے کہ سومناٹ کی مورتی کی حفاظت کے لیے لگنا اور جتنا کے میدانوں سے

اندرواغل ہونے لگے تو انھوں نے مقابلہ کرنا بے سود سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔
عبدالواحد باقی فوج کو باہر بٹھرنے کا حکم دے کر رنیر، رام ناٹھ اور اپنے چند افسروں
سے ساتھ محل کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دہشت زدہ پریداروں کو تسلی دیتے
ہوئے کہا: ”ہتھیار ڈالنے کے بعد تم ہماری پناہ میں آ چکے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں
کہ تم پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف تمھارے سردار کو تلاش کرنا چاہتے
ہیں۔ وہ کہاں ہے؟“

”سردار یہاں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے آٹھ کوس پر ایک دوسرے گاؤں گیا
ہوا ہے۔“

عبدالواحد نے رنیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”آپ تسلی کر لیں۔“
رنیر نے پریدار سے سوال کیا: ”مکان کے اندر کتنے آدمی ہیں؟“
”اندر سردار کی بیوی اور لڑکی کے علاوہ صرف دو لوگ کرانیاں ہیں۔“
”میں ابھی آتا ہوں۔“ رنیر یہ کہہ کر رہائشی مکان کی طرف بڑھا۔ عبدالواحد
نے رام ناٹھ اور تین اور سپاہیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ رنیر کے پیچھے
ہو لیے۔

پنجلی منزل کے تمام کمرے خالی تھے۔ بالائی منزل کی سیڑھی کا دروازہ بند
تھا۔ رنیر نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کئی مرتبہ آدازیں دیں لیکن کوئی جواب
نہ پا کر اس نے اپنے ساتھیوں کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ چار آدمیوں نے مل
کر دروازے کو زور سے دھکیلا۔ اچانک اندر سے کڑی ٹوٹ گئی اور کوڑ پھٹ
سے کھل گئے۔ رنیر بھاگتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ رام ناٹھ اور باقی تین آدمی
بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ بالائی منزل کے کونے کے ایک کمرے کا دروازہ اندر
سے بند تھا۔ رنیر کوڑ پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے چلا یا: ”دروازہ کھولو،

رنیر کی واپسی

طلوع آفتاب کے ساتھ چرواہے اپنے دیوڑ اور کسان اپنے ہل چھوڑ کر واپس
اپنے گاؤں کی طرف بھاگے اور انھوں نے یہ خبر سنائی کہ جنگل کی طرف سے ایک
فوج آرہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد رنیر عبدالواحد اور پانچ سواروں کے ہمراہ گاؤں
میں داخل ہوا۔ بچے کرشن کے سپاہیوں نے لڑنے کی بجائے بھاگنا بہتر خیالی کیا
اور رنیر نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر اپنے گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں کے کسانوں
اور چرواہوں میں سے بعض نے خوفزدہ ہو کر اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے
اور بعض ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ حملہ آور چند آدمیوں کو گھیر کر رنیر کے پاس لے
آئے۔ ان میں سے بعض نے رنیر کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ رنیر نے انھیں تسلی دیتے
ہوئے کہا: ”تمھیں کوئی خطرہ نہیں۔ میرا مقصد تمھیں بچے کرشن کے مظالم سے نجات
دلانا ہے۔ تم جاؤ اور باقی آدمیوں کو بھاگنے سے منع کرو۔“

اس کے بعد حملہ آور فوج نے محل کا رخ کیا۔ محل کے پریداروں کی اکثریت بھی
سلطان محمود کی فوج کی آمد کی اطلاع ملتے ہی راہ فرار اختیار کر چکی تھی چند آدمی
دروازوں کی حفاظت کے لیے کھڑے لیکن جب حملہ آور چار دیواری پھاند کر

و نہ ہم تو ڈالیں گے۔“

میری بھی نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ اگر تم معاف نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو لیکن ہمیں غیروں کے حوالے نہ کرو۔“

”تم میری پناہ میں ہو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے اس جھگڑے میں تمہاری اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوگا۔“ رنیر یہ کہہ کر کرے سے باسر نکل آیا۔

(۲)

رہمت کی جنگ میں ترلوچن پال کی شکست اور قنوج کی طرف سلطان محمود کی پیش قدمی کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ بے کرشن کے گاؤں کے جنوب میں کوئی آٹھ دس کوس کے فاصلے پر ارد گرد کے تمام سردار علاقے کے پر وہمت کے گاؤں میں جمع ہو کر اپنی حفاظت اور راجہ کو مدد دینے کی تجاویز پر بحث کر رہے تھے۔

سرداروں کا یہ اجلاس ایک عالیشان مندر سے باہر کھلے عین میں ہو رہا تھا۔ پر وہمت اس بات پر زور دے رہا تھا کہ ہر سردار اپنے سپاہیوں کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کرے۔ ایک حصہ وہ اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے چھوڑ دے۔ ایک حصہ اس مندر کی حفاظت کے لیے بھیج دے اور باقی سپاہیوں کی ایک فوج فوراً راجہ کی مدد کے لیے روانہ کی جائے۔

بے کرشن نے اس تجویز کی مخالفت کرنے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی قوت کو اس طرح منتشر نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی مجموعی فوج کا تیسرا حصہ فوراً راجہ کی مدد کے لیے بھیج دینا چاہیے لیکن باقی تمام سپاہیوں کو شمالی سرحد کی حفاظت کے لیے بھیج دینا چاہیے۔ اگر سرحد محفوظ ہے تو اس مندر اور ہماری بستیوں

اچانک اندر سے عورتوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ ایک عورت بلند آواز سے چلائی۔ ”کیا کر رہی ہو نرملہ۔ بھگوان کے لیے ایسا نہ کرو۔ پکڑو اسے تم کیا دیکھ رہی ہو۔“

”نہیں نہیں۔ دوسری عورت کی آواز آئی۔ ”وہ صرف میری لاش کو ہاتھ لگا سکیں گے۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے مرنے دو۔“

”نرملہ! ہوش میں آؤ بیٹی، بھگوان کے لیے ایسا نہ کرو۔“

رنیر کے اشارے سے اس کے ساتھیوں نے دھکادے کر دروازہ توڑ دیا۔ رنیر بھاگ کر اندر داخل ہوا۔ اسے عورتوں کی چیخ پکار کی وجہ معلوم کرنے میں وہ نہ لگی۔ ایک نوجوان لڑکی کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش کر رہی تھی اور تین عورتیں اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر کھینچ رہی تھیں۔ رنیر کے اندر داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے اپنا ایک بازو چھڑا لیا اور دوسرا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ رنیر نے بھاگ کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ عورتوں کی چیخ پکار ایک دم بند ہو گئی اور نوجوان لڑکی چند ثانیے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے کے بعد رنیر کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ رنیر نے کہا ”تم ہر انسان کو بے کرشن سمجھنے کی غلطی نہ کرو۔ اس مکان کی چار دیواری میں عورتوں کو کوئی خطرہ نہیں۔“

لڑکی نے گردن اٹھائی اور اُس کی نگاہیں رنیر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ”تم!“ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”رنیر!“

”ہاں!“ رنیر نے اُسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ عمر رسیدہ عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے ہم پر دیا کرو۔“

ہمارا راجہ تنہا نہیں ہوگا۔ کالہنر، گوبیار اور اس پاس کے تمام راجاؤں کی فوج اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گی۔“

مرسیدہ سردار نے اٹھ کر جواب دیا۔ لیکن ہم چند دن انتظار کیوں کریں۔ آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ دشمن کی فوج کا کوئی حصہ اس طرف ضرور آئے گا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ سردار موہن چند کے بیٹے اور اس کی ان دیکھی فوج کا خوف ابھی تک آپ کے دل پر سوار ہے؟“

چند بڑے بڑے سردار اس پر ہنس پڑے لیکن حاضرین کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو ایک قہقہے کے عوض عمر بھر کے لیے بے کرشن کا عتاب مول لینے سے گھبراتے تھے۔ عام حالات میں بے کرشن ایسا مذاق برداشت کرنے کا عادی نہیں تھا لیکن یہ صورت عام حالات سے مختلف تھی۔ وہ پرلے درجے کا جلد باز ہونے کے باوجود کسی کی گالی کا جواب دینے سے پہلے اس کی قوت کا اندازہ کرنے کا فادی تھا اور یہ مرسیدہ سردار جس نے بھری محفل میں اس کا مذاق اڑانے کی کرکشی کی تھی۔ سارے علاقے میں غیر معمولی اثر و رسوخ کا مالک تھا۔

بے کرشن نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اس لیے میں آپ کی ہر گالی برداشت کر سکتا ہوں لیکن میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ جب آپ تمام سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے روانہ ہوں گے تو مجھے ہر منزل پر اپنے آگے پائیں گے۔“

اچانک کہیں پاس ہی چند گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور حاضرین مجلس ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مندر کے صحن کے سامنے آٹھ سوار نظر آئے۔ بے کرشن نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ سب اس کے نوکر تھے۔ بارہ لال سب سے آگے تھا۔ وہ گھوڑا روک کر اپنے سردار کی طرف دیکھتے

کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر دشمن کے چند دستے سرحد عبور کر کے اس طرف آنکلیں گے ہم کئی حصوں میں تقسیم ہونے کے باعث ان کا راستہ نہیں روک سکیں گے ہر دشمن صرف شمال سے آ سکتا ہے اس لیے ہمیں اب باقی تمام قوت سرحد پر مرکوز کرنی چاہیے۔“

ایک مرسیدہ سردار نے اٹھ کر کہا۔ ”آپ یہ مشورہ اس لیے دیتے ہیں کہ آپ کا گاؤں سرحد کے زیادہ قریب ہے۔ آپ کی یہ خواہش ہے کہ ہم نہ تو اس مندر کی فکر کریں اور نہ اپنے گھروں کی بلکہ سب کچھ چھوڑ کر آپ کے گاؤں کی حفاظت کے لیے جھج ہو جائیں۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ دشمن کا سب سے پہلا مقصد باری اور فوج کو فتح کرنا ہے اور ہمارا علاقہ اس کے راستے سے بہت دور ہے، فوج اور باری کو پہچاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی فوج کا ہر سپاہی راجہ کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ اگر ہمارا راجہ سلامت ہے تو ہمارے گھروں کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر اُسے شکست ہوگئی تو ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ ہمیں اپنے تمام سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے پہنچ جانا چاہیے۔“

بے کرشن نے غصے سے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم میں سے کوئی مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا اور نہ کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑھ کر راجہ کا وفادار ہے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم اپنے تمام سپاہی بھیجنے سے پہلے یہ معلوم کر لیں کہ دشمن کا رخ کس طرف ہے۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ دشمن کا لشکر سیدھا فوج یا باری کا رخ کر رہا ہے اور اس کی فوج کے کسی حصے کے اس طرف آنے کا کوئی امکان نہیں تو ہم اپنے باقی تمام سپاہیوں کا رخ بھی اس طرف پھیر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دفعہ اگر دشمن نے ان شہروں کا رخ کیا تو

ہی چلایا۔ ”مہاراج! مہاراج!! اندھیر ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج ہمارے گاؤں پر قبضہ کر چکی ہے اور رنیر ان کے ساتھ ہے۔“

حاضرین مجلس چند ثانیہ مبہوت ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی زبانیں حرکت میں آنے لگیں۔ چند آدمی اٹھ کر پیارے لال اور اس کے ساتھیوں کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ کب آئے؟ وہ کتنے ہیں؟ تم نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کسی نے تمھارے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔ یہ کیے ہو سکتا ہے، یہ ناممکن ہے۔“

اور پیارے لال اپنے ساتھیوں کو ان سوالات کے جواب کا موقع دینے کی بجائے بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ ”آپ سب میرا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اب وہ آگے ہیں، وہ اب کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان کی فوج کا کوئی شمار نہیں آس پاس کی تمام بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ اس ملک کا کوئی کونہ ان سے محفوظ نہیں۔“

بے کرشن سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ ان کی آن میں تمام سردار وہاں سے روف چکے ہو گئے۔ پیارے لال اپنے گھوڑے سے اترا اور آگے بڑھ کر بے کرشن کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے چلا۔ ”مہاراج! اپنی جان بچائیے، رنیر ان کے ساتھ ہے، میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ محض پر قبضہ کر چکے ہیں۔ مہاراج! جلدی کیجیے۔“

(۳)

دن کے تیسرے پرگاؤں کے قریب ڈیڑھ سو آدمی محل کے دروازے پر جمع ہو چکے تھے۔ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے کسان بھی رنیر کی آہ

کی اطلاع پا کر جوق در جوق محل کا رخ کر رہے تھے۔

رنیر عبدالواحد کے ساتھ محل کے دروازے سے باہر نکلا تو اُسے دیکھتے ہی اس کے باپ کے پرانے وفادار آگے بڑھ بڑھ کر اس کے پاؤں چھونے لگے۔ ان لوگوں میں وہ نوجوان بھی تھے جنہوں نے چند ماہ قبل رنیر کی جان بچائی تھی اور رنیر کے بعد دیگرے ان کے ساتھ بنگلگیر ہو رہا تھا۔ رنیر کے باپ کے چند جاں نثاروں نے مطالبہ کیا کہ سکنتلا کا انتقام بے کرشن کی بیوی اور بیٹی سے لیا جائے لیکن رنیر نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں بے کرشن کے جرم کی سزا اس کی بیوی اور بیٹی کو نہیں دے سکتا۔ میں بے بس عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا مشورہ دینے والوں کو اپنا دوست نہیں سمجھتا۔ وہ میری پناہ میں ہیں اور ان کی حفاظت میرا فرض ہے۔“

عبدالواحد نے کہا ”میرے دوست اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا اور میں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے کوچ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اپنے چند آدمی تمھارے پاس چھوڑ جاؤں لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمھیں میری مزید اعانت کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آس پاس کے سردار بھی تمھارے گرد جمع ہو جائیں گے۔ تم انھیں یہ بتا سکتے ہو کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان کی پوری فوج اس راستے سے گزرے گی۔ جو لوگ تمھارے دوست ہوں گے، ان کے ساتھ ہمارا سلوک بھی دوستانہ ہوگا۔ میں رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ عفو اور درگزر انتقام سے بہتر ہے۔ میں تم سے دوبارہ ملنے کی امید پر رخصت ہوتا ہوں۔“

رنیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد عبدالواحد رام ناٹھ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ”رام ناٹھ! ابھی تمھاری منزل بہت دوسرے اور مجھے ان مشکلات کا احساس ہے جو تمھاری راہ میں حائل ہیں لیکن تمھیں مایوس نہیں ہونا

چاہیے۔ امید کا دامن تھامے رہو اور وقت کا انتظار کرو۔“

تھوڑی بعد عبدالواحد اور اس کے ساتھ آئے والے سوار جنوب کی طرف روانہ ہو رہے تھے اور رنیر اور رام ناتھ لوگوں کے هجوم میں گاؤں سے باہر کھڑے اٹھیں گم دو غبار کے بادلوں میں ردپوش ہوتا دیکھ رہے تھے۔ گاؤں والے کہہ رہے تھے۔ ”اس فوج کا سردار تو دیوتا معلوم ہوتا ہے۔“

(۴)

عبدالواحد کا قیاس صحیح ثابت ہوا۔ چند دن کے بعد کافوں اور چرواہوں کی طرح علاقے کے سردار بھی رنیر کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہ خبر دور دور تک مشہور ہو چکی تھی کہ سلطان محمود رنیر کی پشت پر ہے اور جب واپسی پر سلطان کی فوج اس راستے سے گزرے گی تو صرف وہی لوگ محفوظ ہوں گے جو رنیر کی نظر میں قابل رحم ہوں گے۔ چنانچہ رنیر کی دوستی کو اپنی حفاظت کا ضامن سمجھ کر یہ لوگ اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر سردار بے کوشش کے خلاف انتہائی نفرت کا اظہار کرتا تھا اور بعض سردار رنیر کے پاس آنے سے پہلے اس کے سامنے اپنی دوستی کا عملی ثبوت پیش کرنے کے لیے انتہائی شد و مد کے ساتھ بے کوشش کی تلاش شروع کر چکے تھے۔ انھوں نے اس کی گرفتاری کے لیے الغامات کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ علاقے بھر میں رنیر کی بہن شکنتلا کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔

وہ سردار جو بے کوشش کی دوستی کے باعث زیادہ بدنام ہو چکے تھے اور جنھیں رنیر سے کسی نیک سلوک کی توقع نہ تھی۔ سرمد عبور کر کے دوسری

دہانتوں میں پناہ لے چکے تھے۔

رنیر کے پاس جو لوگ آتے تھے وہ ان سے بظاہر خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن جب اُسے رام ناتھ کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہا کرتا تھا ”رام ناتھ! مجھے اُن میں سے کسی کے متعلق غلط فہمی نہیں۔ یہ سب چڑھتے سورج کی پوجا کر لے والے ہیں۔ میرا باپ انہی لوگوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا اور پھر جب مجھ پر مصیبت آئی تھی تو یہ لوگ بے کوشش کو خوش کرنے کے لیے میری تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ آج یہ سب میرے درست ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے کوشش بازی ہار چکا ہے۔“

شکنتلا کے متعلق رنیر کی بے قراری میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چند سواروں کے ہمراہ علی الصباح باہر نکل جاتا اور میلوں (دھڑا دھڑا گھومتا رہتا راستے کی بستیوں کے لوگ اس کے ساتھ ہو لیتے۔ شام کے وقت وہ تھکا ماندہ اپنے دل کو یہ تسلیاں دیتا ہوا گھر لوٹتا کہ شکنتلا گاؤں کے تازہ حالات سے باخبر ہوتے ہی گھر پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ ممکن ہے کہ آج جب میں گھر پہنچوں تو وہ دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو لیکن محل کے اندر پاؤں رکھتے ہی اس کا دل بیٹھ جاتا۔ عام طور پر ہر روز علاقے کے دو چار باشندے آدمی اس کے ہمان خانے میں موجود ہوتے اور وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ شکنتلا کی تلاش میں کم پریشان نہیں۔

بے کوشش کی بیٹی نرملہ کے بارے میں رنیر کا طرز عمل علاقے کے ہر آدمی کی توقع کے خلاف تھا۔ حملے کے روز اُن سے ملاقات کے بعد اس نے دوبارہ انھیں دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ رہائشی مکان کا بالائی حصہ ان کے لیے وقف تھا اور کسی لوگ کو کب بلائے اس طرف جانے کی اجازت نہ تھی۔ رنیر اور رام ناتھ پچلی

میر متوقع حالات میں بھی رنیر کے خدو خال اُسے یہ اطمینان دلانے کے لیے کافی تھے کہ وہ چور نہیں۔ پھر جب رنیر کی باتوں سے اُسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ موہن چند کا بیٹا ہے تو اس کا اطمینان اچانک خوف میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہ انتہائی اضطراب کی حالت میں یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی یہ حالات سے بے خبر ہے لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا باپ اس کے باپ کا قاتل ہے تو میرا منتر کیا ہوگا لیکن اس موقع پر بھی رنیر کی صورت دیکھ کر وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ زندگی کے بدترین حادثات سے دوچار ہونے کے بعد بھی یہ نوجوان ایک عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ رنیر اس کی نگاہ میں ایک شریف اور باوقار دشمن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ گرفتار ہوا تھا تو اس نے اپنے باپ سے رحم کی التجائیں کی تھیں اور جب وہ اُسے قتل کرنے کے لیے لے گئے تھے تو وہ اپنی زندگی میں پہلی بار جی کھول کر روتی تھی۔ اسے اپنے باپ کے دشمن کی موت نہیں بلکہ ایک ایسے مرد کی موت کا افسوس تھا جسے اس نے پہلی بار اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ فرار ہو چکا ہے تو اپنے باپ کے خوف و اضطراب کے باوجود وہ مسرور تھی۔ جب بچے کرشن کے آدمی رنیر کو تلاش کر رہے تھے تو وہ محل کے ایک کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

اگلے دن اُسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی دعائیں قبول ہو چکی ہیں۔ رنیر بچ کر نکل گیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے اور وہ چاہتی بھی یہی تھی لیکن رنیر کا ایک موہوم سا تصور اس کے دل پر چند دن ملنے والے نقوش چھوڑ گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ نقوش اس کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتے اور وہ یہ سوچتی، اگر وہ موہن چند کا بیٹا نہ ہوتا اور اسی قسم کا کوئی حادثہ ہمیں چند

منزل کے ایک کونے کے دو کمروں میں رہتے تھے اور ان کمروں میں آنے جانے کے لیے وہ صحن کی بجائے باہر کی طرف کھلنے والے برآمدے کا راستہ استعمال کرتے تھے۔ صحن کی طرف کھلنے والے دروازے عام طور پر بند رہتے تھے۔ اس طرح رنیر نے دو کمروں کے سوا باقی تمام محل نہ ملا، اس کی ماں اور ان کی نوکرانیوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ بیٹھک اور محالوں کے کمرے محل سے الگ صحن کے جنوبی حصے میں تھے۔

گاؤں پر قابض ہونے کے آٹھ دن بعد ایک شام رنیر دن بھر ادھر ادھر گھوم کر واپس آ رہا تھا کہ محل کے دروازے پر ایک سادہ دھو دھاتی دیا۔ رنیر نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ شبیونا تھا۔

رنیر نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا: ”شکنتلا کا کچھ پتہ چلا؟“

شبیونا نے منموں نگاہوں سے رنیر کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے اپنا سر ہلا دیا:

(۵)

”میرے پتا کہاں ہیں؟ میرا اور میری ماں کا انجام کیا ہوگا؟“ نہ ملا ہر وقت ان سوالات کا جواب سوچا کرتی تھی۔ اس کے سامنے تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کبھی کبھی رنیر کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے اور اُسے امید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دینے لگتی۔ ایک عورت کی ذکاوت جس سے وہ رنیر کا کسدار اس کے چہرے پر دیکھ چکی تھی۔ پہلے دن جب وہ ایک اجنبی کی حیثیت سے اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو وہ اسے سمجھ کر درگئی تھی لیکن اُن

ہیں نرملہ زنبیر کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھی لیکن بے کرشن کی بیٹی کی حیثیت میں اُسے اپنے باپ کے بدترین دشمن کی فتح گوارا نہ تھی۔ ایسے انسان کی قربت کا تصور بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا جو اس کے باپ کے ہاتھوں اس درجہ مجروح ہو چکا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ گویا راسخ اس کے ماموں تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ وہاں پہنچ گیا ہوگا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچتی تھی کہ اگر میں اپنی ماں کے ساتھ وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کروں تو زنبیر شاید مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ ممکن ہے اس نے اتنے دن ہمیں صرف اس خیال سے یہاں رہنے دیا ہو کہ ہمارا باپ روپوش ہے اور ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔

ایک رات وہ دیر تک سوچتی رہی۔ علی الصباح اس نے ایک نوکرانی زبورات کی تھیلی دے کر زنبیر کے پاس بھیج دیا۔ یہ وہی زبورات تھے جو زنبیر بے کرشن کے گرفتار کرنے سے پہلے نرملہ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ نوکرانی زنبیر سے ملاقات کے بعد واپس آئی تو اس نے کہا: "اس نے زبورات لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ میں نے اصرار کیا تو یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا کہ جھگو ان کے لیے مجھے تنگ نہ کر دو۔"

نرملہ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ زنبیر کے خیالات کی دنیا سے کوسوں دور ہے جس شخص کے سامنے وہ اپنی نفرت کا مظاہرہ ضروری سمجھتی تھی وہ اس کا وجود تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔

نرملہ کی ماں کی حالت اس کی نہت کہیں زیادہ قابلِ رحم تھی۔ وہ اپنے شوہر کے غم اور اپنی بیٹی کے مستقبل کے فکریں گھلی جا رہی تھی۔ اسے زنبیر سے کسی نیک

لمحات کے لیے ایک دوسرے کے قریب لے آنا تو کیا ہوتا ہے پھر وہ خود ہی اپنے آپ کو ملاہٹ کرنے لگتی۔

اب وہ زنبیر کے رحم و کرم پر تھی اور یہ محل اس کے لیے ایک وسیع قید خانہ تھا۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ زنبیر اپنی بہن کے عوض ہمیشہ کے لیے ہمیں اپنی قید میں رکھے گا۔ زنبیر کو اس بات کا بھی یقین ہوگا کہ تمہارا باپ ہماری خاطر اس کے پاس ضرور آئے گا اور وہ اپنے باپ کا انتقام لے سکے گا لیکن نرملہ کے احساسات اپنی ماں سے مختلف تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار تھی کہ اس کے باپ کے لیے زنبیر کے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی کہ انتقام کے جوش میں وہ اپنے دشمن کی بیوی اور بیٹی کو بھی قابلِ رحم نہیں سمجھے گا۔ وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ زنبیر انھیں اگر قابلِ عزت نہیں تو قابلِ رحم ضرور سمجھتا ہے۔ زنبیر کے طرزِ عمل بھی نرملہ کے ان خیالات کی تائید ہوتی تھی۔ اس نے دو کمروں کے سوا باقی سارا محل انھیں سونپ رکھا تھا۔ اس کے نوکران کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے اور براہِ راست ان سے ہم کلام ہونے کی بجائے دروازے سے باہر نوکرانیوں کو آواز دے کر پوچھ لیا کرتے کہ گھر میں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ انھیں کھانے پینے کی جواڑیاں بھیجی جاتی تھیں وہ ہمیشہ ان کی ضرورت سے وافر ہوتی تھیں۔ محل کے ایک کمرے میں بے کرشن کی دلدل کے صندوق بند پڑے تھے اور ان کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

یہ تمام حالات نرملہ کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا معاملہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو انتہائی غضب کی حالت میں بھی شرافت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ایک عورت کی حیثیت

سردار بھی اپنی اپنی فوج لے کر اس کے ساتھ جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آج صبح چند سردار رنیر کے پاس آئے تھے۔

نرملہ نے کہا: ”ماتا! معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان نے آپ کی دعائیں سن لی ہیں، مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہو چکی ہے اور رنیر اب بھاگنا چاہتا ہے اور جن سرداروں نے اُسے خوش کرنے کے لیے راجہ کی مدد کے لیے اپنے سپاہی بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، وہ بھی اب راجہ کے انتقام کے خوف سے بھاگنے کی فکر میں ہیں۔“

دوسری نوکرانی جو گاؤں کے طبیب سے نرملہ کی ماں کے لیے دوائی لینے گئی تھی، ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی: ”آپ نے سن لیا مسلمانوں نے باری پر قبضہ کر لیا ہے اور راجہ بھاگ گیا ہے۔ اب مسلمانوں کی فوج کا بخر پر حملہ کرنے والی ہے اور رنیر علاقے کے کئی سرداروں کے ساتھ انکی مدد کے لیے جا رہا ہے۔“

نرملہ اور اس کی ماں سمجھنے کے عالم میں خادمہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ایک نوکرانی چلائی: ”نرملہ! انھیں کچھ ہو گیا ہے۔“

”ماتا! ماتا!“ نرملہ اپنی ماں کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے چلائی لیکن آنکھوں کے سوا اس کے جسم کے کسی حصے میں زندگی کے آثار نہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد شبنو ناٹھ گاؤں کے طبیب کو لے آیا۔ اس نے بتایا کہ مرلیضہ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔

دس دن بعد جب نرملہ کی ماں اپنی زندگی کا آخری سالس لے رہی تھی تو اس کی نگاہیں اپنی بیٹی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان نگاہوں میں نرملہ کے لیے ایک نہ بھولنے والا پیغام تھا۔ موت کے بعد نرملہ کی ماں کے سینے پر سر رکھ کر یہ کہہ رہی تھی: ”ماتا! میں تمہارا انتقام لوں گی۔ میں تمہارے دشمن کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ مجھے بھگوان کی قسم! مجھے دیوتاؤں کی قسم!“

سلوک کی توقع نہ تھی۔ رنیر اس کی نگاہ میں صرف اس کے شوہر کے خون ہی کا پیارا تھا بلکہ ہندو سماج کا باغی اور اپنے وطن کا دشمن بھی تھا۔ اس کا آخری سہارا مرثیہ یقین تھا کہ جن لوگوں کی مدد سے رنیر نے اس کے شوہر پر فتح حاصل کی ہے وہ بالآخر قہر قہر کے ہمسایہ راجاؤں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے اور اس کا شوہر قہر قہر کے راجہ کی مدد سے دوبارہ اس گاؤں پر قبضہ کر لے گا۔ چنانچہ وہ صبح شام بھگوان اور اس کے دیوتاؤں کے سامنے مسلمانوں کی شکست کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ نرملہ بھی اپنی ماں کی ہم خیال ہو گئی۔ رنیر اپنے دھرم کا باغی اور اپنے وطن کا دشمن ہونے کے باعث اس کی نگاہ میں بدترین سزا کا مستحق بن چکا تھا۔

ایک دن نرملہ کی ماں شدید بیمار کی حالت میں بستر پر لیٹی نرملہ سے کہہ رہی تھی: ”بیٹی! مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی فوج کو شکست ہوگی۔ تمہارا باپ راجہ کی فوج لے کر آئے گا لیکن میں شاید وہیں چند کے بیٹے کا انجام دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں۔“

”نہیں ماتا جی!“ نرملہ نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”ایسی باتیں نہ کیجیے، آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“

ماں نے کہا: ”بیٹی تم یہ سمجھتی ہو گی کہ تمہارے باپ نے ہمیں دشمن کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگنے میں بے غیرتی کا ثبوت دیا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ وہ اکیلا اتنے آدمیوں سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ وقت کا انتظار کر رہا ہو گا۔“

ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور کہا: ”محل سے باہر گاؤں کے آدمی جمع ہو رہے تھے اور رنیر کے سپاہی گھوڑوں پر زینیں ڈال کر باہر نکل رہے تھے۔ رنیر کا ایک نوکر کہتا ہے کہ وہ کہیں دور جا رہا ہے۔ علاقے کے کئی

ہو سکتا ہے کہ ہم ملک کا بچہ بچہ اس کے راستے میں کھڑا کر دیں اور اسے ایسی شکست دیں کہ وہ دوبارہ اس پوتہ دھرتی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔“

چند اور راجاؤں نے یکے بعد دیگرے جنگ کی حمایت میں تقریریں کیں، اُس کے بعد سرداروں کی بادی آئی اور انھوں نے بھی اس قسم کے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ کالنجھر کے ایک سردار نے ہوراجہ کے بعد سلطنت میں سب سے زیادہ اثر درموج کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ ایک پر جوش تقریر کرتے ہوئے کہا: ”ان دانا! دشمن کی اس جرأت کا جواب صرف تلوار ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔ کالنجھر کا ہر بچہ، جوان اور بوڑھا اپنی گردن کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ جنگ میں ہم یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ کالنجھر کے راجپوتوں کا خون منجمد نہیں ہوا اور ہم شمال کے راجاؤں کی طرح بے غیرت نہیں، جنھوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے قومی عزت اور آں بان کر بیان کر دی، ہماری تلواریں حاضر ہیں۔“

راجہ گنڈا نے کہا: ”کیا کوئی ایسا بھی ہے جو ان شرائط کے ماننے کے حق میں ہو؟“ ”ہمارا راج! کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔“ حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا۔

راجہ نے وفد کے ارکان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم ہمارا جواب سن چکے ہو۔ ہندوستان کی پوتہ دھرتی کے دیوتا تمھارے بادشاہ کے پاپ کا بدلہ لینے کے لیے جس وقت کا انتظار کر رہے تھے وہ آچکا ہے۔ اب وہ ہمارے دیوتاؤں کے عقاب سے نچ کر نہیں جاسکتا۔ اُسے جا کر ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ موت اس کا انتظار کر رہی ہے اور ہماری تلواریں اپنے دیوتاؤں کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہیں۔“

ایک اور فتح

کالنجھر کا حکمران راجہ گنڈا اپنے تخت پر رونق افروز تھا۔ کالنجھر کے بااثر سرداروں کے علاوہ پڑوس کی سلطنتوں کے چند حکمران جو اس کے باجگزار تھے۔ تخت سے نیچے دائیں اور بائیں دو قطاروں میں حسب مراتب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دوسرے درجے کے سردار اور عمدہ دار کرسیوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ عبدالواحد اور غزنی کی فوج کے چار اور افسر تخت کے سامنے کھڑے تھے۔

راجہ کچھ دیر خاموشی سے درباریوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ایک بادشاہ انداز میں کہنے لگا۔ ”میں اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ صلح کے لیے دشمن کی شرائط کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟“

پڑوس کے راجاؤں کے ترجمان کی حیثیت سے گوالیار کے راجہ ادجن نے اٹھ کر جواب دیا۔ ”ہمارا راج! ہم ان شرائط پر صلح کرنے کی بجائے موت کو ترجیح دیں گے۔ دشمن صرف ہماری لاشوں پر پادشہ رکھ کر آگے بڑھ سکتا ہے۔“

ایک اور راجہ نے اٹھ کر کہا۔ ”ان دانا! دشمن نے ایسی شرائط پیش کر کے اس ملک کے کرداروں انسانوں کی توہین کی ہے۔ اس توہین کا بدلہ صرف یہی

سے چند کوس دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کی فوج ایک لاکھ پینتالیس ہزار
بیادہ سپاہیوں، تیس ہزار سواروں اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ سلطان
محمود نے دیکھا کہ جہنا عبود کے اپنے لشکر کو دشمن کے پڑاؤ سے پانچ کوس دور قیام
کا حکم دیا۔

دشمن کی فوجی طاقت کے متعلق اپنے جاسوسوں کی اطلاعات سننے کے بعد
سلطان نے ایک عام سپاہی کے بھیس میں اپنے چند افراد کے ہمراہ دشمن کے
پڑاؤ کا رخ کیا۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر قبل مغرب کی جانب ایک طویل چکر
لگانے کے بعد وہ دور سے دشمن کے پڑاؤ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ دشمن کی فوج کے
نیچے میلوں تک پھیلے ہوئے تھے اور مختلف اطراف سے راجہ گنڈا کے باجگزار
راجاؤں اور سرداروں کی افواج پڑاؤ میں داخل ہو رہی تھیں۔ سلطان نے اُس
سے زیادہ حوصلہ شکن منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور اُسے پہلی بار اس
بات کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ غزنی سے بہت دور آچکا ہے۔ کسی نازک مرحلے پر
اُسے کمک پہنچنے کی امید نہ تھی۔ شکست یا پسائی کی صورت اس کے لشکر کی مکمل
نہاجی یقینی تھی۔

غروب آفتاب کے ساتھ پڑاؤ کے طول و عرض میں ہاتھیوں کی چنگھاڑ
گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور آدمیوں کی چیخ پکار، ناقوس اور گھنٹیوں کی صداؤں
میں دب کر رہ گئی۔ سلطان نے اپنے ساتھیوں کو داپسی کا حکم دیا۔ محفوظی دور
چلنے کے بعد انھوں نے ایک جگہ اتر کر نماز مغرب ادا کی اور دوبارہ اپنے گھوڑوں
پر سوار ہوا۔ اپنے غیموں میں آگئے۔

رات کے تیسرے پہر سلطان اپنے خیمے میں سر بسجود ہو کر یہ دعا مانگ رہا
تھا۔ ”رب العزت! مجھے اس امتحان میں ثابت قدم رہنے کی ہمت دے۔ دشمن

عبدالواحد نے اپنے ساتھیوں کو فارسی زبان میں راجہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھایا
اور پھر راجہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”میں آخری بار یہ کہتا ہوں کہ اگر فوج کے ہمارے
تدبیر سے کام لیں تو ان گنت انسانوں کو بلاوجہ ہلاک ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ریت کے
بند دریاؤں کے سیلاب نہیں روک سکتے۔ تم معترض وہ طوفان دیکھو گے جو اپنے
راستے کی ہر شے کو تنکوں کی طرح اڑا کر لے جائے گا۔ تم اس شخص کی راہ میں الفاظ
کی دیواریں کھڑی نہیں کر سکتے جو اڑ رہی ہیں کی گردیں مروڑنے کے لیے پیدا ہوا
ہے۔ تمہارے دیوتا وہ بھاری پتھر ہیں جن کے بوجھ کے نیچے انسانیت صدیوں
سے پس رہی ہے۔ یہ پتھر اس کے پاؤں کی ٹھوک سے دیزہ دیزہ ہو جائیں گے۔
وہ آئے گا اور ان گنت مظلوموں اور بے گناہوں کی بھجکتی ہوئی دو جلیں اس کا
استقبال کریں گی۔ صدیوں کی روندی اور پس ہوئی انسانیت اس کے گلے میں
پھولوں کے ہار ڈالے گی۔ جو اس کا ساتھ دے گا سرخرو ہو گا اور جو اس کا راستہ
رد کریں گے، کانٹوں کی طرح مسل دیے جائیں گے۔“

حاضرین کے پر خلوص احتجاج نے عبدالواحد کو اپنی تقریر ختم کرنے کا موقع
نہ دیا، چند سردار تلواروں سے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ راجہ نے بلند آواز میں
کہا۔ ”ٹھہرو!“ اور محفل پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

راجہ نے قدرے توقف کے بعد عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم ایک
اچھی کی حدود سے تجاوز کر چکے ہو۔ جاؤ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔“
عبدالواحد کچھ کہے بغیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

(۲)

راجہ گنڈا نے کھلے میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی نیت سے اپنی راجدھانی

تھوڑی دیر کے بعد سلطان چند افسروں کے ہمراہ پڑاؤ کے جنوب مشرقی کونے کا رخ کر رہا تھا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ سامنے سے چند مشعل بروار پہریداروں کی ایک ٹولی آتی ہوئی دکھائی دی۔ سلطان کے ساتھیوں میں سے ایک سوار گھوڑا بھگا کر ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا "کھڑو!"

پہریدار رک گئے اور ان کے ایک ساتھی نے کہا "ہم سلطان معظم کے پاس جا رہے ہیں۔"

"سلطان معظم یہاں ہیں؟" سلطان کے ایک اور ساتھی نے چند قدم سے آواز دی۔

پہریدار ایک نوجوان کو سلطان کے پاس لے آئے اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا "سلطان معظم! میرا نام زبیر ہے۔ آپ کی فوج کا ہندی سالار عبدالوادیجہ جانتا ہے۔ رہت کی لڑائی کے بعد مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔"

سلطان نے گھوڑا بڑھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا "میں جانتا ہوں کو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"عالی جاہ! میرے ساتھ میرے وطن کے پندرہ سردار دو ہزار سپاہی لے کر آپ کی مدد کے لیے آرہے تھے۔ شام کے وقت ہم لوگ یہاں سے مشرق کی طرف کوئی دس کوس کے فاصلے پر جنگل عبور کر رہے تھے کہ ہمیں ایک جگہ گھوڑوں کی ہمنما ہٹ سُنائی دی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو شمال کی طرف ہٹنے کا مشورہ دیا اور خود اس طرف چل دیا۔ گھنے جنگل میں کالنجری فوج کے کسی دستے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور راست کی ناریکی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ جا ملا۔ وہاں سپاہیوں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مشرق کی طرف سے جنگل کے راستے ایک لمبا چکر کاٹ کر

کو اپنی بے شمار فوج اور اپنے ان گنت دیوتاؤں کی اعانت پر بھروسہ ہے لیکن میں صرف تیری رحمت کا سہارا لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے اور میرے سپاہیوں کو ہمت دے کہ ہم اپنے آپ کو تیری رحمت کا حق دار ثابت کر سکیں۔ ہمیں ہمت دے کہ ہم دشمن کے تیروں اور نیزوں کے سامنے سینے تان کر کھڑے ہو سکیں، ہمیں اپنے غازیوں اور اپنے شہیدوں کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ ہم زندگی اور موت میں صرف تیری رضا کے طلب گار ہوں۔ مولائے کویم! جن لوگوں کے سر تیری بارگاہ میں جھکتے ہیں وہ کسی اور کے جلاء و جلال سے مرعوب نہ ہوں ہمیں صرف ایسی زندگی اور ایسی موت کی تمنا دے جو تیرے حبیب کے غلاموں کی شان کے شایان ہو۔"

دُعا کے اختتام پر سلطان کے منہ سے الفاظ کی بجائے صرف چمکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ اچانک اُسے اپنے پڑاؤ کے ایک گوشے میں پہریداروں کا شور و غوغا سُنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پڑاؤ کے طول و عرض میں نقاروں کی صدائیں سُنائی دینے لگیں۔ سلطان نے دُعا ختم کی اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ فوج کے چند افسر خیمے کے دروازے سے باہر کھڑے تھے اور باتی اپنے اپنے دستوں کو کسی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

سلطان نے اس ہنگامے کی وجہ پوچھی تو ایک افسر نے جواب دیا "سلطان معظم پڑاؤ کے شمال مشرقی کونے میں پہریداروں نے اچانک شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ فوج ہر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اب نقارے کی صدا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طرف دشمن کے شب خون کا خطرہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جاسوس پکڑا گیا ہے۔ ابھی تمام حالات معلوم ہو جائیں گے۔"

سلطان نے حکم دیا "میرا گھوڑا لاؤ۔"

سپاہی مشرق کا رخ کر رہے تھے۔ رنیران کا لہا ہر تھا۔ چند کوس چلنے کے بعد رنیر نے ابو عبد اللہ سے کہا۔ ”میرے خیال میں اب دشمن زیادہ دور نہیں ہوگا۔“

ابو عبد اللہ نے فوج کو روکنے کا حکم دیا اور پیادہ سپاہیوں کے سالار سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم اعتدال کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھو۔ ہم دشمن کو دائیں اور بائیں بازو سے گھیرے میں لینے کے بعد اس کے عقب میں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اگر رنیر کا اندازہ صحیح نکلا تو دشمن طلوع سحر سے قبل تمہارے تیروں کی زد میں ہوگا اور ہم اُسے دائیں بائیں اور پیچھے سے ہانک رہے ہوں گے۔ اگر دشمن نے تمہاری صفوں کو توڑ کر نکلنے کی کوشش کی تو سواروں کے چند دستے تمہاری مدد کے لیے پہنچ جائیں گے۔“

(۳)

افنی مشرق سے صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا۔ راجہ گنڈاپنے ہاتھی کے سنہری ہودج میں کھڑا اپنی سپاہ کی قوت و شوکت کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور اس کے پیچھے گھوڑ سواروں اور ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ اور پیادہ سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ ناقوس بجانے اور بھجن گانے والے برہمنوں کی ٹولیاں سپاہیوں کی صفوں میں گھوم رہی تھیں۔ فضا میں ”بھگوان کی جے، دیوتاؤں کی جے ہمارا راجہ کی جے“ کے نعرے گونج رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی ساری قوت مدافعت سمٹ کر اس خطہ زمین پر جمع ہو گئی ہے۔ راجہ نے اپنے اُن باغزار حکمرانوں کی طرف دیکھا جو ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے اور بلند آواز میں چلا یا۔ ”بھگوان کی قسم! اس لشکر کے ساتھ میں دنیا کے آخری گوشے تک دشمن کا پیچھا کر سکتا ہوں۔“

”ہمارا آج کی جے ہو۔“ راجہ کے جاں نثاروں نے یک زبان ہو کر کہا۔

آپ کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کی نیت سے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ سپاہیوں کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پیش قدمی کریں گے۔ پھر سواروں کے دستے کچھ دور ٹرک جائیں گے اور پیادہ سپاہی پڑاؤ کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ صبح ہوتے ہی وہ پڑاؤ پر حملہ کر دیں گے۔ سواروں کے دستے بھی ان کی مدد کریں گے۔ اس کے بعد کالجھ کی فوج عام حملہ شروع کر دے گی۔ میں وہاں سے بھاگ کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور انھیں دشمن کے ان دستوں کے عقب میں رہنے کا مشورہ دیا۔ پھر آپ کی فوج کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ میرا کچھ وقت آپ کے پرے داروں کو یہ یقین دلانے میں بھی ضائع ہوا ہے کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔“

سلطان نے سوال کیا۔ ”ان کی تعداد کے متعلق تمہارا اندازہ کیا ہے؟“

”میرے خیال میں وہ بیس ہزار سے زیادہ ہوں گے۔ سواروں کی تعداد کوئی چار ہزار ہوگی، باقی پیادہ ہیں۔“ رنیر نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں سلطان کی فوج کے پیچیدہ پیچیدہ افسر وہاں جمع ہو چکے تھے سلطان نے اپنے ہراول دستوں کے نامور جنرل ابو عبد اللہ محمد کو حکم دیا کہ تم آٹھ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔“

اس کے بعد اس نے فوج کے باقی افسروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ راجہ صبح سے پہلے اپنا ارادہ تبدیل کر دے گا۔ تاہم تم لوگ مدافعت کے لیے تیار رہو۔ اگر دشمن نے ہم پر حملہ نہ کیا تو ابو عبد اللہ کی کامیابی کے بعد ہم دشمن کی سرزمین کی بے فائدہ اٹھائیں گے۔ عبدالواحد تم چند ہوشیار آدمی لے کر دشمن کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور ہمیں اس کی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔“

تھوڑی دیر بعد ابو عبد اللہ کی قیادت میں بائیس ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ

سے نیر اندازوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ اگر آپ کو خبردار کرنا ضروری نہ ہوتا تو میں دشمن کا گھراؤ کرنا باہر نکلنے کی بجائے لڑکر جان دینا بہتر سمجھتا۔ ہمارے آدمیوں کو دشمن مکمل طور پر نرنے میں لے چکا ہے اور صبح کی روشنی کے ساتھ ہی وہ ان کا مفاہک کر دے گا۔ اب تک شاید.....“

راجہ نے ولی عہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کا پڑاؤ خالی ہوگا اور ہمیں کسی تاخیر کے بغیر حملہ کر دینا چاہیے۔“

ولی عہد نے کہا۔ ”نہیں میں دشمن کے نرنے سے نکل کر اُس کے لشکر کے پڑاؤ کے قریب سے گزرا ہوں۔ پڑاؤ میں اس کی فوج اطمینان سے صاف درست کر رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیش قدمی کے لیے صبح کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ فوج جس نے ہم پر حملہ کیا تھا کسی اور سمت سے آئی تھی۔ ممکن ہے یہ دشمن کی کمک کے دستے ہوں جنہوں نے اپنے پڑاؤ کا رخ کرنے ہوئے ہمیں راستے میں دیکھ لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لیے اپنی فوج کا بیشتر حصہ کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ دشمن کی تعداد ہماری قوت سے بہت زیادہ ثابت ہوگی۔“

راجہ گنڈا کے تمام حوصلے اور دلے بالوسی اور خوف میں تبدیل ہو گئے۔ بھٹوڑی دیر پہلے وہ فتح کے خیال میں گن تھا لیکن اب تصور میں دشمن کی لاتعداد فوج دیکھ کر سراپمہ ہو رہا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی۔

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔
راجہ نے جواب دیا۔ ”ہمارا ج! ہمیں آگے بڑھنے کی بجائے اپنی حفاظت کی فکر کرنی چاہیے۔“

ایک سردار جو اپنے ہاتھی سے اتر کر راجہ کے قریب آچکا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے

ایک سردار گھوڑا دوڑاتا ہوا راجہ کے قریب رکا اور بولا۔ ”ہمارا ج! آگیا اب صبح ہونے والی ہے۔“

راجہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، جب تک راجہمار کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آتی۔ ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس کے حملے سے پہلے دشمن کو چونکا کر دینا ہمارے لیے نقصان دہ ہوگا۔ ہم اس وقت پہنچیں گے۔ جب راجہمار دشمن کی ساری توجہ اپنی طرف پھیر چکا ہوگا۔“

راجہ کے قریب ایک سردار جو اپنے ہاتھی کے ہودج میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں چلایا۔ ”ہمارا ج! ادھر دیکھیے شاید کوئی راجہمار کا پیغام لے کر آ رہا ہے۔“

راجہ دم بخود ہو کر سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ صبح کے دھندلکے میں کچھ فاصلے پر سرسٹ سواروں کی ایک ٹوٹی دکھائی۔ بھٹوڑی دیر میں ایک سوار ہاتھیوں کی قطار کے سامنے سے گزرتا ہوا راجہ کے سامنے رکا۔ یہ کالہجر کا ولی عہد تھا اور راجہ گنڈا اسے دیکھتے ہی کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

”کیا ہوا؟ تم خود کیوں آگے بڑھ رہے ہو؟ بھگوان کے لیے کچھ تو بولو.....“

”ہمارا ج!“ راجہمار نے اپنے باپ کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا ج! دشمن نے ہمیں جنگل سے نکلنے ہی گھیرے میں لے لیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام مذاقہ اس کے آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے بہت کم آدمی زندہ بچ کر نکل سکیں گے۔ دشمن نے پہلے ہمارے دائیں اور بائیں بازو پر حملہ کیا۔ ہم پیچھے ہٹ کر دوبارہ جنگل میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئے لیکن جنگل کا یہ حصہ دشمن کے آدمیوں سے بھر چکا تھا۔ اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ہمارے سامنے دشمن

بغض میں آچکے تھے۔

اس فتح کے چند دن بعد سلطان کا لشکر واپس غزنی کا رخ کر رہا تھا۔ رنیر اور علاقے کے وہ سردار جو اس کے ساتھ آئے تھے، سلطان کے ہمراہ تھے۔ سلطان نے عبدالواحد کو حکم دیا کہ تم ہندی سپاہیوں کے ساتھ تلوچ چلے جاؤ اور میسری راہی تک رہیں رہو ۛ

لگاؤ۔ مہاراج! اگر ہمیں پسپا ہونا پڑا تو دشمن کے سوار آندھی کی طرح ہماری راہدھانی میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لیے ہمیں راہدھانی کی فکر کرنی چاہیے۔“
تھوڑی دیر میں ہمسایہ ریاستوں کے حکمران اور سردار بھی مل جل کر جمع ہو چکے تھے۔ بعض فوری حملے کے حامی تھے لیکن اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اچانک سامنے سے تیس چالیس سوار نمودار ہوئے اور کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر رگ کر چند ثانیے راجہ کی طرف دیکھنے کے بعد واپس چلے گئے۔

ایک سردار نے کہا: ”مہاراج! دشمن حملہ کرنے والا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی فوج قریب آچکی ہے۔ آپ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔“
راجہ گنڈا قدرے رد و قدر کے بعد ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔
فوج کے چیدہ چیدہ سرداروں نے اس کی تقلید کی۔ ایک ساعت کے اندر اندر ساری فوج میں افزائش مچ گئی۔ ناقوس اور زنگوں کی صدائیں انسانوں کی چیخ بکھاریں دب کر رہ گئیں، راجہ کی ٹڈی دل فوج انتہائی انتشار کی حالت میں پسپا ہو رہی تھی۔ ہر سپاہی کے دل پر غواروں کی بھلاکار اور تیروں کی سنناہٹ کے خوف سے کہیں زیادہ ان دیکھے دشمن کا خوف طاری تھا۔

طلوع آفتاب سے تھوڑی دیر بعد سلطان محمود اس مقام سے پانچ کوس دور نیچے کے سامنے کھڑا خمیر کے عالم میں یہ خبر سُن رہا تھا کہ دشمن میدان سے فرار ہو چکا ہے۔ ذات ہاری کے لیے ہونٹوں پر دعائیں اور آنکھوں میں شکر کے آنسو تھے۔ فوج کی قیام گاہ کے طول و عرض میں اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا اور دو پہر تک دشمن کا تعاقب جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ آیا۔ شام تک پانچ سو ہاتھی سلطان کے

اُسے سنا رہے۔“

شبنونا تھ نے جواب دیا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔ میں وید کو بلاتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”گاؤں میں مجھے ایک اندکام بھی ہے۔“

شبنونا تھ نے کہا۔ ”آپ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔ میں جانتا ہوں آپ

کون ہیں۔“

نرملانے تسلیم کر اپنا گھونگھٹ اتار دیا اور غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہاری قید میں ہوں۔“

شبنونا تھ نے جواب دیا۔ ”جب تک ہمارا سردار واپس نہیں آتا، آپ تنہا

اس محل سے باہر نہیں جاسکتیں۔ وہ مجھے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر گیا

ہے۔“

”میری حفاظت!“ نرملانے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم یہ کیوں نہیں کہتے

کہ اپنی ماں کی طرح مجھے بھی صرف موت ہی اس قید خانے سے رہائی دلا سکتی ہے

لیکن یاد رکھو کہ کسی دن تمہارا سردار پھٹائے گا۔“

شبنونا تھ نے کہا۔ ”جب وہ یہاں تھے تو آپ نے کبھی یہاں سے جانے کا

ارادہ ظاہر نہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ آپ اپنی خوشی سے یہاں رہنا چاہتی ہیں۔ اگر

آپ انھیں یہ بتا دیتیں کہ آپ کہیں جانا چاہتی ہیں تو وہ کبھی آپ کو روکنے کی کوشش

نہ کرتے لیکن اب ان کی غیر حاضری میں ہم آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت

نہیں دے سکتے۔“

”میں اپنے باپ کے دشمن، اپنی ماں کے قاتل اور اپنی قوم اور اپنے وطن کے

دشمنوں کے دوست اپنا محافظ سمجھنے کی بجائے مرجانا بہتر سمجھتی ہوں۔“

شبنونا تھ نے کہا۔ ”میں آپ کی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ سردار

جے کرشن کی بیٹی

اپنی ماں کی موت کے بعد نرمل محل میں انتہائی بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔
رنیر کے لیے اس کے دل میں اب نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ رنیر کی
غیر حاضری کے دوران میں اس کی نگہانی شبنونا تھ کے سپرد تھی اور شبنونا تھ کے سلوک
نے اس پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں،
اسے پہلی بار صرف اپنی ماں کی ادھن کے ساتھ مرگھٹ تک جانے کے لیے محل سے
باہر نکلنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن وہاں بھی شبنونا تھ اور چند نوکر اس کے سر پر
کھڑے رہے۔ اس کے بعد بھی اُسے کبھی رنیر کے نوکروں کے پرے میں اپنی
ماں کی سمدھن تک جانے کی اجازت ملتی تھی اور خاص طور پر شبنونا تھ سائے کی
طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ان پابندیوں نے اس کے دل میں فرار ہونے کی خواہش
پیدا کر دی۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح وہ اپنی نوکرانی کا لباس پہن کر گھونگھٹ
نکالے مکان سے باہر نکلی لیکن شبنونا تھ اس کی چال دیکھ کر پہچان گیا اور آگے بڑھ کر
راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس وقت آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں... میں نرمل کے لیے دوا لینے جا رہی ہوں

شہر نائنہ چلا گیا تو نرملہ نے اپنی نوکرانیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”وہ آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دو اور دیکھو جب تک میں آواز نہ دوں، تم میں سے کوئی وہاں نہ آئے۔“

نرملہ نے اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں پڑا ہوا صندوق کھولا اور ایک چمکا ہوا خنجر نکال کر اپنی قمیض میں چھپالیا۔ اس کے بعد وہ اضطراب کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ جلدی سے اپنے پلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ رنیر کے اندر داخل ہوا تو اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی نرملہ نے اپنے جسم میں ایک کپسی سی عسوس کی۔ رنیر کمرے کے درمیان رکا اور ایک ثانیہ نرملہ کی طرف دیکھنے کے بعد آنکھیں نیچی کر کے بولا: ”میں نے ابھی آپ کی ماں کے متعلق سنا ہے۔ مجھے ہمت افسوس ہے۔“

نرملہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ رنیر نے ایک ثانیہ کے لیے پھر اس کی طرف دیکھا اور اضطرابی حالت میں آگے بڑھ کر باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ قد سے قوت کے بعد اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا: ”آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے لیکن اگر میں یہاں ہوتا تو ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ میں آپ کے باپ کو معاف نہیں کر سکتا لیکن ایک عذرت کے ساتھ مجھے کوئی دشمنی نہ تھی۔“

”مجھے آپ سے کوئی لگہ نہیں۔“ نرملہ نے ذرا آگے بڑھ کر اپنی گھبراہٹ پر تابو بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

رنیر نے اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر کہا: ”یہ مکان میری نگاہ میں ایک مند بے ادبیاں کسی کی موت بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے۔“

کی طرف سے ہمیں حکم ہے کہ آپ کی عزت کی جائے۔“

نرملہ کچھ اور کہے بغیر واپس چلی آئی لیکن وہ اپنے دل میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہی تھی: ”تم بچھاؤ گے۔ رنیر کو میرے انتقام سے ڈبنا چاہیے، میں اُسے زندہ نہیں چھوڑ دوں گی۔“

(۲)

ایک دن نرملہ کی نوکرانی اس کے پاس یہ خبر لے کر آئی کہ گاؤں کے لوگ جو رنیر کے ساتھ گئے تھے، واپس آگئے ہیں۔ سلطان محمود کی فوج یہاں سے تین کوس پر بڑا ڈاڑھے ہوئے ہے۔ واپس آنے والے سپاہی بتاتے ہیں کہ سلطان نے رنیر کے ساتھ کالہ بھر کے راجہ کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے تمام سرداروں کو غلہ قسیم کی ہیں اور سلطان کے سامنے علاقے کے تمام سرداروں نے رنیر کو اپنا بڑا سردار مان لیا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر کل روانہ ہو جائے گا اور رنیر انھیں رخصت کرنے کے بعد یہاں آجائے گا۔ سپاہی کہتے ہیں کہ سلطان کی فوج اس گاؤں کے قریب سے گزرے گی۔

اگلے دن نرملہ اپنی نوکرانیوں سمیت بالائی منزل کی چھت پر مسلمانوں کا لشکر گزرتا دیکھ رہی تھی۔

دوپہر کے قریب نرملہ کے پاس شہر نائنہ آیا اور اُس نے کہا: ”مجھے سردار نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انھیں آپ کی ماما کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو وہ ابھی آپ کے پاس آجائیں۔“ نرملہ نے جواب دیا: ”اسے ایک قیدی کے پاس آنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔“

نرملہ نے ایک قدم ادا آگے بڑھتے ہوئے کہا: "اس کمرے میں آپ کی بہن رہا کرتی تھی۔"

"ہاں!" زبیر نے بھرا آئی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اس رات میں یہی سمجھ کر اس کمرے میں داخل ہوا تھا کہ ٹسکنٹلا یہاں ہے۔ نندنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے انتظار میں رات بھر اپنے کمرے میں دیا روشن کرتی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جب وہ یہاں نہ تھی تو آپ کو دیا جلانے کا خیال کیسے آیا۔ میں نے گاؤں کے لوگوں سے سنا ہے کہ ٹسکنٹلا کے ردپوش ہونے کے بعد بھی یہ کمرہ ساری رات روشن رہتا تھا۔ آپ نے شاید ٹسکنٹلا کو دیکھا بھی نہ ہو گا لیکن اگر آپ اُسے ایک بار دیکھ لیتیں تو مجھے اس کی خاطر اس سماج کے خلاف تلوار اٹھانے میں حق بجانب سمجھتیں۔ کاش مجھے کوئی یہ بتا سکے کہ ٹسکنٹلا کہاں ہے؟"

زبیر نے ملا کی طرف دیکھے بغیر بولتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس درخت پر مرکوز تھیں جس سے وہ بچپن میں اس کمرے تک پہنچنے کے لیے ریڑھی کام لیا کرتا تھا۔ وہ اس بات سے غافل نہ تھا کہ نرملہ اس کے بہت قریب آچکی ہے لیکن یہ احساس کہ وہ ٹسکنٹلا کا بھائی اور موہن چند کا بیٹا ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دیوار بن کر حائل ہو چکا تھا۔ غیرت اس کی آنکھوں کے سامنے پراچھا چکی تھی۔ ٹسکنٹلا کے متعلق بڑھتی ہوئی مایوسی نے اُسے تنگوں کا سہارا بنایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نرملہ ضرور ٹسکنٹلا کے متعلق جانتی ہے۔ چنانچہ آج وہ یہ اُمید لے کر آیا تھا کہ شاید نرملہ کا دل پیچ جائے اور وہ ٹسکنٹلا کے بارے میں کچھ بتا دے۔

نرملہ نے زبیر کی گفتگو کے دوران میں دودھ دار کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ہر دفعہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے تیسری دفعہ ہاتھ بلند کیا تو زبیر نے اچانک مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نرملہ کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ زبیر نے جھک کر

خنجر اٹھایا اور نرملہ کو پیش کرتے ہوئے کہا: "آپ مجھے قتل نہیں کر سکتیں۔" نرملہ بھاگ کر منہ کے بل اپنے بستر پر گر پڑی اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا:

"کاش میں آپ کو قتل کر سکتی۔ کاش میں آپ کو اپنا دشمن سمجھ سکتی۔" زبیر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن اس کا لڑنا ہوا ہاتھ نرملہ کے بازو تک پہنچ کر روک گیا۔ ایک جھرجھری لینے کے بعد اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا: "شب سونا تھ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کہیں جانا چاہتی تھیں میں آپ کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ میری قید میں ہیں۔ اگر آپ کو یہاں رہنا پسند نہ ہو تو آپ جاسکتی ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کے رشتہ دار گوالیار میں ہیں۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو میں آپ کو وہاں پہنچانے کا بندوبست کر دوں۔ ٹسکنٹلا کا بھائی کسی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں پہلی اور آخری بار آپ سے اپنی بہن کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے تھوڑی بہت ہمدردی کا مستحق سمجھیں تو مجھے اس کے بارے میں بتا دیں۔ ورنہ میں آپ کو جواب دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں صرت یہ جانا چاہتا ہوں کہ ٹسکنٹلا کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے؟"

نرملہ اٹھ کر بیٹھ اور اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا: "اگر مجھے ٹسکنٹلا کے متعلق علم ہوتا تو میں آپ کو پوچھے بغیر بتا دیتی۔ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے لیکن بھگوان جانتا ہے کہ اس کے متعلق میرے پتا کو بھی کوئی علم نہیں۔ پتا جی نے اُسے ہر جگہ تلاش کرایا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جھوٹ نہیں کہہ سکتیں۔ میں آپ سے آئندہ ہرگز یہ سوال نہیں کروں گا لیکن کیا یہ محض اتفاقی تھا کہ ٹسکنٹلا کے ردپوش ہو جانے کے بعد بھی یہ کمرہ رات بھر روشن رہتا تھا؟ کیا آپ کو یہ معلوم تھا کہ محل میں داخل ہوتے ہی سیدھا اس کمرے میں آؤں گا؟ آپ کی ایک نوکرانی بھی کہتی تھی کہ اس محل میں

رنیر نے کہا: ”شاید ہم دونوں عمر بھر اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ آپ کب اور کہاں جانا چاہتی ہیں؟“

”میں اسی وقت جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”کہاں؟“

”گو ایار، اپنے ماموں کے پاس۔“

”آپ کے پناہی دہاں ہوں گے؟“

”شاید۔“

”اب شام ہونے کو ہے۔ میں علی الصباح آپ کو یہاں سے روانہ کر دوں گا۔“
شبنو ناٹھ آپ کے ہمراہ جائے گا۔“ رنیر یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔

(۳)

رات کو رنیر دیر تک کھلے صحن میں ٹھہرا ہوا۔ آدھی رات کے قریب اس نے اپنے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کی لیکن اُسے نیند نہ آئی۔ نرملہ کا تصور اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا۔ تیسرے پہر اس نے دوسرے کمرے میں جا کر رام ناٹھ کو جگایا اور اسے ساتھ لے کر دریا کی طرف چلا گیا۔ شام کو اس نے رام ناٹھ کو بتایا تھا کہ نرملہ علی الصباح گو ایار جا رہی ہے اور وہ رخصت کے وقت اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ رام ناٹھ اس کے جہیز سے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔

وہ خاموشی سے کچھ دور تک دریا کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ رام ناٹھ نے کہا: ”میں نے سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔“

آنے کے بعد آپ نے کسی رات انہیں اس کمرے کا دیا بچھانے کی اجازت نہیں دی۔ نرملہ نے جواب دیا: ”یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے گاؤں کی عورتوں نے بتایا تھا کہ رات کے وقت شکنتلا کے کمرے میں گھسی دیوی آیا کرتی تھی اور وہ اس کے انتظار میں ہر رات اپنا کمرہ روشن رکھتی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی رہنے کے لیے اسی کمرے کو پسند کیا اور سوتے وقت بھی اسے روشن رکھتی تھی۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے کمرے کی روشنی کسی دن آپ کو دھوکا دے گی۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے شکنتلا کو نہیں دیکھا۔ میں اس کے ردپوش ہونے کے چند دن بعد یہاں آئی تھی۔ اگر میں اُسے دیکھ لیتی تو پتا جی کی ناراضی کا خوف بھی مجھے اس کی حمایت سے باز نہ رکھ سکتا لیکن مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اس کے کسی کام نہ آ سکی۔ یہ میں آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی بلکہ یہ ایک عورت کے متعلق ایک عورت کے جذبات ہیں۔ میں اپنے باپ کے دشمن سے رحم کی بھینک نہیں مانگوں گی۔ اگر مجھ سے اپنی بہن کا بدلہ لے کر آپ کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ میں بے کرشن کی بیٹی ہوں اور آپ مرہن چند کے بیٹے ہیں۔ ابھی اگر میری ہمت جواب نہ دے جاتی تو میں آپ کو قتل کر دیتی۔“
شکنتلا سے ہمدردی کے باوجود آپ کو قتل کرنا میرا فرض تھا۔ آپ کو بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔“

رنیر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس میں نرملہ کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات نہ تھی۔ اس کے سامنے صرف ایک لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس کا ہلکا سا ہنسنے کی بے جا چٹائوں میں بھی نغمے بیدار کر سکتا تھا۔ جس کے آنسو ایک جلا کے سینے میں بھی دھرکنیں بیدار کر سکتے تھے۔ بے کرشن کی بیٹی التجا کرنے کے لیے نہیں حکم دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔“

توڑی دیر بعد جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا تو کسی نے اندرونی صحن میں
کھینے والے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ رنیر نے کہا۔

نرملہ کی ایک خادمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک
تھیلی تھی۔ اس نے کہا: ”یہ تھیلی مجھے نرملہ دے گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کے
پاس پہنچا دوں۔ اس میں وہی زیور ہیں جنہیں آپ نے اس دن واپس لینے سے انکار
کر دیا تھا۔“

رنیر نے کہا: ”تم نے اس سے کیوں لیے؟“

”میں نے اُسے کہا تھا کہ آپ خفا ہوں گے لیکن وہ پھینک کر چلی گئی۔“

”بہت اچھا، اسے اپنے پاس رکھو۔“

”لو کرانی نے کہا: ”اور ہمارے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟“

”کیسا حکم؟“

”ہمارے یہاں رہنے کے متعلق۔“

”اگر تم یہاں رہنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی۔“

خادمہ دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

رنیر نے جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اس کی طرف
غور سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نرملہ صرف ایک عورت نہیں، بلکہ توڑنے پھوڑنے
اور ہلے جانے والی قوت کا نام ہے۔ دیکھنے والے کی نگاہیں اس کے چہرے پر
مرکوز ہونے کی بجائے ادھر ادھر بٹک جاتی ہیں۔ رام ناتھ! تم ایک شاعر ہو اور
شاید ان باتوں کو میری نسبت زیادہ سمجھ سکو۔“

رام ناتھ نے کہا: ”اگر وہ بے کوشش کی بیٹی نہ ہوتی تو آپ کیا کرتے؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ شاید میرے لیے اس کا جانا تکلیف دہ ہوتا۔“

”آپ کو یقین ہے کہ اب اس کا جانا آپ کے لیے تکلیف دہ نہیں۔ آپ ساری
رات نہیں سوئے اور اب بھی آپ کا محل سے دور چلے آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ میں
ایک تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔“

”میں نے کل ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھوں گا۔“

”اور آپ اپنے اس فیصلے پر قائم رہنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں! مجھے یقین ہے کہ اگر میں کم ہمتی کا ثبوت دوں تو بھی ہمارے راستے
ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے۔“

رام ناتھ نے سوال کیا: ”وہ آپ کے متعلق کیا خیال کرتی ہے؟“

”میں نہیں بتانا بھول گیا، اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”پھر تو اس کی حالت آپ کی نسبت زیادہ قابلِ رحم ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔“

”تم سچے شاعر ہو۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

طلوع آفتاب کے وقت رنیر واپس گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ نرملہ جا چکی ہے

ہے اس کا سراغ ضرور مل چکا ہوتا۔ مجھے ابھی تک قطعی طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“

رام ناتھ نے ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”دیکھیے شنبونا تھ آ رہا ہے۔“
رنیر نے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھا۔ سامنے شنبونا تھ آ رہا تھا۔
شنبونا تھ ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ رنیر نے پوچھا: ”بچا شنبو! انہیں پہنچا آئے؟“

”جی ہمارا ج!“ اس نے ہاتھ باندھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔
”راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“
”نہیں ہمارا ج!“

”جے کرشن سے ملے تھے؟“

”نہیں ہمارا ج! وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نرملہ کاموں گھر میں تھا اور کہتا تھا کہ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو تمہارے سردار کے چرن چھونے جاتا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جے کرشن سے بہت نفرت کرتا ہے۔ نرملہ نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔ یہ کہہ کر شنبونا تھ نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکال کر رنیر کو پیش کر دیا۔ رنیر نے خط کھول کر پڑھا۔ نرملہ نے لکھا تھا:۔

”ماموں جان نے حکم دیا ہے کہ میں خط لکھ کر آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اگر پتا جی یہاں موجود ہوتے تو شاید یہ خط ان سے لکھوایا جاتا۔ آپ نے مجھ سے جو نیک سلوک کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بھگوان آپ کو اس کا بدلہ ضرور دے گا اور جس طرح میں اپنے ماموں کے ہاں پہنچ گئی ہوں اسی طرح کسی دن آپ کی بہن بھی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ آپ اس کی تلاش جاری رکھیں۔ میں آپ کو ایک بار پھر اس بات کا یقین

نئی منازل

چند دن بعد دوپہر کے وقت رنیر اور رام ناتھ محل کے بیرونی صحن میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ رام ناتھ ہلکے ہلکے سروں میں گارہا تھا۔

رنیر نے کہا: ”رام ناتھ! ذرا بلند آواز میں گاؤ۔“
رام ناتھ نے جواب دیا: ”گانا کیسا، اب تو آواز گلے سے باہر ہی نہیں نکلتی۔“
کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر رنیر نے کہا: ”رام ناتھ! میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہو اور میں سومنات ہو آؤں۔“
”آپ تنہا رہاں جا کر کیا کریں گے؟“

”ممکن ہے میں وہاں تمہارے اور روپ دتی کے ملاپ کا کوئی راستہ معلوم کر سکوں۔“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اگر آپ کوئی صورت پیدا کر بھی لیں تو بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی جان کے خوف سے آپ کو وہاں جانے دوں؟ موجودہ حالات میں آپ کو سب سے پہلے اپنی بہن کی تلاش کرنا چاہیے۔“
رنیر نے مغموم لہجہ میں کہا: ”میری بہن اگر قہر کی حدود میں ہوتی تو اب تک

دلالتی ہوں کہ آپ کی بہن کے غائب ہونے میں میرے پتا جی کا کوئی ہاتھ نہیں۔

میرے اور آپ کے خاندان کے درمیان نفرت کی جو خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اسے پاٹنا میرے بس کی بات نہیں لیکن اس کے باوجود میں بھگوان سے ہمیشہ یہ دعا کروں گی کہ آپ کی بہن جلد آپ کو مل جائے۔

نرملہ

رنیر نے خط پڑھ کر رام ناٹھ کو دے دیا اور خود گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد رام ناٹھ نے خط واپس دیتے ہوئے کہا: ”میرے دوست! اس خط کا ہر لفظ یہ بتا رہا ہے کہ وہ تم سے پریم کرتی ہے۔“

رنیر نے قدرے جوش میں اکر کہا: ”نہیں رام ناٹھ! اُسے یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میں اس کی باتوں میں اکر اپنے باپ کے قاتل کو بھول جاؤں گا۔ جے کرشن جیسے سنگدل انسان کے متعلق میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں کہ اگر میری بہن اس کے تالو میں آجاتی تو وہ اس کے ساتھ شرافت سے پیش آتا۔ میں وہ وقت بھی کیسے بھول سکتا ہوں جب اس کے ہاتھ میری شہ رگ تک پہنچ چکے تھے۔ جے کرشن نے جس زمین میں کانٹے بوئے ہیں وہاں کیونکر پھول نکلاش کر سکتا ہوں۔ تمہیں میرے سامنے پریم کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے میری غیرت کو ٹھیس لگتی ہے۔ میں نے نرملہ سے جو سلوک کیا اس کا مطلب نہیں کہ میں اس کے باپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔“

رام ناٹھ نے نادم سا ہو کر کہا: ”معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوئی۔“

رنیر نے شہسوناٹھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”چچا شہسوا! جاؤ اب تم آرام کرو۔“

شہسوناٹھ چلا گیا۔ رنیر اور رام ناٹھ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر رام ناٹھ نے کہا: ”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

رنیر نے جواب دیا: ”میرا ارادہ ہے کہ میں قنوج کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں سنگنلا کو دوبارہ تلاش کروں اور اس کے بعد بھیس بدل کر کالنجرجاؤں۔ لیکن ہے اس نے وہاں کسی آشرم یا مندر میں پناہ لے رکھی ہو۔“

(۲)

اگلے دن رنیر اور رام ناٹھ چند لوگوں کے ساتھ قنوج کی مشرقی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوئی تین ہفتوں میں انھوں نے کئی شہر اور گاؤں چھان مائے لیکن سنگنلا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ چوتھے ہفتے وہ جنوبی سرحد کے شہروں اور بستیوں کا دورہ کر رہے تھے کہ رام ناٹھ بیمار ہو گیا۔ رنیر نے اسے ایک گاؤں میں ٹھہرا دیا اور شہسوناٹھ کو اس کی تیمارداری کے لیے چھوڑ کر خود آگے روانہ ہوا۔

پندرہ دن تک ایک وسیع علاقے میں گھومنے کے بعد رنیر واپس آ گیا۔ اب رام ناٹھ کا بخار اتر چکا تھا۔ اس نے کالنجرجے کے سفر میں رنیر کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن رنیر نے اُسے سمجھایا: ”تم ابھی بہت کمزور ہو اور میرا یہ سفر بہت دشوار ہے۔ میں ایک سیاسی کا بھیس بدل کر وہاں جا رہا ہوں۔ مجھے روزانہ کئی کئی کوس پیڈل چلنا پڑے گا۔ شہسوناٹھ کے سوا میں کسی لڑکے کو بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ تم باقی لوگوں کے ساتھ واپس چلے جاؤ اور چند دن میرے گھر میں آرام کرو۔ میں واپس آتے ہی سومات روانہ ہو جاؤں گا۔ رام ناٹھ نے اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا لیکن رنیر نے اُسے مجبور کر کے باقی لوگوں کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔

”حضور! سردار زبیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔“
 عبدالواحد نے چونک کر جواب دیا: ”انہیں فوراً یہاں لے آؤ۔“
 نقوی دیر بعد زبیر کمرے میں داخل ہوا۔ عبدالواحد نے اٹھ کر گر بخوشی سے
 مصافحہ کیا اور اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا: ”اچھا ہوا کہ تم آگئے،
 ورنہ میں تمہارے گاؤں جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ بہن کا کچھ پتہ چلا؟“
 ”نہیں“ زبیر نے مایوسی کی حالت میں گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا: ”میں

نے قنوج کا کوئی نہ چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“
 عبدالواحد نے کہا: ”مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بھی اپنی طرف سے ہر ممکن
 کوشش کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں قنوج کے ہر سردار نے مجھ سے تعاون کیا
 ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ قنوج میں نہیں ہے۔“
 زبیر نے کہا: ”میں ایک سادھو کا بھیس بدل کر کانچر گیا تھا لیکن کئی ہفتے
 ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ مقامی حکومت کا تعاون حاصل کیے
 بغیر میرے لیے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا ممکن نہ تھا۔“

عبدالواحد نے کہا: ”تمہیں مالوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں جب
 ان تمام ریاستوں کی حکومتیں تمہاری بہن کی تلاش اپنا اولین فرض سمجھیں گی۔ خدا کی
 رحمت پر بھروسہ رکھو۔ اگر وہ زندہ ہے تو کسی دن تمہیں ضرور مل جائے گی۔ ہاں!
 وہ تمہارا دوست رام ناتھ کہاں ہے؟“

”رام ناتھ سومات جاپکا ہے اور میں بھی اب وہاں جانے کا ارادہ کر چکا ہوں
 کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ شاید سکنتلا بھی وہیں چلی گئی ہو۔ کچھ عرصہ سے اس
 ملک کے لوگوں نے اپنی تمام امیدیں سومات سے وابستہ کر دی ہیں۔ جن دنوں
 قنوج پر آپ کے حملے کا خدشہ تھا۔ کئی سرداروں نے اپنی نوجوانی لڑکیوں کو سومات

قریباً ڈیڑھ ماہ زبیر اور شبنم ناتھ سنیاسیوں کے بھیس میں کانچر کے مختلف ٹھہروں
 میں گھومتے رہے۔ انہوں نے کانچر کے تمام مشہور مندر اور آشرم دیکھ ڈالے لیکن
 سکنتلا کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد جب وہ دونوں گاؤں پہنچے تو زبیر کو اپنے نوکران
 کی زبانی معلوم ہوا کہ رام ناتھ بیس دن قبل کہیں جاپکا ہے اور اس کے نام ایک خط
 چھوڑ گیا ہے۔ زبیر نے جلدی سے خط کھولا۔ رام ناتھ نے لکھا تھا:۔
 ”میرے دوست!

میں آپ کی اجازت کے بغیر جا رہا ہوں اور آپ کو یہ بتانے کی
 ضرورت نہیں کہ میری منزل کہاں ہے۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ اپنی
 بہن کی تلاش چھوڑ کر میری خاطر وہاں جائیں۔

آپ سے التجا ہے کہ آپ میرا پیچا نہ کریں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہاں
 میری نسبت آپ کو پہچاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ ممکن
 ہے کہ اس علاقے کے کئی آدمی وہاں پہنچ چکے ہوں اور آپ
 بھیس بدل کر بھی ان کی ہنگاموں کو دھوکا نہ دے سکیں۔ میں ایک معمولی
 آدمی ہوں اور انسانوں کی بھڑ میں چھپ سکتا ہوں اور اگر مجھے کسی
 نے پہچان لیا تو بھی روپ وئی کے بغیر اب میرے لیے زندگی کی کوئی
 قیمت نہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔

آپ کا رام ناتھ“

(۳)

عبدالواحد قنوج کے قلعہ میں مقیم تھا۔ ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا
 کہ ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔

ظاہر کیے بغیر بعض لوگوں کو کسی کام پر لگا دیتی ہے۔ سومات تم جا نہیں رہے بلکہ نہیں بھیجا جا رہا ہے۔ سومات ان تاریکیوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ جی کے فلات ہم برسرِ پکار ہیں۔ وہاں جا کر شاید تم یہ محسوس کرو کہ سومات کی تسخیر اس ملک کے مستقبل کے لیے سلطان محمود کی باقی فتوحات کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ سلطان کے دل میں سومات کی تسخیر کا عزم بیدار کرنے کے لیے اس ملک کے بہمنوں کا یہ مشہور کردینا کافی ہے کہ سومات ناقابلِ تسخیر ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کب سومات کا رخ کرے گا لیکن اگر حالات نے اسے مہلت دی تو وہ کسی نہ کسی دن وہاں ضرور پہنچے گا۔ سردست وہاں کے حالات کے متعلق باخبر رہنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ تمہیں وہاں ایسے آدمی ملیں گے جو برسوں سے سلطان کی راہ دیکھ رہے ہیں اور ان کی مدد سے تم وہاں بہت کچھ کر سکو گے۔ گجرات میں عرب کے مسلمان تاجسروں کی کئی بستیاں تھیں لیکن اب سومات کے پجاریوں کے مظالم کے باعث مسلمانوں کی اکثریت مالا بار اور سندھ میں پناہ لے چکی ہے۔ اور جو مسلمان ابھی تک وہاں موجود ہیں، وہ اچھوتوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ سلطان ان لوگوں کی مظلومیت کی داستانیں سن چکا ہے۔ پچھلے چند برس میں کئی دفعہ اس کے پاس آچکے ہیں۔ گجرات کا ایک پراسرار شخص ان لوگوں کی راہنمائی کر رہا ہے۔ وہ ایک سادہ سادہ بھیس میں شہر سے باہر ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ اس کا اصلی نام عبداللہ ہے لیکن عوام میں وہ بھگوان داس کے نام سے مشہور ہے۔ تھانہ سر کے محاصرے کے دوران میں جب وہ ایک وفد کے ساتھ سلطان کے پاس آیا تھا تو میں اس سے ملا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے چند آدمی واپس جانے کی بجائے ہماری فوج میں شامل ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک اسلام کے مبلغ کی حیثیت سے یہاں رہتا ہے۔ وہ تمہیں عبداللہ کے متعلق تمام

بھیج دیا تھا۔ ممکن ہے شکنتلا کچھ مدت ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد کسی قافلے میں شامل ہو کر سومات پہنچ گئی ہو۔ اُسے بچپن میں سومات کا مندر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک سردار کی لڑکی اس کی سہیلی تھی اور اس کے باپ نے اُسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہاں بھیج دیا تھا۔ ایک سال بعد جب وہ واپس اپنے گھر آئی تو وہ ناعلاجانے میں اپنے کمالات کے باعث تمام علاقے کی لڑکیوں کے لیے باعثِ رشک بن چکی تھی۔ پچھلے دنوں جب میں اپنی بہن کی اس سہیلی سے ملا تو اس نے بھی مجھے یہی بتایا کہ شکنتلا کو واقعی سومات دیکھنے کا بہت شوق تھا اور بتا جی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب میں قید سے رہا ہو کر واپس آؤں گا تو ہم سب سومات کی یا تر کو جائیں گے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میری بہن یا تریوں کے کسی قافلے کے سومات پہنچ گئی ہو۔“

عبدالواحد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میرے خیال میں اس کا وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔ تم سے دوبارہ ملنے کی امید پر اس نے اتنی دور جانا گوارا نہیں کیا ہوگا۔“
 رنیر نے کہا۔ ”میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو فریب دے رہا ہوں لیکن اس قسم کے فریب ہی میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں سومات جلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اس فیصلے کی بڑی دہراں ناتھ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس نے سومات کے ایک پجاری کو قتل کر دیا تھا۔ اس لیے میری کوشش یہ تھی کہ اس کی جگہ میں وہاں جاؤں لیکن وہ کانچر سے میری واپسی کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔ اب چار مہینے ہو چکے ہیں، مجھے اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ اس لیے فوراً میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ شکنتلا کی تلاش تو دل کو تسلی دینے کا ایک بہانہ ہے۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”رنیر! کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ قدرت اپنا مقصد

دیر کے لیے خیرہ کرنے کے بعد روپوش ہو جانا ہے؟
 ”آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے کہ قزج کے راہ کی شکست کے باوجود
 یہاں کے باشندے ایک استبدادی نظام کی گرفت سے آزاد نہیں ہوئے۔ سلطان
 کے خوف نے جن سرداروں کو اس کی اطاعت پر مجبور کر دیا ہے وہ لوگوں پر اُسی
 طرح مسلط ہیں اور جب سلطان کا خوف اُٹھ جائے گا تو لوگوں پر عدل و انصاف کے
 جو دروازے آپ نے کھولے ہیں وہ پھر بند ہو جائیں گے اور بہرہ من ایک بار پھر
 لوگوں کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ
 قزج کے کئی سردار جن پر آپ نے اعتماد کیا تھا، پھر راہ گنڈا سے ساز باز کر
 رہے ہیں؟“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن میں ان باتوں سے
 پریشان نہیں، جو کام قدرت نے سلطان کو سونپا ہے وہ پورا ہو رہا ہے۔ اس نے
 ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جو ایک نئے نظام کے لیے سازگار ہیں ان حالات
 سے نائدہ اٹھنا میرا اور آپ کا کام ہے۔ اس نے استبداد کے قلعوں کو مٹا کر دیا ہے
 تاکہ اس ملک کے مہمراز ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھ سکیں۔ اس نے ظلم کے پرچم
 سرنگوں کیے ہیں تاکہ ہم عدل و انصاف اور مساوات کے جھنڈے لہرا سکیں۔ اس
 نے انسان کو سستی اور ذلت کی طرف دھکیلنے والے دیوتاؤں کی موزنیاں توڑی ہیں
 تاکہ ہم انسانیت کا بول بالا کر سکیں۔ وہ ایک سیلاب کی لہر ہے جو اپنی تندی و تیزی
 کی بدولت دریاؤں اور ندیوں کے لیے گزرگاہیں تیار کرتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ ظلم
 کے ایوانوں پر اس کی ضرب آخری ضرب نہیں ہوگی، اس نے جو راستے ہموار کیے
 ہیں وہ کئی فائیتیں کو اس ملک میں آنے کی دعوت دیتے رہیں گے۔ غزنی اور ہندوستان
 کے درمیان اس کے پاؤں کے نشان کسی دن ایک ایسی شاہراہ کا کام دیں گے جس

معلومات ہم پہنچا دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی مشکل کے وقت عبداللہ تمہارے لیے
 بہترین مددگار ثابت ہو گا۔ اگر تمہیں نہیں تو شاید رام ناتھ کو کبھی اس کی ضرورت پڑے۔
 اپنے قیام کے دوران میں اگر تم سو منات کی دفاعی قوت کے متعلق صحیح اعداد و شمار
 فراہم کر سکو تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ میں عبداللہ کی وساطت سے تمہارے
 ساتھ رابطہ قائم رکھوں گا۔ تمہاری غیر حاضری میں تمہاری بہن کی تلاش میں میری طرف
 سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ سلطان شمال کی مہمات سے فارغ ہوتے
 ہی کانہر اور گوالیار کا رخ کرے گا اور ان ریاستوں کی تسخیر کے بعد میں تمہاری بہن
 کی تلاش کے لیے مقامی عوام اور سرداروں کا تعاون حاصل کر سکوں گا۔“

زمیر نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے سفر کا مقصد وسیع کر دیا ہے
 لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے اور میں جانے سے پہلے آپ سے چند باتیں کرنا
 ضروری سمجھتا ہوں۔“

”جتنے یہ کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کہ سلطان کی فتوحات نے ابھی تک وہ
 نتائج پیدا نہیں کیے جن کی مجھے توقع تھی۔ اس نے ظلم کی بوسیدہ عمارتوں کو گرایا ضرور
 ہے لیکن ان کی جگہ وہ عمارت ابھی تک تعمیر نہیں ہوئی جس کے اندر دائمی امن اور
 عدل و انصاف کے تلامش پناہ لے سکیں۔ اس نے کانٹوں کو روند ڈالا ہے لیکن مڑھائے
 ہوئے پھولوں کی آبیاری نہیں کی۔ اُس نے فتوحات حاصل کی ہیں لیکن اس ملک
 کے عوام ان فتوحات کے انعامات سے ابھی تک محروم ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ
 اس ملک میں جو انقلاب اس کی آمد سے پیدا ہوا ہے اس کے اثرات سطحی اور ہنگامی
 ہیں۔ وہ اس سرزمین کی بھیا ننگ تاریکیوں کے لیے ایک نئی مسیح کا آفتاب نہیں
 بلکہ ایک ایسا ستارہ ہے جو آسمان سے لوٹتا ہے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو تھوڑی

انڈیا کی سندیں اپنے خاندانوں کی میراث سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی اُسے فراغت سے بیٹھنے کا موقع نہیں دیا اور ہندوستان میں اس کا تھادام ایک ایسے سماج سے ہے جس کا بااختیار طبقہ حشراتی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان حالات میں سلطان کے لیے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ ایک محدود خطہ زمین پر قابض ہو کر بیٹھ جاتا اور اپنی زندگی اس کے انتظام میں صرف کر دیتا۔ پھر شاید اس کی نگاہ شمال اور جنوب کے در افتادہ ممالک کی طرف نہ اٹھتی لیکن اس نے اپنے لیے دوسرا راستہ منتخب کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قدرت نے اُسے ایک حکمران کی سند پر بٹھانے کی بجائے ایک سپاہی کے فرائض انجام دینے کے لیے منتخب کیا ہے۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے اس کی کامیابی کا راز اپنی ساری فوجی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھنے میں ہے۔

”فرض کیجیے اگر وہ ابتدائی حملوں کے ساتھ ہی لمغان اور دریائے سندھ کے درمیان وسیع علاقوں پر قبضہ جمائے کی کوشش کرتا تو اُسے اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد وہاں رکھنی پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مرکز میں اس کی طاقت کمزور ہو جاتی۔ پھر ایک طرف شمال کے ممالک میں دبے ہوئے عناصر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور دوسری طرف ہندوستان کی سلطنتوں کو اس کے خلاف متحد ہونے کا موقع مل جاتا۔ چنانچہ ان خطرات سے بچنے کے لیے سلطان نے اپنی قوت کو متحد رکھا۔ وہ ایک طرف قریباً ہر سال شمال کے در افتادہ مقامات پر فوج کشی کر کے اپنے حریفوں کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا رہا کہ اس کی قوتِ تسخیر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور دوسری طرف ہندوستان میں وہیں کے حکمران اور اس کے حلیفوں کو پے درپے ضربیں لگانے کے بعد اس نے ان کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست کر دیے۔ چنانچہ آج اس کے مٹھی بھر آدمی کسی

پرہیزی آنے والی نسلیں نت نئے قافلے دیکھیں گی۔ ان مسافروں کے قافلے جن کے ہاتھوں میں تلواروں کی بجائے نوہدایت کی مشعلیں ہوں گی۔ یہ لوگ تم جیسے انسانوں کے ساتھ مل کر اس عمارت کی تکمیل کریں گے جس کی بنیادیں کھودنے کا کام قدرت نے سلطان کے سپرد کیا ہے۔

”اس وقت بھی افغانستان کے پہاڑوں اور لنگا کے میدانوں کے درمیان اسلام کے سینکڑوں مبلغ آزادی کے ساتھ تبلیغ کر رہے ہیں اور وہ اس ملک کے ہزاروں انسانوں کے دلوں پر دائمی فتح حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی پُر امن فتوحات کے نتائج ان فتوحات کی نسبت کہیں زیادہ دور رس ہوں گے جو سلطان نے بڑوشیئر حاصل کی ہیں۔ ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک کے مورخ شاید سلطان محمود کو صرف ایک الواعزم فاتح کی حیثیت سے یاد کریں لیکن جب اس ملک کے مورخ اس کی فتوحات کے قصے لکھیں گے تو وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے کہ وہ ایک نئے زمانے کا نقیب اور ایک نئی روشنی کا مشعل بردار تھا۔ اس نے اس ملک میں صرف مغرور بادشاہوں کی گردنیں نہیں جھکائیں بلکہ ان بنوں کا طلسم بھی توڑ دیا ہے جن کی خدائی میں انسانیت کے ابھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمہارا یہ اعتراف درست ہے کہ سلطان نے اس ملک کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کر کے ان کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا لیکن تمہیں اس کی مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام گھوڑے کی زین پر گزارے ہیں۔ اس کی شاہراہ حیات پر آرام و سکون کے لیے کوئی مقام نہیں۔ اس کی منزل ہمیشہ کوئی رزمگاہ ہوتی ہے۔ جہاں کشائی کے ان تھک و لوسلے نے اُسے جہاں بانی کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان گنت مفتوحہ ممالک پر تسلط قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی موجودہ فوج سے کئی گنا زیادہ فوج کی ضرورت ہے۔ ہندوستان سے باہر اس کا تھادام ان قسمت آزادوں سے ہے جو

بغاوت کے خطرے کے بغیر شمالی ہند کے علاقوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ اگر قدرت نے سلطان کو مہلت دی تو کسی دن یہی حالت وسطی ہندوستان کی ہوگی۔ اب بھی اگر میں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ قنوج میں ٹھہر گیا ہوں اور میرے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہوئی تو اس کی وجہ غزنی کے اس لشکر کا خوف ہے جو ہر صبح پوری قوت کے ساتھ یلغار کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

شکنتلا کی سرگذشت

”میں ان سرداروں کے متعلق قطعاً پریشان نہیں جو سلطان کی اطاعت قبول کرنے کے بعد پھر راج گنڈ اسے اپنی امیدیں وابستہ کر چکے ہیں۔ راج گنڈ اسے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس کے اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کی امیدیں بھی خاک میں مل جائیں گی لیکن اس کے باوجود اگر کچھ عرصہ تک سلطان اپنے تمام مفتوحہ علاقوں پر پوری طرح قبضہ نہ جما سکا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ سوماتا اس ملک کا آخری دفاعی حصار بن چکا ہے۔ سوماتا کی شکست اس ملک کے دیوتاؤں اور ان کے سچاریوں کی آخری شکست ہوگی۔ سوماتا کا بت ہندوستان کا سب سے بڑا بت ہے اور اسے توڑنے کے بعد اس ملک میں سلطان کا مقصد پورا ہو جائے گا“

شکنتلا اپنے بھائی کی واپسی اور گاؤں کے نئے حالات سے بے خبرگی کو س دور گو الیاد کے ایک کسان کے ہاں اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ بچے کرشن کے جلنے کی رات اپنے محل سے فرار ہو کر اس نے تیر کر دریا عبور کیا لیکن اس کے بعد اسے معلوم نہ تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ وہ رات بھر دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ علی الصبح وہ تھکاوٹ سے چور ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ طلوع آفتاب سے تھوڑی دیر قبل پاس کی کسی بستی سے ایک عمر رسیدہ آدمی اور اس کی بیوی وہاں آئے اور شکنتلا سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے سے کشتی کا انتظار کرنے لگے۔ یہ عمر رسیدہ آدمی جس کا نام کیندارنا تھا، گوالیاد کا باشندہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سارے کی لڑکی کی شادی میں یہاں آیا تھا اور اب یہ دونوں گوالیاد واپس جا رہے تھے۔ کیندارنا تھا کہ بیوی نے ایک خوبصورت لڑکی کو جس کے چہرے سے حزن و ملال کے باوجود امارت ٹپک رہی تھی، تنہا دیکھا تو اپنے خاوند سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی کسی مصیبت میں ہے۔ اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کی ہے۔ دیکھو کتنی پیاری صورت ہے۔“

ہے تو ہم تمہیں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچا دیتے ہیں، ان کا گاؤں یہاں سے صرف ایک کوس پر ہے۔“

”نہیں، میں یہاں سے بہت دور جانا چاہتی ہوں۔“

دریا کے دوسرے کنارے سے ایک کشتی آ رہی تھی اور اس پر چند مردوں اور عورتوں کے علاوہ تین گھوڑے بھی لدے ہوئے تھے۔ کشتی کے قریب آتے ہی شکنتلا کرتیں مسلح آدمی دکھائی دیے اور اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ زمین میرے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ شاید وہ مسلح آدمی میری تلاش میں آ رہے ہیں۔“

کیدار ناتھ نے کہا۔ ”اب تمہارے لیے بھاگنے کی کوئی صورت نہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ بھگوان تمہاری مدد کرے گا۔“

شکنتلا کچھ کے بغیر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور کیدار ناتھ کی بیوی نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے چادر کھینچ کر اس کے چہرے پر گھونگھٹ ڈال دیا۔

کشتی کنارے پر لگی اور مسلح آدمی نیچے اتر کر اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے ایک سوار نے آگے بڑھ کر کیدار ناتھ سے سوال کیا۔ ”تم کون ہو؟“

”جی میں ایک غریب کسان ہوں۔“

”تم کہاں سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ کون ہیں؟“

”جی یہ میری بیٹی اور بیوی ہیں۔ ہم یہاں پاس ہی ایک گاؤں سے آئے ہیں میں اپنی بیٹی کو اس کے سسرال سے اپنے گاؤں لے جا رہا ہوں۔“

”تمہارا گاؤں کہاں ہے؟“

”جی میرا گاؤں دریا کے پار کوئی دس کوس کے فاصلے پر ہوگا۔“

کیدار ناتھ نے جواب دیا۔ ”جاؤ اس کا حال پوچھو۔“

کیدار ناتھ کی بیوی اٹھ کر شکنتلا کے پاس جا بیٹھی اور کہا۔ ”بیٹی یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ شکنتلا نے جواب دیا۔

”تمہارا گھر کہاں ہے بیٹی؟“

شکنتلا نے سرسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا کوئی گھر نہیں۔“

کیدار ناتھ کی بیوی نے اپنی چھوٹی سی گٹھری کھولی اور ایک چادر نکال کر شکنتلا کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی تمہیں سردی لگ رہی ہوگی۔“

کیدار ناتھ بھی اٹھ کر قریب آ گیا اور بولا۔ ”بیٹی تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے شکنتلا اٹھی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ایک

طرف چل پڑی۔

”ٹھہرو بیٹی! شاید ہم تمہارے کسی کام آ سکیں۔“ یہ کہتے ہوئے کیدار ناتھ کی بڑا

نے آگے بڑھ کر شکنتلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شکنتلا نے اپنا ہاتھ پھرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دیجیے

آپ میری مدد نہیں کر سکتیں۔ بیڑیوں کی ایک فوج میرا پیچھا کر رہی ہے۔“

کیدار ناتھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! ایک راجپوت کا دھرم اُسے اس

بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک کنیا کو مصیبت میں دیکھ کر منہ پھیر لے۔ ہم پر اعتبار کرو۔“

شکنتلا نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”آپ اس علاقے میں رہتے ہیں؟“

”نہیں، ہم گویا راکے رہنے والے ہیں۔ ہم اپنے ایک رشتہ دار کی لڑکی کی شادی

پر آئے تھے اور اب واپس جا رہے ہیں۔ اگر تمہیں اس علاقے میں کسی مدد کی ضرورت

سے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا تھا۔ وہ ایک معمولی حیثیت کا کسان تھا، لیکن اس کی شرافت اور تدبیر کے باعث گاؤں کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔

گاؤں کا ٹھاکر ایک با اثر آدمی تھا۔ اس پاس کی کئی بستیاں اس کی ملکیت تھیں۔ گیارہ کے راجہ کا وزیر اس کا رشتہ دار تھا اور علاقے کا ہر آدمی اس کے اشارے کو اپنے لیے حکم سمجھتا تھا۔ پڑوس کے سردار اس کے سامنے لوگوں کی طرح کھڑے ہوتے تھے لیکن کیدار ناتھ کا وہ بھی احترام کرتا تھا۔

شکنتلا کے آنے سے کیدار ناتھ اور اس کی بیوی خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پڑوسیوں سے کہا کرتے تھے: ”میرا کھل بیٹھا ہوتا ہے۔ بھگوان نے ہمیں بڑھاپے میں ایک ایسی لڑکی دی ہے جو چاند سے زیادہ سندر اور لگنگا کے پانی سے زیادہ پوتر ہے۔ ہم بے اولاد تھے اور شکنتلا کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بھگوان نے ہم پر دیا کی اور لگنگا کے کنارے ہمیں ایک دوسرے سے ملا دیا۔ چند دن میں شکنتلا کی غویوں کی شہرت ٹھاکر کے محل تک جا پہنچی۔ ٹھاکر کی بیوی نے کیدار ناتھ کی بیوی کو پیغام بھیج کر اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کیدار ناتھ کی بیوی شکنتلا کو بہترین لباس پہنا کر اس کے گھر لے گئی۔ اس ملاقات کے بعد ٹھاکر کی لڑکی بھاگوئی شکنتلا کی بے تکلف سہیلی بن گئی۔

شکنتلا کو یقین تھا کہ جے کہ شن اُسے تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا اور اگر اس نے یہ بات لوگوں پر ظاہر کر دی کہ وہ مومن چند کی بیٹی ہے تو ممکن ہے کہ کسی دلی جے کہ شن کے کانوں تک یہ بات پہنچ جائے۔ چنانچہ کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے سوا جب دوسرے لوگ اس کے ماضی کا تذکرہ چھڑتے تو وہ انہیں صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی کہ دنیا میں میرا ایک بھائی کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی مسلمانوں کی قید میں ہے۔“

”تم کب سے یہاں ہو؟“

”جی ہم کافی دیر سے کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔“

”تم نے اپنے راستے میں ایک فوجیان اور خوبصورت لڑکی کو تو نہیں دیکھا؟“

”جی نہیں۔“

مسلم آدمی ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اسے تھوڑی دور خوردوں اور مردوں کی ایک ٹولی کشتی کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر ان کے قریب جا پہنچا۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کے باقی دو ساتھیوں نے بلند آواز میں کہا: ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ ہم نے بہت آگے نکل کر دریا عبور کیا ہے۔ اس نے دریا پار کرتے ہی پڑوس کی کسی بستی میں چھپنے کی کوشش کی ہوگی۔ اب ہمیں اوپر کی طرف جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پیارے لال اور اس کے ساتھی اسے تلاش بھی کر چکے ہوں۔“

مسلم سوار دریا کے اوپر کی طرف چل پڑے اور شکنتلا، کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئی۔ دریا عبور کرنے کے بعد شکنتلا ایک بار پھر بے بسی اور پریشانی کی حالت میں کھڑی کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیدار ناتھ نے کہا: ”چلو بیٹی! ہمارے ساتھ چلو۔“

شکنتلا نے کہا: ”میں محسوس کرتی ہوں کہ بھگوان نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے لیکن یاد رکھیے کہ آپ نے مجھے اپنی بیٹی کہا ہے۔“

”ہم تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھیں گے۔ چلو!“

شکنتلا ان کے ساتھ چل پڑی۔

(۲)

چند دن کے بعد شکنتلا کیدار ناتھ کے گھر پہنچ چکی تھی۔ کیدار ناتھ کو الیار کی راجہ

ہیں پاؤں رکھتے ہی اس نے رنیر کے گاؤں کے تازہ حالات سنے تو اسے بیحد تعجب ہوا وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ شکنتلا کا بھائی مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے، اردان کی اعانت کے لیے علاقے سے ایک فوج جمع کر کے کالنجر روانہ ہو چکا ہے لیکن راستے کی ہر بستی کے لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ اب اس کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ شکنتلا کو ان واقعات سے کس طرح آگاہ کرے۔ وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا۔ کیا میں واپس جا کر شکنتلا کو یہ بتا سکوں گا کہ تمہارا بھائی اپنے دھرم اور وطن کا دشمن بن چکا ہے؟

رنیر کے گاؤں پہنچ کر کیدار ناتھ نے کالنجر کے راجہ کی شکست کی خبر سنی تو اسے بہت ہمدہ ہوا۔ رنیر کے خلاف اُس کے دل میں پہلے ہی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اب اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ رنیر کی بہن کا ذکر کیے بغیر دریا عبور کر کے اپنی بیوی کے رشتہ داروں کے ہاں چلا گیا۔ وہاں چند دن وہ ایک فہمی کرب میں مبتلا رہا۔ کبھی اُسے یہ خیال آتا کہ وہ رنیر کی آمد کا انتظار کیے بغیر لوٹ جائے اور کبھی اس کے ضمیر کی آواز اس ارادے کی مخالفت کرتی۔

چار دن بعد اُسے رنیر کے گھر واپس آنے کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ ہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان محمود نے رنیر کو کالنجر کی جنگ میں مدد دینے کے صلہ میں علاقے کے تمام سرداروں کا سربراہ بنا دیا ہے تو اس کے دل میں نفرت کی آگ جو کسی حد تک دب چکی تھی پھر بھڑک اٹھی۔ اب اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں دوبارہ رنیر کے گاؤں نہیں جاؤں گا۔ میں اس سے نہیں ملوں گا۔ وہ ہمارے دھرم کے دشمنوں کے ساتھ ناٹھ جوڑنے کے بعد شکنتلا جیسی دیوی کا بھائی نہ کہلانے کا حقدار نہیں۔ شکنتلا کو اب یہی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا بھائی مر چکا ہے۔

دوبارہ کیدار ناتھ شکنتلا کے گاؤں کے حالات پتہ کرنے کے لیے گیا۔ اس نے واپس آ کر رنیر کے گرفتار اور فرار ہونے کے واقعات بتائے اور شکنتلا کو ہدایت کی کہ تمہیں آئندہ بھی کسی پر اپنا بھید ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ جے کہرشن قنوج کے نئے راجہ کے دربار میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر چکا ہے اور قنوج کا نیاراجہ اور گوایار کا جہاراجہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر جے کہرشن کو معلوم ہو جائے کہ تم یہاں ہو تو وہ گاؤں بھی تمہارے لیے محفوظ نہیں ہوگا۔ اس نے تمہارا سراغ لگانے والے کے لیے بہت بڑا انعام مقرر کیا ہے اور علاقے کے تمام سردار اس کے طرفدار بن چکے ہیں۔ تمہارا بھائی دوبارہ اس علاقے میں پاؤں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد اپنے بھائی کے متعلق شکنتلا کی تشویش بڑھتی گئی۔ پھر ایک دن جب اس نے یہ خبر سنی کہ سلطان کی افواج قنوج اور باری کے نئے راجہ کو شکست دینے کے بعد کالنجر کا رخ کر رہی ہیں تو اس نے کیدار ناتھ سے کہا: ”چچا! آپ ایک بار پھر میرے گاؤں ہو آئیں۔ کیا مجھ پر بھائی وہاں پہنچ چکا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد جے کہرشن ہمارے گاؤں پر قابض نہیں رہ سکتا۔ میرا بھائی جہیں سے بیٹھنے والا نہیں۔ اس نے موقع ملتے ہی گاؤں پر حملہ کیا ہوگا میرے بھائی نے دھرم کے لیے جو قربانیاں کی ہیں علاقے کے لوگ اس سے واقف ہیں۔ انھوں نے یقیناً اس کا ساتھ دیا ہوگا۔“

کیدار ناتھ نے کہا: ”میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ جے کہرشن کی تمناش کے لوگ قنوج کے نئے راجہ کے ساتھ ہی ملک چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں گے۔ قنوج کے باشندے اپنے ان سرداروں کے سخت خلاف تھے جنھوں نے ترلوچن کو اپنے باپ کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

کیدار ناتھ اگلے دن ہی اپنے گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ چند دن بعد قنوج کی حدود

سے اس پاس کے تمام سردار مسلمانوں کی اghاحت قبول کر چکے ہیں اور انہوں نے بھی کالج کی جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے۔“

بیوی نے کہا: ”مجھے یقین نہیں آتا کہ شکنتلا کا بھائی ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ تو اُسے انسان کی بجائے دیوتا سمجھتی ہے۔ بھگوان کے لیے یہ باتیں شکنتلا سے نہ کہیں۔ وہ مر جائے گی۔ لوگوں کے طعنے اس کے لیے ناقابل برداشت ہوں گے۔“

”لیکن اسے دھوکے میں رکھنا بھی تو ٹھیک نہیں۔“

بیوی نے جواب دیا: ”اگر وہ ٹیچہ ہو چکا ہے تو شکنتلا کے ساتھ اس کے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ جیسے جی اس کے پاس جانا تو درکنار وہ مر کر بھی یہ گوارا نہ کرے گی کہ ایسا بھائی اس کی لاش کو ہاتھ لگائے۔ بھگوان کے لیے آپ شکنتلا کو کچھ نہ بتائیں۔ صرف اتنا کہہ دیں کہ رنیر ابھی گاؤں نہیں آیا۔ اس کے لیے یہ سوچنا زیادہ آسان ہوگا کہ وہ مر چکا ہے۔ اگر یہ بات چھپی رہی تو ہم شکنتلا کو کسی اچھی جگہ بیاہ سکیں گے۔ ٹھاکر کی بیوی کچھ عرصہ سے شکنتلا پر بہت مہربان ہے۔ ممکن ہے وہ اُسے اپنے لڑکے کے لیے پسند کر لیں لیکن اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ رنیر جیسے بھائی کی بہن ہے تو پھر اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔“

کیدار ناتھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شکنتلا صحن میں داخل ہوئی اور آگے بڑھ کر جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کیدار ناتھ نے اُٹھ کر شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور منموم لہجے میں کہا: ”بیٹی! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی خوشخبری لے کر نہیں آیا۔ تمہارے بھائی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔“

شکنتلا نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا: ”کیا آپ ہمارے گاؤں گئے تھے؟“

”ہاں! لیکن تمہارے بھائی کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”کیا ہمارے محل پر ابھی تک جے کرشن کا قبضہ ہے؟“

کیدار ناتھ کی بیوی اپنے مکان کے صحن میں بیٹھی چہرہ کات رہی تھی۔ باہر گاؤں کے بچوں کا شور مچائی دیا: ”چچا آگیا! چچا آگیا!“ تھوڑی دیر بعد کیدار ناتھ صحن میں داخل ہوا اور اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا: ”شکنتلا کہاں ہے؟“

بیوی نے جواب دیا: ”وہ ٹھاکر کی لڑکی کے پاس گئی ہے۔ آپ نے بہت دن لگا دیے۔ اس کے بھائی کا پتہ چلا؟“

کیدار ناتھ نے جواب دینے کی بجائے سر کٹے کا موٹھا گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ بیوی نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اپنا سوال دہرا نا مناسب نہ سمجھا اور چہرہ چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولی: ”میں ابھی کھانا تیار کرتی ہوں۔“

”نہیں! میں نے راستے میں ایک گاؤں سے کھانا کھا لیا تھا۔ صرف ٹھنڈا پانی لے۔“

”دودھ لادوں؟“

”نہیں! صرف پانی۔“

کیدار ناتھ کی بیوی پانی کا ایک کٹورا لے آئی اور اس کے قریب دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ کیدار ناتھ نے پانی پینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے شکنتلا سے سچی بات کہہ دی تو اسے سیدھا صدمہ ہوگا۔“

”کیا ہوا؟“ بیوی نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

کیدار ناتھ نے جواب دیا: ”اس کے بھائی نے اپنے گاؤں پر قبضہ کر لیا ہے لیکن وہ مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے فوج پر مسلمانوں کا حملہ اسی کی غداری کا نتیجہ تھا۔ کالج کی جنگ میں بھی اُس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی کوشش

”کہاں جا رہے ہو بھتیہ؟“ بھاگوئی نے قریب پہنچ کر سوال کیا۔
 ”ذرا ہر جا رہا ہوں“ اس نے جواب دیا۔

شکنتلا نے بھاگوئی کے بھائی کو دوبار پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ لنگڑا ہے۔ وہ اسے پہلی بار چلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چند قدم آگے جا کر اس نے بھاگوئی سے اس کے لنگڑا کر چلنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا: ”میرا بھائی جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔“

”کون سی جنگ میں؟“ شکنتلا نے سوال کیا۔

”سرسوا کی جنگ میں گوالیار سے ایک فوج سرسوا کے راجہ کی مدد کے لیے گئی تھی۔ بھتیہ بھی اس فوج میں تھے۔ جنگ میں گھوڑے سے گر کر ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ قید ہو گئے۔ واپسی پر مسلمانوں نے بہت سے قیدیوں کو چھوڑ دیا لیکن میرے بھائی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ نندنہ سے چند قیدی رہا ہو کر آئے اور انھوں نے ہمیں بتایا کہ بھتیہ نندنہ کے قلعے میں قید ہیں۔ پتا جی خود وہاں گئے اور فدیہ ادا کر کے بنا کو قید سے چھڑا لائے۔“

”آپ کے بھائی نندنہ میں قید تھے؟“ شکنتلا نے سوال کیا۔

”ہاں!“

”میرا بھائی بھی وہیں تھا۔ شاید اُس کے متعلق کچھ جانتے ہوں۔ ذرا اپنے بھائی صاحب کو بلائیے۔“

بھاگوئی نے فوراً بھائی کو بلانے کے لیے لوکرانی کو بھیجا اور خود شکنتلا کو لے کر اُٹھ کے ایک کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بھاگوئی کا بھائی مگلاب چند بھی وہاں آگیا۔ شکنتلا نے اُسے دیکھتے ہی کسی تمہید کے بغیر سوال کیا: ”میرا بھائی نندنہ کے قلعے میں قید تھا۔ شاید آپ اُسے جانتے ہوں۔ اُس کا نام رنبیر تھا۔“

ایک ثانیہ کے لیے کیدار ناتھ کی ہمت جواب دے گئی لیکن یومی کا اشارہ پار اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا: ”ہاں!“
 شکنتلا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ کیدار ناتھ نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”بیٹی! پہلی بار جب میں وہاں گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ رات کے وقت تمھارے بھائی کو بچے کرشن کے سپاہیوں سے چھڑانے والے مسلمان تھے۔ میں نے یہ بات تمھیں اس لیے نہ بتائی کہ تمھیں دکھ ہوگا۔ اس مرتبہ میں یہ سوچ کر وہاں گیا تھا کہ شاید یہاں سچ ہو اور مسلمانوں نے قنوج کی فتح کے بعد گاؤں پر قبضہ کرنے میں اُسے مدد دی ہو۔“

شکنتلا نے رسیکیاں لیتے ہوئے کہا: ”میرے بھائی کے متعلق آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ دنیا بدل سکتی ہے لیکن وہ نہیں بدل سکتا۔ اگر رنبیر مسلمانوں کی مدد سے بادشاہ بن جائے تو میں اس کے عالیشان محلات کی بجائے بھیک مانگ کر پیٹ پالنے کو ترجیح دوں گی۔“

(۴)

گاؤں کے ٹھا کر کی لڑکی بھاگوئی شکنتلا کی بے تکلف سبیلی بن چکی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن شکنتلا کو اپنے گھر بلا لیا کرتی۔ قنوج سے کیدار ناتھ کی واپسی کے بعد شکنتلا چند دن بے حد غمور رہی۔ بھاگوئی کی لوکرانی اسے دوبار بلانے کے لیے آئی لیکن شکنتلا نے دروں بار اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ایک دن بھاگوئی خود اُس کے پاس آئی اور شکنتلا کو مجبور کر کے ساتھ لے گئی۔ بھاگوئی کے مکان میں داخل ہوتے ہی شکنتلا کو ایک نوجوان دکھائی دیا جو صحنے سے باہر کے دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

ہے بات کہیں تو وہ یہی کہے گا کہ وہ انسان نہیں دیتا تھا۔ آپ کا بھائی بیمار تھا اور وہ اس کی تیمارداری کے لیے آیا کرتا تھا۔ آپ کا بھائی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور اس نے اس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا کی تھی۔ پھر ایسے حالات میں جو آپ نے بیان کیے ہیں اس کا وہاں جانا تعجب کی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے ان میں سے اکثر دوبارہ مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکیں گے۔ شکستہ نے کہا۔ ”اگر وہ زندہ نہ ہوتا اور زندہ نہ کے حاکم نے اس کی مدد کی ہوتی تو اب تک اسے اپنے گاؤں پر قابض ہو جانا چاہیے تھا لیکن چچا کیدار ناتھ حال ہی میں وہاں گیا تھا۔ اسے بھیا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔“

گلاب چند نے کہا۔ ”میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ضرور وہیں گیا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی دوست کے پاس چلا گیا ہو اور اپنا گاؤں دشمن کے قبضے سے چھڑانے کے لیے وقت کا انتظار کر رہا ہو۔ بہر حال اگر وہ زندہ ہے تو کبھی نہ کبھی اپنے گاؤں ضرور آئے گا اگر ضرورت پڑی تو میں خود اس کی تلاش کے لیے جاؤں گا۔“

(۵)

کانجھر کے حکمران کو شکست دینے کے بعد سلطان کو اپنی وسیع سلطنت کے شمالی ممالک کے حالات نے جنوب کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے کی اجازت نہ دی اور اسے اچانک واپس جانا پڑا۔ میدان سے فرار ہونے کے باوجود راجہ گندا کے فوجی نقصانات ایسے نہ تھے کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا۔ کانجھر کے قلعے کو وہ اب بھی ناقابلِ تسخیر خیال کرتا تھا۔ چنانچہ سلطان کی واپسی کے بعد اس نے ایک بار پھر مسلمانوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

عبدالواحد قنوج میں تھا اور اس کی حیثیت ایک گورنر یا حاکم سے زیادہ ایک

”وزیر! وہ آپ کا بھائی تھا؟“ گلاب چند نے شکستہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا آپ اسے جانتے ہیں؟“

گلاب چند نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں اسے جانتا ہوں۔ قلعے کے تمام قیدی اسے جانتے تھے۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟ بھگوان کے لیے مجھے بتائیے!“

گلاب چند نے جواب دیا۔ ”اسے مجھ سے ایک ہفتہ پہلے رپا کر دیا گیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ وہ آپ کے پاس کیوں نہیں آیا۔“

شکستہ نے کہا۔ ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ رہا ہونے کے بعد گھر آیا تھا لیکن ہمارے گاؤں پر ہمارے ایک دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ لیکن بعد میں جان بچا کر کہیں بھاگ گیا۔ بھگوان جانے اب وہ کہاں ہے؟“

گلاب چند کے استفسار پر شکستہ نے قدرے تفصیل سے اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ گلاب چند کچھ دیر سوچتا رہا پھر شکستہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا بھائی ایسے ذلیل دشمن سے ہار ماننے والا نہیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو ضرور دوبارہ زندہ ہو گا۔“

شکستہ کا چہرہ اچانک غصے سے تنہا اٹھا اور اس نے کہا۔ ”میرا بھائی ایسا نہیں وہ مسلمانوں کی مدد سے زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دے گا۔“

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے بھائی ہی کو نہیں جانتا رہا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ان حالات میں ہی کرتا۔“

زندہ کے قلعے کا حاکم ان لوگوں میں سے تھا جنہیں ہر شخص اپنا دوست خیال کرتا ہے۔ آپ اگر زندہ کے کسی قیدی

محسوس کر رہے تھے کہ ان کے لیے عدل و انصاف کے دروازے کھل رہے ہیں، اونچی ذات کے تخت کے قلعے سمار ہو رہے تھے اور بھونپڑیوں میں بسنے والوں کے رلوں میں انسانی اخوت و مساوات کا شعور ابھر رہا تھا۔ دیوتاؤں کی سرزمین میں پہلی بار اچھوت کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔

لیکن چند ماہ بعد اس سیداری کے خلاف رد عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے صرف اقتدار کی مسندوں پر قابض رہنے کے لیے سلطان کی اطاعت قبول کی تھی اب آہستہ آہستہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ نیا شعور ان کی نسلی برتری کے خلاف ایک کھلی بغاوت کا پیش خیمہ ہے۔ وہ ان انسانوں کو ابھرنے اور پیٹنے کا موقع دے رہے ہیں جو کسی دن منوجی کے سماج کے دیوتاؤں کا مذاق اڑائیں گے۔ برہمن جس کی برتری کا راز اچھوت کی تذلیل میں تھا۔ راجپوت سرداروں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھے اور بہت پہلے ہو کار رخ دیکھ چکے تھے۔ وہ سرداروں کے پاس جاتے اور انہیں سمجھاتے کہ تمہارے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اگر تم نے اس ملک میں مسلمانوں کے مذہب کو پھیلنے کا موقع دیا تو تمہیں کسی دن اونچے ایوانوں سے گھسیٹ کر اچھوت کے برابر کھڑا کر دیا جائے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ اور اپنے دھرم کے دشمنوں کو بڑھنے اور پھولنے کا موقع نہ دو۔ راجہ کالنجر مسلمانوں کو اس ملک سے نکالنے کے لیے ایک ایسی فوج جمع کر رہا ہے جو سلطان محمود کے لشکر کو تنکوں کی طرح بہا لے جائے گی۔ تم فیصلہ کن جنگ میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہو۔ برہمنوں کی ان سرگرمیوں کے باعث فوج کے کئی سردار ایک بار پھر راجہ گنڈا کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔

مبلغ کی سی تھی۔ اس کا مقصد اہل فوج کے دلوں پر سلطان کی سطوت اور طاقت کا رعب بٹھانے کی بجائے ان کا ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا، جس کے بغیر اس کے نزدیک اہل ہند کی نجات ممکن نہ تھی۔

شاہی گھرانے کے اقتدار کے خاتمے کے بعد فوج کے بیشتر سردار سلطان کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کالنجر کے حکمران کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر رکھا تھا لیکن راجہ گنڈا کی پسائی کے بعد وہ بھی یکے بعد دیگرے عبدالواحد کے پاس پہنچ کر سلطان کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ سلطان راجہ گنڈا اور اس کے حلیفوں پر آخری ضرب لگانے کے لیے پھر آئے گا۔ عبدالواحد ہر با اثر آدمی کو یہ تلقین کیا کرتا تھا کہ سلطان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صرف زبانی اطاعت کافی نہیں۔ بلکہ عوام کی خوشنودی حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپ اقتدار کی مسندوں پر قابض نہیں رہ سکتے۔ سلطان کے دربار میں اعلیٰ دادی کی تمیز نہیں کی جائے گی۔ وہ جس ضابطہ اخلاق پر ایمان رکھتا ہے وہ انسانوں کو بھیڑیوں اور بھیڑوں کی ٹولیوں میں تقسیم کرنے والے سماج کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔

فوج کے سردار عوام سے زیادہ عبدالواحد اور اس کی وساطت سے سلطان کو خوش کرنے کے لیے اپنی اپنی رعیت کی دوستی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عبدالواحد فوج کے ہر گوشے میں جاتا۔ عوام کی شکایات سناتا اور سرداروں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا۔ اسلام کے مبلغین جن میں بعض ہندی نو مسلم تھے۔ فوج کے شہروں اور بستیوں میں توحید کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ عبدالواحد کی طرح یہ لوگ بھی ناقابل اصلاح سرداروں کے خلاف عوام کی داد رسی کرتے تھے۔ ان حالات میں نیچ ذات کے لوگ مدلیوں کے بعد یہ

ہوتی رہیں پھر گلاب چند لنگھاتا ہوا برآمدے کی طرف چل دیا۔
 گاؤں کے لوگ گلاب چند کے ان ساتھیوں کے گرد جمع ہو رہے تھے جو محل
 سے باہر کھڑے تھے۔ بڑا ٹھا کر بھی انہیں دیکھنے کے لیے باہر نکل گیا۔ شکنتلا اس
 بات سے حیران تھی کہ شکست کے باوجود گلاب چند کے چہرے پر رنج و ملال کے کوئی
 آثار نہ تھے۔ اس نے اطمینان سے ماں کے پاؤں پھونکے کے بعد شکنتلا کی طرف دیکھا
 اور پھر بھاگوئی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں تمہاری سہیلی کے لیے ایک اچھی خبر
 لایا ہوں۔“

”کیسی خبر؟“ بھاگوئی نے سوال کیا۔
 ”گلاب چند نے بھاگوئی کی بجائے شکنتلا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ کا بھائی
 زندہ ہے۔“

ایک نانیہ کے لیے شکنتلا کی تمام حیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں
 اور اس نے مسرت اور اضطراب کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”وہ
 کہاں ہے؟ آپ کو اس کے متعلق کس نے بتایا؟“

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ زندہ
 ہے جس شخص نے مجھے اس کے متعلق یہ اطلاع دی تھی اس نے یہ بتانے سے انکار
 کر دیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بہر حال وہ شاید کل تک خود ہی یہاں پہنچ جائے اور آپ
 کی پریشانی دور ہو جائے۔“
 ”وہ کون ہے؟“

”عبدالواحد جس نے آپ کے بھائی کو قید سے آزاد کیا تھا۔ وہ سلطان محمود
 کی طرف سے صلح کی شرائط کے درجہ کے پاس آیا تھا۔ جب وہ راجہ کے دربار سے
 باہر نکلا تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کی

صبح مسرت

”وہ آ رہے ہیں۔ وہ گوالیار کی سرحد عبور کر چکے ہیں۔ انہوں نے گوالیار کے قلعے کا
 محاصرہ کر لیا ہے۔“ لوگوں نے یکے بعد دیگرے یہ اطلاعات سنیں اور پٹیز اس کے کہ وہ
 اپنی بدحواسی پر قابو پاتے، گوالیار کے طول و عرض میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ ہمارا راجہ
 ارجن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

ٹھا کر کالہ گلاب چند اپنے علاقے سے آٹھ سو سوا ہی لے کر راجہ کی مدد کے
 لیے گیا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ جنگ کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے اس کی
 واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بھاگوئی اپنے بھائی کے متعلق بہت پریشان تھی اور
 کیدار ناتھ نے اس کی دلجوئی کے لیے شکنتلا کو چند دن اس کے گھر رہنے کی اجازت
 دے دی تھی۔ ایک روز دوپہر کے وقت شکنتلا محل کے ایک کمرے میں بھاگوئی
 اور اس کی ماں سے باتیں کر رہی تھی کہ محل سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ یہ
 تینوں جلدی سے اُٹھ کر برآمدے میں آگئیں۔ اتنے میں ایک لوکر بھاگتا ہوا اندر
 آیا اور بلند آواز میں چلایا۔ ”پھوٹے ٹھا کر آگئے۔“

تھوڑی دیر بعد گلاب چند اپنے باپ سے بغلیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر دونوں میں

ہے لیکن میں اس کے متعلق ابھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم رنیر کی بہن سے مرث آنا کہہ دو کہ میں ان کے بھائی کا دوست ہوں اور جب ملوں گا تو ان کی تمام پریشانیوں دور ہو جائیں گی۔ میں عبدالواحد کو گاؤں کا راستہ دکھانے کے لیے اپنا ایک آدمی اس کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ ممکن ہے وہ کل صبح ہی یہاں پہنچ جائے لیکن وہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے گا۔ اس لیے آپ کیدار ناتھ کے ہاں جانے کی بجائے یہیں قیام کریں تو بہتر ہوگا۔“

گلاب چند کی باتوں سے اس کی ماں اور بہن کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ راجہ کی شکست اور گوالیار کے مستقبل سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جس قدر اطمینان سے شکست سے باتیں کر رہا تھا اس قدر بے چینی سے اس کی ماں اور بہن ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر ماں نے کہا۔ ”بیٹا! اب گوالیار کا کیا بنے گا؟“

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ماتا! آپ گوالیار کے متعلق پریشان نہ ہوں۔ گوالیار کا مستقبل اب بھی اس ملک کے راجہ اور اس کے درباریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر انھوں نے صلح کی شرائط کو پورا کیا تو گوالیار کو کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن انھوں نے پھر کوئی غلطی کی تو مسلمانوں کی ضرب بہت سخت ہوگی۔ گوالیار کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف کسی لڑائی میں حصہ نہ لے۔“

بھانجی نے کہا۔ ”کیسی غلطی؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ گوالیار کے لوگوں کو اس شکست کے بعد دوبارہ مراٹھانے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے؟“

گلاب چند نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ گوالیار کے عوام کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اپنا دشمن خیال نہیں کریں گے۔“

ماں نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”بیٹا! کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ اس شکست کی ذلت کو بھول جائیں گے؟“

فوج کے چند اور افسر تھے اور راجہ کا وزیر اور سینا پتی انھیں قلعے کے دروازے تک چھوڑنے جا رہے تھے۔ وزیر اور سینا پتی کی موجودگی میں میرے لیے اس سے بات کرنا مشکل تھا لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ چند ہی باتوں کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”آپ کو رنیر کے متعلق کچھ معلوم ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کی بہن ہمارے گاؤں میں پریشانی کے دن گزار رہی ہے۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ ہم باہر نکل کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

میں اس کے ساتھ باہر چل دیا۔ قلعے سے نکل کر اس نے آپ کے متعلق کئی سوال پوچھے۔ میں نے اسے آپ کی سرگزشت سنادی۔ پھر اس نے کہا۔ ”رنیر کی بہن نے اپنے گاؤں سے اس کا پتہ کیوں نہ لگایا۔“ میں نے اس کے جواب میں اُسے بتایا کہ کیدار ناتھ وہاں گیا تھا لیکن اس نے واپس آکر یہ اطلاع دی تھی کہ ابھی تک گاؤں پر بھے کرشن کی قبضہ ہے اور رنیر کا کوئی پتہ نہیں۔ اس نے کہا۔ ”اگر کیدار ناتھ وہاں گیا ہوتا تو کبھی ایسا نہ کہتا۔“ میں نے اصرار کیا کہ کیدار ناتھ بھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”میں ایک نہایت اہم خدمت تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً اپنے گاؤں جاؤ اور جب تک میں وہاں نہیں پہنچتا، رنیر کی بہن کو اپنی حفاظت میں رکھو۔ اگر مجھے اجازت مل گئی تو میں کل تمہارے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ درنہ ایک اور مہم سے فارغ ہونے کے بعد وہاں آؤں گا۔ کیدار ناتھ کو ہماری اس ملاقات کا علم نہ ہو تو بہتر ہے۔“ میں نے اس سے بار بار یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ رنیر کہاں ہے؟ لیکن اُس نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ رنیر زندہ

”ماتا جی آپ پریشان نہ ہوں۔ تپا جی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“
ٹھا کر کے ساتھ گاؤں کے دو عمریدہ آدمی تھے۔ اس نے برآمدے کی
طرف آنے کی بجائے دور سے گلاب چند کو اشارے سے بلایا اور پھر دیوان خانے
کی طرف چلا گیا۔ گلاب چند برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر اس کے پیچھے ہولیا۔

(۲)

بھاگوتی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا ”شکنتلا! وہ
آ رہے ہیں، وہ اس طرف آ رہے ہیں۔“
شکنتلا جو بھاگوتی کی ماں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، اضطرابی حالت میں اٹھ
کر کھڑی ہو گئی۔ بھاگوتی اور اس کی ماں قدرے وقف کے بعد برابر کے کمرے میں
چلی گئیں اور شکنتلا کمرے میں تنہا کھڑی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے اشتیاق سے دروازے
کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازے سے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس کے دل
کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ گلاب چند نے دروازے کے سامنے آکر اندر جھانکا اور
پھر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تشریف لائیے!“

عبدالواحد بڑے ٹھا کر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شکنتلا کی طرف
ایک نظر دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک موہوم سا خیال اس
کے دماغ کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ اس نے جھپکے ہوئے دوبارہ شکنتلا کی طرف
دیکھا اور چند لمحات کے لیے اس کی نگاہیں شکنتلا کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔
شکنتلا سے ملتی جلتی ایک اور صورت اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی
سطح پر ابھر آئی۔ ”آشا!“ اس کے منہ سے پہلے اختیار نکل گیا۔

گلاب چند نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ رنیر کی بہن ہیں اور ان کا نام شکنتلا ہے۔“

”ماتا! یہ گویا راجہ کے عوام کی شکست نہیں بلکہ اس سماج کی شکست ہے جو
چھوت اور اچھوت کی تفریق پر قائم ہے۔ یہ اس راجہ کی شکست ہے جس نے
اپنی رعایا کو رکھوالوں کی بجائے بھیڑیوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ یہ اونچی ذات
کے ان برہمنوں کی شکست ہے جو اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے۔ اس شکست
کے اثرات صرف ان اونچے ایوانوں میں محسوس کیے جائیں گے جن کی بنیاد بے بس
عوام کی ہڈیوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ ان دیوتاؤں کی شکست ہے جنہوں نے انسانوں
کے درمیان نفرت و حقارت کی دیواریں کھڑی کی ہیں۔ ایک برہمن یا کھتری کو کہا
بات کا افسوس ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ایک نیچ ذات کے برابر کھڑا ہونے کے لیے
تیار نہیں لیکن ایک نیچ ذات اس شکست کو اپنی فتح خیال کرے گا۔“
شکنتلا نے کہا۔ ”آپ راجپوت ہو کر ایسی باتیں کہہ رہے ہیں؟“

گلاب چند نے جواب دیا۔ ”ہاں! ایک راجپوت کی حیثیت سے مجھے ایسی
باتیں نہیں کہنی چاہئیں کیونکہ مجھے اس نام کی بدولت عزت، دولت اور حکومت
ملتی ہے لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ میں راجپوت ہوتے ہوئے بھی اپنی شکست
کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ اب ہمارا مقابلہ اپنے سماج کے اچھوتوں کے
ساتھ نہیں جنہیں ہم اپنی تلواروں اور اپنے دیوتاؤں کی قوت سے مغرب کر سکیں
بلکہ ہمارا مقابلہ ایسے لوگوں سے ہے جو ہر لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔“
شکنتلا نے کہا۔ ”لیکن آپ تو ان سے جنگ کرنے گئے تھے؟“

”میں نے تپا جی کے حکم کی تعمیل کی تھی لیکن جانے سے پہلے مجھے اس بات کا یقین
تھا کہ راجہ معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دے گا۔“

گلاب چند کی ماں نے کہا۔ ”بیٹا! بھگوان کے لیے اپنے تپا جی کے سامنے
ایسی باتیں نہ کرنا۔ وہ آ رہے ہیں۔“

عبدالواحد کو شکنتلا کے الفاظ سے زیادہ اس کی طبعی نگاہوں نے متاثر کیا۔ اس نے کہا: کیا آپ اپنے بھائی کی جان خطرے میں ڈالنا گوارا کریں گی؟
”نہیں!“

”تو پھر آپ ابھی یہ نہ پوچھیے کہ وہ کہاں ہے۔ اس وقت آپ کے لیے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ اُسے آپ کے متعلق اطلاع مل جائے گی۔“
”اُسے کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”نہیں، مجھے کوئی ڈیرہ ماہ قبل اس کا پیغام ملا تھا۔ اسے پہلے اگر کوئی خطرہ تھا تو اب وہ ٹل چکا ہے۔“

”کیا میرا اس کے پاس پہنچنا ممکن نہیں؟“

”نہیں۔ ابھی آپ اس کے پاس نہیں جاسکتیں، اس وقت آپ کا اپنے گھر پہنچنا بہتر ہوگا۔ گلاب چند کا باپ آپ کو وہاں پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ میں اس مقصد کے لیے اپنے چند آدمی بھی چھوڑ جاؤں گا۔ میں خود بھی آپ کے ساتھ چلتا لیکن ہماری فوج کل تک گوالیار سے روانہ ہو جائے گی اور میرے لیے آج ہی واپس جانا ضروری ہے۔ اپنے گاؤں میں آپ کو رنیر کی غیر حاضری میں بھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ بے کرشن جیسے لوگ اس علاقے میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتے۔“
”جے کرشن کہاں ہے؟“

”وہ گاؤں پر ہمارے حملے سے پہلے ہی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔“

”تو گاؤں پر قبضہ کرنے میں آپ نے میرے بھائی کی مدد کی تھی؟“
”ہاں!“

”شکنتلا گمری سوچ میں پڑ گئی۔ ایک طرف کیدار ناتھ کے متعلق اس کا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اسے دھوکے میں رکھنے کی کوشش

عبدالواحد نے چونک کر اپنے پیچھے ٹھا کر اور گلاب چند کی طرف دیکھا پھر نام سا ہو کر شکنتلا سے کہنے لگا: ”معاف کیجیے! میں کسی خیال میں کھو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آسکتا کہ دوسروں میں اس قدر مشابہت ہو سکتی ہے۔ میری نگاہیں تھوڑی دیر کے لیے دھوکا کھا گئیں تھیں۔“

”بڑے ٹھا کر نے کہا۔“ آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے ساتھیوں کو دیکھ آؤں گمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے گلاب چند کو اشارہ کیا اور وہ بھی اُس کے پیچھے ہو گیا۔

”تشریف رکھیے“ عبدالواحد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”شکنتلا جھجکتی ہوئی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔“

عبدالواحد نے کسی تنہید کے بغیر کہا: ”میں نے سنا ہے کہ آپ جس شخص کی پناہ میں ہیں وہ ہر آدمی نہیں لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی کوشش کیوں کی۔ اگر وہ آپ کے گاؤں گیا ہوتا تو یقیناً آپ کے پاس یہ خبر لے کر آتا کہ فوج کے کونے کونے میں آپ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ فوج کے نئے حکمران کی شکست سے چند دن قبل ہی رنیر اپنے گاؤں پر قابض ہو گیا تھا اور اب اس کی زندگی کا مقصد صرف آپ کو تلاش کرنا ہے۔“

”شکنتلا نے کہا۔“ لیکن بھگوان کے لیے مجھے یہ بتائیے کہ اب وہ کہاں ہے؟
”ان دنوں وہ اپنے گاؤں میں نہیں لیکن آپ تسلی رکھیں، وہ مخترب دہاں پہنچ جائے گا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

”ہاں!“

”پھر آپ مجھے کیوں نہیں بتاتے۔ میں اس کی بہن ہوں۔“

صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں۔“

شکستلانے کہا۔ ”میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھیے!“

”گلاب چند نے مجھے بتایا تھا کہ آپ میرے بھائی پر بہت مہربان تھے۔ میں یہ

جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی اس ہمدردی کی وجہ کیا تھی؟“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”آپ کی تسلی کے لیے میں صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس نے ہماری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنی غیرت کا سودا نہیں

کیا تھا۔“

شکستلا اس قدر غیر مبہم الفاظ میں اپنے سوال کا جواب سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے پریشان سی ہو کر کہا۔ ”آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں اپنے بھائی کے متعلق یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اس نے اپنی آن پر دھبہ آنے دیا ہوگا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ قید سے رہا ہونے کے بعد اگر بے کرشن کی دشمنی اس کی زندگی کا راستہ نہ بدل دیتی تو وہ آپ کے متعلق اور آپ اس کے متعلق کیا سوچتے۔ کیا وہ آپ کی مدد حاصل کر کے گاؤں پر قبضہ کرنے اور اس کے بعد کہیں ردپوش ہونے کی بجائے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے قنوج، کالنجرا اور گوالیار کی جنگوں میں حصہ نہ لیتا؟“

عبدالواحد نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر آپ ایسے سوالات پوچھنے میں جلدی نہ کرتیں تو اچھا ہوتا۔ میرا جواب سن کر آپ کو پریشانی ہوگی لیکن وہ دن دور نہیں جب آپ ان باتوں میں اپنے بھائی کی ہم خیال ہوں گی۔ اگر بے کرشن آپ کے گاؤں پر قابض نہ ہوتا اور آپ اور آپ کے پتارنیر کے استقبال کے لیے موجود ہوتے تو بھی وہ ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ نہ لیتا۔ اس کی تلوار ہمارے خلاف صرف اسی وقت بے تک بے نیام ہو سکتی تھی جب تک اس کی آنکھوں پر پردہ

کی ہے اور دوسری طرف وہ عبدالواحد کے متعلق یہ شک کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ہی نگاہ میں دوسروں کو اپنی صداقت اور خلوص کا معترف بنا لیتے ہیں۔ چند لمحات کے اندر اندر اس کے پھرے سے اجنبیت کا نقاب اتر چکا تھا اور شکستلا ایک عورت کی ذکاوت جس سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک چکی تھی۔

عبدالواحد نے کہا۔ ”اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو آپ کی تسلی کے لیے میں گلاب چند کو وہاں بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔“

”نہیں میں گلاب چند سے آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکی ہوں لیکن اگر آپ میرے لیے بالکل اجنبی ہونے تو بھی شاید میں آپ کی کسی بات پر شک نہ کرتی میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ کیدار ناٹھ نے مجھے تاریکی میں رکھنے کی کوشش کیوں کی؟“

”اگر آپ چاہیں تو میں اُسے یہاں بلا لیتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کیدار ناٹھ کو میرے بھائی کی مسلمانوں کے ساتھ دوستی پسند نہ آئی ہو اور اس نے اس خیال سے یہ بات مجھ سے پوشیدہ رکھی ہو کہ مجھے اس سے دکھ ہوگا۔“

”تو اب آپ کا اپنے بھائی کے متعلق کیا خیال ہے؟“

شکستلانے جواب دیا۔ ”میرا بھائی ایک دیوتا ہے اور میں ہمیشہ اس پر فخر کرتی رہوں گی؟“

”آپ نے اپنے گھر جانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

شکستلا کی آنکھیں ڈبڈباتیں اور اس نے کہا۔ ”یہ بھی کوئی سوچنے کی بات؟ میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتی ہوں۔“

عبدالواحد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو یہاں میرا کام ختم ہوا۔ آپ کا

کامنہ لوتھ لپٹے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں عبدالواحد کی نگاہیں کبھی کبھی غیر شعوری طور پر شکستلا کے ہرے کی طرف اٹھ جاتیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ آٹا ایک نئے روپ میں اس کے سامنے آگئی ہے لیکن جب شکستلا اس کی طرف دیکھتی تو اس کی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں۔

جب عبدالواحد اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو شکستلا کے دل میں اچانک کوئی خیال آیا اور اُس نے کہا: ”ٹھہریے! جانے سے پہلے مجھے یہ بتاتے جاتیے کہ نہیر کے متعلق مجھے کب اور کیسے اطلاع ملے گی؟“

عبدالواحد نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ میری ذمہ داری ہے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر میں قنوج واپس آ رہا ہوں اور آپ کو اپنے بھائی کے متعلق باقاعدہ اطلاع ملتی رہے گی۔“

مقوڑی دیر بعد محل سے باہر ٹھا کر اور اس کا بیٹا عبدالواحد کو الوداع کہہ رہے تھے۔ گاؤں کے بہت سے آدمی وہاں جمع تھے۔ عبدالواحد کے ساتھ جو بیس سوار آئے تھے ان میں سے دس شکستلا کے ہمراہ جانے کے لیے ٹھہر گئے اور باقی اس کے ساتھ واپس چلے گئے۔

(۳)

عبدالواحد کے رخصت ہوتے ہی شکستلا نے کیدار ناتھ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ بھاگو نئی بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کو ابھی تک اس بات کا علم نہ تھا کہ سلطان محمود کی فوج کا ایک بڑا افسر صرف شکستلا کی خاطر وہاں آیا تھا۔

تھا۔ یہ پردہ اٹھ جانے کے بعد اس کے لیے ہمیں دشمن کی حیثیت سے دیکھنا ناممکن ہو چکا ہے۔ اب ہمارا راستہ اس کا راستہ اور ہماری منزل اس کی منزل بن چکی ہے۔ یہ ممکن تھا کہ گھرا کر وہ اس منزل کی طرف قدم اٹھانے کا ارادہ بدل دیتا لیکن یہ کبھی ممکن نہ تھا کہ وہ ہمارے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ وہ اگر ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تو بھی اس کی دعائیں ہمارے ساتھ ہوتیں۔ رہے کہ دشمن کی دشمنی کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ وہ زیادہ دیر تذبذب کی حالت میں نہیں رہ سکا۔ یہ ایک تازیانہ تھا جس کی ضرب نے اُسے پوری رفتار سے ہمارے ساتھ دوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

شکستلا نے بے چین سی ہو کر کہا: ”یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ میں آپ سے صرف ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے جھوٹی تسلی نہیں دیں گے۔ ان واقعات کے بعد آپ نے میرے بھائی کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”میں نہیر کا دوست ہونے پر فخر کرتا ہوں۔“
شکستلا نے اچانک اپنے دل میں مسرت کی دھڑکنیں محسوس کیں اور لشکر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا: ”آپ بہت رحم دل ہیں۔ اچھا یہ بتائیے آپ کی قید میں اس کے دن کیسے گزرے۔ رہائی کے وقت اس کی صحت کیسی تھی اور آخری بار جب آپ نے اسے دیکھا تھا تو وہ کیسا تھا؟“

عبدالواحد نے ان سوالات کے جواب میں مختصر طور پر نہیر سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک کے واقعات بیان کر دیے لیکن اختتام پر اس نے سو منات کا ذکر کرنے کی بجائے شکستلا کو صرف یہ بتا دینا کافی سمجھا کہ اب نہیر اس دنیا کے ہر جگہ کرشن کے خلاف جنگ کا اعلان کر چکا ہے اور اب وہ ایک ایسی جگہ کے حالات معلوم کرنے جا چکا ہے جہاں ہزاروں بے کرشن انسانیت

کیدار ناتھ کی بیوی شکنتلا کو دیکھتے ہی اٹھ کر اُسکے بڑھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ ”بیٹی! میں ابھی تمہارے پاس آنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ تمہارے بغیر یہ گھر سونا پڑا تھا۔“

صحن میں ایک کھاٹ اور سرکنڈے کے دو مونڈھے پڑے تھے۔ کیدار ناتھ اندر جا کر ایک اور مونڈھا اٹھا لایا۔ شکنتلا اور بھاگوئی کیدار ناتھ کی بیوی کے قریب مونڈھوں پر بیٹھ گئیں اور کیدار ناتھ ان سے تھوڑی دور کھاٹ پر جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر چاروں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر شکنتلا نے کیدار ناتھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”چچا! میں کل جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ کیدار ناتھ نے چونک کر سوال کیا۔

”اپنے گاؤں!“

کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے چہروں پر اچانک اُداسی چھا گئی۔

شکنتلا نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”چچا! میں مرتے دم تک آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکوں گی لیکن آپ کو مجھے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔“

کیدار ناتھ نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! مجھے صرف اس بات کا خیال تھا کہ میں سچ بول کر تمہارے دکھوں میں اضافہ کروں گا۔ تم اپنے بھائی کو ایک دیوتا سمجھتی تھیں اور مجھے ڈر تھا کہ جب تمہیں اس کے متعلق وہ باتیں معلوم ہوں گی جن کا مجھے پتہ چلا ہے تو تمہاری زندگی اور تلخ ہو جائے گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب ہم کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے تو تم میری نیت پر شک نہیں کرو گی۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ آپ گاؤں گئے تو آپ کو یہ معلوم

ہوا کہ میرا بھائی مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے اور انہوں نے گاؤں پر قبضہ کرنے میں اسے مدد دی ہے۔ اس بات سے آپ کو میرے بھائی سے نفرت ہو گئی لیکن کاش آپ یہ سوچتے کہ میرے بھائی نے صرف میری خاطر یہ سب کچھ کیا تھا۔ اگر یہ باپ تھا تو اس کا باعث میں تھی۔ پھر وہ ان حالات میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے دشمن کو اپنے وطن کی سرحد سے سینکڑوں کوس دور روکنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی۔ اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن قید میں گزارے اور جب وہ رہا ہو کر واپس آیا تو اس کے گھر پر اس کے باپ کا قاتل قبضہ کر چکا تھا اور اسے اپنی بہن کے متعلق اتنا بھی علم نہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ مجھے کرشن نے اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی لیکن قدرت نے اسے بچا لیا۔ اس کے بعد آپ ہی بتائیے کہ وہ کیا کرتا۔ کیا وہ اس راجہ کے پاس جاتا جو بے کرشن کا سر پرست تھا۔ کیا وہ ان پروہتوں کے پاس جاتا جو اب ہمارے پتا جی کی بجائے اس کے قاتل سے دان لینے آتے تھے۔ کیا وہ اس سماج سے بھیک مانگتا جو صرف چڑھتے سورج کی بلو جا کرنا ہے؟ اس نے قوج کو اپنا خون پیش کیا تھا لیکن قوج نے اُسے کیا دیا؟ ذلت، روائی اور بے بسی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا عہد کیا تھا لیکن جب وہ ان کی قید میں زندگی سے مایوس ہو گیا تو انہوں نے اس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا کی۔ پھر جب وہ رہا ہونے کے بعد دنیا کا مظلوم ترین انسان بنا کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی۔ کیا آپ ان واقعات کے بعد اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ تنہا مسلمانوں کے لشکر کے سامنے کھڑا ہو جانا کہ جے کرشن جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے اس دنیا پر مسلط ہو جائیں؟ آپ کو یہ خیال آیا ہو گا کہ مسلمانوں کا ساتھی بننے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا لیکن آج گوالیار کا راجہ بھی مسلمانوں کا ساتھی بن چکا ہے۔“

تو اتنی مدت مسلمانوں کی قید میں نہ رہتا۔ وہ شاید اس وقت بھی قید سے باہر نہ نکلتا جب اس کے مفرد راجے اور مہاراجے چاروں طرف سے ناامید ہو کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر چکے تھے لیکن ایک بہن کی التجاؤں نے اُسے مجبور کر دیا۔ میں نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب میری خاطر تھا۔ کاشش آپ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتے۔ میری نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ ایک دیوتا ہے۔ اُسے بزدلی کا طعنہ دینے والے کون ہیں؟ یہ راجے یہ سردار ادیب برہمن، جن پر محمود کا نام سن کر لڑھکا جاتا ہے؟

ٹسکنٹا کیدار ناٹھ کو قاتل کرنے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیدار ناٹھ نے انتہائی کرب انگیز آواز میں کہا۔ ”بیٹی! اب شاید تم میری کسی بات پر بھی یقین نہ کرو لیکن بھگوان جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے ہمیشہ اس بات سے ندامت رہی کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ تم سے سچی بات کہ دوں لیکن ہر بار میری ہمت جواب دے جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ جب تم حلی جاؤ گی تو یہ بستی ہمارے لیے ویران ہو جائے گی۔ پھر اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے لیے ان باتوں کا سہارا لیتا کہ شاید تم اس کے پاس جانا گوارا نہ کرو لیکن گوالیار کی ٹسکنٹ اور راجہ کی بزدلی کی خبر نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ خاص طور پر جب میں نے سنا کہ گوالیار کے کئی سردار کالج پور چڑھائی کے لیے محمود کا ساتھ دینے کو تیار ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ایک ہار سپرد تمہارے گاؤں جاؤں گا۔ اگر تمہارا بھائی وہاں ہوا تو اسے اپنے ساتھ لے آؤں گا اور پھر تم دونوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہوں گا کہ بھگوان کے لیے میری غلطی کو ایک بوڑھے باپ کی کمزوری سمجھ کر معاف کر دو لیکن اب شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ اگر تم میرے گھر میں بھی جنم لیتیں تو بھی مجھے اس سے زیادہ

کیدار ناٹھ نے مر جھائی ہوئی آوازیں کہا۔ ”بیٹی! میرے پاس تمہاری کسی بات کا جواب نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے یہی فرض کر لو کہ میرے لیے تمہاری جدائی صبر کرنا تھی اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اس بات کا سہارا لیا تھا کہ تم ان حالات میں اپنے بھائی کے پاس جانا گوارا نہیں کر دو گی۔ تمہیں معلوم ہے جب میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے گاؤں کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے بھائی کو بے کرش کی قید سے چھڑانے والے مسلمان تھے اور شاید وہ اُسے گاؤں پر دوبارہ قابض ہونے میں مدد دیں تو تم نے کہا تھا کہ اگر رنیر مسلمانوں کی مدد سے بادشاہ بن جائے تو میں اس کے عالیشان محلوں میں رہنے کی بجائے بھیک مانگ کر پیٹ پالنے کو ترجیح دوں گی“

”میں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ میرے بھائی نے مسلمانوں سے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ اُسے صرف حالات نے اُن کی گود میں ڈال دیا ہے اور ایسے حالات دنیا کے ہر انسان میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ فنوج اور گوالیار کا کوئی راجپوت اُسے بزدلی یا پست ہمتی کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ جن سوداؤں نے غزنی تک مسلمانوں کا تعاقب کرنے کا عہد کیا تھا وہ آج اپنے شہروں اور بستیوں میں ان کا سوا گت کر رہے ہیں۔ آپ کہتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے گوالیار کا رخ کیا تو یہاں کا بچہ بچہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن جان پر کھیلنے والے آج اس بات پر خوشیاں منا رہے ہیں کہ راجہ نے ہتھیار ڈال کر ملک کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ اس دھرتی پر صرف طاقت کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک دن وہ تھا جب ہمارے علاقے کے سردار میرے پتا جی کے اشاروں پر چلتے تھے۔ پھر بے کرشن کی باری آئی اور یہ لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ اب مسلمانوں کا طوطی بول رہا ہے تو یہ ان کے ساتھ مل گئے۔ لیکن مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرا بھائی ان سب سے مختلف ہے۔ اگر وہ طاقت کی پوجا کرنے والوں میں سے ہوتا

(۴)

کالنجہ کا قلعہ ایک وسیع اور بلند پٹان پر تعمیر کیا گیا تھا اور اسے برسوں سے ناقابلِ تخریب سمجھا جاتا تھا۔ قلعے کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس کے اندر پانچ لاکھ انسان ہی ہزار گھوڑے اور پانچ سو ہاتھی باسانی رہ سکتے تھے۔ سپاہیوں کے لیے رسد اور جانوروں کے لیے چارے کے اس قدر ذخائر جمع کیے گئے تھے کہ راجہ کی فوج دہائیوں قلعہ بند ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ یہ عظیم الشان قلعہ وسطی اور مشرقی راجاؤں کی آخری امید تھا اور اس کی تخریب کے بعد گنگا اور گوداوری کے دہانوں تک سلطان محمود کی فتوحات کے راستے کھل جاتے تھے۔

ملک کے طول و عرض میں جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ غزنی کی افواج کالنجہ کا رخ کر رہی ہیں تو مندروں میں راجہ گنڈا کی فتح کے لیے دُعاؤں کی جانے لگیں۔ جنوب اور مشرق کے راجے گنڈا کے حکمران کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے کہ آپ دشمن کے مقابلے میں ڈرٹ جائیں۔ کالنجہ کے قلعے کی دیواریں بڑے سے بڑے طوفان کا رخ پھیر سکتی ہیں۔ ہم آپ کی مدد کیلئے آرہے ہیں۔ اگر آپ نے ہمت ہار دی تو اس طوفان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ ملک کے برہمن لوگوں کو اس قسم کی تسلیاں دے رہے تھے۔ دشمن نے اب اس سمت کا رخ کیا ہے جہاں اُسے تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ ایک پہاڑ سے ٹکرانے جا رہا ہے۔ راجہ گنڈا کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ دشمن کسی طرح قلعے کی دیواریں تک پہنچ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گزشتہ لڑائی میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب بھگوان سے دعا کر کہ دشمن اپنا ارادہ تبدیل نہ کرے۔ فلاں مندر کے فلاں پجاری اور فلاں پر دہست کو دیوتاؤں نے خواب میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ محمود کی فوج غزنی تک پہنچا ہوگی اور اس کے بعد بھارت کے سوراغزنی کی دیواریں تک اس کا تعاقب کریں گے۔“

عزیز نہیں ہو سکتی تھیں۔“

شکنگلہ کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ اُٹھ آئے اور اس نے کہا ”مجھے آپ سے کوئی لگہ نہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ اپنا پتا سمجھتی رہوں گی۔ آپ دونوں میرے ساتھ چلیں۔ رنیرا بھی تک گاؤں واپس نہیں آیا۔“

کیدارنا تھ نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا ”تمہیں اپنے گاؤں کا کوئی آدمی ملا ہے؟“

”نہیں“ شکنگلہ نے جواب دیا۔

”تو پھر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“

شکنگلہ نے اس کے جواب میں عبد الواحد کے ساتھ اپنی ملاقات کا تمام حال بیان کر دیا۔ کیدارنا تھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”بیٹی! تم جا رہی ہو، میں بھگوان سے پرارتنا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں خوش رکھے لیکن ہمیں بھول نہ جانا۔“

”آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گے؟“

”نہیں، ابھی نہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم کسی دن مزدور آئیں گے۔“

بھاگوئی جو انتہائی پریشانی کی حالت میں ان کی گفتگو سُن رہی تھی۔ اچانک بولی ”بھجوا! آپ پریشان نہ ہوں۔ شکنگلہ زیادہ دیر ہم سے دور نہیں رہ سکتی۔ ہم سب کسی دن اس کے گاؤں جائیں گے اور اسے وہاں سے چھین لائیں گے۔“

اگلے دن شکنگلہ اپنے گاؤں کا رخ کر رہی تھی۔ ٹھاکر نے اس کے سفر کے لیے جو انتظامات کیے تھے وہ ایک عالی نسب شہزادی کی شان کے نمایاں تھے۔ وہ بیلوں کے خوبصورت رتھ پر سوار تھی۔ گاؤں کی دو طرفہ اس کی خدمت کے لیے ساتھ تھیں۔ عبد الواحد کے دس سواروں کے علاوہ ٹھاکر کے تیس سوار بھی اس کے ہمراہ تھے۔

عبدالواحد کی بدولت اُسے اپنے بھائی کے متعلق اطلاع ملتی رہے گی لیکن ڈیڑھ مہینہ گزر جانے پر بھی عبدالواحد کی طرف سے رنیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک شام شکنتلا تنہا اپنے محل کی چھت پر ٹھل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں اور شکنتلا وسیع چھت کے درمیان ایک چھوٹی سی بارہ دری میں جا کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بچپن کے ان دنوں کے تصور میں کھو گئی، جب وہ اور رنیر اس جگہ کھڑے ہو کر برسات کا منظر دیکھ کر رہے تھے۔

شبنو ناتھ بانپتا ہوا اور ہنپچا اور بارہ دری میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی! فوج کا حاکم اس علاقے کا دروہ کر رہا ہے۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ دریا کے پار سنت نگر کے سردار کے ہاں قیام کرے گا۔“

”اس نے کوئی پیغام نہیں بھیجا؟“ شکنتلا نے پر امید ہو کر سوال کیا۔

”نہیں، اگر تم چاہو تو میں ابھی اس کے پاس جا کر رنیر کا پتہ پوچھتا ہوں۔“
”نہیں اب شام ہونے والی ہے۔ اگر رنیر کے متعلق کوئی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً یہاں آجائے گا۔“

شبنو ناتھ نے کہا۔ ”اگر رنیر یہاں ہوتا تو فوج کا حاکم اس علاقے میں کسی اور کے پاس کبھی نہ ٹھہرتا۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ وہاں پہنچ چکا ہے؟“

شبنو ناتھ نے جواب دیا۔ ”پار سے جو آدمی آیا ہے اس نے بتایا ہے کہ شام تک وہ سنت نگر پہنچ جائے گا۔“

”تو پھر میں یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ کل ضرور یہاں آئے گا۔ تم نوکر دوں سے کہو کہ یہاں خانے کی صفائی کریں۔“

پھر ایک دن ملک کے طول و عرض میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ غزنی کی فوج کابل کے قلعے کا محاصرہ کر چکی ہے اور چند دن کے بعد لوگ کلیجہ تمام کر یہ خبر سن رہے تھے کہ کابل کے راجہ نے خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ صرف یہی نہیں کابل کی ہمسایہ سلطنتوں کے کئی راجے سلطان کی اطاعت قبول کر چکے تھے ہیں۔ اب اگر مسلمانوں نے پیش قدمی کی تو وہ ملک کی آخری سرحد تک پہنچ جائیں گے لیکن سلطان آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ واپس جا رہا ہے۔ دور شمال میں کسی اور ملک کے حالات اسے بلا رہے ہیں۔ مندروں کے پجاری لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ ”یہ گوان سے دعا کرو، سلطان دوبارہ اس طرف نہ آئے، اب خلیج بنگال تک اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں۔“

دوسری طرف سومنات کے پجاری پہلے سے زیادہ خوش و خرم دشمن کے ساتھ لوگوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ جب تک تمام دیوتاؤں کے پجاری سومنات کے دیوتا کی برتری کا اعتراف نہیں کرتے۔ وہ ہر میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے۔ اگر تم غزنی کے سیلاب کا رخ پھیرنا چاہتے ہو تو سومنات کے پر وہنت کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ۔ مہادیو فوج کا سہرا صرف ان راجوں اور مہاراجوں کے سر باندھیں گے جو مسلمانوں کے حملے کے دن سومنات کے دروازوں پر پرا دے رہے ہوں گے۔ چنانچہ چند مہینوں میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ”سومنات چلو“ کی پکار سنائی دینے لگی۔

(۵)

کابل کے سلطان کی واپسی کے دو مہینے بعد شکنتلا کو معلوم ہوا کہ عبدالواحد پھر فوج کا حاکم بن کر آگیا ہے۔ اسے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ اب

”ہاں مہمان خانے کی حالت بہت خراب ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔“

بارش قدرے تیز ہو چکی تھی۔ شبنونا تھک بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد شکنتلا ایک سوئٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں۔ ”وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ اسے ضرور آنا چاہیے۔ کیدار ناتھ کے گھر سے اپنے گاؤں پہنچنے کے بعد وہ اکثر اسے یاد کیا کرتی تھی۔ اس نے ایسے سماج کے آغوش میں انکو کھولی تھی جس کی بنیاد غیروں سے نفرت پر رکھی گئی تھی لیکن عبدالواحد کا تصور اسے ہر لشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب کر دیا کرتا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد شبنونا تھک کی زبانی اسے کئی اور باتوں کا علم ہوا۔ عبدالواحد نے نسیر کی قید اور رہائی کے واقعات بیان کرتے ہوئے ان زیورات کا ذکر نہیں کیا تھا جو اس نے اپنے بھائی کا فدیہ ادا کرنے کے لیے بھیجے تھے لیکن جب اس نے شبنونا تھک کی زبانی تمام واقعات سنے تو اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔“

گزشتہ ملاقات کے دوران میں شکنتلا کو دیکھتے ہی عبدالواحد کے منہ سے غیر شعوری طور پر ”آشا“ کا لفظ نکل گیا تھا۔ اب وہ اکثر یہ سوچا کرتی تھی ”آشا کون ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ انسان جو دلوں کے قلعے مسخر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے خود کی نگاہوں کا شکار ہو چکا ہو۔ وہ ایک عورت کی ذکاوت جس سے اس کی مسکراہٹوں میں آنسوؤں اور آنہوں کے رُکے ہوئے طوفان دیکھ چکی تھی۔ شبنونا تھک نے اس کے سوالات کے جواب میں صرف یہ بتایا کہ وہ ایک نو مسلم ہے اور نگر کوٹ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ شبنونا تھک کو کچھ معلوم نہ تھا۔ شکنتلا کی ذہنی الجھنوں میں اضافہ کرنے کے لیے یہی کافی تھا۔ اس کا دماغ ہر روز عبدالواحد اور آشا کے متعلق ایک نیا افسانہ تراشا کرتا تھا۔ کبھی وہ یہ سوچتی کہ آشا شاید اس کی بہن ہے۔ جیسے کسی بچے کو کشتن جیسے سنگدل آدمی نے چھین لیا ہے۔ کبھی

یہ خیال کرتی کہ آشا کوئی ایسی لڑکی ہوگی کہ جو اس کی محبت کو ٹھکرا کر کسی اور کی ہو گئی ہے۔ یا شاید کسی المناک حادثے کے باعث وہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی اسے آشا پر زنج آئے لگتا لیکن پھر ضمیر کی طامت سے اس کا دل رز جاتا۔ ”وہ ایک ٹیپھ ہے۔ میرے بھائی کا دوست اور میرا محسن ہونے کے باوجود وہ ایک ٹیپھ ہے۔ اس کی مردانہ وجاہت، اس کی جفا اور ثرافت، نفرت کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے جو ہمارے درمیان حائل ہے۔“

بارش تیز ہو چکی تھی اور فضا میں رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ شکنتلا نیچے آنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شبنونا تھک نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔

”بیٹی شکنتلا نیچے آؤ۔“

”کیا ہے چچا؟“

شبنونا تھک جلدی سے اوپر آیا اور بولا۔ ”بیٹی وہ آگئے ہیں۔“

”کون، عبدالواحد؟“

”ہاں! میں نے انھیں مہمان خانے میں بٹھا دیا ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنے بھیکے ہوئے کپڑے بدل لیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بارش ختم ہوتے ہی سنت نگر واپس چلے جائیں گے۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”بارش شاید آج رات نہ تھے۔ ہمیں ان کے کھانے کی فکر کرنی چاہیے۔ چلو!“

شبنونا تھک نے کہا۔ ”کھانے کے متعلق میں پوچھ چکا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا تھا اس لیے ابھی بھوک نہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی کہتے ہیں۔“

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے شکنتلا نے سوال کیا۔ ”ان کے ساتھ کتنے آدمی

ہیں۔

بھائی کا ایلچی پہنچ گیا۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ اسے شاید وہاں کچھ اور مدت لگ جائے۔ ایلچی نے وہ تمام حالات بھی بیان کیے ہیں جن کے باعث اس کا وہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔

شکستلا نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ابھی تک میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع نہیں ملی۔

”آپ کا بھائی یہاں سے کافی دور ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ اب تک میرا ایلچی اس کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔“

شکستلا نے اُمید یہ ہو کر کہا: بھگوان کے لیے بتائیے وہ کہاں ہے؟

عبدالواحد نے جواب دیا: ”میں نے آپ کو اسی دن بتا دیا ہوتا لیکن ساتھ والے کمرے سے کوئی عورت جھانک رہی تھی اور میں یہ بات صرف آپ تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔“

”وہ گلاب چند کی بہن ہوگی۔ تشریف رکھیں میں ابھی آتی ہوں۔“ شکستلا یہ کہہ کر باہر نکل گئی اور عبدالواحد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شکستلا واپس آئی اور اس نے عبدالواحد کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے: ”اب آپ اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ میں نے نوکرانیوں کو دوسری طرف بھیج دیا ہے۔“

عبدالواحد نے کہا: ”آپ نے صرف ایک جے کرشن دیکھا ہے لیکن اس ملک میں اس وقت ہزاروں جے کرشن موجود ہیں اور اب اس ملک کی زمین ان کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ چاروں اطراف سے سمٹ کر یہاں سے سینکڑوں میل دور ایک مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ اس اُمید پر کہ ان کی متحدہ قوت زمانے کے سیلاب کا رخ پھیر سکے گی اور وہ اس ملک میں عدل و مساوات کا جھنڈا بلند کرنے والوں کو شکست دینے کے بعد انسانوں کی بستیوں کو ایک بار پھر بھیلوں

”صرف تین نوکر ہیں۔ انہیں میں نے باہر کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا ہے۔“

دوسری منزل کے برآمدے میں پہنچ کر شکستلا نے کہا: ”چچا شہسو! میں پہنچے نہیں جاتی تم انہیں ادھر لے آؤ۔“

شہسو ناٹھ نیچے چلا گیا اور شکستلا نوکرانی کو ایک کمرے کی کرسیاں صاف کرنے کا حکم دے کر بے قراری سے ادھر ادھر ٹھٹھنے لگی۔ دوسری نوکرانی نے برآمدے کا نالوس روشن کر دیا۔

(۶)

تھوڑی دیر بعد عبدالواحد اور شہسو ناٹھ برآمدے میں آئے۔ شکستلا دروازے سے ہٹ کر کمرے میں آگئی۔ شہسو ناٹھ عبدالواحد کو کمرے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلا گیا اور عبدالواحد ایک ثانوی توقف کے بعد اندر داخل ہوا۔

”میں آپ کو ونیر کے متعلق کچھ بتانے آیا ہوں۔“ اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

شکستلا خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولا: ”پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، ونیر خیریت سے ہے۔ پانچ دن ہوئے مجھے اس کا پیغام ملا تھا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ سے رخصت ہونے کے بعد میں جلد اس کے پاس اپنا ایلچی نہ بھیج سکا۔ وہ آدمی جو اس کام کے لیے موزوں تھا، قنوج میں تھا۔ کالنجور کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد میں قنوج پہنچا تو وہ بیمار پڑا تھا۔ قریباً ایک ہفتہ کے بعد وہ ٹھیک ہوا اور میں نے اسے ونیر کے پاس روانہ کر دیا۔ اس کی روانگی سے کوئی دس دن بعد میرے پاس آپ کے

عیب و غریب شکلوں میں بدل دیا ہے۔ کبھی یہ پتھر پہاڑوں میں بکھرے ہوئے تھے اور اب تیشے کی کرامت نے انھیں مندروں کی زینت بنا دیا ہے۔ ایک پتھر دریا کے کنارے پڑا ہوا ہے۔ دوسرا آپ کے محل کی دیوار میں لگا ہوا ہے۔ تیسرا پتھر آپ کے گاؤں کی مورتی بن گیا ہے۔ اگر دریا کے کنارے پڑے ہوئے پتھر کو تراش کر مندر میں رکھ دیا جائے اور مندر کے بت کو اٹھا کر آپ کے محل کی دیوار میں لگا دیا جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ذرا اطمینان سے سوچیے کہ سومات کے دروازے کی سیڑھی اور سومات کے مندر کی مورتی کے پتھر میں کیا فرق ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اگر کسی سنگ تراش کی مرضی ہوتی تو سیڑھی کے پتھر کو تراش کر مندر کی مورتی بنا دیتا اور دوسرے پتھر کو سیڑھی میں لگا دیتا۔ اگر آپ ان دو پتھروں کو ٹوڑ کر ان کے ٹکڑے غور سے دیکھیں تو آپ کو کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

شکنتلا اپنے تصورات کی دنیا میں ایک خوفناک زلزلے کے جھٹکے محسوس کر رہی تھی۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی جو آندھی میں اپنے نشیمن کے بکھرتے ہوئے تنکوں کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے سر ابا التجا بن کر کہا: ”نہیں نہیں، یوں نہ کیجیے۔ آپ میرے محسن ہیں لیکن سومات ہمارا دیوتا ہے۔“ عبدالواحد نے کہا: ”ہر انسان اپنے توہمات کی دنیا سے باہر نکلتے ہوئے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ کبھی میں بھی آپ کی طرح تھا۔ مجھے بھی ان مورتیوں سے محبت تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ پتھر کے ان تراشے ہوئے ٹکڑوں کی آڑ میں ہوشیار انسانوں کا ایک گروہ ہمیشہ مادہ دل، کمزور اور بے بس انسانوں کا شرکار کھینچتا رہا ہے۔ اونچی ذات کے لوگ ان مورتیوں کی عظمت اور مہیت کا ڈھنڈورا اس لیے پیٹتے ہیں کہ ایسا کرنے سے انھیں نیچے ذات انسانوں پر برتری حاصل ہوتی ہے اجموت ردیل ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ سراج کی تراشی ہوئی مورتیوں

کی شرکار گاہیں بنا سکیں گے۔ آپ اس مقام کا نام سن کر پریشان ضرور ہوں گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خود بھی زمبر کی جگہ ہوتیں تو یہی کرتیں۔ جس دن جے کرشن کے آدمی زمبر کا نقاب کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اس کی جان بچائی تھی۔ آپ نے رام ناٹھ کی سرگزشت سنی ہوگی۔“

”شکنتلا نے کہا: ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اس نے بھائی کی جان بچائی تھی وہ اس محل میں بھائی کے ساتھ قیام کے دوران سبے حد مخموم رہا کرتا تھا۔ پھر وہ ایک دن اچانک کہیں چلا گیا اور اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلا۔“

”ہیں آپ کو اس کی سرگزشت سناتا ہوں۔ اس کے بعد آپ یہ فیصلہ کر لیں گی کہ آپ کے بھائی کو اس کی مدد کے لیے جانا کس قدر ضروری تھا۔“

”سنائیے!“

عبدالواحد نے مختصر طور پر رام ناٹھ کی زندگی کے حالات سنا دیے۔ شکنتلا کچھ دیر سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا: ”آپ کو یقین ہے کہ وہاں میرے بھائی کو کوئی خطرہ نہیں؟“

”ایک سپاہی کا کوئی کام خطرے سے خالی نہیں ہوتا لیکن آپ پریشان نہ ہوں اگر زمبر کو کوئی خطرہ پیش آیا تو وہاں اس کے بہت سے مددگار موجود ہیں۔“

شکنتلا نے کہا: ”اگر اس پر سومات کے دیوتا کا عتاب نازل ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے پناہ نہیں دے سکے گی۔ وہ دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ آپ کو اس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ اس کا غصہ پہاڑوں کو بھسم کر سکتا ہے۔ مندروں کو رگستان بنا سکتا ہے۔ بھگوان کے لیے اسے واپس بلا لیجیے۔“

عبدالواحد نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”سومات کے مندر میں ان بھاری پتھروں کے سوا کچھ نہیں، جنھیں سنگ تراشوں کی محنت نے

فالٹ کے سامنے سر جھکا دے گا تو اس ملک کے برہمن، کھشتری، ویشی اور
اچوت ایک ہی سطح پر نظر آئیں گے۔ اچھائی اور بُرائی کی تیز خون سے نہیں بلکہ
اعمال سے کی جائے گی۔ نحیف اور لاعز انسانوں پر اپنا بوجھ لادنے والے نہیں
بلکہ ان کا بوجھ اٹھانے والے قابل عزت سمجھے جائیں گے۔ اب ان دیوتاؤں کا زمانہ
ختم ہو گیا ہے۔ جن کی بدولت اس ملک میں صرف ظلم کا بول بالا ہوتا تھا۔ اب قانون
کے ترازو کا پلڑا صرف برہمن کی طرف نہیں جھکے گا۔ اب جسے کرشن جیسے لوگ مجرموں
کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔“

شکنتلا نے عاجزی ہو کر کہا۔ ”میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی لیکن
آپ مجھے اپنے دیوتاؤں سے بظن کرنے پر کیوں مہر ہیں؟“
”اس لیے کہ آپ زہیر کی بہن ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ زندگی میں آپ
کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔“
شکنتلا کے جسم پر اچانک کپکپی طاری ہو گئی اور اس میں سمی ہوئی آوازیں کہا
”تو کیا وہ مسلمان ہو چکا ہے؟“

”نہیں، اس نے ابھی مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا لیکن میں اس کے دل کا
حال جانتا ہوں۔ اس کا دل اسلام کی صداقت پر ایمان لا چکا ہے لیکن ابھی تک وہ اس
بات کا اعلان کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری ایک
بہن کی محبت ہے۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان ہو جانے کے بعد آپ
سے دوبارہ ملنے کے امکانات کہیں ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائیں۔ وہ اس نئی
دنیا میں پاؤں رکھنے سے پہلے آپ کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ میری
ان باتوں سے پریشان نہ ہوں۔ کم از کم آپ کو اپنے بھائی کے متعلق یہ یقین ضرور ہونا
چاہیے کہ وہ کسی لالچ یا خوف کے باعث اپنا دھرم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں

کے سامنے آئیں، خون اور پسینہ پیش کرنا ہے۔ برہمن پوتر ہے اس لیے اسے حق ہے
کہ وہ ان پتھروں کے نام پر ملک کی تمام دولت سمیٹ کر اپنے مندروں میں جمع کر
لے۔ ان بتوں نے انسان اور انسان کے درمیان نفرت اور تعادلت کے پسار
کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ٹوٹنا ضروری ہے۔ ان پر سونے کے غلاف چڑھانے
انھیں ہیروں اور موتیوں سے بچانے اور ان کے لیے عظیم الشان مندر تعمیر کرنے
کے باوجود ادبچی ذات کے انسانوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بیچ ذات کے انسانوں
کو قدرت کے ہر انعام سے محروم کر دیں۔ کیا یہ مذاق نہیں کہ بھگوان نے پہلے
ادبچی ذات کے انسانوں کو بنایا۔ پھر اچھوتوں کو پیدا کیا اور پھر ان پتھروں کو بنایا
تاکہ وہ انھیں تراش کر سورتیاں بنائیں اور بھگوان کو خوش کرنے کے لیے ان موتیوں
کے سامنے اچھوت کا بیدان پیش کریں۔ کیا ان بتوں کا ٹوٹنا ضروری نہیں جو برہمن
کے بھجن سُن کر خوش ہوتے ہیں لیکن شودر کی شاہ رگ سے خون کی دھارا ان کے پاؤں
دھونے کے بعد بھی انھیں متاثر نہیں کر سکتی۔ کیا ان بتوں میں اس خالق کا قصور سما
سکتا ہے جس کے حکم سے چاند، سورج اور ستارے گردش کرتے ہیں جو مٹی سے
پھول پیدا کرتا ہے، جس نے چھوت اور اچھوت کو ایک ماحجم، ایک سی
آنکھیں اور ایک سادل و دماغ عطا کیا ہے۔ کیا اس کے سورج کی روشنی اچھوت
کے گھر تک نہیں پہنچتی؟ اس کے بادل شودر کی کھیتی پر نہیں برستے؟ کیا جو بیج شودر
کے ہاتھوں زمین میں لویا جاتا ہے وہ درخت نہیں بنتا؟ پھر اس سماج میں صرف شودر
ہی مظلوم نہیں۔ یہاں ہر طاقت ور مظلوم کا گلا گھونٹتا ہے۔ جو دیوتا ایک برہمن
یا کھشتری کو شودر پر ظلم کرنے کی اجازت دیتے ہیں، وہ انھیں ایک دوسرے کا
گلا کاٹنے سے منع نہیں کر سکتے۔

جب انسانوں کے تراشے ہوئے بت ٹوٹ جائیں گے اور انسان اپنے

ہوگا۔

شکستلانے کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا بھائی جو راستہ اختیار کرے گا مجھے اس پر چلنا پڑے گا۔ میں اس کے پیچھے آگ میں کودنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔“

عبدالواحد نے کہا: ”اسلام اندھی تقلید نہیں سکھاتا۔ یہ زندگی کا ایک اصول ہے جس پر ایمان لانے سے پہلے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔ پھر شاید آپ کو یہ محسوس ہو کہ آپ مجبوری کی حالت میں نہیں بلکہ خوشی سے اپنے بھائی کا ساتھ دے رہی ہیں لیکن اب مجھے دیر ہو رہی ہے میں پھر آؤں گا۔ آپ بھی شاید میری باتوں سے اکتا گئی ہوں۔“

شکستلانے: ”نہیں، میں سننا چاہتی ہوں۔ ابھی بارش نہیں تھپی۔ آپ صبح چلے جاتیں۔“

عبدالواحد نے مختصراً اسلام کے ابتدائی اصول، پیغمبر اسلام کی زندگی کے حالات اور کفر و اسلام کی جنگوں کے واقعات بیان کیے۔ اس کی تفسیر کے دوران میں شکستلابہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو رہا ہے۔ عبدالواحد کے اختتام پر اس نے سوال کیا: ”کیا سلطان خود بھی اس زمانے کے مسلمانوں کے نقش قدم پر چل رہا ہے؟“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”وہ لوگ انسانیت کا بہترین نمونہ تھے اور سلطان کو ان کے ساتھ کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی فتوحات اسلام کے ان مبلغوں کے لیے راستہ صاف کر دیں گی جن میں ہم اس زمانے کے مسلمانوں کی جھلک دیکھ سکیں گے۔ سلطان نے قلعوں کو فتح کیا ہے لیکن یہ لوگ انسانوں کے دلوں کو سفر کریں گے۔ شمال کے علاقوں میں وہ درویش خصلت انسان پتہ چکے ہیں

جن کی ہڈیاں ہوں کی قوتِ تسخیر محمود کی تلوار سے کہیں زیادہ ہے۔“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر عبدالواحد نے کہا: ”مجھے اب اجازت دیجیے میں علی الصباح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں دو ہفتوں کے اندر اندر اپنا درہ ختم کر کے عزنی جا رہا ہوں۔ وہاں شاید مجھے کچھ مدت ٹھہرنا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں سے مجھے کسی اور طرف بھیج دیا جائے لیکن میری غیر حاضری میں آپ کو اپنے بھائی کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قنوج میں میرا قاتل تمام آپ کو زہر کا پتہ دیتا رہے گا۔ جب زہر آئے گا تو اسے میرا سلام کہہ دیں۔“

شکستلابہ کے چہرے پر اچانک اداسی چھا گئی۔ اس نے منہموم آوازیں کہا: ”اگر آپ کو عزنی سے کسی اور جگہ بھیج دیا گیا تو بھی آپ بھائی سے ملنے کے لیے تشریف لایا کریں گے نا؟“

”اگر موقع ملا تو میں ضرور آؤں گا۔ اب آپ آرام کریں۔“ عبدالواحد یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

شکستلابہ اٹھتے ہوئے کہا: ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھیے!“

شکستلابہ جھجکتے ہوئے کہا: ”آشا کون ہے؟“

عبدالواحد مبہوت سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

شکستلابہ دوبارہ کہا: ”معاف کیجیے۔ شاید یہ گستاخی کی بات ہو لیکن اُس دن جب آپ نے مجھے دیکھا تھا تو آپ کے منہ سے ”آشا“ کا لفظ نکل گیا تھا۔“

عبدالواحد نے گردن جھکاتے ہوئے منہموم آوازیں کہا: ”ابھی آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھیں۔ جب آپ کا بھائی آئے گا تو وہ آپ کو آشا کے متعلق بہت

کچھ بتا سکے گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“

شکنتلا عبدالواحد کو سیڑھیوں تک پہنچانے کے لیے باہر نکلی۔ شبنم ناٹھ انتہائی اضطراب کی حالت میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد شکنتلا اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ”آشاکون ہے؟ اس نے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟“ وہ بستر پر لیٹ کر دیر تک سوچتی رہی۔ بالآخر اُسے نیند آگئی۔ گہری اور ٹھیک نیند اور پھر جب وہ بیدار ہوئی تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکلی۔ ایک لوکرانی برآمدے میں صفائی کر رہی تھی۔

شکنتلا نے کہا: ”کیا مکان جا چکے ہیں؟“

”وہ تو پچھلے پہر ہی روانہ ہو گئے تھے۔“ لوکرانی نے جواب دیا۔ یہ سن کر شکنتلا کا دل بیٹھ گیا۔

رام ناٹھ کا سفر

زمبیر کے گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد رام ناٹھ کی منزل مقصود سوسنات تھی۔ چند دن کے سفر کے بعد وہ ایک شام دریائے جمیل کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوا۔ گاؤں کے چوپال میں چند آدمی اسے دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نو عمر لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ رام ناٹھ نے گھوڑے سے انزکبر گاؤں کے چودھری کے متعلق پوچھا۔ نو عمر لڑکے نے جواب دیا: ”مہاراج! وہ سردار کا حکم ملتے ہی آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئے تھے۔ گاؤں میں صرف پندرہ بیس آدمی رہ گئے ہیں اور ان میں سے کوئی لشکار میں حصہ لینے سے قائل نہیں۔“

رام ناٹھ نے کہا: ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ میں ایک مسافر ہوں اور اس گاؤں میں رات گزارنا چاہتا ہوں۔“

لڑکے نے کہا: ”آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے۔ میں چودھری کا لڑکا ہوں اسیئے بیٹھے۔“

رام ناٹھ ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ چودھری کا لڑکا گھوڑے کو ایک آدمی

رام ناتھ کا چہرہ غصے سے تنہا اٹھا لیکن اس نے غیظ سے کام لیتے ہوئے کہا۔
 "دلت آنے پر آپ مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکیں گے۔"
 نوجوان نے کہا۔ "اگر میری بات سے تمہیں رنج پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں
 میرا مطلب صرف یہ تھا کہ نیزے اور ڈھال کے بغیر تمہارا یہاں کھڑا ہونا درست
 نہیں لیکن اس کے باوجود اگر تم بہادری دکھانا چاہتے ہو تو میں منع نہیں کرتا گھوڑے
 کو ذرا پیچھے کسی درخت کے ساتھ باندھ دو۔"
 "آپ اطمینان رکھیے میری تلوار لکڑی کی نہیں۔" یہ کہہ کر رام ناتھ اپنا گھوڑا پیچھے
 لے گیا اور اسے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ باندھ کر شکاریوں کے ساتھ
 شامل ہو گیا۔

(۲)

شکار کو گھیر کر لانے والے آدمیوں کی چیخ پکار زیادہ قریب سنائی دے رہی
 تھی۔ شکاری خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گیدڑ خرگوش
 اور بھڑیے بدحواسی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔
 رام ناتھ سے آگے تھوڑی دور انہل واڑہ کا مہاراجہ بھیم دیو ایک ہاتھی کے
 سنہری ہودج میں کھڑا ادھر ادھر جھانک رہا تھا۔ ایک تجربہ کار شکاری اس
 کے ساتھ کھڑا تھا۔ مہاراجہ ایک خوش وضع اور قوی ہیکل آدمی تھا۔ اس کے ہاتھی
 کے ماتھے پر موتیوں کی جھال اور گلے میں سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ پاؤں میں سونے
 کے بھاری کڑے چمک رہے تھے۔

اچانک دو چیتے نمودار ہوئے اور شکاریوں نے انہیں دونوں طرف سے
 ہانک کر مہاراجہ کے سامنے لانے کی کوشش کی لیکن ایک چیتے نے اچانک

کے سپرد کر کے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ باتوں باتوں میں رام ناتھ کو معلوم ہوا کہ
 انہل واڑہ کا مہاراجہ مقامی راجہ کی دعوت پر شیر کے شکار کے لیے آیا ہوا ہے اور
 علاقے کے سردار اسے شکار میں مدد دینے کے لیے یہاں سے تھوڑی دور جنگل
 میں اپنے اپنے آدمی جمع کر رہے ہیں۔

رام ناتھ علی الصبح اس گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ کوئی تیس کوں ایک گھنٹے
 جنگل میں چلنے کے بعد اسے پندہا تھی نظر آئے جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے
 تھے۔ شکاری ان ہاتھیوں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے پیادہ آدمی نیزے اور
 بھالے سنبھالے کھڑے تھے۔ ایک نوجوان نے رام ناتھ کو اشارے سے رکا
 اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ انہل واڑہ کے مہاراجہ کے آدمی ہیں؟"

"نہیں" رام ناتھ نے جواب دیا۔ "میں ایک مسافر ہوں۔"
 "تو ہمیں ٹھہرو! اس طرف سے کسی کو آگے جانے کی اجازت نہیں۔"
 "تو میں دوسری طرف سے نکل جاتا ہوں۔"

نوجوان نے برہم ہو کر کہا۔ "ہیں کتنا ہوں کہ تم آگے نہیں جا سکتے۔ دائیں بائیں
 اور سامنے کی سمتوں سے ہمارے آدمی شکار کو گھیر کر اس طرف لا رہے ہیں
 تمہارے ہی فائدے کی بات کرتا ہوں۔ فوراً واپس چلے جاؤ۔ گھوڑے کو یہاں
 کھڑا کرنے کی اجازت نہیں۔"

دوسرے آدمیوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ رام ناتھ پر تھوڑی
 دیر کے لیے شکار دیکھنے کی خواہش غالب آگئی اور اس نے گھوڑے سے
 اتر کر نوجوان سے کہا۔ "مجھے شکار دیکھنے کا شوق ہے اگر اجازت ہو تو آپ کے
 پاس کھڑا ہو جاؤں۔"

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "تم پیچھے کسی درخت پر چڑھ کر تماشا دیکھو۔"

بھائی لیکن اس کا ساتھی خبردار ہونے سے قبل درخت کے ایک مضبوط تنے کی زد میں آگیا اور ہودھ تنے سے ٹکرا کر شکاری سمیت زمین پر گر پڑا۔ ہاتھی آگے نکل گیا۔ شکاری کا سرا ایک پتھر سے ٹکرایا اور اُسے دوبارہ گردن اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ راجہ ابھی تک بے بسی کی حالت میں درخت پر ہی لٹک رہا تھا کہ اچانک ایک چیتا جو کسی شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر پاس کی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا، ایک دم ہمت لگا کر اس درخت کے اس تنے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ راجہ پر آسانی سے حملہ کر سکتا تھا لیکن ارد گرد آدمیوں کی چیخ اور پکار نے اُسے بدحواس کر دیا اور وہ راجہ کی بجائے نیچے دیکھنے لگا۔ راجہ نے درخت سے اتنا زیادہ خطرناک سمجھ کر اپنی ٹانگیں اوپر کر لیں اور شاخ پر جم کر بیٹھنے ہوئے نیام سے تلوار نکال لی۔ اچانک چیتے نے گردن اٹھائی۔ راجہ اُسے حملے کے لیے تیار دیکھ کر سرا سمہ ہو گیا اور چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو مدد کے لیے بلانے لگا۔

رام ناٹھ جھاڑیوں میں سے بھاگتا ہوا درخت کی طرف بڑھا۔ تین اور شکاری ہندو قدم کے ناصطے پر تھے۔ اتنے میں راجہ بلند آواز میں چلایا۔ ”ہو شیوار! اوپر سے جیتا حملہ کرنے والا ہے۔“

رام ناٹھ نے فوراً اوپر دیکھا تو چیتا اس پر حملے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ڈھال پھینک دی اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ سنبھال کر چیتے کی زد میں کھڑا ہو گیا۔ چیتے نے ایک خوفناک گرج کے ساتھ نیچے چھلانگ لگا دی۔ رام ناٹھ نے گھٹنوں کے بل ہو کر نیزہ زمین سے لگا دیا اور نوک چیتے کے سامنے کر دی۔ خوش قسمتی سے چیتا سیدھا نیزے پر گرا۔ اس کی نوک چیتے کی گردن اور سینے کو چیرتی ہوئی کمر کے قریب جا نکلی۔ چیتے کے بوجھ کے باعث نیزہ درمیان سے ٹوٹ گیا لیکن رام ناٹھ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار

جست لگائی اور ایک شکاری کے جسم پر اپنے پنجوں کے نشان چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ دوسرے چیتے کو راجہ بھیم دیونے بھالامارا۔ چیتے نے زخمی ہو کر ایک پٹا کھایا پھر غضبناک ہو کر جست لگائی اور راجہ کے فیلبان کے سینے میں پنجے گاڑ دیے۔ بدحواس ہاتھی نے اپنی سونڈ گھائی اور فیلبان اور چیتا دونوں اس کی لمبیٹ میں آکر نیچے گر پڑے۔ مہاراجہ کے ساتھی نے چیتے کو بھالامارا کر فیلبان کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن بدحواس ہاتھی چند قدم آگے نکل گیا۔ اتنی دیر میں دوسرے شکاریوں کے سامنے چند اور شیر اور چیتے آگئے اور وہ فیلبان کا خیال کرنے کی بجائے اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔ رام ناٹھ نے بھاگ کر چیتے پر حملہ کیا۔ اس کی تلوار پوری قوت سے چیتے کی کھوپڑی پر لگی اور وہ دو تین پٹیاں کھا کر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ لیکن فیلبان بھی اس کے ساتھ ہی اپنا سفر حیات ختم کر چکا تھا۔ اتنی دیر میں دوسرے شکاری دوشیر مار چکے تھے۔ چند درندے شکاریوں کی صفیں چیر کر آگے نکل گئے اور باقی جنگل میں پھپ گئے۔ راجہ بھیم دیو کا ہاتھی کوئی چالیس پچاس قدم دور جا کر رکا۔ اس کے محافظ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک سردار کا فیلبان اپنے ہاتھی سے اتار کر راجہ کے ہاتھی کو قابو میں کرنے کیلئے بڑھا لیکن ابھی کچھ دور ہی تھا کہ تین شیر بیک وقت جنگل سے نمودار ہوئے۔ دوشیروں نے راجہ کے پیادہ محافظوں پر حملہ کر دیا اور ان کی آن میں درآدمیوں کو پھاڑ ڈالا۔ تیسرے شیر نے جست لگائی اور راجہ کے ہاتھی کی گردن پر سوار ہو گیا۔ راجہ نے برجھا مار کر شیر کو نیچے گرا دیا لیکن ہاتھی جو پہلے ہی بدحواس تھا، چنگھارتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ رام ناٹھ نے یہ دیکھ کر ایک گرسے ہوئے شکاری کا نیزہ اور ڈھال اٹھالی اور تیزی سے راجہ کے ہاتھی کے پیچھے دوڑنے لگا۔ جب بدحواس ہاتھی ایک درخت کے نیچے سے گزرنے لگا تو راجہ نے ایک بھکی ہوئی شاخ کے ساتھ لٹک کر اپنی جان

بھیم دیو نے سوال کیا ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”فوج سے مہاراج!“

”اور کہاں جا رہے تھے؟“

”مہاراج! میں سومنات کی یاترا کے لیے جا رہا ہوں، وہاں میں نے ایک

سنت مانی تھی“

”آج تم ہمارے مہمان ہو۔“

”مہاراج کی خواہش میری خوشی ہے۔“

بھیم دیو شکار ختم کرنے کا حکم دے کر اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ آیا۔ اگلے دن رام ناتھ رخصت لینے کے لیے حاضر ہوا تو مہاراجہ نے اُسے یاترا کے بعد انہل واڑہ آنے کی دعوت دی اور کہا۔ ”اگر تم ہماری فوج کی ملازمت پسند کر دو تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ نہیں کرتا تھا لیکن شاید میرے حالات مجھے کسی دن آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے مجبور کر دیں۔“

”ہم تمہارا انتظام کریں گے اور ہم نے تمہیں سومنات پہنچانے کا انتظام بھی کر دیا ہے۔“

”نہیں مہاراج! مجھے وہاں جانے کے لیے کسی خاص انتظام کی ضرورت نہیں۔“

”ہماری خواہش ہے کہ تم ہمارے ایک دوست کی حیثیت سے ہاتھی پر سوار ہو کر جاؤ۔ ایک فیلان کے علاوہ میرے چار لوگ تمہارے ساتھ جائیں گے اور وہاں پہنچ کر تمہیں یہ کہنے کی اجازت ہوگی کہ میں انہل واڑہ کے تیس بڑے سرداروں میں سے ایک ہوں۔ ہم تمہیں وہاں ایک بہت بڑی

نکال لی اور اتنی دیر میں دوسرے شکاری بھی وہاں پہنچ گئے۔

چیتا زمین پر اچھل اچھل کر پٹنیاں کھا رہا تھا۔ شکاریوں نے آن کی آن میں اُسے اپنے نیزوں سے چھلنی کر دیا۔ تھوڑی دیر میں مقامی راجہ اور کئی سردار وہاں جمع ہو چکے تھے۔

(۳)

مہاراجہ بھیم دیو درخت سے اُترا۔ لوگوں نے بلند آواز سے ”مہاراج کی بے ہو کاغرا بلند کیا لیکن بھیم دیو کسی اور کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنی آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھتا ہوا سیدھا رام ناتھ کی طرف بڑھا اور کچھ کہنے لگا۔ اپنے گالے سے مونٹیوں کی بیش قیمت مالا اتار کر اس کے گالے میں ڈال دی۔ چند آدمیوں نے مل کر ہودج کے نیچے دبے ہوئے شکاری کو نکالا لیکن وہ زندگی کی دلچسپیوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکا تھا۔ بھیم دیو نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے اپنے میزبان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میرا بہترین شکاری مارا جا چکا ہے اور میں اس کے عوض آپ کا بہترین شکاری اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

میزبان نے جواب دیا۔ ”مہاراج کا حکم سراسر آنکھوں پر لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ فوجوان آپ کے ساتھ آیا ہے۔“

بھیم دیو نے کہا۔ ”اگر یہ میرے ساتھ ہوتا تو آپ اسے میرے بہترین ہاتھی پر سوار دیکھتے۔“

”تو پھر شاید یہ اچھن کے مہاراج کے ساتھ آیا ہو۔“

رام ناتھ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”نہیں مہاراج! میں کسی کے ساتھ نہیں آیا میں ایک مسافر ہوں اور یہ محض اتفاق تھا کہ میں اس طرف آ نکلا۔“

فیل تھی اور اس تفصیل کے اندر سومات کے محافظ سپاہیوں کی قیام گاہیں تھیں۔ اس سے آگے سمندر کی طرف یا قریبوں کے لیے مہمان خانے اور نوکروں اور خدمت گاروں کی رہائش کے کمرے تھے۔ ان کے بعد ان عالی شان محلات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا جو ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں نے یا ترائے کے دوران میں اپنی رہائش کے لیے بنوائے تھے۔ مندر کے پجاریوں اور برہمنوں کے مکانات ان محلات سے ملتی تھے۔ پھر ایک کشادہ گزرگاہ دکھائی دیتی تھی۔ جو پانی کی سطح سے چند گز بلند تھی۔ اس گزرگاہ کے دائیں بائیں اونچے درجے کے پجاریوں کے محلات تھے۔ جو اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے ان محلات سے کم نہ تھے۔ جو ملک کے بڑے بڑے راجاؤں نے اپنے لیے تعمیر کیے تھے۔ یہ گزرگاہ دائیں ہاتھ سومات کے بڑے پروہت کے رفیع الشان محل کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی سومات کے مندر کے آہنی دروازے پر ختم ہوتی تھی۔

مندر کی تیرہ منزلہ عمارت مخروطی شکل میں گہرے پانی میں کھڑی تھی اور اس کی چھت پر چودہ سنہری کلس دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ قلعے کی طرف سے دو الگ گزرگاہیں مندر کے شمالی اور جنوبی دروازوں تک پہنچتی تھیں۔ مغرب کی جانب ایک کشادہ چبوترہ تھا جس کے آگے پتھر کی سیڑھیاں پانی میں غائب ہو جاتی تھیں۔ مندر کا درمیانی کمرہ چھپن ستونوں پر کھڑا تھا اور اس وسیع کمرے کے درمیان ایک گول چبوترے پر وہ بت نصب تھا جس کی قوت اور ہیبت کی داستانیں اطراف عالم میں مشہور تھیں۔ یہ بت چبوترے سے پانچ ہاتھ اونچا اور دو ہاتھ چبوترے

جاگیر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ انعام نہیں بلکہ تمھاری بھادری کا خراج ہے۔
رام نا تھا جیسے خواب کی حالت میں یہ الفاظ سن رہا تھا۔ تشکر اور اصرار مندی کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی منزل مقصود کا رخ کر رہا تھا۔ چار سوار اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اس کے پڑائے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کر رہا تھا کہ زندگی میں میرے اور رنیر کے راستے مختلف ہیں۔ روپوتی کو پالنے کے بعد میری زندگی میں کوئی خلا باقی نہ رہے گا۔ مجھے ہندو سماج اور محمود غزنوی کے حملوں سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ مجھے اس بات سے کوئی دل چسپی نہیں ہوگی کہ پتھر کی موریتیاں ٹوٹتی ہیں یا سلامت رہتی ہیں۔ روپوتی کو حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک جائے پناہ کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گئی ہے۔ اب میں ایک ایسے خانماں مسافر کی حیثیت سے نہیں بلکہ انہل داڑھ کے ایک با اثر سردار کی حیثیت سے وہاں جاؤں گا۔ سومات کے پروہت کو یہ بات تھی دان کرنے کے بعد مجھے آزادی کے ساتھ مندر میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل جائے گی۔ پھر موتیوں کی یہ بیش قیمت مالا پروہت کی نذر کرنے میں روپوتی کو آزاد کر سکوں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو میں کسی اور طریقے سے اسے مندر سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ انہل داڑھ میں اسے جاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ روپوتی کو حاصل کرنے کے بعد میری زندگی کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں گی؛

(۲)

لے ہندوؤں کی ایک روایت کے مطابق چاند کے پوتا سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا اور جرم کی تلافی کے لیے اسے مہا بھو کے لنگ کی یہ مورتی بنانی پڑی۔ ہندی زبان میں سوم کے

سومات بیک وقت ایک قلعہ، ایک مندر اور ایک مکتب بھت۔
کاٹھیاواڑ کے ساحل پر دیباٹے سرسوتی سے کوئی تین میل دور ایک بلند

کے اندر تھا۔ اس کی سطح بیش قیمت جواہرات سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چھت کے درمیان میں سونے کی زنجیر کے ساتھ مورتی کے اوپر ایک تاج لٹکایا گیا تھا جو ہیروں اور موتیوں سے مرصع تھا۔ چھت اور دیواریں اور ستون بھی رنگارنگ کے جواہرات سے مزین تھے۔ روشنی کے لیے چھت کے ساتھ بیش قیمت ہیروں کے فالوس لٹکے ہوئے تھے اور کمرے کے دروازوں کے پردوں میں بھی موتی، میرے لال اور یا قوت جڑے ہوئے تھے۔ سومات کے بت کے ارد گرد سونے اور چاندی کی کئی اور مورتیاں نصب تھیں جو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ باقی تمام دیوتا اس دیوتا کے خدمت گزار ہیں۔

معنی چاند اور ناتھ کے معنی آتاپیں۔ چنانچہ سومات کا مطلب "چاند کا آتما ہے۔ سومات کے عقیدت مندوں کے اعتقاد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ چاند کے طلوع و غروب کے باعث سمندر میں مژدہ زریہ پیدا ہوتا تھا۔ جب سمندر کی لہر لہائے کی طرف بڑھتی تھی تو سومات کا بت پانی میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد سمندر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا تو یہ بت پانی کی آغوش سے دوبارہ نمودار ہو جاتا تھا۔ سومات کے پجاری اس سے نتیجہ اخذ کرتے تھے کہ چاند سومات کے بت کی خدمت پر آمون ہے۔

بعض مسلمانوں کے نزدیک سومات وہی بت تھا جسے سات کے نام سے کفار نے کعبہ میں نصب کر رکھا تھا۔ ظہور اسلام کے ساتھ جب اس بت کے پجاریوں نے خضر محسوس کیا تو انہوں نے اُسے کعبہ سے اٹھا کر کاٹھیاوار پہنچا دیا۔ اور اسے ساحل کے قریب نصب کر کے مشہور کر دیا کہ یہ سمندر سے نمودار ہوا ہے اور اس کا نام سات

بجائے سومات رکھ دیا۔ لیکن اس خیال آرائی کی وجہ سومات اور سات کی لفظی مناسبت کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عرب جن بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے وہ انسان کی شکل پر بندے گئے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے شہر داراب سے بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عربوں میں لنگ کی پوجا کا رواج تھا۔

رہ گئی جو اس بت کی پوجا کے اوقات میں بھائی جاتی تھی۔ سونے کی دو سون وزنی زنجیر کے ساتھ لٹکائی گئی تھی۔

ہندوؤں کے نزدیک سومات کا بت زندگی اور موت پر قادر تھا۔ یہ انسانوں کو خوشی اور علم عطا کرتا تھا۔ موت کے بعد انسانوں کی روحیں اس بت کے گرد جمع ہوتی تھیں اور وہ انھیں نئے جنم دیتا تھا۔

اس مندر میں باتریوں کا اس قدر جھوم رہتا تھا کہ قریباً ایک ہزار برہمن انھیں پوجا پاٹھ کے طریقے سمجھانے پر مقرر تھے۔ سینکڑوں آدمی باتریوں کی خدمت پر مامور تھے، سینکڑوں رتاص اور گویے ہر وقت مندر کے دروازوں پر موجود رہتے تھے۔ ملک کے طول و عرض سے عالی نسب لڑکیاں یہاں رقص اور موسیقی سیکھنے کے لیے آتی تھیں۔ ان میں سے صرف بہترین ناپنے اور گانے والی دو شیرازوں کو سومات کے بت کے سامنے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیوں کو ملک کے ہر حصے میں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے رٹ کے انھیں اپنی دلہن بنانے کے خواہش مند رہتے تھے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں لڑکیاں ایسی تھیں جو سومات کی دایاں کمر لاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر وہ تھیں جن کے والدین انھیں اُن کی پیدائش سے پہلے ہی سومات کی بھینٹ کر چھوڑتے تھے اور بعض ایسی یتیم اور لادارث ہوتی تھیں جنھیں با اثر لوگ سومات کے مندر پہنچا دیتے تھے۔ یہ لڑکیاں مندر کے پجاریوں اور برہمنوں کی سیوا کرتی تھیں اور پردہست کی مرضی کے بغیر انھیں مندر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ رقص اور موسیقی کی

بعض روایات کے مطابق سومات کے مندر میں رقص کرنے والی لڑکیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔

کے آس پاس اگر کوئی جہاز غرق ہو جاتا تو یہ مشہور ہو جاتا کہ سومنات کا دیوتا اس کے
ملاحوں سے ناراض ہو گیا تھا اور اگر کوئی سفینہ بحیرہ عرب اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا
تو کہا جاتا کہ ملاحوں سے دیوتا خوش تھا۔

سومنات کے قلعے اور مندر سے باہر دریائے سرسوتی کے کنارے ایک
پر رونق شہر آباد تھا اور ایک اہم تجارتی مرکز ہونے کے باعث یہاں کے
باشندے کافی متمول تھے۔

تربیت دینے کے بعد انھیں مندر کے ان اسرار و رموز سے آگاہ کیا جاتا تھا جن کا
برہمنوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

سومنات کی موروثی کو غنسل دینے کے لیے ہزاروں آدمی ہر روز لنگا جلی میں
کرنے پر متعین تھے۔ اسی طرح لوگوں کی ایک جماعت سینکڑوں کوس دور کشمیر کی
وادیلوں سے سومنات کے دیوتا کے لیے پھولوں کے ہار مہیا کرتی تھی۔ مندر راضی
بڑا تھا کہ اس کے ان گنت کردوں اور کوٹھڑیوں میں اس کا بے شمار عملہ آسانی سے سما
سکتا تھا۔ مندر سے ایک طرف مندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ ان تارک المذنب
سادھوؤں، جگتوں اور دنیاویوں کی کوٹھڑیاں تھیں جو اولاد کے خواہشمندوں کی حاجت
ردائی پر مامور تھے۔ یہ لوگ لباس پینے کی بجائے اپنے جسم پر صرف راکھ مل لینا ہی
کافی سمجھتے تھے۔

سومنات کی دولت و ثروت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک
کے طول و عرض میں دس ہزار دیہات اس کی جاگیر تھیں۔ ہندوستان کے راجے
اور مہاراجے یا ان کے سفیر ہر سال اس مندر کی اہم رسومات میں حصہ لینے کے لیے
آتے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نذرانے پیش کرتے۔ اس کے علاوہ
اولاد کے خواہش مند بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں بڑے بڑے نذرانے لے کر
آتے تھے۔

سومنات کی شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی۔ مشرق و مغرب
کے کسی ممالک کے تجارتی جہاز پانی اور رسد حاصل کرنے کے لیے سومنات کی
بندرگاہ پر کھڑے ہوتے تھے۔ ان جہازوں کے توہم پرست ملاحوں نے سومنات
کی شہرت دور دور تک پہنچا دی تھی۔ وہ سومنات کو مندر کا دیوتا سمجھتے تھے اور اپنے
ہر سفر کی کامیابی کے صلے میں یہاں نذرانے پیش کرتے تھے۔ ہندوستان کے ساحل

کچھ ہوا ہے۔ میری غیر حاضری میں ہوا ہے اور راجہ کی شکست کے بعد اپنی بیوی اور نرملہ کو رنجیہ کی قید سے چھڑانا میرے بس کی بات نہیں۔ اتفاق سے راستے میں اُس کی ملاقات سرحد کے چند ایسے سرداروں سے ہو گئی جو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے باری جا رہے تھے۔ جے کرشن بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کے لوگوں میں سے صرف پیارے لال اس کے ہمراہ تھا۔

نرملہ اور روپوتی

فوج اور باری میں سلطان محمود کی فتوحات کے بعد جے کرشن کو اپنی جان بچانے کے لیے شکست خوردہ فوج کے ان دستوں کا ساتھ دینا پڑا جو راجہ گنڈا کو اپنا آخری سہارا سمجھ کر کالنجرا رخ کر رہے تھے۔ کالنجر کی سرحد میں داخل ہوئے ہی جے کرشن نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگ میں حصہ لینے کی بجائے گوالیار چل دیا۔ راستے میں اُسے پڑوس کے کئی راجوں اور سرداروں کی افواج دکھائی دیں جو راجہ گنڈا کی مدد کے لیے جا رہے تھے۔ راجہ گنڈا کی دفاعی تیاریوں کے متعلق اس نے جو کچھ سنا وہ بہت حوصلہ افزا تھا۔ چنانچہ وہ پھر ایک بار تذبذب میں پڑ گیا۔

ایک شام اُسے گوالیار کی سرحد سے چند منازل دور ایک لشکر کا پڑاؤ نظر آیا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ گوالیار کی فوج ہے جو دہاں کے حکمران کی قیادت میں راجہ گنڈا کی مدد کے لیے جا رہی ہے۔ جے کرشن کو راہ فرار نظر نہ آئی اور وہ مجبوراً اس لشکر میں شامل ہو گیا۔ سردار شیا لال اور اس کے خاندان کے کئی آدمی بھی اس فوج کے ساتھ تھے۔ جے کرشن نے انہیں اپنے گاؤں کے حالات بتا دیے۔

جب کالنجرا راجہ میدان چھوڑ کر بھاگا تو جے کرشن شیا لال کے ساتھ گوالیار پہنچ گیا۔ چند دن کے بعد شیا لال نے اپنے ایک وفادار نوکر کو نرملہ کی

گوالیار میں جے کرشن کی بیوی کا بڑا بھائی سردار شیا لال ایک راست گواہ اور غیور راجپوت تھا۔ اسے جے کرشن کی خود پسندی، ریا کاری اور ابن الوقتی سے نفرت تھی اور کئی موقعوں پر وہ بے تحشک اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ اس لیے جے کرشن عام طور پر اس سے دور رہنا پسند کرتا تھا لیکن اپنے گاؤں پر حملے کی اطلاع پا کر اسے مجبوراً گوالیار کا رخ کرنا پڑا۔ راستے میں یہ خیال اُسے بری طرح پریشان کر رہا تھا کہ جب شیا لال کو یہ معلوم ہو گا کہ میں اس کی بہن اور بھانجی کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا ہوں تو وہ کیا کہے گا۔ پہلے اس نے یہ سوچا کہ مجھے جانتے ہی اپنے گاؤں پر حملے کا ذکر نہیں کرنا چاہیے لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ شیا لال سے وقتی طور پر جان چھڑانے کے لیے بھی یہ بہانہ کافی نہیں۔ وہ کہے گا جب مسلمان فوج اور باری کی طرف بڑھ رہے ہیں تو تم یہاں کیوں آئے ہو۔ چنانچہ سرحد عبور کرنے سے پہلے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے واپس جا کر راجہ کی فوج میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اگر راجہ کو فتح ہوئی تو مجھے شیا لال کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی اور اگر اُسے شکست ہوئی تو میں گوالیار پہنچ کر شیا لال سے کہہ سکوں گا کہ گاؤں میں جو

دشمنوں کے پہنچنے کی توقع نہ تھی۔

شیام لال کا گوالیار کے دربار میں کافی اثر و رسوخ تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ جے کرشن کو راجہ کی فوج میں کوئی موزوں عہدہ مل جائے۔ جے کرشن چند دن شیام لال پر اپنا ارادہ ظاہر کرنے سے ہچکچاتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ نرملہ کو اس کے ساتھ بھیجنے سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ اس نے ایک بہانہ تلاش کیا اور شیام لال سے کہا: ”میں نے شیوجی سے منت مان لی تھی کہ اگر نرملہ مجھے دوبارہ مل گئی تو میں اس کے ساتھ سومنات کے مندر کی یا ترائے کے لیے جاؤں گا۔“ نرملہ نے بھی سومنات کی یا ترائے کے لیے اپنے باپ کا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ شیام لال نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اتفاق سے گوالیار کے چند یا تری سومنات جا رہے تھے۔ جے کرشن اور نرملہ سفر کرنے کی بجائے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

(۲)

یا تریوں کے محضر سے قافلے کے ساتھ کئی دن سفر کرنے کے بعد جے کرشن اور نرملہ ایک دن تیسرے پہر ایک چھوٹے سے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کے لوگوں سے دھرم شالہ کا راستہ پوچھنے کے بعد یہ قافلہ ایک کشادہ بازار میں سے گزرتا ہوا اس طرف چل دیا۔ جے کرشن اور نرملہ سب سے آگے تھے۔ ایک چوک کے قریب پہنچ کر انھیں لوگوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ جے کرشن نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو روکا اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھا۔ لوگ سراپائی کی حالت میں شور مچاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جے کرشن نے چند آدمیوں کو روک کر ان کی بدحواسی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن

ماں کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا۔ وہ یہ خبر لے کر آیا کہ نرملہ کی ماں مر چکی ہے اور نرملہ ابھی تک رنیر کے گھر میں ہے۔ شیام لال نے بذات خود رنیر کے پاس جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کی روانگی سے قبل رنیر کا نوکر شیمونا نرملہ کو لے کر پہنچ گیا۔ نرملہ کی آمد کے بعد جے کرشن کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی۔ ہر ابن الوقت کی طرح وہ بھی پرلے درجے کا دور اندیش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں میں ایک فارتھ کی حیثیت سے واپس جانے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ اگر وہ گوالیار کو محفوظ سمجھتا تو اپنی بیٹی کی خاطر کسمپرسی کی حالت میں بھی وہاں رہنا گوارا کر لیتا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ راجہ گنڈا کی شکست کے بعد وسطی ہند کی قوت مدافعت ختم ہو چکی ہے اور سلطان محمود جب دوبارہ اس طرف آئے گا تو گوالیار کی فوج اس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ پھر رنیر ہر قیمت پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے گا اور اس صورت میں گوالیار کے سردار اور شاید گوالیار کا راجہ بھی مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے گرفتار کر کے رنیر کے حوالے کر دے۔ رنیر کے انتقام کا خوف اسے سوتے جاگتے پریشان رکھتا تھا۔ اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جو رنیر اور مسلمانوں کی دسترس سے دور ہو۔ کئی دن کے غور و فکر کے بعد سومنات اس کی جائے پناہ تھی۔ وہاں جنوب اور مغرب کے ان گنت راجے اپنی افواج جمع کر رہے تھے اور پروہت فوجی تجربہ رکھنے والوں کو بڑی بڑی تمناؤں پر ملازم رکھ رہے تھے۔ جے کرشن نے سوچا سومنات کے بھاری کو خوش کرنے کے بعد میرے لیے پڑوس کے کسی راجہ کا مصاحب بن جانا مشکل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ نرملہ سومنات کے مندر میں نسوانی کمالات حاصل کر سکے گی جن کی بدولت معمولی لڑکیاں بھی شاہی محلات میں پہنچ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سومنات مسلمانوں کے حملوں کی زد سے بہت دور تھا اور وہاں رنیر جیسے

وہ سب ”دوڑو، بھاگو، آگیا، آگیا“ کہتے ہوئے ادھر اُدھر نکل گئے۔ پھر تک پہنچتے پہنچتے بے کوشش بنات خود اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے گھوڑے سے جھک کر ایک آدمی کا بازو پکڑ لیا اور چلا کر پوچھا ”کیا ہوا، کون آگیا، تم بھاگ کیوں رہے ہو؟“ بدحواس آدمی نے جھکے سے اپنا بازو چھڑا کر بے کوشش کے دائیں ہاتھ ایک تنگ گلی کی طرف اشارہ کیا اور وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ گلی کی طرف دیکھتے ہی ایک ثانیہ کے لیے بے کوشش سم گیا۔ ایک مست ہاتھی سوٹ اٹھائے تیزی سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ آن کی آن میں بے کوشش کے سر پر آگیا۔ بے کوشش نے ایک لحظہ گھوڑے کی باگ موڑ لی اور بائیں ہاتھ کی گلی میں داخل ہو گیا۔ ہاتھی بے کوشش کا پیچھا کرنے کی بجائے کشادہ بازار کی طرف مڑ گیا۔ قافلے کے آدمی اس صورت حال سے بے خبر چوک سے کچھ دور کھڑے تھے۔ نہ ملا بھی چند ثانیہ وہاں کھڑی رہی۔ پھر جلدی سے گھوڑا دوڑا کر چوک میں پہنچ گئی تاکہ کسی فوری خطرے میں اپنے باپ کا ساتھ دے سکے۔ ہاتھی پر اس کی نگاہ اس وقت پڑی جب وہ تنگ گلی سے نکل کر کشادہ بازار میں اس کے سامنے آچکا تھا بے کوشش نے چلانے کی کوشش کی لیکن آواز گلی میں اٹک کر رہ گئی۔ نہ ملنے کترا کر اپنے باپ کے پاس گلی میں گھسنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا خوفزدہ ہو کر اچھلا اور نہ ملا نیچے گر پڑی۔ ہاتھی چنگھارٹا ہوا آگے بڑھا۔ نہ ملا میں اٹھ کر اپنے آپ کو بچانے کی ہمت نہ تھی لیکن خوش قسمتی سے قافلے کی چیخ بکارد نے ہاتھی کو نہ ملا کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا اور وہ بیدھا آگے نکل گیا۔ چند یاتری جو گھوڑوں پر سوار تھے، ادھر اُدھر بھاگ گئے اور باقی آس پاس کی تنگ گلیوں میں پھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد نہ ملا کے گرد کسی آدمی جمع ہو چکے تھے۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا

تھا اور بے کوشش گھوڑے سے اتر کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے میں سواروں کی ایک ٹولی وہاں آگئی۔ ایک مہمراور خوش پوش آدمی نے اپنے ساتھیوں کو روکا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ خوش پوش آدمی حادثے کی تفصیلات سننے کے بعد گھوڑے سے اتر کر تیزی سے آگے بڑھا۔ شہر کے لوگ اس کے سامنے سے راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

نہ ملا ہوش میں آچکی تھی۔ بے کوشش اسے بیٹھنے کے لیے اپنے بازوؤں کا سہارا دے رہا تھا اور شہر کا ایک آدمی اپنی پگڑی پھاڑ کر اس کے ماتھے پر پٹی باندھ رہا تھا۔ خوش پوش آدمی نے قریب آ کر پوچھا ”تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

نہ ملنے کوئی جواب نہ دیا۔ پٹی باندھنے والا آدمی جلدی سے اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ”مہاراج! جھگوان کی دیا سے ان کی جان بچ گئی ہے۔ ورنہ ہاتھی کا پاؤں ذرا اس طرف پڑ جاتا تو ان کی خیر نہ تھی۔ ان کا گھوڑا سیخ پا ہو گیا تھا!“ خوش پوش آدمی نے ادھر اُدھر دیکھ کر سوال کیا ”ہاتھی نے کسی اور کو نقصان نہیں پہنچایا؟“

ایک آدمی نے جواب دیا ”مہاراج! پھلی گلی میں ایک آدمی اس کے پاؤں تلے کھلا گیا ہے۔“

”بڑا افسوس ہے۔ دیکھو! اگر اس کا کوئی وارث ہو تو اسے ہمارے پاس لے آؤ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ نہ ملا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ کا گھر کہاں ہے؟“

نہ ملا کی بجائے بے کوشش نے جواب دیا۔ ”ہم قنوج سے آئے ہیں اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس ملک کے ہاتھی شہروں اور جنگلوں میں تمیز نہیں کرتے۔“ اس نے بے کوشش کی طرز سے بے پردائی ظاہر کرتے ہوئے کہا ”مجھے اس

عادتے کا بہت افسوس ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ اس دیوی کے...
 ”میں اس کا باپ ہوں...“ بے کشرن نے جلدی سے یہ کہہ کر اس کا فقرہ پورا کر دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”سومناٹ“

”تو ہماری ایک ہی منزل ہے۔ سومناٹ تک آپ میرے ہمان ہیں۔“
 بے کشرن اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کا مخاطب کوئی بڑی حیثیت کا آدمی ہے۔ ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کا قائل تھا۔ تاہم نرملہ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا: ”آپ کا شکریہ۔ میری بیٹی شاید چند دن گھوڑے پر سواری کے قابل نہ ہو سکے۔“
 ”آپ تسلی رکھیں۔ ان کے لیے گھوڑے سے زیادہ آرام دہ سواری کا انتظام کر دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر عمر رسیدہ آدمی نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا: ”تم انھیں پڑاؤ میں پہنچانے کا انتظام کرو۔ ہم ہاتھی کا ہتھ لگائے آتے ہیں۔“
 ”یہ کون ہیں؟“ بے کشرن نے عمر رسیدہ آدمی کے جاتے ہی سپاہی سے سوال کیا۔

سپاہی نے جواب دیا: ”یہ ہمارا راج رگھوناتھ ہیں۔ انہل واڑہ کے ہمارا راج کے چچا۔“

بے کشرن نے اچانک محسوس کیا کہ اس کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کے راستے کھل گئے ہیں۔ سپاہی سے باتوں باتوں میں بے کشرن کو معلوم ہوا کہ رگھوناتھ انہل واڑہ کے حکمران کی حیثیت سے سالانہ خراج کے علاوہ بیس ہاتھیوں کا نذرانہ لے کر سومناٹ جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد چار آدمی نرملہ کو ایک پالکی پر ڈال کر رگھوناتھ کے پڑاؤ کی طرف

لے گئے۔ جاتی دفعہ بے کشرن نے اپنے ساتھی یا تریوں کی طرف دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ اب وہ انہل واڑہ کے ہمارا راج بھیم دیو کے چچا کا ہمان تھا۔
 پڑاؤ میں اسے رات گزارنے کے لیے ایک علیحدہ خیمہ دیا گیا۔ نرملہ کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ رگھوناتھ کے خاص طبیب نے اسے دیکھنے کے بعد بے کشرن کو یہ تسلی دی کہ تمھاری بیٹی کو پالکی میں سفر کرنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

رات کے وقت بے کشرن انتہائی جوش و خروش کے عالم میں رگھوناتھ سے کہہ رہا تھا: ”میرا گھر بار لٹ چکا ہے۔ میرے وطن کے بڑے بڑے سردار دشمن کی غلامی کا طوق پہن چکے ہیں لیکن میں نے یہ ذلت گوارا نہیں کی۔ انھوں نے مجھے بھی بڑے بڑے لالچ دیے لیکن مجھے اگر محمود کی اطاعت کے صلہ میں قنوج کا تخت بھی مل جاتا تو بھی انکار کر دیتا۔ میرے لیے کسی غیرت مند راجپوت کے گھوڑوں کی رکھوالی اس تاج و تخت سے زیادہ قابل فخر ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ دشمن کو اپنے دیس سے نکالنے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ نرملہ کو سومناٹ کی حفاظت میں چھوڑ کر اس پاس کے تمام راجوں اور ہمارا راج کو بیدار کروں۔“ اور رگھوناتھ اسے تسلی دے رہا تھا: ”ہمیں آپ جیسے آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس ملک کی بہت بڑی خدمت کر سکیں گے۔ انہل واڑہ سومناٹ کا دروازہ ہے اور میری کوشش یہ ہوگی کہ واپسی پر آپ کو وہاں لے چلوں۔ ہمارا راج آپ جیسے آدمیوں کی قدر کرتے ہیں۔“

اگلے دن بے کشرن رگھوناتھ کے ہمراہ سومناٹ روانہ ہو گیا۔ نرملہ ایک پالکی میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رگھوناتھ کی ہمدردی رفتہ رفتہ دلچسپی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ ہر روز کئی بار کبھی اپنے طبیب اور کبھی بے کشرن سے اس

کر چکا تھا۔ گھوٹا تھ کو اپنے حال پر مہربان دیکھ کر وہ نہ صرف اپنے بلکہ نرملہ کے مستقبل کے متعلق بھی بہت پر امید تھا۔

دو ہفتوں کے بعد رخصت ہوتے وقت اس نے نرملہ سے کہا: ”بیٹی میری زندگی کی آخری خواہش یہ ہے کہ تم کسی سلطنت کی رانی بنو۔ اگر مجھے تمہارے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر گھوٹا تھ کے ساتھ نہ جاتا۔“

نرملہ نے ابدیدہ ہو کر جواب دیا: ”بتا جی مجھے رانی بننے کا شوق نہیں۔ میں دنیا کو تیاگ کر مہادیوی کی داسی بننا چاہتی ہوں۔ میں اس جگہ خوش رہوں گی۔“

جے کرشن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”بیٹی! تمہیں اپنے باپ کی بے بسی پر آنسو نہیں بہانے چاہئیں۔ میں اس حالت میں بھی تمہارے لیے خوشیوں کے محل تعمیر کر سکتا ہوں؟“

(۳)

روپ وئی انتہائی بے چینی سے غروب آفتاب کا انتظار کر رہی۔ اسے رقص کی تعلیم دینے والے بھاریوں نے ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد یہ خوشخبری سنائی تھی کہ آج تم دیوتا کے سامنے اپنے جوہر دکھا سکو گی۔ اس دن کے لیے وہ ہر روز کئی کئی گھنٹے ناچ کی مشق کیا کرتی تھی۔ رقص و موسیقی کو سومات کی پوجا کی رسومات میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ لوجوان اور حسین لڑکیوں کو ان فنون کی تربیت دینے کے لیے بہترین استاد مقرر تھے۔

اونچے گھرانوں کی لڑکیوں کو جو اپنی مرضی سے یہاں آتی تھیں اور جن کا قیام عارضی ہوتا تھا چند ماہ کی محنت کے بعد سومات کی مورتی کے سامنے بھجن گانے یا ناچنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ان کے والدین اس کامیابی کی خوشی

کے متعلق پوچھتا اور جب کافی قیام کرنا تو وہ طبیب کے ساتھ خود بھی نرملہ کے خیمے میں چلا جاتا جے کرشن اس عزت افزائی پر پھولے نہیں سماتا لیکن نرملہ اس کے ساتھ عام طور پر بے توجہی سے پیش آتی۔

نرملہ مقصود تک پہنچتے پہنچتے نرملہ کی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ اس کے سر کا زخم مندمل ہو رہا تھا لیکن بازو کا جوڑ ہل جانے کے باعث اسے چند دن اور آرام کی ضرورت تھی۔ سومات کی چار دیواری میں داخل ہونے کے بعد جے کرشن اور اس کی بیٹی رگھونا تھ کے مہمان تھے۔ ہندوستان کے کئی اور حکمرانوں کی طرح انہل راہ کے راجہ نے بھی سومات کی چار دیواری کے اندر اپنے لیے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا ہوا تھا۔ رگھونا تھ نے اسی محل میں قیام کیا اور اس کے چند کمرے جے کرشن اور نرملہ کو دے دیے۔ رگھونا تھ کی عنایات پر جس قدر جے کرشن خوش تھا اسی قدر نرملہ پریشان تھی اور وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف اس سے دور رہنا پسند کرتی تھی۔

رگھونا تھ نے دو ہفتے وہاں قیام کیا۔ اس عرصہ میں نرملہ اور اس کی بدولت جے کرشن کے ساتھ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ نرملہ کی تیمارداری کے بہانے صبح و شام اس کے کمرے میں چلا جاتا اور نہ مل ہر بار اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نرملہ کو رقص اور موسیقی کی بجائے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور رگھونا تھ نے پروہت سے مل کر مندر کے ایک مشہور و نامور پنڈت کی خدمات حاصل کر لیں۔ رگھونا تھ کی دلچسپی کے باعث نرملہ ایک عام لڑکی کی بجائے ان عالی نسب شہزادیوں کی ہم مرتبہ خیال کی جانے لگی جو مند میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے آئی ہوئی تھیں۔

جے کرشن رگھونا تھ کی دعوت پر اس کے ساتھ انہل واڑہ جانے کا فیصلہ

میں ان کے استادوں اور مندر کے پردہت کو گراں بہا خدا نے پیش کرتے تھے۔ پھر ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے کے خواہشمند ان کے والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے بچاریوں کی خدمات حاصل کرتے تھے اور کامیابی کی حالت میں بچاریوں کو منہ مانگا انعام ملتا تھا۔ اس لیے بچاریوں کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ایسی لڑکیوں کو جلد از جلد فارغ التحصیل کیا جائے اور نئی لڑکیوں کے لیے جگہ پیدا کی جائے۔

لیکن لاوارث یا ایسی لڑکیوں کی حالت ان سے مختلف نہ تھی جنہیں ان کے وارث سومات کی بھینٹ کر جاتے۔ یہ مندر کی دایاں کھلاتی تھیں اور تعلیم تربیت کے طویل اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد ان پر مندر کے ایسے ایسے اسرار منکشف ہوتے تھے جن کا مندر سے باہر کسی کو علم نہ تھا۔ معمولی شکل و صورت اور ادنیٰ ذہانت کی دایاں کو یہ مراحل عبور کرنے سے پہلے ہی مندر سے چھٹی مل جاتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی زیادہ خوش قسمت ہوتی تو اسے کوئی شادی کا خواہش مند مل جاتا ورنہ یہ اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے عام طور پر مندر سے فارغ التحصیل ہونے والی عالی نسب لڑکیوں کی مصاحب بن کر ان کے ساتھ چلی جاتیں۔ اس بات کا پورا خیال رکھا جاتا تھا کہ مندر کے راز ہائے سر بستہ کا انہیں کوئی علم نہ ہو اور وہ اپنے دلوں پر سومات کی ہیبت اور عظمت کا ایک دائمی اثر لے کر جائیں لیکن ان میں سے کسی کی بد قسمتی اسے ایک بار مندر کے تاریک گوشوں تک پہنچا دیتی تو مندر کے بچاریوں کے سوا اس کی زندگی اور موت کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔

مندر کی چار دیواری میں داخل ہونے کے بعد روپ و تی کچھ عرصہ بچاؤ اس اور منہموم رہی۔ رام ناتھ کا تصور اُسے بے چین رکھتا تھا۔ اس کے دلکش نغمے ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے لیکن یہ سب باتیں اس کے نزدیک پاپ تھیں۔

وہ سومات کی دایاں بن چکی تھی اور رات کی تنہائیوں میں رو رو کر اپنے دیوتا سے صبر اور ہمت کی دُعاؤں مانگا کرتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے دل کے زخم بھرتے گئے۔ اس کی تمام خواہشیں اور امنگیں مندر کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ گئیں اور زندگی کے حسین تصورات ماضی کے دھند لکوں میں ڈوب گئے۔

اس کی آواز میں ہلاکی دکھائی تھی اور موسیقی کے استادوں کو اس کی غیسر معمولی صلاحیتوں کا معترف ہونے میں دیر نہ لگی۔ اس کے حسین چہرے اور جسمانی اعضا کے مناسب نے رقص کی تعلیم دینے والے استادوں کو بھی جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک دن ایک تجربہ کار استاد نے اس سے کہا: ”روپ و تی! تم جس طرح گاسکتی ہو اگر اسی طرح ناچ بھی سکو تو کسی دن مندر کی دیوی کا تاج تمہارے سر پر ہوگا۔“ اس نے جواب دیا: ”مند کی دیوی کا تاج میرے تصورات سے بہت بلند ہے ہمارا ج! میں صرف ایک بار اپنے دیوتا کی مورتی کے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد میرے دل میں کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔“

”وہ دن دور نہیں جب تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ عام لڑکیاں جو کچھ برسوں میں سیکھتی ہیں تم مہینوں میں سیکھ جاؤ گی، صرف محنت کی ضرورت ہے۔“

”میں محنت کروں گی۔“ روپ و تی نے پرامید ہو کر جواب دیا۔ اس کے بعد روپ و تی صبح و شام ناچ کی مشق کیا کرتی تھی۔ اس کے پاؤں شل ہو جاتے۔ اس کا بند بند درد کرنے لگتا لیکن وہ مشق جاری رکھتی۔ کبھی کبھی وہ بڑھال ہو کر گر پڑتی اور استاد اُسے آرام کا مشورہ دیتے لیکن اس فن میں کمال حاصل کرنے کا ولولہ جسمانی کمزوری کے احساس پر غالب آ جاتا اور وہ اٹھ کر دوبارہ رقص میں شریک ہو جاتی کبھی کبھی وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ سومات کی مورتی کے سامنے رقص کر رہی ہے اور

رہے تھے۔ برہمن دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے اور ان سے آگے سومات کے بُت کے چاروں طرف ان دیوتاؤں کی سونے اور چاندی کی مورتیاں تھیں، جنہیں سومات دیوتا کا دربان سمجھا جاتا تھا۔

رقص شروع ہوا اور گنگھوڑوں کی پھنچا پھنچ اور پردوں کی اوٹ سے سازوں کی آواز نے روپ وتی کے رگ و پے میں بجلی کی لہر دوڑا دی۔ وہ ناچ رہی تھی اور باقی تمام لڑکیوں کے مقابلے میں لومشق ہونے کے باوجود تماشا سائوں کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی تمام دھڑکنیں سمٹ کر اس کے وجود میں آگئی ہیں۔ ہر لڑکی کی لڑکیاں ایک ایک کر کے سومات کے بُت کے سامنے آتیں اور تھوڑی دیر اپنے کمال کا مظاہرہ کر کے بغل کے کمر میں غائب ہو جاتیں تھیں۔ جب روپ وتی کی باری آئی تو وہ اپنے گرد و پیش سے بیخبر ہو کر کافی دیر ناچتی رہی لیکن تماشا سائی اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت کا احساس نہ ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کا رواں رواں ناچ رہا ہے۔ اتنے میں سمندر کی طرنت کھلنے والے دروازے سے پروہت نمودار ہوا۔ چند تانبے روپ وتی کا رقص دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بلند کیا اور ایک لخت تمام ساز خاموش ہو گئے۔ روپ وتی گھبرا کر بھاگتی ہوئی پردے کے پیچھے زلپوش ہو گئی۔

پروہت نے کہا: ”چندرما سمندر کے دیوتا کو جگا چکا ہے۔ اب صرف سومات کی دیوی کا ناچ ہو گا۔“

پردوں کی اوٹ سے مختلف سازوں کی صدائیں ایک بار پھر بلند ہونے لگیں اور تمام لڑکیاں مختلف دروازوں سے نکل کر دوبارہ مورتی کے سامنے جمع ہو گئیں اور فرش پر بیٹھ کر اپنے بازو ہوا میں لہرانے لگی ایک حسینہ و جمیل عورت جس کے سر پر ہیروں کا تاج جگمگا رہا تھا، نمودار ہوئی اور ناچتی ہوئی سومات

مہادیو کئی دیوتاؤں کے ساتھ آکاش سے اتر کر اُسے دیکھ رہے ہیں۔ میرے دیوتا دیوتا کہتے ہوئے وہ مہادیو کے پاؤں میں گر جاتی۔ مہادیو اُسے اٹھاتے اور اپنے ماتہ اڑاتے ہوئے اس رنگین دنیا میں لے جاتے جہاں سدا بہار پھول کھلتے تھے۔ انشانی اور ندیاں نہ ختم ہونے والے راگ الاپتی تھیں۔ ایسے سپنوں سے بیدار ہونے کے بعد وہ دیر تک حسین تصورات میں کھوئی رہتی۔ شدید جسمانی ریاضت کے باعث روپ وتی کا جسم قدرے دُبلا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے حسن میں غایت درجہ کا نکھار اور اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ کشش پیدا ہو چکی تھی :

(۴)

مذہب آفتاب کے بعد مندر کی گھنٹی اور ناقوس کی آواز کے ساتھ روپ وتی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ رقص کرنے والی لڑکیوں کی ایک ٹولی میں اس جگہ کھڑی تھی جہاں ایک دروازہ اس وسیع کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کے درمیان سومات کا بہت نصب تھا۔ رقص کرنے والی لڑکیوں کی چند اور ٹولیاں اِدھر اُدھر پردوں کے پیچھے کھڑی تھیں۔

گھنٹیوں اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوئیں۔ برہمنوں نے بھجن گانے شروع کر دیے اور اس کے بعد رقص کرنے والی لڑکیوں کی مختلف ٹولیاں باری باری اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ آخر میں اس ٹولی کی باری آئی جس میں روپ وتی رقص کے لیے بے چین کھڑی تھی۔ دیوتا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک تانبے کے لیے روپ وتی کے حواس گم ہو گئے۔ ہیروں اور موتیوں سے سجے ہوئے فالو میں کافوری سمعوں کی تیز روشنی، چھت، دیواروں، ستونوں اور دروازوں کے پردوں میں جڑے ہوئے رنگارنگ جواہرات سے منعکس ہو کر نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سومات کا بُت جن بیش قیمت ہیروں سے مزین تھا۔ وہ ستاروں کی طرح بھللا

اس کی آمد و رفت کے راستے عام گزرگاہوں سے مختلف تھے اور اُسے کامنی اور اس کے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کو خاص خاص موقعوں کے سوا بہت کم دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ مندر کے اندر اور باہر کامنی کی حیثیت ایک ملکہ کی سی تھی اور کسی داسی یا بچاری کو اس کے ساتھ بے شکلف ہونے کی جرأت نہ تھی۔ مندر میں مشہور تھا کہ جو خوش قسمت لڑکی سومات کی دیوی کا تاج پہنتی ہیں وہ چند مہینوں کے اندر اندر کسی نامعلوم راستے سے مہادیو کے چروں میں جا پہنچتی ہے اور اس دنیا کے انسان اسے پھر بھی نہیں دیکھتے۔ اس کے بعد دیوی کا تاج کسی اور خوش نصیب لڑکی کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا تھا کہ ایک داسی مندر کی دیوی کا تاج پہننے کے چند ہفتے یا چند دن بعد ہی غائب ہو جاتی لیکن کامنی کے متعلق مندر کی لڑکیاں حیران تھیں کہ اُسے مندر کی دیوی کا تاج پہننے تین برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک مہادیو نے اُسے اپنے چروں میں جگہ نہیں دی۔ بعض لڑکیاں سرگوشی میں ایک دوسری سے کہا کرتی تھیں کہ کامنی سے کوئی پاپ ہوا ہے۔ اسی لیے مہادیو اسے اپنے پاس نہیں بلاتے لیکن اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جب تک کامنی جیسی حسین اور باکمال عورت اس کی جگہ لینے کے لیے موجود نہیں ہوگی۔ مہادیو اُسے اپنے پاس نہیں بلائیں گے۔ روپ و تی کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی کامنی کی جگہ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ عام لڑکیوں کی جاسے رہائش سے اس عالیشان عمارت میں منتقل ہونے کے بعد روپ و تی ناچ کی مشق کرنے میں اور زیادہ دلچسپی لیا کرتی تھی۔

ایک دن وہ علی الصباح حسب معمول اپنے کمرے میں ناچ رہی تھی کہ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ کچھ دیر وہ اپنے رقص میں غور ہی لیکن پھر اچانک دروازے پر اس کی نگاہ پڑی تو وہاں مندر کے پروہت کو دیکھ کر سکتے

کے بت کے سامنے آ گئی۔ اس کا نام کامنی تھا لیکن لوگ اسے سومات کی دیوی کہتے تھے، کامنی کا رقص عبودیت کے جذبات کے جذبات کے اظہار کی بجائے جسم کی پیاس کا مظاہرہ تھا۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح جھج جھج کھا رہی تھی۔ اس کے بازو ناگ کی طرح لہرا رہے تھے۔ اپنے بچاریوں کے جسم کو راجتیں بکھٹنے والے یلڑنا کے سامنے وہ ایک مجسم ابھرتی تھی۔

مندر میں ناؤس اور گھنٹیوں کی صدائیں زیادہ بلند ہونے لگیں۔ بچاریوں اور رقص کرنے والی لڑکیوں نے بلند آواز میں بھجن گانا شروع کر دیا۔ گھنٹیوں کی صدائیں جوں جوں بلند ہو رہی تھیں۔ کامنی کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ پھر مندر سے باہر سمندر کا شور سنائی دیا اور اٹھتی ہوئی لہر کا پانی کمرے کے اندر جمع ہونے لگا۔ جب اس کمرے میں پانی بڑھنے لگا تو رقصائیں اور بچاری ”مہادیو کی جے“ کے نعرے لگاتے ہوئے مندر کے بالائی حصوں کا رخ کر رہے تھے۔ اب ان کی جگہ چاند کا دیوتا اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ سومات کا بت آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب رہا تھا۔ پوجا کی رسومات مکمل ہو چکی تھیں اور بچاریوں کے نعروں کے جواب میں ہزاروں لوگ جو مندر سے باہر کھڑے تھے ”مہادیو کی جے“ کے نعرے لگا رہے تھے :

(۵)

سومات کے بت کے سامنے اپنے رقص کے کمالات پیش کر کے روپ و تی نے فن رقص کے استادوں کے علاوہ بڑے پروہت کو بھی اپنا مہربان بنا لیا تھا۔ اُسے عام لڑکیوں کے ساتھ رہنے کی بجائے اب پروہت کے محل کے ساتھ اس عالیشان عمارت میں ایک علیحدہ کمرہ دل گیا تھا، جہاں ادنیٰ حیثیت کی داسیاں رہتی تھیں۔ اس عمارت کی بالائی منزل میں کامنی رہتی تھی۔ مندر اور پروہت کے محل کی طرف

جاہل بیٹھ جاؤ۔ اسے تمھاری تو سانس بھولی ہوئی ہے، خیر تو ہے۔“

روپ دتی اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔ ”آج ایک عجیب بات ہوئی ہے میں ابھی تک ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں نے پینا دیکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں ناچ رہی تھی کہ اچانک کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں پردہ ہٹ جی کھڑے ہیں۔ پھر مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ انھوں نے کہا۔ ”تم بہت اچھا ناچتی ہو، ہم کامنی دیوی سے کہیں گے کہ وہ تمھارا خیال رکھے۔“ بس اتنی بات کہہ کر وہ چلے گئے۔

نرملانے کہا۔ ”میں نے پہلے دن ہی تمھارا ناچ دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ تم کسی دن مندر کی دیوی بنو گی۔ اب تو تم یہ نہیں کہو گی کہ میں نے تم سے مذاق کیا تھا۔ تم بہت خوش قسمت ہو روپ دتی۔“

”لیکن میں ڈرتی ہوں۔“

”کس بات سے؟“

”میں سوچتی ہوں کہ ماد دیو مجھے اپنے چرنوں میں کیسے جگہ دیں گے۔ کامنی کا ناچ دیکھ کر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں ویسی بن سکتی ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ کامنی دیوی نے تمھارے متعلق کیا کہا تھا؟“

”کیا کہا تھا، کس سے کہا تھا۔“

”میں کل ان کے درشن کے لیے گئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ روپ دتی کسی دن مجھ سے بہتر ہو جائے گی۔“

”کامنی دیوی بہت رحم دل ہے لیکن میں اس قابل نہیں۔“

”تم نے کبھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے؟“

”کیا ہے میرے چہرے میں؟“

”تم بہت سند ہو روپ دتی۔“

میں آگئی۔ پردہ ہٹ سانسوں کے رنگ اور درمیانے قد کا تو ہی سہی انسان تھا۔ اس کی عمر چالیس سے ادیر تھی لیکن اس کے چہرے سے عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کی ہیبت میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ آنکھیں کافی بڑی تھیں اور گھنی بھوئی آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ روپ دتی نے اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد جھٹک کر اس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

پردہ ہٹ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت اچھا ناچتی ہو۔“

روپ دتی نے اس کی نگاہوں کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھپکالیں۔ پردہ ہٹ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”اگر تمھارا شوق اسی طرح رہا تو تم بہت کچھ سیکھ جاؤ گی۔ ہم کامنی سے کہیں گے کہ وہ تمھارا خاص خیال رکھے۔“

پردہ ہٹ کچھ اور کچھ بغیر باہر نکل گیا۔ روپ دتی اپنے دل میں مسرت کی دھڑکنیں محسوس کر رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس عمارت سے کچھ دور ایک اور عالی شان عمارت کا رخ کر رہی تھی۔ اس محل کی دوسری منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی کی تسوانی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں روپ دتی!“

”اندر آ جاؤ نا۔“

روپ دتی اندر داخل ہوئی۔ نرملانے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ روپ دتی کو دیکھ کر انگڑائی لینے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم ابھی تک سو رہی ہو اب تو سو راج بھی نکل آیا ہے۔“ روپ دتی نے کہا۔ نرملانے جواب دیا۔ ”سو نہیں رہی، یونہی لیٹی ہوئی تھی۔ اٹھنے کو جی نہیں

رہتی تھی۔ عام طور پر وہ خود روپ دتی کے پاس جایا کرتی تھی۔ لیکن جب کبھی وہ ایک در
دن تک نہ آتی تو روپ دتی اس کے پاس پہنچ جاتی،

(۶)

ایک دن روپ دتی نرلا سے ملاقات کے بعد محل سے نیچے اتر رہی تھی کہ پھلی
منزل سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے تدریے آہستہ سے چند
قدم اٹھائے اور پھر بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ کسی خیال سے اس کا سارا جسم
رزاٹھا۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ اس کی سانس ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ یہ راگ
اس نے کئی بار سنا تھا، کئی بار گایا تھا۔ کبھی اس کی تانیں اس کی چھوٹی سی معصوم دنیا
کو مرستی سے لبریز کر دیا کرتی تھیں لیکن اب وہ مسرت کی بجائے خوف اور اضطراب
محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی پختی
منزل میں جا پہنچی لیکن اب اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ چند ثانیے توقف
کے بعد وہ ڈرتی، جھجکتی اور لرزتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں سے گانے
کی آواز آرہی تھی اور کمرے کے نیم دروازے کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ کئی بار
اس نے کمرے کے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو اوٹ کو
پھونکنے کے بعد خود بخود پیچھے ہٹ جاتے۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنا چاہا
لیکن اچانک برآمدے کے آخری سرے سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور
وہ گھبراہٹ میں پھر بیڑھی کی طرف لوٹ آئی اور پیچھے اترنے کی بجائے بھاگتی
ہوئی دوبارہ نرلا کے کمرے میں جا پہنچی۔

”کیا ہوا؟ نرلا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہ..... وہ کون ہے؟“ روپ دتی نے سنہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”کس کے متعلق پوچھ رہی ہو تم۔ اری کہیں بھوت تو نہیں دیکھ لیا تم نے؟“

”تم سے زیادہ مسندرتو نہیں ہوں۔“

”تم بہت بھولی ہو۔“ نرلا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
نرلا اور روپ دتی کو ایک دوسرے سے متعارف ہونے سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا
تھا، صرف تین ماہ قبل نرلا نے اسے پہلی بار رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد
ایک دن وہ اپنے استاد سے سبق لے کر آرہی تھی کہ اُسے دایسوں کی قیام گاہ کے
ایک کمرے میں کسی کے ہونے ہوئے سروں میں گانے کی آواز آئی۔ یہ بیٹھی اور
دلکش آواز اس کے کانوں کو بھلی معلوم ہوئی اور وہ دیر تک دروازے کے قریب
کھڑی سنتی رہی پھر اس نے قدرے جرأت سے کام لیا اور کمرے کے اندر چلی گئی
گانے والی روپ دتی تھی۔

نرلا نے کہا۔ ”معاف کیجیے آپ کی آواز مجھے زبردستی اندر کھینچ لائی ہے۔“

”آئیے تشریف لائیے۔“ روپ دتی نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”نہیں میں پھر آؤں گی۔ اب مجھے اپنا سبق یاد کرنا ہے۔“

”ضرور آئیے۔“

نرلا دروازے کے قریب پہنچ کر رُکی اور مڑ کر روپ دتی کی طرف دیکھتے
ہوئے بولی۔ ”چند دن ہوئے میں نے آپ کو ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت
بھی میرا ارادہ تھا کہ آپ سے ملوں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ کسی دن مندر
کی دیوی کا تاج آپ کے سر پر ہوگا۔“

”آپ مذاق کرتی ہیں۔“

”نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔“

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد چند اور ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے
کی بے تکلف سہیلیاں بن چکی تھیں۔ نرلا ابھی تک انہل وارہ کے راجہ کے محل میں

”نچلی منزل میں کوئی گارہا ہے۔ وہ کون ہے؟“
 ”اس نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“
 ”نہیں نہیں..... میں..... میں اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی“
 ”بلیٹھ جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ نیچے
 گانے والا کوئی بھوت نہیں ایک انسان ہے اور وہ خوفناک بھی معلوم نہیں ہوتا۔
 میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے“

”وہ کون ہے، آپ اسے جانتی ہیں، وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“
 ”وہ انہل واڑہ کے راجہ کا آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک بہادر سپاہی
 ہے اور یہاں پہنچتے ہی اس نے فوج میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کر لیا ہے۔“
 ”تمہیں یقین ہے کہ وہ انہل واڑہ کے راجہ کا آدمی ہے؟“
 ”اگر وہ راجہ کا آدمی نہ ہوتا تو اس محل میں اُسے ٹھہرنے کی اجازت نہ ملتی۔“
 ”لیکن وہ تو....“ روپ دتی اتنا کہہ کر اچانک خاموش ہو گئی۔
 ”وہ کیا؟“ نرملانے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کوئی دنیا کا بہت ہی ستایا ہوا انسان ہے۔“
 ”ہاں! اس کی آواز میں بہت درد ہے۔ اُسے جب بھی موقع ملتا ہے گانے
 لگتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ رات کے تیسرے پہر گانا شروع کر دیتا ہے لیکن میں
 تمہاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ سچ کہو تمہارے ساتھ اس نے کوئی گستاخی تو
 نہیں کی؟“

”نہیں، میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“
 ”تو پھر اس قدر پریشان کیوں ہو؟“
 ”روپ دتی لا جواب ہو کر بولی۔“ میں اس کی درد بھری آواز سن کر چلتے چلتے
 ”تم بہت بھولی ہو۔“
 ”کبھی کبھی میں پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہوں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔“
 ”روپ دتی کرنے سے باہر آئی تو گانے والے کا راگ ختم ہو چکا تھا۔ وہ نیچلی
 منزل میں پہنچی تو ایک آدمی سیڑھی کے قریب برآمدے میں کھڑا باہر جھانک رہا
 تھا۔ اس کا چہرہ ستون کی اوٹ میں تھا لیکن عین اس وقت جب روپ دتی وہاں
 گزر کر پانچ چھ سیڑھیاں نیچے اتر گئی تو وہ آدمی جلدی سے اس کے پیچھے اترنے لگا
 روپ دتی نے اچانک مڑ کر دیکھا اور ایک لمحہ کے لیے سکتہ میں رہ گئی۔ یہ وہی
 زبوان تھا جسے وہ چاہتی تھی۔ رام ناتھ اپنے خیال میں آگے نکل گیا لیکن اچانک
 اس کے پاؤں رُک گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”روپا! روپا!“ اس کے جسم اور روح کی پکار بے اختیار اس کے ہونٹوں پر
 اُٹتی۔ ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور پھر ان کے درمیان آنسوؤں کے
 پردے عائل ہونے لگے۔

”روپا! میں کئی دن سے یہاں بھٹک رہا ہوں اس امید پر کہ تم اچانک کہیں
 مل جاؤ گی۔ میں کسی کو تمہارا نام بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ بھگوان نے میری پکار سن
 لی اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔ اب میں تمہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں
 گا۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔“

”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“ روپ دتی نے انتہائی اضطراب کی
 حالت میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”رام ناتھ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔“ میرے ساتھ آؤ

روپا! میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

اور روپا نے کچھ کے بغیر اس کے ساتھ چل دی۔ چند ثانیے بعد وہ دارم کے کمرے میں کھڑی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”روپا! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اب ہمارے کے مندر کی ہندو اور اس ہمارے درمیان حائل نہیں ہو سکیں گی۔“

اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ ہمارے درمیان آگ کا ایک پہاڑ کھڑا ہے۔ اسے عبور کرنے کی کوشش میں ہم دونوں بھسم ہو جائیں گے۔ میں مادیو کی داسی بن چکی ہوں۔ اب اس دنیا سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تمہارے لیے مرجی چکی ہوں۔“

”پگلی! تم سمجھتی ہو کہ وہ پتھر کی مورتی تمہیں مجھ سے چھین لے گی۔“

”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“

”نادان کہیں کی۔“ رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ بکلمت ایک طرف ہٹ گئی اور غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس کے بعد تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔“

”میں سو منات کے بت کے سامنے کھڑا ہو کر چلاؤں گا کہ تم میری ہو۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو۔“ روپا نے یہ کہہ کر دروازہ کھولا اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رام ناتھ انتہائی بے بسی کی حالت میں کھڑا تھا۔ اس مسافر کی طرح جس کی تمام پونجی لٹ چکی ہو۔

رنیر اور رام ناتھ

رام ناتھ کے سامنے مایوسی کی تاریک گھاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زندگی اب اس کے لیے صبح دشام کے بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ وہ دلکش نغمے جو اسے اپنی دلی محبت نے سکھائے تھے، اب اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ اس فریب میں مبتلا رہنا چاہتا تھا کہ روپا نے اس سے ہمیشہ کے لیے جدا نہیں ہوئی۔ وہ علی الصباح اٹھتا اور مندر کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا۔ عام لوگوں کو خاص خاص موقعوں کے سوا اس خندق کا پل عبور کرنے کی اجازت نہ تھی جو مندر کے ساتھ چند ملحقہ عمارات کو قلعے کے وسیع احاطہ سے جدا کرتی تھی۔ پھر بیدار ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے تھے۔

رام ناتھ پنڈتوں، سادھوؤں، داسیوں اور ادنیٰ حیثیت کے ملازموں کو بڑوں پر آتے جاتے دیکھتا لیکن روپا نے اُسے کہیں نظر نہ آتی۔ پھر مایوسی کی حالت میں فوج کی تربیت گاہوں میں چلا جاتا۔ ابتدائی چند دنوں میں اس نے نیزہ بازی اور بیخ زنی کے مقابلوں میں کافی نام پیدا کر لیا تھا لیکن روپا نے اس سے ملاقات کے بعد اس پر ایک ذہنی اور جسمانی جمود طاری ہو چکا تھا اور جب فوج کے افسر

اسے کسی مقابلے میں شرکت کی دعوت دیتے تو وہ علالت کا بہانہ کر دیتا۔ ایک شام وہ اپنی قیام گاہ سے نکلا اور ٹہلتا ہوا خندق کے پل کے قریب جا پہنچا۔ اسے خندق کے دوسرے کنارے روپ دتی دکھائی دی۔ وہ نرلا کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی پل کی طرف آرہی تھی۔ رام ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ روپ دتی کے قریب پہنچ کر ٹوک گئی لیکن نرلا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر پل کے اوپر لے آئی۔ نصف سے زیادہ پل عبور کرنے کے بعد اچانک روپ دتی کی نگاہ رام ناتھ پر پڑی۔ وہ رُک کر اور بدحواسی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ نرلا کچھ دیر پریشانی کی حالت میں اسے دیکھ رہی۔ پھر اپنی قیام گاہ کی طرف بڑھی۔

رام ناتھ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور چند ثانیے وقت کے بعد نرلا کے پیچھے ہولیا اور جلد ہی اس کے قریب پہنچ کر ملتی آواز میں بولا ”دیوی ٹھہریے“ وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”معاف کیجیے۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں“

”پوچھیے!“ نرلا نے ملائمت سے جواب دیا۔

”میں اس لڑکی کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں جو ابھی آپ کے ساتھ آرہی تھی۔“ نرلا کو مندر کی ہوسنے والی دیوی کے لیے لڑکی کا لفظ کچھ ناگوار محسوس ہوا اور اس نے کہا ”اس سے پہلے کہ آپ کوئی اور بات کریں، میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ وہ عام لڑکی نہیں۔ وہ بہت جلد مندر کی دیوی بننے والی ہے۔“

رام ناتھ کا دل بیٹھ گیا اور اس نے قدرے محتاط ہو کر کہا ”معلوم ہوتا ہے وہ آپ کی سبیلی ہے۔ ایک دن میں نے اسے محل میں دیکھا تھا۔ شاید وہ آپ سے

ملنے آئی تھی۔“

نرلا نے کہا ”تو اس دن اس کی پریشانی کی وجہ آپ تھے اور آج بھی شاید وہ آپ کو دیکھ کر واپس چلی گئی ہے۔ دیکھیے! اگر آپ زندگی سے تنگ نہیں آگئے تو دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ مہادیو کا مندر ہے، انہل راڈ کا بازار نہیں۔“

رام ناتھ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ سینے میں گھٹ کر رہ گئے۔

(۲)

رات کو رام ناتھ دیر تک بستر برسرے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی اُمید کا آخری چراغ بجھ چکا تھا۔ اس کے سینے میں محبت کے نغمے خاموش ہو چکے تھے۔ زندگی میں اب کوئی دلکشی باقی نہ تھی۔ روپ دتی اس سے ہمیشہ کے لیے چھن چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور وہ بھی صرف نفرت کے لیے۔ روپ دتی نے اس کی محبت کے پھول مسل دیے تھے اور اب وہ اس کی آنکھوں میں ایک خارین کرکھٹکنا چاہتا تھا۔ پھر وہ سوچتا کیا میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں اور کیا میری نفرت کا اظہار اسے متاثر کر سکتا ہے۔ نہیں میرے دل کی آگ صرف مجھے جلا سکتی ہے۔ وہ مجھے نہیں دیکھے گی، وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ میرے اور اس کے درمیان مندر کی بلند دیواریں حائل ہیں۔ وہ مندر کی دیوی بننے والی ہے۔ راجے اور رانیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر ہیں گے۔ وہ میری طرف کیسے دیکھے گی۔ دیوتاؤں کا خوف اس کے اور میرے درمیان حائل رہے گا۔ پھر وہ کسی دن مہادیو کے چرنوں میں پہنچ جائے گی۔ کیسے اور کیوں؟ اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک ذہنی تبدیلی کے باوجود جس کا پس منظر

”روپا! روپا!“ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ ”میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔“

صبح ہو گئی۔ وہ اپنے دل پر ایک ناٹابل برداشت بوجھ لیے محل سے باہر نکلا۔ مندر کی طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر تیسے کی چہل پہل دیکھتا ہوا اس طرف نکل گیا جہاں گھوڑوں کے اصطبل تھے۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بے اختیار ”رنیر رنیر کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ رنیر ایک عام سپاہی کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو رام ناٹھ کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں ہمارا ایک دوسرے سے بڑے تکلف ملنا ٹھیک نہیں۔“

رام ناٹھ نے کہا، ”تم بہت اچھے وقت پر ملے ورنہ میں کہیں جا رہا تھا۔ کب آئے تم؟“

رنیر نے جواب دیا۔ ”میں کئی دن سے یہاں ہوں لیکن قلعے کی فوج میں پرسوں بھرتی ہوا تھا۔ اس سے قبل میں شہر میں تھا۔ تم کہاں جا رہے تھے؟“

”مجھے معلوم نہیں، شاید میں کچھ عرصہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد تمہارے گاؤں پہنچ جاتا۔“

”تم بہت مفہوم معلوم ہوتے ہو۔ روپ وٹی کا کوئی پتہ چلا۔“

”وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بھین چکی ہے۔ کاش! میں یہاں نہ آتا۔“

”کیا ہوا اُسے، مجھے تمام واقعات سناؤ۔“

رام ناٹھ نے اپنی ملاقات کے حالات بیان کر دیے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

رنیر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

خیالات کے نشو و ارتقا کی بجائے صرف چند حادثات تھے۔ وہ اس فلسفہ کی گہرائیوں تک نگاہ دوڑانے سے قاصر تھا جو سومات کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھا۔

دیر تک سوچنے کے بعد وہ اس حقیقت کا اعتراف کر رہا تھا کہ روپ وٹی کی سنگدلی اور بے وفائی کے باوجود میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے بتوں کی قوت و عظمت سے انکار کر سکتا ہوں لیکن اس انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی کہ روپ وٹی کو وہ مجھ سے چھین چکے ہیں اور میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں کسی سلطنت کا راجہ بن کر بھی سومات کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا۔ مندر کے پروہت کے حکم سے اس ملک کے لاکھوں انسان میرا گوشت لوہنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میں اس دن اپنے آپ کو کس قدر خوش قسمت سمجھتا تھا کہ جب انہل واڑہ کے راجہ نے مجھے ہیروں کی مالا اور ایک ہاتھی عطا کیا تھا۔ سومات کے مندر کا رخ کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میرے قدموں میں ہے۔ روپ وٹی مجھ پر فخر کرے گی لیکن اب میں کیا ہوں۔ ایک ایسا انسان جو زندگی کی ہر بازی ہار چکا ہے۔ اُس دن مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ اسے ہیروں کی مالا پیش کرنے کا موقع نہ ملا لیکن اگر میں یہ مالا پیش کر دیتا تو وہ شاید قہقہہ لگا کر کہتی کہ ایسے تمہارے قدموں پر سچا در کیے جاتے ہیں۔ روپ وٹی کے مقابلے میں کمتری کے احساس نے اس کی بے بسی اور تلخی میں اضافہ کر دیا۔ وہ بھاگتا چاہتا تھا۔ سومات سے کہیں دور جہاں روپا کی یاد اُسے پریشان نہ کر سکے لیکن دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ روپ وٹی جو سومات کی دیوی بننے والی ہے ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین چکی ہے لیکن وہ دیہاتی لڑکی جو دریا کے کنارے میرے گیت گایا کرتی تھی، ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ اس کی مسکراہٹیں ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی رہیں گی۔ میری روح کا نسا کی بھیانک دستوں میں ہمیشہ اُسے پکارتی رہے گی۔

رام ناٹھ نے کہا: ”تم نہیں جانتے رہبر! مندر کی دیوی بننے کے بعد اُن
دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لاسکتی۔“
”مجھے یقین ہے کہ تمہاری محبت دنیا کی ہر طاقت کو شکست دے گی۔“
رام ناٹھ ایک بار پھر تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رہبر
کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: ”میرے ساتھ آؤ، مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔“
رہبر اس کے ساتھ چل دیا:

(۳)

نرمل محل کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اچانک اُسے رام ناٹھ اور رہبر
اوپر آتے ہوئے دکھائی دیے اور وہ انھیں راستہ دیتے کے لیے ایک طرف ہٹ
کر کھڑی ہو گئی۔ رہبر گردن جھکائے رام ناٹھ کے ساتھ باتیں کرتا آ رہا تھا۔ اس
لیے وہ نرمل کو نہ دیکھ سکا۔ نرمل نے پہلے تو اس کی طرف بے توجہی سے دیکھا لیکن
دوسری نظر میں دیکھتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب ان کے درمیان صرف
زینوں کا فاصلہ رہ گیا تو رہبر نے اچانک گردن اٹھائی اور نرمل کو دیکھ کر وہیں ٹھٹھک
گیا۔ رام ناٹھ چند زینے اوپر چڑھ گیا لیکن یہ دونوں سکتے کے عالم میں ایک دوسرے
کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی میں زبان ہلانے یا آنکھیں جھپکانے کی سکت نہ تھی۔
انھیں اپنے دلوں کی دھڑکنیں محسوس ہونے لگیں۔ نرمل کے چہرے پر سرخ و سپید
لہریں دوڑنے لگیں۔ رہبر نے رام ناٹھ کی طرف دیکھا جو چند زینے اوپر کھڑا
پریشان ہو کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ نرمل وہیں
بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ جب وہ دونوں نکلا ہوں سے ادھل ہو گئے تو نرمل لپچے
اترنے کی بجائے زینے پر چڑھنے لگی۔ ہر قدم پر اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔

رہبر دوسری منزل کے برآمدے میں آ کر رکا اور اس نے رام ناٹھ سے سوال
کیا: ”تم جانتے ہو وہ کون ہے؟“
رام ناٹھ مگر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: ”میں اس کے متعلق صرف اتنا
جانتا ہوں کہ وہ اسی محل میں رہتی ہے۔ ایک نوکر نے مجھے بتایا تھا کہ انہل وارٹھ کے
راجہ کا چچا اس کے باپ کا دوست ہے لیکن تم اُسے دیکھ کر اس قدر بدحواس
کیوں ہو گئے تھے۔“

رہبر نے کہا: ”یہ رہی ہے۔ جے کرشن کی بیٹی۔ تم نے اُسے ہمارے محل میں
نہیں دیکھا؟“

”نہیں، وہاں مجھے اُس کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔“

”اس کا باپ بھی یہیں رہتا ہے؟“

رام ناٹھ اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن نرمل کو اوپر آتے دیکھ کر چپ
ہو گیا۔ سیڑھی کے موڑ پر پہنچ کر نرمل نے ایک ثانیہ کے لیے رُک کر اُن کی طرف
دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

رہبر نے کہا: ”میں اس کے باپ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“

رام ناٹھ نے جواب دیا: ”میں اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔
لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں۔ اس لڑکی کے پاس چند نوکروں اور
نوکرانیوں کے سوا کوئی نہیں۔ ایک نوکرانی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں تعلیم حاصل
کرنے کے لیے ٹھہری ہوئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو دیکھ کر وہ کیا خیال کرے
گی۔ اگر وہ چاہے تو آپ کے لیے بہت سے خطرات پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں فوج
میں انہل وارٹھ کے کسی دستے ہیں۔ اگر وہ انھیں حکم دے تو وہ فوراً اس محل کا
محاصرہ کر لیں گے۔ مندر کے بڑے پروہت تک بھی اس کی رسائی ہے۔“

پر آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

زنیر نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے میں انتقام کی آگ سر ہو کر رہ گئی۔
چند لمحات کے لیے وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ایک ایسی
لڑکی کھڑی تھی جس کی مسکراہٹ ماضی کی تمام تلخیوں کا عداوہ بن سکتی تھی۔ جس کے
آنسو بغض و عناد کی اس سیاہی کو دھو سکتے تھے جو اس کی زندگی کے دامن پر پھیلی
ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں وہ میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی جو اسے ایک
نئی زندگی کا پیام دے چکی تھی۔ وہ ان باتوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سارے حیات
کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑ سکتے تھے۔ نرملہ اپنی رعنائیوں اور دلہریسیوں کے ساتھ
اس کی داستانِ حیات کا ایک نیا درق الٹ رہی تھی۔ چند لمحات کے لیے وہ سب کچھ
بھول جانا چاہتا تھا لیکن اچانک اس کا سارا جسم کپکپا اٹھا۔ ”میں کیا سوچ رہا
ہوں؟“ اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور بڑھے باپ کا خون اور لوز جوان بہن
کے آنسو ان کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا
دل بیٹھ گیا۔

نرملہ نے پھر کہا ”آپ مجھے یہی بتانے آئے تھے کہ آپ میرے باپ کو
معاف نہیں کر سکتے؟“

زنیر نے جواب دیا ”مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ یہاں ہوں گی۔ میں یہاں اپنی
بہن کی تلاش میں آیا ہوں۔“

نرملہ نے کہا ”میں بھی آپ کی بہن کو تلاش کر چکی ہوں۔ شکستہ نام کی یہاں تھیں
لڑکیاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی قنوج کی نہیں۔ میں بڑے پردہ پر ہوت اور بھاری
سے بھی پوچھ چکی ہوں۔“

”میں اس ہمدردی کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن آپ کو یہ خیال کیسے

زنیر نے کہا ”اگر اس کا باپ یہاں نہیں ہے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں، تاہم
جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں اس کے لیے احتیاط برتنا ضروری ہے۔ تم
یہیں ٹھہر دوں ابھی آنا ہوں۔“ زنیر رام ناٹھ کو کچھ کہنے کا موقع دے بغیر واپس
سڑا اور تیزی سے میٹر بھی پر چڑھنے لگا۔

نرملہ اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ زنیر میٹر بھی
نمودار ہوا تو اس کا چہرہ ایک بار پھر تھما اٹھا۔ زنیر آگے بڑھا تو وہ جھجکتی ہوئی کمرے
کے اندر چلی گئی۔ زنیر تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ نرملہ ایک ثانیہ کے لیے دروازے
کے باہر جھانکنے کے بعد پیچھے ہٹ گئی۔ زنیر کمرے میں داخل ہوا۔ انھوں نے
بھکی بھکی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نرملہ مسکرائی اور اس کے ساتھ ہی
آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

زنیر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ”معاف کیجیے، میں آپ کو پریشان کرنے نہیں
آیا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کا خطرہ محسوس
نہیں کرنا چاہیے۔“

نرملہ نے سنجیدہ آواز میں جواب دیا۔ ”آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن میں اب بھی تمھارے باپ کا دشمن ہوں۔“

وہ بولی۔ ”دنیا میں اگر کسی انسان کو اچھا دوست نہ ملے تو اچھا دشمن مل جاتا
بھی غنیمت ہے۔ آپ یقین رکھیں کہ جب آپ کی تلوار میرے پتا کی گہرے دن پر ہوگی
تو میں آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔“

”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو بھول سکتا ہوں تو آپ غلطی
پر ہیں۔“

”کیا آپ مجھے یہی بتانے آئے ہیں؟“ نرملہ کی خوبصورت آنکھیں پھر ایک

آیا کہ وہ یہاں ہوگی۔“

”آپ کا گاوں چھوڑنے کے بعد میں بھگوان سے صرف یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ آپ کی بہن آپ کو مل جائے۔ میں نے اسے گوالیار میں بھی تلاش کیا تھا لیکن آپ مایوس نہ ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے ضرور ملے گی۔ اس دنیا میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ہو جاتی ہیں جن کا انسان کو گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ بات میرے تصور میں بھی نہ تھی کہ میں آپ کو دوبارہ دیکھوں گی۔ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ میرے سامنے کھڑے ہیں۔“

رنیر پھر ایک باد محسوس کرنے لگا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ہیں۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پوری قوت سے چلانا چاہتا تھا۔ ”تم میری ہو۔ جے کرشن کی بیٹی ہونے کے باوجود تم میری ہو۔“ وہ گرنے کو تھا کہ ایک بار گرنے کے بعد وہ پھر نہیں اٹھ سکے گا لیکن جذبات کی دوسری رد اسی شدت سے اس کا جذبہ مدافعت بیدار کر رہی تھی۔ وہ اپنے دل سے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا تم جے کرشن کو معاف کر سکتے ہو۔ کیا تم اپنی بہن اور اپنے باپ کو بھلا سکتے ہو؟“

”تشریف رکھیے۔“ نرملانے ملائمت سے کہا۔

”نہیں نہیں، مجھے معاف کیجیے۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

نرملانے اپنا کانپٹا ہوا ہاتھ اس کے بازو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھگوان کے کھیل ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر ہم دونوں بے بس ہیں۔“

لیکن رنیر اچانک پیچھے ہٹا، مڑا اور کچھ بھینکنے میں باہر نکل گیا۔

”رنیر!“ پیچھے سے نرملانے کی آواز سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے پاؤں میں بھاری زنجیریں ڈال دی ہیں لیکن اس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی

جرات نہ تھی۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑاہے تھے۔ اس کے باوجود اس کی رنما ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ دو لڑکیاں سیڑھی سے اوپر چڑھ رہی تھیں۔ رنیر کو اندھا دھند نیچے اترتا دیکھ کہ وہ بدحواس ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ رام ناتھ نیچلی منزل میں سیڑھی کے موڑ کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہوا رنیر! تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ رنیر نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ رام ناتھ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنارہے تھے۔ روپ دتی کے متعلق چند باتیں پوچھنے کے بعد رنیر نے کہا۔ ”میں اب اس قلعے سے باہر جا رہا ہوں۔ جب واپس آؤں گا تو تمہیں یہ بتا سکوں گا کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ روپ دتی کو اب بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔ اُسے یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔“

”کیسا خطرہ؟“

”تم نے نہیں سنا کہ جو لوگ کی مندر کی دیوی یا سب سے بڑی رفاہی مانتی ہے وہ کسی رات اچانک غائب ہو جاتی ہے۔“

”ہاں میں نے بھی سنا ہے اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہ جیتے جی مہادیو کے چرنوں میں کیسے پہنچ جاتی ہے۔“

رنیر نے کہا۔ ”اگر ہمیں اس بات کا علم ہو گیا کہ مندر کی موجودہ دیوی کس رات غائب ہوگی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے کہ وہ مہادیو کے چرنوں میں کس طرح پہنچتی ہے۔“

”یہ بات تو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔ ایک رات اچانک مندر کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں اور لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مندر کی دیوی مہادیو کے چرنوں

زئیر نے جواب دیا۔ ”شہر سے باہر دیا کے کنارے ایک سادہ صورت ہے اس کا نام بھگوان داس ہے۔ اگر تم کسی وقت میری ضرورت محسوس کرو تو اس کے پاس آجانا۔ شہر کے لوگ اُسے جانتے ہیں اور تمہیں تلاش میں دقت نہیں ہوگی۔“

(۴)

زئیر کی ملاقات سے دوسرے دن زلا مندر میں اپنے استاد سے سبق لے کر واپس آ رہی تھی تو محل کے دروازے پر ایک لوکرانی نے بتایا کہ ابھی آپ کے پتا جی آئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

زلا کے لیے پتا کی آمد غیر متوقع تھی۔ اس کے پتانے چند دن پہلے صرف یہ پیغام بھیجا تھا کہ رگھوناتھ کی کوششوں سے اُسے انہل واڑہ کے راہر نے ایک بڑی جاگیر عطا کر دی ہے اور وہ اس کے انتظام میں مصروف ہے۔ اس لیے تین چار مہینے تک سومنات نہیں آ سکے گا۔

وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بے کمرش اُسے دیکھتے ہی اٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بیٹی! تمہارا چہرہ اس قدر گرہایا ہوا کیوں ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں پتا جی! بیٹھے۔“

بے کمرش نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا رنگ بہت زرد ہو گیا ہے بیٹی!“

زلا نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”پتا جی! میں آپ کو ہمیشہ بیمار نظر آتی ہوں۔“

”میں تمہارے لیے ایک خوشخبری لایا ہوں بیٹی!“

میں پہنچ چکی ہے۔ اگلی شام مندر میں جشن منایا جاتا ہے اور دیوی کا تاج کسی اور کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔“

زئیر نے کہا۔ ”میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہمیشہ اس رات کے منتظر رہتے ہیں جنہوں نے کئی دیویوں کو مہادیو کے چرنوں تک پہنچتے دیکھا ہے۔ میں ایک ایسی دیوی کے متعلق سن چکا ہوں جو چار سال قبل مہادیو کے چرنوں تک پہنچتے پہنچتے واپس آ گئی تھی۔ اگر مندر کے پردہست کو اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے تو سومنات کا تمام لشکر اس کی تلاش میں نکل آئے گا۔“

”رام ناٹھ نے کہا۔“ میں کچھ نہیں سمجھا۔ بھگوان کے لیے مجھے صاف صاف بتائیے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔“

زئیر نے کہا۔ ”مندر کی دیوی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بڑے پردہست کو خوش رکھنا ہے۔ جب پردہست کا جی اچھا ہو جاتا ہے تو وہ اسے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔“

رام ناٹھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ اُسے مار دیا جاتا ہے۔“

زئیر نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں اُسے مندر سے دور مندر کی سطح پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں آدم خور مچھلیاں ہر وقت نئے شکار کی تلاش میں رہتی ہیں۔“

”نہیں نہیں میں یہ نہیں مان سکتا۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔“

”یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور تمہارے مانتے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے یہ باتیں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ روپ دتی اس افسوسناک انجام سے بچ جائے۔ اب میں جاتا ہوں۔“

زئیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رام ناٹھ نے پوچھا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”کینسی پتا جی؟“

جے کرشن نے اٹھ کر نرملہ کے پلنگ پر رکھی ہوئی آبنوس کی ایک صندوقچی اٹھائی اور اس کی گود میں رکھ دی۔

”اس میں کیا ہے پتا جی؟“ نرملہ نے دریافت کیا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“

نرملہ نے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو اس میں جو اہرات کے زیور جگمگا رہے تھے۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

جے کرشن نے کہا۔ ”بیٹی یہ تمام زیور تمہارے ہیں۔“

نرملہ کی حیرانی خوف و اضطراب میں تبدیل ہونے لگی۔

جے کرشن نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”تم بہت خوش قسمت ہو بیٹی۔“

رگھوناتھ نے بڑے بڑے راجوں کے خاندانوں کی لڑکیوں کو ٹھکر کر تمہیں منتخب کیا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“

نرملہ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جے کرشن اس کے سامنے رگھوناتھ کی

شخصیت، اس کی دولت، اس کے محل کی شان و شوکت اور راجہ کے دربار میں اس

کے اثر و رسوخ کی تعریف کر رہا تھا لیکن نرملہ جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دل

سے کہہ رہی تھی۔ ”کیا میرے سپنوں کی تعبیر ہی تھی؟ کیا میں نے اسی آندھی کے لیے

چراغ روشن کیے تھے۔ کیا قدرت کے نامعلوم ہاتھ ہمیں صرف اس لیے مختلف

سمتوں سے گھیر گھر کر ایک دوسرے کے قریب لاتے رہے ہیں کہ ہم اچانک ایک

دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں۔ کل میرے لیے زمیر نیلی امیدوں کا پیٹا

لے کر آیا تھا۔ وہ مجھے پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن اس کے باوجود میں

مایوس نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پھر آئے گا، وہ بار بار آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو قدرت

مجھے اس کے پاس لے جائے گی لیکن کیا یہ سب کچھ ایک دم تھا؟“

جے کرشن رگھوناتھ کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا۔ نرملہ کا دم گھٹ رہا تھا

وہ چیخا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر

بھاگ جائے لیکن اُس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔

بالآخر جے کرشن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں پروہت جی سے مل

اؤں۔ تمہیں لے جانے کے لیے ان کی اجازت ضروری ہے۔“

وہ باہر نکل گیا اور نرملہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ وہ

دیر تک غم میں ڈوبی رہی۔

(۵)

رام ناتھ علی الصباح قلعے سے باہر نکل کر شہر پہنچا اور وہاں سے بھگوان

داس کا پتہ پوچھتا ہوا دریا کے کنارے ایک باغ میں داخل ہوا۔ بھگوان داس جس

کا اصلی نام اس کے چند عقیدت مندوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک برگد کے

درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ چند آدمی اس کے گرد جمع تھے۔

”میں بھگوان داس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر کہا۔

بھگوان داس نے گردن اُپر اٹھائی اور رام ناتھ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے

کے بعد کہا۔ ”بھگوان داس میرا نام ہے۔ کہیے۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں زمیر کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس نے مجھے اس جگہ کا پتہ

دیا تھا۔“

بھگوان داس نے اُس کی طرف دوبارہ غور سے دیکھنے ہوئے پوچھا۔ ”آپ

کا نام؟“

”میرا نام رام ناٹھ ہے“

بھگوان داس نے کہا: ”رنیر اس وقت یہاں نہیں۔ ممکن ہے وہ تھوڑی دیر تک یہاں آجائے لیکن یہ ضروری نہیں۔“

”وہ اس وقت کہاں ہوگا، میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“

بھگوان داس نے عربی زبان میں اپنے ایک ساتھی کو کچھ سمجھایا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے رام ناٹھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ اس کے ساتھ جائیں۔“

رام ناٹھ اس کے ہمراہ چل دیا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ بالآخر رام ناٹھ نے اپنے راہنما سے دریافت کیا: ”رنیر کہاں گیا ہے؟“

”وہ آپ کو بندرگاہ پر ملے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

رام ناٹھ نے باقی راستہ اس سے کوئی بات نہ کی۔

بندرگاہ سومناٹ کے شہر کا ایک پررونق جھٹہ تھی۔ بڑی بڑی دکانوں میں ددر دراز کے ممالک کی مصنوعات فروخت ہوتی تھیں۔ سمندر کے کنارے دور دراز تک تاجروں اور ماہی گیروں کی کشتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ساحل سے دریا فصلے پر گمرے پانی میں پانچ جہاز کھڑے تھے۔ کشتیاں کسی جہاز سے تجارتی مال اتارنے اور کسی پر لانے میں مصروف تھے۔ ان جہازوں سے آگے حدنگاہ تک کئی اور جہازوں اور کشتیوں کے بازبان نظر آ رہے تھے۔

رام ناٹھ لوگوں کے ہجوم میں رک رک کر اندر دھڑکیٹھنے لگا لیکن اُس کے

ہمراہی نے کہا: ”وہ آپ کو یہاں نہیں ملے گا۔ میرے ساتھ آئیے۔“ رام ناٹھ پھر اس کے پیچھے ہو لیا۔ سمندر کے کنارے کنارے تھوڑی دور جا کر اس کا ساتھی ایک کشتی کے پاس رکا اور عربی زبان میں ملاحوں کو کچھ سمجھانے کے بعد کشتی میں سوار ہو گیا۔ رام ناٹھ نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی دیر بعد یہ کشتی گمرے پانی میں ایک جہاز کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاز کے قریب پہنچ کر رام ناٹھ کے راہنما نے جہاز کے ملاحوں کو دیکھ کر انہیں بلند آواز سے عربی زبان میں کچھ کہا۔ جہاز کا ایک طالع اس سے چند باتیں کر کے جہاز میں کہیں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نمودار ہوا تو رنیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ رنیر کا اشارہ باکر جہاز کے ملاحوں نے فوراً رستیوں کی سیڑھی نیچے لٹکادی۔

رام ناٹھ کے راہنما نے کہا: ”آپ اوپر جائیں، ہم یہاں انتظار کریں گے۔“

رام ناٹھ سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ گیا اور جہاز پر پاؤں رکھتے ہی رنیر کی طرف دیکھ کر بولا: ”میں صبح سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”خیر تو ہے؟“ رنیر نے پوچھا۔

رام ناٹھ جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مٹھا اس کی توجہ ایک خوش پوش آدمی کی طرف مبذول ہو گئی جو جہاز کے دوسرے کونے سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ جسم کے لحاظ سے اس کا چہرہ کچھ پتلا تھا۔ کشادہ پیشانی نیکے نقوش اور چمکدار آنکھوں سے ذہانت اور شجاعت ٹپکتی تھی۔ اس کی چال میں ثابت درجہ کی خود اعتمادی تھی۔ طالع اس سے دیکھتے ہی ادھر ادھر مٹھ گئے۔

رنیر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”یہ میرا دوست رام ناٹھ ہے۔ میں آپ سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے رام ناٹھ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا: ”میرا نام سلمان ہے۔“

”یہ اس جہاز کے کپتان ہیں۔“ رنیر نے کہا۔

مصافحہ کرتے وقت رام ناٹھ کی انگلیاں اس کی آہنی گرفت میں پھنچ کر رہ گئیں۔ رنیر نے رام ناٹھ کو مذہب دیکھ کر کہا: ”آپ یہاں بے تکلفی سے باتیں کر سکتے

ہوگی۔

رام ناٹھ نے کہا۔ ”لیکن میں آپ کو بھگے کرشن کے سامنے نہیں جانے دوں گا۔“
 رنبیر نے رام ناٹھ کی بات پر تو جبر نہ دی اور سلمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں
 رات کے وقت سمندر کے راستے مندر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قلعے کا
 دروازہ بند ہوگا اور باہر آنے کے لیے بھی مجھے یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا،
 اس لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

سلمان نے رنبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر میں انکار کر دوں تو؟“
 ”تو میں ابھی رام ناٹھ کے ساتھ وہاں چلا جاؤں گا۔ بھگے کرشن سے پٹنا میری
 زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔“

”لیکن آپ اگر اس سے انتقام لینے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی وہاں سے
 آپ کا بچ بھگنا آسان نہیں ہوگا۔“
 ”مجھے اس بات کی پروا نہیں۔“
 سلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں،
 لیکن میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

رام ناٹھ نے رنبیر سے کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“
 ”نہیں تم ابھی واپس چلے جاؤ۔ میں سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر بعد
 وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میرے لیے بہترین موقع وہ ہوگا جب مندر کے لوگ پوجا پاٹ
 میں مشغول ہوں گے۔ تم محل کے دروازے پر میرا انتظار کرنا اور نرملہ کو میرے
 متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

رام ناٹھ نے کہا۔ ”میں شام تک محل سے باہر رہوں گا۔“
 وہاں سے رخصت ہوتے وقت جب رام ناٹھ نے مہا فحے کے لیے سلمان

ہیں۔

سلمان نے ملاحتوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ان کی آن میں ادھر ادھر چلے گئے۔
 رام ناٹھ نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ خبر دیتے آیا ہوں کہ بھگے کرشن آگیا ہے۔“
 ”کہاں ہے وہ؟“ رنبیر نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنے محسوس کرنے
 ہوئے کہا۔

”وہ اسی محل میں اپنی بیٹی کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔“
 رنبیر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تو اُسے میرے متعلق معلوم ہو گیا ہوگا۔“
 ”نہیں مجھے یقین ہے کہ نرملہ اس سے آپ کا ذکر نہیں کرے گی۔“
 ”کیوں؟“

”میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ رات کے وقت میرے کمرے میں آئی تھی،
 اور اس نے رورو کر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کے پاس آپ کا آخری
 پیغام پہنچا دوں۔ وہ کل اپنے باپ کے ساتھ چلی جائے گی لیکن جانے سے پہلے
 وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے؟“

”تو اُسے ابھی تک اس بات کا یقین ہے کہ اس کے آنسو اس کے باپ
 کے پاپ دھو سکیں گے۔“

”میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ آپ کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔“
 رنبیر کا ارادہ ایک بار پھر متزلزل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے سنہلنے کی کوشش
 کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے بس کی بات نہیں رام ناٹھ! میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا
 کہ وہ بھگے کرشن کی بیٹی ہے اور میں مومن پسند کا بیٹا اور سکندلا کا بھائی ہوں۔ میں
 اپنے خاندان کی غیرت ایک لڑکی کے آنسوؤں کی بھینٹ نہیں کر سکتا۔ میں وہاں
 چلوں گا لیکن بھگے کرشن سے ملنے کے لیے ادبہ اس سے میری آخری ملاقات

رام ناٹھ نے سراپا التجا بن کر کہا: ”مجھے یقین ہے کہ راتِ وقی کا یہ انجام نہیں ہوگا۔ بھگوان نے آپ کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔“

”میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے آپ کی مدد کرنے کی ہمت دے۔“
(۶)

کافی رات گزرنے لگی تھی۔ بے کرشن نرملاکے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا لیکن نرملاکے توجہ کہیں اور تھی۔ وہ رنبیر کے متعلق پوچھنے کے لیے صبح سے شام تک کئی بار نچلی منزل میں رام ناٹھ کے کمرے میں جا چکی تھی لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ اب وہ ایک بار پھر قسمت آزمایا جا رہی تھی لیکن بے کرشن رگھو ناٹھ کا ذکر چھڑ چکا تھا اور اس کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ نرملانے سوچا رام ناٹھ کے نہ آنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ رنبیر اسے ابھی تک نہیں ملا۔ یا پھر بہت دیر بعد ملا ہوگا اور وہ رات کے وقت قلعے کے دروازے بند پا کر واپس چلے گئے ہوں گے۔ اب وہ علی الصبح قلعے کے دروازے کھلتے ہی یہاں پہنچ جائیں گے لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے وہ صبح دیر سے پہنچیں اور اسے اپنے تپا کے ساتھ انہیں دیکھے بغیر روانہ ہونا پڑے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنا سفر ملتوی کرنے کے بہانے سوچنے لگی لیکن کسی بھی فیصلہ کن اقدام کے لیے رنبیر کے ساتھ اس کی ملاقات ضروری تھی۔ رنبیر کے دل میں اپنے لیے تھوڑی سی جگہ پا کر وہ ہر طرف ان کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن رنبیر سے مایوس ہونے کے بعد اس کے لیے خوشی اور غم دونوں الفاظ بے معنی تھے۔ رنبیر اس کا آخری سہارا تھا اور یہ سہارا ٹوٹ جانے کے بعد مستقبل کی تمام امیدیں اور آرزوئیں ختم ہو جاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد نرملانے آنکھیں بند کر کے جمائی لیتے ہوئے کہا: ”پتاچی! میرا جسم لوٹ رہا ہے۔“

کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا: ”ہم دوبارہ ملیں گے۔ میں آپ کے دوست کی بنانی آپ کی سرگزشت سن چکا ہوں۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

رام ناٹھ پر اُمید سا ہو کر اس کی جانب دیکھتا رہا۔ سلمان تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا: ”اگر تم کسی طرح اس لڑکی کو مندر سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ جہاز تمہاری جائے پناہ ہوگا۔“

رام ناٹھ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”آپ کب تک یہاں ہیں؟“

”جب تک مجھے یہ اُمید رہے گی کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

اچانک رام ناٹھ کے دل میں ایک اور خیال آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے مایوسی کا اندھیرا چھا گیا۔ اس نے کہا: ”مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اپنی مرضی سے مندر چھوڑنے پر تیار ہو جائے گی۔“

سلمان نے کہا: ”جب وہ مندر کی دیوی بنے گی تو تم اس خیالات میں بہت بڑی تبدیلی پاؤ گے۔ اس رات وہ چلا چلا کر تمہیں مدد کے لیے پکار رہی ہوگی۔“

رام ناٹھ کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ملتی آواز میں کہا: ”میں نے اس قسم کی باتیں پہلے بھی سنی ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ کی صورت دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ بھگوان کے لیے مجھے بتائیے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔“

”وہی جو گزشتہ صدیوں میں بے شمار لڑکیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ابھی تک ایک عورت مالا بار میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ چار سال پہلے وہ بھی اس مندر کی دیوی تھی۔ پھر جب مندر کے پروہت کی طبیعت اس سے بھر گئی تو اسے مہادیو کے پاس پہنچانے کے بہانے مندر میں پھینک دیا گیا۔“

بے کوشی نے پریشان ہو کر کہا: ”اوہو! تمہیں میند آکر ہی ہے۔ مجھے باتوں میں یہ خیال نہیں رہا کہ تم گزشتہ رات بھی بہت کم سوئی تھیں اور کل تو ہمیں بہت سویرے اٹھنا ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔“

نرملانے اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا: ”چلے میں آک کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔“

”نہیں نہیں بیٹی تم لیٹ جاؤ۔“ یہ کہہ کر بے کوشی برآمدے سے ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نرملانے اپنے کمرے کا چراغ بجھایا اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل کر زینے کی طرف چل دی۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اُسے چند قدم نیچے ایک پہرے دار دکھائی دیا۔ جو ہاتھ میں مشعل لیے رام ناٹھ سے باتیں کر رہا تھا۔ نرملارام ناٹھ سے زینر کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے بے قرار تھی لیکن پہرے دار کی موجودگی میں اُسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں کھڑی رہی لیکن جب پہرے دار اپنی جگہ سے نہ ہلا تو وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور پہرے دار کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

بے کوشی نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پگڑی اتار کر ایک کھونٹی سے لٹکائی اور بستر پر بیٹھ گیا۔ بالکنی کی طرف کھلنے والے دروازے سے سمند کی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ بے کوشی کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر بالکنی کی طرف چلا گیا۔ اس کے دائیں اور بائیں کونوں کے چند کمرؤں کے سوا باقی تمام کمرؤں کی بالکنیاں ایک تنگ گیلری کے ذریعے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ بے کوشی تروتازہ ہوا میں چند سانس لے کر واپس مڑنے کو تھا کہ اسے نرمل کے کمرے کی بالکنی کے قریب کوئی متحرک سایہ دکھائی دیا۔

”کون ہے؟“ بے کوشی نے پوچھا۔

”میں پہرے دار ہوں۔ کسی نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے حجاب دیا۔ بے کوشی دوبارہ کہا: ”پہرے دار کو اس وقت سیرھیوں کا خیال کرنا چاہیے، یہاں تمہارا کیا کام ہے۔ تم بہت....“

بے کوشی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ پہرے دار نے آگے بڑھ کر اپنا خنجر اس کے سینے پر رکھ دیا اور کہا: ”خاموش رہو!“

بے کوشی خوف سے لرزنا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹا لیکن اجنبی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اُسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا۔

”تم کون ہو؟“ بے کوشی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں رنیر ہوں، موہن چند کا بیٹا اور شکنتلا کا بھائی۔“

یہ کہتے ہوئے رنیر نے اُسے دھکا دے کر بستر پر گرادیا۔

بے کوشی سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رنیر نے کہا: ”اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو میرے سوال کا جواب دو۔“ شکنتلا کہاں ہے؟“

بے کوشی نے کانپتی آواز میں کہا: ”مجھے معلوم نہیں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”میں جھگوان کی سرگد کھاتا ہوں۔ میں ہمارے لوگ قسم کھاتا ہوں، مجھ پر اعتبار کرو، مجھے معاف کر دو۔“

رنیر نے دوبارہ خنجر اس کے سینے پر رکھ دیا اور کہا: ”میں تمہیں آخری بار موقع دیتا ہوں۔“

”نہیں نہیں مجھ پر رحم کرو۔ تمہاری بہن کا مجھے کوئی علم نہیں۔ تمہارے گاؤں

نرملانے اپنے باپ کا بازو پکڑ کر اُسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن جے کرشن نے گھٹنوں کے بل ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔

رنیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نرملانے جے کرشن کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور بستر پر بٹھا دیا۔ جے کرشن کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ نرملانے چند ثانیے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ بارہا اس کے جی میں آئی کہ وہ بھاگ کر رنیر کا دامن پکڑ لے لیکن شرم و ندامت کے ناقابلِ برداشت احساس نے اس کے پاؤں میں رنجیر ڈال دیں۔ پھر وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی لیکن جے کرشن کو اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اُس کی نفرت اور حقارتِ رحم میں تبدیل ہونے لگی۔

”پتا جی!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جے کرشن نے گردن اوپر اٹھائی اور کچھ کہے بغیر اپنی باہیں کھول دیں۔ نرملانے مسکریاں لیتے ہوئے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

”پتا جی! مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دنیا میں اب میرا کوئی دشمن نہیں بیٹی!“

اب صرف تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“

نرملانے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پتا جی میرا خیال تھا کہ میں صبح آپ کے

نہرا نہ جاؤں لیکن اب میں آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔ ہم علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔“

جے کرشن پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں کوئی خیال آیا اور اس کی سرورہ لگوں میں غم کی گر دشت تیز ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ ”میں

کے لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں نے اسے بہت تلاش کیا تھا۔ میں نے اس کا سراغ لگانے والے کے لیے انعام مقرر کیا تھا اور اپنی بیٹی کے ساتھ تمہارا سلوک دیکھنے کے بعد میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر وہ کہیں مل جاتے تو میں اُسے لے کر خود تمہارے پاس پہنچوں اور تمہارے پاؤں پر برسرِ رکھ کر تم سے معافی مانگوں۔“

”اور تم سمجھتے تھے کہ اس طرح میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ تمہیں جس کے ہاتھ میرے باپ کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔“

نرملانے اپنے کمرے سے ان کی باتیں سن کر بالکنی کے راستے بھاگتی ہوئی جے کرشن کے کمرے میں داخل ہوئی اور رنیر اُسے دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ رنیر کے سامنے کھڑی ہو گئی اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ آپ کی فتح کا دن ہے۔ آپ رگ کیوں گئے، آپ کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں، میں آپ سے رحم کی درخواست نہیں کروں گی۔“

جے کرشن اٹھ کر بے اختیار آگے بڑھا اور رنیر کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھ پر دیا کر دو۔ مجھے معاف کر دو، میں اپنے کیسے کی سزا جھگت چکا ہوں۔“

رنیر نے نرملانے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ مجھے بزدل کہہ سکتی ہیں۔ آپ میرا کمزوری کا مذاق اڑا سکتی ہیں۔“

نرملانے آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ رنیر نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جے کرشن نے اس کے پاؤں مضبوطی سے تھام رکھے تھے۔ رنیر نے جھک کر اُس کا ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔ پھر دوسری ٹانگ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد دروازے کی طرف ہٹ گیا۔

لیکن اگر آپ کا بس چلے تو آپ اُسے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“
جے کرشن خاموش ہو گیا۔

جب رنیر جے کرشن کے کمرے سے باہر نکلا تو رام ناتھ دروازے کے قریب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ محل سے باہر نکل آئے اور رام ناتھ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ”مجھے یقین تھا کہ آپ نرملہ کے باپ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکیں گے۔“

رنیر نے کہا: ”اب کشتی والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں چند دن تک

تمہارے پاس نہیں آسکوں گا۔ جے کرشن جیسے لوگوں کی نیت بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ آج میں اگر میری ضرورت پڑے تو میرا ٹھکانا وہی ہے۔“

حیران ہوں کہ رنیر یہاں کیسے آیا اور اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں تمہارے کمرے میں تھا، وہ بالکنی میں پھپھپ کر ہماری باتیں کر رہا ہو گا۔ اب قلعے کے دروازے بند ہیں، کچھ یقین نہیں کہ وہ صبح تک باہر نکل سکے۔“

نرملہ اچانک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بدحواس ہو کر کہنے لگی: ”نہیں نہیں پتا!“
آپ ایسا نہ سوچیے۔ اگر اب آپ کے دل میں اس کے لیے کوئی بُرا خیال پیدا ہوا
آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھیں گے۔“

جے کرشن نے نرملہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا اور کہا: ”بیٹی! تم اطمینان رکھو، اب مجھے اس کا پیچھا کرنے کا خیال بھی نہیں آسکتا لیکن اس کا سو منات کے مندر کے آس پاس رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مسلمانوں کا جاسوس بن کر وہ اس مندر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”پتا جی! وہ صرف اپنی بہن کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اُسے دوبارہ یہاں نہیں دیکھیں گے لیکن میں جگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ نے اُسے پکڑ دانے کی کوشش کی تو میں اس محل کی پھت سے پھلانگ لگا دوں گی۔ اب آپ اُسے ہمیشہ کے لیے بھول جائیں۔“

جے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا: ”تمہیں معلوم تھا کہ رنیر یہاں ہے؟“

نرملہ نے جواب دیا: ”ہاں! وہ آتے ہی مجھ سے ملا تھا اور میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہاری بہن یہاں نہیں ہے۔“

”لیکن تم نے مجھے خبردار کیوں نہ کیا؟“

”پتا جی! مجھے یقین تھا کہ وہ موقع ملنے پر بھی آپ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔“

روپوش ہو جائے گی اور کبھی رام ناتھ کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی
اور وہ اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرنے لگتی۔

اپنے کمرے سے تھوڑی دور وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ رام ناتھ ایک بجلدی کے
باس میں ٹھکرا تھا۔ وہ ایک تانیہ کھڑی رہی، پھر کترا کر آگے نکل گئی لیکن چند قدم
چلنے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ ہانپتی کانپتی اور لڑکھاتی
ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کمرے کا دروازہ بند کرتی
رام ناتھ دہیز کے اندر پاؤں رکھ چکا تھا۔

”بھگوان کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔“ روپ دتی نے پیچھے ہٹتے ہوئے ملتی
آواز میں کہا۔

رام ناتھ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: ”میں زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہوں
اگر تم چاہو تو پھرے داروں کو بلالو۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”اپنے دل سے پوچھو۔“ رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے کٹدی چڑھا دی۔

”رام ناتھ ہوش کرو۔ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔“

”یہ کھیل تمہیں نے تو سکھایا تھا۔ گھبراؤ نہیں روپا! میں تم سے صرف ایک ضروری
بات کہنے آیا ہوں۔“

بھگوان کے لیے یہاں سے نکل جاؤ۔“

”نہیں میں اپنی بات ختم کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”میں تمہاری ہر بات کا جواب دے چکی ہوں۔“

”نہیں کئی باتیں ایسی ہیں جن کا جواب تم نہیں دے سکتیں۔ تم مجھے اس
ال کا جواب نہیں دے سکتیں کہ مندر کی دیویاں جیتنے جی مہادیو کے چرنوڑ

مندر کی دیوی

روپ دتی ناچ کی مشق کرنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا
دل مسرت سے اچھل رہا تھا۔ آج پروہت اور مندر کے چیدہ چیدہ یجاریوں نے
اس کا ناچ دیکھا تھا۔ یہ دسم تھی کہ جب ناچ ختم ہوتے پر آتما تھا تو کامنی مندر کی
دیوی کی حیثیت سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی تھی لیکن آج جب
کامنی کی باری آئی تو وہ غیر حاضر تھی اور پروہت نے اس کی جگہ روپ دتی کو ناچ
کا موقع دیا تھا۔

ناچ کے اختتام پر جب پروہت اور یجاری وہاں سے چلے گئے تو روپ دتی
کے استاد نے اس سے کہا: ”آج پروہت جی تم سے بہت خوش تھے۔ مجھے یقین
ہے کہ وہ کامنی کے بعد تمہیں مندر کی دیوی بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“ اس کے
بعد داسیوں نے روپ دتی کو اپنے جھڑٹ میں لے لیا اور اُسے مبارکباد دینے
لگیں۔ اپنی سہیلیوں سے پیچھا چھڑانے کے بعد وہ ایک فاستحانہ شان سے باہر
نکلی لیکن اس کی مسکراہٹیں اضطراب کے بغیر نہ تھیں کبھی اسے کامنی کا خیال آتا
اور اُسے اس بات کا افسوس ہوتا کہ کسی دن وہ ہمیشہ کے لیے اس کی نگاہوں سے

میں کیسے پہنچ جاتی ہیں۔“

”ایسی باتیں سوچنا پاپ ہے۔“

”نہیں، یہ کہنا پاپ نہیں کہ مندر کی دیوایاں مہادیو کے چہرہ کی بجائے آدم خور پھلیوں کے پیٹ میں جاتی ہیں۔ یہ کہنا بھی پاپ نہیں کہ وہ پروہت کے گناہوں کی گھڑیلوں کا بوجھ اپنے سر پر لا کر مندر سے باہر نکلتی ہیں اور یہ کہنا بھی پاپ نہیں کہ مندر میں کامنی کی جگہ لینے کے بعد تمہارے لیے زندگی کا ہر لمحہ موت سے زیادہ بھیانک ہوگا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو رام ناتھ! بھگوان سے ڈرو۔“

رام ناتھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے روپ وتی کو آواز دی۔ روپ وتی نے سراسیمگی کی حالت میں رام ناتھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور سہمی ہوئی آوازیں کہا: ”بھگوان کے لیے پلنگ کے نیچے چھپ جاؤ۔ جلدی کرو یہ شاید کامنی ہے مندر کی دیوی۔“

باہر سے آواز آئی۔ ”روپ وتی! روپ وتی! دروازہ کھولو!“

روپ وتی نے رام ناتھ کو پوری قوت سے پلنگ کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا: ”جی کھولتی ہوں۔“

رام ناتھ پلنگ کے نیچے چھپ گیا اور روپ وتی نے دروازہ کھول دیا۔ کامنی اندر داخل ہوئی۔ کامنی نے بید کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ تم کسی سے باتیں کر رہی ہو۔“

”میں، میں کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں۔“ روپ وتی نے ہکا بے ہوئے جواب دیا۔ ”آج آپ ناچ کے لیے نہیں آئیں۔ میں ارادہ کر رہی تھی کہ آپ کی خیریت پوچھنے آؤں۔“

کامنی نے مغموم لہجے میں کہا: ”آج رات میں تم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاؤں گی۔ میں تمہارے پاس ایک التجائے کر آئی ہوں۔ دروازہ بند کر دو۔“ روپ وتی نے دروازہ بند کر دیا۔ کامنی نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”میری ماں کچھ کوٹ میں رہتی ہے۔ وہ ہر تیسرے مہینے مجھے دیکھنے آیا کرتی تھی۔ اب اگلے مہینے اسے یہاں آنا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری غیر حاضری میں تم اسے یہ سوس نہ ہونے دو کہ یہاں اُس کا کوئی نہیں۔“

”آپ کی ماما کی سیوا میرا دھرم ہے لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آج رات آپ یہاں سے جا رہی ہیں۔ کیا پروہت نے آپ پر وہ راز ظاہر کر دیا ہے جو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا۔“

”پروہت کے بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھ پر یہ راز کسی دن پہلے ظاہر ہو چکا تھا۔ آج جب اس نے مجھے ناچ میں حصہ لینے سے روک دیا تھا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں میرے دن ختم ہو چکے ہیں۔“

”کئی دن پہلے؟ وہ کس طرح؟ بھگوان کے لیے مجھے بتائیے۔“

کامنی نے اٹھتے ہوئے کہا: ”ایسی باتیں مت پوچھو، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ کامنی کرے سے باہر نکل گئی اور روپ وتی نے دوبارہ دروازہ بند کر لیا۔ رام ناتھ پلنگ کے نیچے سے نکل آیا اور کہا: ”میں تمہیں اب پریشان نہیں کروں گا۔ اگر تم پر کوئی نازک وقت آیا تو یہ یاد رکھنا کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔“ اس وقت میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تم ہو۔ بھگوان کے لیے جاؤ، ورنہ میں اس کرے سے چلی جاتی ہوں۔“

”ہم بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے۔“ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ روپ وتی دوزخ ہو کر انتہائی عجز سے یہ دعا کرنے لگی۔ ”بھگوان

”یہاں آنے سے پہلے مجھے ہمارا رہنے جاگیر عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ہماری فوج میں نہیں رہنا چاہتے۔“

”ہمارا ج! جب میری ضرورت پڑے گی میں بن بلائے آ جاؤں گا۔“

سینا پتی نے کہا: ”تم ایک اچھے سپاہی ہو اور مجھے تمھارے جانے کا دکھ ہوگا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ انہل واڑہ کے ہمارا رہنے کے پاس جانے میں جو فائدہ ہیں تم ان سے محروم ہو جاؤ۔“

رام ناتھ نے کہا: ”مجھے جاگیر کالاچ نہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کسی دن محمد نے سونمات کا رخ کیا تو انہل واڑہ ہمارا سب سے بڑا مورچہ ہوگا۔“

میں چاہتا ہوں کہ وہاں جا کر قوم کے نوجوانوں کو بیدار کروں۔“

سینا پتی نے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”میں تمھیں خوشی سے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے سے باہر نکلا لیکن انہل واڑہ کی بجائے اس کی منزل بھنگوان داس کی قیام گاہ تھی۔

(۲)

اگلی رات کے تیسرے پہر مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صدا میں اور پجاریوں کے بھجن اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ مندر کی ذیلی مہادیو کے چرنوں میں پہنچ چکی ہے۔

روپ وتی رات کے تیسرے پہر مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کے شور سے جاگ اٹھی اور دیر تک بے حس و حرکت اپنے بستر پر پڑی رہی۔ رات کے وقت کمرے میں گھٹن سی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ مندر کے مختلف گوشوں سے ناقوس اور گھنٹیوں کے علاوہ آ

رام ناتھ کو معاف کر دو۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں گلی دککش نغمہ گونجنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

روپ وتی کے کمرے سے نکلنے کے بعد رام ناتھ نے اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ رقص اور موسیقی کے استادوں کے سوا عام پجاری مندر کے اس حصے میں بہت کم آتے تھے اور رام ناتھ کو خطرہ تھا کہ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ تم کون ہو، تو میں کیا ہوا دوں گا۔ آتی دفعہ بھی اس نے خطرہ محسوس کیا تھا لیکن اس وقت اس کے دل کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ روپ وتی تک پہنچنے کے لیے بڑے سے بڑے خطے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اب اس کے دل میں ایک نئی امید کھڑی ہو رہی تھی۔ اس کی نسب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں کسی طرح رنیر اور سلمان کو تمام حالات سے باخبر کروں۔ دایبوں کی قیام گاہ سے نکلنے کے بعد اُسے اپنے راستے میں جگہ جگہ پجاری اور پنڈت نظر آئے لیکن اُسے ایک پجاری کے لباس میں دیکھ کر کسی نے توبہ نہ کی۔

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا لباس تبدیل کیا۔ پجاری کے لباس کی گٹھری بنا کر نعل میں دبائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ زینے کے قریب پہنچ کر اس نے گٹھری ایک خالی کمرے میں پھینک دی اور نیچے اتر گیا۔ محل سے باہر نکلنے ہی اس نے قلعے کی افواج کے سینا پتی کے دفتر کا رخ کیا۔ سینا پتی رام ناتھ پر بہت مہربان تھا۔ اس نے اطلاع پاتے ہی اُسے ملاقات کے لیے بلایا۔ رام ناتھ نے سینا پتی سے کہا: ”ہمارا ج! میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔“

”کیسی درخواست؟“

”ہمارا ج! میں انہل واڑہ جانا چاہتا ہوں۔“

”واپس کب آؤ گے؟“

بجاریوں کے بھجن بھی سُنانی دے رہے تھے۔ بجاریوں کا ایک گروہ بھی گاتا ہوا اس کے کمرے کے قریب آگیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کمرے کی کھڑکی اور دروازے کے سامنے کئی بجاری مشعلیں اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

ایک بجاری ہاتھ میں مشعل لیے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد دو اور بجاری اندر آ گئے۔ وہ اُن کی تنظیم کے لیے اُٹھی۔ ایک بجاری نے اُس پر گنگنا جھل چھڑکا۔ دوسرے نے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ تیسرے نے کمرے میں خطر چھڑک دیا اور کمرے کی فضا مہک اُٹھی۔ پھر وہ ”مہادیو کی بے“ کے نعرے لگاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد دو عمر رسیدہ عورتیں کمرے میں داخل ہوئیں اور روپ وٹی کے بازو پکڑ کر باہر لے گئیں۔ راستے میں بجاری قطاری باندھے کھڑے تھے۔ جب وہ صحن سے گزر رہی تھی تو وہ مچھک مچھک کر اس کے پاؤں چھو رہے تھے۔ روپ وٹی کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ وہ اپنا ماضی بھول چکی تھی اور مستقبل سے بے پروا تھی۔ اس کے سامنے صرف حال تھا۔

سُرت کے قنفذوں اور خوشی کے نغموں سے لبریز، اب وہ ایک گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی نہ تھی، جس نے ایک معمولی حیثیت کے لوجوان کے لیے محبت کے گیت گائے تھے بلکہ وہ ایک رانی تھی۔ مہادیوں کی داسی کو اپنی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ صحن سے گزرنے کے بعد وہ ایک کشادہ زینے کے راستے بالائی منزل میں داخل ہوئی۔ کھلی پھٹ پر سنگ مرمر کا فرش بنا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ برآمدے کے پیچھے چند کمرے تھے، جن کے درپچے سمندر کی طرف کھلتے تھے۔ دائیں ہاتھ ایک بارہ دری تھی، جس کے ستونوں پر سونے کے غول چڑھے ہوئے تھے۔ دایاں جو اس کی راہنمائی کر رہی تھیں، اُسے ایک کشادہ کمرے میں لے گئیں۔ کمرے کی سنگری

چٹ کے ساتھ حجابرات سے ترصع فالوس لٹک رہے تھے۔ آبنوس کے فرش پر اپنی دانت کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازوں اور درپچوں پر نڈتا پر دسے لٹک رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساگوان کی لکڑی کے تختے اس صفائی سے لگے ہوئے تھے کہ ان کے جوڑ تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نڈا آدم آئینے تھے۔ سونے اور چاندی کی چند کرسیوں کے درمیان ایک خوبصورت پلنگ تھا جو محفل کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ دایاں روپ وٹی کو کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

روپ وٹی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں کمرے کا ساز و سامان دیکھتی رہی۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے برابر والے دو کمروں کا جائزہ لیا۔ ان کمروں میں زیادہ تر کپڑوں کے صندوق اور آرائش کا سامان تھا۔ وہ واپس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے دیوار میں ایک شگاف پیدا ہو رہا ہے (دروہ بدو) کے عالم میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شگاف بڑھتے بڑھتے ایک دروازے کے برابر ہو گیا۔ وہ بھاگنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کسی کی آواز آئی۔ گھبراؤ نہیں۔

ایک ثانیہ کے بعد وہ مندر کے بڑے پردہ پر دیکھ رہی تھی۔ پردہ ہست اطمینان سے آگے بڑھا۔ روپ وٹی نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ڈر گئی تھیں۔“ پردہ ہست نے اس کی ٹھوری کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر اُپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

روپ وٹی کا سارا جسم لرز اٹھا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ہمارے بچے معلوم نہ تھا کہ دیوار میں کوئی دروازہ بھی ہے۔“

”یہ ہمارے محل کا راستہ ہے۔ اب تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟“

روپ وتی نے ایک نظر پردہت کی طرف دیکھا اور اُسے ایک بار پھر خور
سامحوس ہونے لگا۔ پردہت نے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا تم
بہت خوش قسمت ہو۔ آج رات تم وہ تاج پہنو گی جس کی تمنا اس ملک کی شہزادیاں
کرتی ہیں۔“

”یہ سب آپ کی دیا ہے مہاراج!“

”نہیں یہ دیوتاؤں کی کرم پائے۔“

روپ وتی نے دُرتے دُرتے کہا ”مہاراج! اگر آپ ٹھانے ہوں تو ایک سوال

پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”مندر کی دیوی مہادیو کے چرنوں میں کیسے پہنچ جاتی ہے۔“

پردہت نے جواب دیا ”یہ سوال پوچھنا پاپ ہے۔ جب دیوتاؤں کی مرضی
ہوگی تو تمہیں خود بخود اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے گا۔ شاید آج رات تم وہ
باتیں سمجھنے لگ جاؤ جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ دن تمہارے آرام کا دن ہے
پردہت اسی راستے واپس چلا گیا اور روپ وتی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ دیر
تک وہ یہ غسوس کرتی رہی کہ وہ مہیب اور پراسرار آنکھیں اُسے کمرے کی چھت
اور دیواروں سے جھانک رہی ہیں۔

طلوع آفتاب سے تھوڑی دیر بعد مندر کا پردہت ایک غیر متوقع پریشانی کا
سامنا کر رہا تھا۔ پانچ ہجاری جو کامنی کو کشتی پر بٹھا کر دیوتا کے چرنوں میں پہنچانے
کے لیے گئے تھے، ابھی تک لاپتہ تھے۔ دوپہر کے قریب مندر سے تھوڑی دور ایک
ہجاری کی لاش ملی تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ کشتی ڈوب چکی ہے اور کامنی کے ساتھ باقی
ہجاری بھی آدم خور مچھلیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔

شام کے وقت عمر رسیدہ داسیاں جو مندر کی دیوی کی خدمت پر مامور تھیں۔
روپ وتی کو نہلانے اور اس کے جسم پر خوشبوئیں ملنے کے بعد اُسے نیا لباس پہنا رہی
تھیں۔ پردہت دیوار کے خفیہ راستے کی بجائے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا
اس کے ساتھ گیارہ چیدہ چیدہ ہجاری تھے۔ ایک ہجاری سونے کا طشت اٹھائے
ہوئے تھا۔ جس میں مندر کی دیوی کے تاج کے علاوہ بیش قیمت زیورات رکھے
ہوئے تھے۔ پردہت کے اشارے سے داسیوں نے روپ وتی کو زیورات سے
لا دیا۔ اس کے بعد پردہت نے دونوں ہاتھوں سے تاج اٹھایا اور روپ وتی کے سر
پر رکھ دیا۔ ایک ہجاری نے ناقوس بجایا اور آن کی آن میں مندر کے ہر گوشے سے ناقوس
اور گھنٹیوں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ ہجاری اور پردہت بھجن گاتے ہوئے واپس
چلے گئے اور روپ وتی کے پاس صرف دو داسیاں رہ گئیں۔

ایک داسی نے آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آگے بڑھ کر دیکھیے،
آپ ہمارا نیا معلوم ہوتی ہیں۔“
روپ وتی جھجکتی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی۔ آئینے میں آج اُسے اپنی صورت
بالکل نئی نظر آرہی تھی۔ ایک داسی نے کہا ”اب آپ آرام کریں۔ جب آپ کی
باری آئے گی تو ہم آپ کو لے جائیں گی۔“
داسیاں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ روپ وتی کرسی گھسیٹ کر آئینے کے
سامنے بیٹھ گئی۔

(۳)

رات کے وقت مندر کا پردہت، داسیاں اور چیدہ چیدہ ہجاری دم بخود ہو
کر سو منات کے سامنے نئی دیوی کا رقص دیکھ رہے تھے۔ جب اٹھتی ہوئی لہر کا پانی
کمرے میں پہنچ گیا تو روپ وتی کا ناچ ختم ہوا۔ ہجاری ”مہادیو کی جے“ کے نعرے

”میرے ساتھ آؤ!“ پروہت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”کہاں ہمارا؟“

”آج میں تمہیں وہ راز بتاؤں گا جو میرے سو کوئی نہیں جانتا۔“ پروہت یہ کہنے ہوئے خفیہ دروازے کی طرف بڑھا۔

روپ وتی ایک لمحہ کھڑی رہی پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔ دروازے سے آگے ایک زینہ قدیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ زینے سے اتر کر وہ ایک تنگ راستے پر چلتے رہے۔ یہ راستہ سمندر کے کنارے ایک بلند چوڑے پر ختم ہو گیا۔ اس چوڑے کی سیڑھیاں پانی میں اترتی تھیں۔ پروہت نے چوڑے کے کنارے کھڑے ہو کر کہا: ”اب تھوڑی دیر میں سمندر کا پانی اترنا شروع ہو جائے گا۔ وہ دیکھو پانی اٹھوئیں سیڑھی سے اوپر آچکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر میں مہاراجہ کی نورتی اب پانی میں چھپ چکی ہے۔ آؤ ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔“

روپ وتی قدرے مطمئن ہو کر پروہت کے پیچھے چل دی۔ اس کا ضمیر اس بات پر علامت کر رہا تھا کہ جب پروہت نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا تو وہ ڈر کیوں گئی تھی۔ کچھ دور سمندر کے کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ دائیں ہاتھ کشادہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ پھر وہ ایک کھلے صحن میں داخل ہوئے چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلا ہوا تھا۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ بائیں جانب کھلے ہوئے رنگ رنگ کے پھول مسکرا رہے تھے۔ صحن کے درمیان ایک سنگ سرس کا تالاب تھا اور تالاب سے کچھ دور آگے روپ وتی اپنے سلمنے ایک عالی شان محل دیکھ رہی تھی۔ محل میں داخل ہونے کے بعد وہ حیران تھی کہ وہاں کوئی لڑکیاں نہ تھیں۔ اس کے باوجود محل کا گوشہ گوشہ روشن تھا۔ پروہت کے پیچھے ایک کشادہ زینے پر چڑھنے کے بعد وہ ایک نہایت شاندار کمرے میں

بلند کرنے لگے اور مندر میں ناقوس اور گھنٹیاں بجھنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں وسیع کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ اٹھتی ہوئی لہر آہستہ آہستہ سونمات کے بت کو اپنے آسٹوش میں لے رہی تھی۔ مندر کی طرح قلعے میں بھی ہزاروں انسان ”مہادیو کی جے“ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

ناچ سے فارغ ہوتے ہی روپ وتی نے دو عمر رسیدہ دایوں کی راہنمائی میں اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ دایاں اُسے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ روپ وتی کچھ دیر ایک آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر نالوں کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل مسرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد اس نے اپنا بھاری تاج اٹھا کر سونے کی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر وہ اُٹھ کر ایک درپچے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ سخت ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں غنڈہ نہ تھی۔ اس کے پاس کوئی نہ تھا اور اُسے شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اگر میں پروہت سے درخواست کروں تو وہ ساتھ کے خالی کمرے میں میری کسی سہیلی کو رہنے کی اجازت دے دے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس سے پہلے کامنی اس جگہ تنہا رہتی تھی۔ لیکن ہے مندر کی دیو کی کے لیے تنہا رہنا ضروری ہو۔

اچانک اُسے کمرے کی دیوار میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی اور وہ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ دیوار میں خفیہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پروہت نمودار ہوا اُس کے ہاتھوں میں تروتازہ پھولوں کے ہار تھے روپ وتی آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکی۔ پروہت نے کچھ کہے بغیر اس کے گلے میں ہار ڈال دیے۔ روپ وتی کے سامنے ایک بار پھر وہ مہیب اور پر اسرار آنکھیں ناچنے لگیں۔

ہی سس نے دروازے کو دھکا دیا اور وہ گھبرا کر اس طرف دیکھنے لگا۔ روپ دتی نے
 راتوں ہاتھوں سے سونے کا پھول دان اٹھایا اور آگے بڑھ کر پروہت کے سر پر
 مارا۔ پروہت چکر اکر گر پڑا اور ساتھ ہی کوئی زیادہ شدت سے دروازے کو دھکے دینے
 لگا۔ روپ دتی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے تین بجاری کھڑے تھے۔ روپ دتی
 چلائی: ”میں نے اُسے مار دیا ہے۔ میں نے مندر کے پروہت کو مار دیا ہے۔ وہ پانی تھا۔“
 ایک بجاری نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا: ”آہستہ بولو
 روپ دتی! میں رام ناٹھ ہوں۔“ اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہی
 تھی۔ رام ناٹھ کے دوسا تھی اندر آئے۔ اُن میں سے ایک زنبیر اور دوسری کامنی تھی۔
 زنبیر نے پروہت کے قریب جا کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ زندہ ہے۔ کامنی
 نے خنجر نکال کر پروہت پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن زنبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا
 اور اُسے کھینچا ہوا باہر لے آیا۔“

”رام ناٹھ! رام ناٹھ!“ روپ دتی نے سخت آواز میں کہا اور پھر اچانک
 اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

”روپ دتی! اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“ کامنی نے کہا۔

”روپ دتی کے کانوں کو اس کی آواز مانوس معلوم ہوئی اور وہ چونک کر اُس
 کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اچانک بولی: ”کامنی! کامنی تم!“

”ڈرو نہیں روپ! میں زندہ ہوں۔“

روپ دتی ایک ثانیہ سکتے میں رہی۔ پھر رام ناٹھ کو چھوڑ کر کامنی سے لپٹ گئی۔

زنبیر نے کہا: ”اب ہمیں جلدیماں سے نکل جانا چاہیے۔“

کامنی نے جواب دیا: ”اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ صبح تک پروہت کے

عمل میں کوئی نہیں آئے گا۔“

میں داخل ہوئی۔ اس کمرے کی آرائش وزینائش دیکھ کر اُسے اپنا کمرہ اس کمرے
 کے مقابلے میں سچ نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے درمیان ہما دیو کا سونے کا بت نصب
 تھا اور اس کے ارد گرد داسیوں کے چاندی کے بت رقص کرتے دکھائے گئے تھے
 پروہت نے زرتار پردہ ہٹا کر بتل کے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور روپ دتی کو اپنے
 پیچھے لے کر اشارہ کیا۔ روپ دتی اندر چلی گئی۔ کمرہ تیز خوشبود سے ہمک رہا تھا۔ فرش پر تالیں
 پیچھے چھوئے تھے جو آج تک روپ دتی نے نہیں دیکھے تھے۔ ایک طرف ایک کشادہ پٹنگ بچا ہوا
 تھا۔ پروہت نے پٹنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”بیٹھ جاؤ روپ دتی!“
 ”جی... جی میں یہ گستاخی نہیں کر سکتی۔“

”کیسی گستاخی! تم مندر کی دیوی ہو اور میں تمہاری سیوا کے لیے ہوں۔“ پروہت
 نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ روپ دتی نے اچانک یہ محسوس
 کیا کہ اس کے سامنے مندر کا پروہت نہیں بلکہ ایک اور انسان کھڑا ہے۔ سر سے لے کر پاؤں
 تک اس کا جسم لرز رہا تھا۔ پروہت نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال لیے
 اور اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کی گرفت میں لے کر اُپر اٹھایا اور کہا: ”میری طرف دیکھو پٹنگ
 میں ہما دیو ہوں۔“

روپ دتی کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور اس تاریکی میں سے پروہت کی آنکھیں
 آنکھیں ناچتی دکھائی دینے لگیں، زیادہ پراسرار، زیادہ مہیب، نھوڑی دیر کے لیے اُس
 کے جسم کا خون سجم ہو گیا۔

”ڈرو نہیں روپ دتی! ڈرو نہیں۔“ پروہت نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ اچانک
 روپ دتی کی مردہ رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ کسی نے دیکھنے سے
 انکار کیا اس کے جسم پر رکھ دیے ہیں۔ مندر کی دیوی اور ہما دیو کی بجاہن ہونے کے باوجود وہ ایک
 عورت تھی۔ وہ پہلی کی سی تیزی کے ساتھ پروہت کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹی۔ پروہت آگے بڑھا

ان بجاویں کو تھاری تلاش کا حکم دے گا جو مندر کے ہر راز سے واقف ہیں۔ پھر وہ یہ اعلان کر دے گا کہ میری طرح تم بھی مہادیو کے چرنوں میں پہنچ چکی ہو۔ اس کے بعد شہر اور اس پاس کے علاقے میں شاید خفیہ طور پر تھاری تلاش جاری رہے۔

تھوڑی دیر بعد روپ دتی اور کامنی آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور رام ناٹھ رنیر کو سمجھا رہا تھا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اور کامنی تمہارے گاؤں چلیں تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں اب تمہارا کوئی کام نہیں۔ سومات کے آس پاس رہنا تمہارے لیے خطرناک ہے۔

”نہیں میں یہاں رہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہوتی تو میں یقیناً تمہارا ساتھ دیتا۔ سلمان تمہیں کسی محفوظ جگہ اتار دے گا۔ اس کے بعد تم سیدھے قنوج کا رخ کرو۔ تمہارے لیے میرے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہوگی میں گھر جانے کے لیے اس دن کا انتظار کروں گا۔ جب سلطان محمود کی فوجیں سومات کے قلعے پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ چکی ہوگی۔ میں اپنی آنکھوں سے اس مندر کی تباہی دیکھنا چاہتا ہوں جس کی بنیاد ظلم پر رکھی گئی ہے۔ ظلم کے ایوانوں کی بنیادیں کھودنے کے سوا اب میری زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سکنتلا کے بغیر میرے لیے گھر اور دیرانے میں کوئی فرق نہیں۔“

کشتی جہاز کے قریب پہنچی تو سلمان جو اپنے ملاحوں کے ساتھ تختے پر کھڑا تھا بلند آواز میں بولا۔ ”تم نے بہت دیر لگائی۔ اس لڑکی کا ہتہ چلا؟“

رنیر نے جواب دیا۔ ”ہم اُسے لے آئے ہیں۔ اُسے مندر سے نکالنے میں ہمیں کوئی وقت پیش نہیں آئی۔ کسی کو خبر تک نہیں ہوئی۔“

اتنے میں کشتی جہاز کے ساتھ آگئی اور وہ رسی کی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھ گئے۔ رام ناٹھ روپ دتی کو ہاتھ کے سوارے اور چڑھار ہا تھا۔ کشتی کے

تھوڑی دیر بعد یہ چاروں پروہت کے محل سے نکلے اور سمندر کے کنارے کنارے پہنچے۔ پرتے پرتے ہوئے ایک جگہ ٹھہر گئے۔ کنارے سے تھوڑے فاصلے پر ایک کشتی کھڑی تھی۔ ملاحوں نے انہیں دیکھ کر کشتی میٹرھیوں سے لگا دی اور کشتی پر بیٹھ گئے۔ روپ دتی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ رام ناٹھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم رہاں کیسے پہنچے۔ اس کے جواب میں رام ناٹھ اُسے سمجھا رہا تھا۔ ”یہ سب کامنی دیوی کی مہربانی ہے۔ اگر یہ ہمارا ساتھ نہ دیتیں تو ہم مندر میں تھیں کبھی نہ تلاش کر سکتے۔“ پھر وہ کامنی کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے بتایا کہ رام ناٹھ اور اُس کے ساتھیوں نے اُسے آدم خور پھلیوں کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔

جوں جوں کشتی مندر سے دور جا رہی تھی، روپ دتی کا غوت کم ہو رہا تھا۔ اس نے رام ناٹھ سے دریافت کیا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

رام ناٹھ نے مغرب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ جہاز ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اس پر سوار ہو کر ہم یہاں سے کوسوں دور کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔“

”لیکن اس ملک میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں پروہت کے آدمی ہمارا پیچھا نہیں کریں گے۔ اگر وہ مر گیا تو مندر میں مجھے نہ پا کر وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ اُسے میں نے ہلا ہے۔“

رنیر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اُسے دیکھا تھا وہ مرا نہیں۔ اس کی نبض چل رہی تھی۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا اور ہم میں سے کسی کو دیکھ کر پہچان لیتا تو ہم یقیناً اسے مار دیتے۔ صبح جب اُسے بجاویں اُسے کمرے سے باہر نکالیں گے وہ تمہارا نام لینے کی بجائے اپنے زخمی ہونے کے بارے میں کوئی بہانہ پیش کرے گا۔“

کامنی بولی۔ ”میں جانتی ہوں وہ کیا کرے گا۔ وہ اپنی بدنامی کے ڈر سے مرے

رام ناتھ نے کہا: ”روپا! جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ ایک بھیانک سپنا تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھیں گے۔ ہم ایک بار پھر اپنی اُبتڑی ہوئی دنیا کو نعموں اور نعمتوں سے بھر دیں گے۔ روپ وئی! آج ہم نے نیا جنم لیا ہے۔ چلو اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ جہاز کے کپتان نے تمہارے اور کامنی کے لیے اپنا کمرہ خالی کر دیا ہے۔“

روپ وئی اس کے ساتھ چل پڑی لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد وہ اچانک رک گئی۔ ”ٹھہرو رام ناتھ!“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے سے جواہرات کا ہار اتارا۔ پھر ہاتھوں، پاؤں اور کانوں کے تمام زیورات کر کے بعد دیکھ کر سمندر میں پھینکنے لگی۔ ”آن کی آن میں روپ وئی نے ایک انگوٹھی کے سوا جو بڑی طرح اس کی انگلی میں پھنسی ہوئی تھی، تمام زیورات سمندر کی نظر کر دیے۔ رام ناتھ نے اپنی جیب سے ایک روپال نکالا اور اسے کھول کر موتیوں کی مالا جو اسے انہل واڑہ کے راجہ نے انعام میں دی تھی۔ روپ وئی کے گلے میں ڈال دی۔“

(۴)

پر وہمت نے رات کے تیسرے پہر ہوش میں اُگر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر میں درد کی ٹپیں اُٹھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دوبارہ اپنا سر فرش پر رکھ دیا اور لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک رات کے واقعات کی یاد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں دوڑ گئی۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ نقاہت کے باعث اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ دروازہ باہر سے بند پا کر وہ اپنے لوکروں کو آوازیں دینے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ صبح تک محل کے اس حصے میں کسی بھاری یا نوکر کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے سسلاتا ہوا

تین ملاح جہاز پر آگئے اور باقی چار وہیں رہے۔ سلمان نے زنبیر سے کہا: ”اب باتوں کا وقت نہیں، ہمیں صبح کی روشنی سے پہلے یہاں سے کافی دودھل جانا چاہیے۔ تم نے اپنے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟“

زنبیر نے جواب دیا: ”میں واپس عبداللہ کے پاس جا رہا ہوں۔“ سلمان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”اچھا خدا حافظ! انشاء اللہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے۔“ زنبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: ”آپ نے مندر کے قیدروں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

سلمان نے جواب دیا: ”آپ ان کی فکر نہ کریں، انھیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جو سومات کے بھاریوں کی پہنچ سے دور ہو۔“ روپ وئی نے دبی زبان میں کامنی سے پوچھا: ”قیدی کون ہیں؟“ کامنی نے جواب دیا: ”مجھے کشتی پر بٹھا کر لانے والوں میں سے تین بھاری زندہ گرفتار کر لیے گئے تھے۔“

سلمان سے مصافحہ کرنے کے بعد زنبیر نے رام ناتھ سے ہاتھ ملایا۔ رام ناتھ کی آنکھیں لشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ سلمان نے جہاز کے بادبان کھولنے کا حکم دیا اور زنبیر رسیوں کی سیڑھی سے نیچے اتر کر کشتی میں آگیا اور کشتی واپس ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جہاز روانہ ہو گیا۔ رام ناتھ، روپ وئی اور کامنی کچھ دیر جنگل کے ساتھ کھڑے کشتی کو دیکھتے رہے، پھر کامنی نیند کا بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ روپ وئی ادھر ادھر دیکھ کر رام ناتھ اور کامنی کے ہاتھ ہوتی بے اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”رام ناتھ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔“

سے نزدیک یہ حادثہ کسی خوفناک انقلاب کی تمہید تھا۔ اُس کے جانبازوں کا ایک گروہ بدستور روپ دلی کی تلاش میں تھا،

(۵)

زئیر، روپ دلی کو کامیابی اور رام ناتھ کے ساتھ سلمان کے جہاز پر پہنچانے کے بعد عبداللہ کے پاس پہنچا تو سورج نکل چکا تھا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے باعث اُس کا جسم تھکا دلی سے چور تھا۔ اس نے عبداللہ کو مندر کے واقعات سنانے کے بعد کھانا کھایا اور ایک کوٹھڑی کے اندر جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ بیدار ہوا اور آنکھیں ملتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ عبداللہ ایک درخت کے نیچے دھونی راتے بیٹھا ایک اجنبی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس نے زئیر کو دیکھتے ہی آواز دی: ”ادھر آؤ زئیر! تمہارے لیے ایک خوشی کی خبر آئی ہے۔“

زئیر کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا: ”کیسی خبر؟“

زئیر کو اچانک اپنی دنیا کی منوم فضاؤں میں مسرت کے نغمے سنائی دینے لگے۔ ”کب؟ کہاں؟ آپ کو کس نے بتایا؟“ اس نے لڑتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عبداللہ نے اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اے عبدالواحد! یہی ہے۔“

اجنبی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور زئیر نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بلیتے ہوئے کہا: ”کہاں؟ کب؟ میری بہن؟“

”وہ آپ کے گھر پہنچ چکی ہے۔“

زئیر کے چند اور سوالات کے جواب میں اجنبی نے سکنتلا کی سرگوشٹ سنا دی۔

بستر پر آ بیٹھا۔ اُسے یقین تھا کہ مندر میں کوئی اس کے خلاف روپ دلی کی پکار تھیں۔ سنے گا۔ روپ دلی کا قلعے میں پہنچ جانا اس کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا تھا لیکن اُسے یہ اطمینان تھا کہ پیریدار اُسے مندر کے احاطے سے نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ اس کے سر پر چوٹ لگنے سے پہلے کوئی دروازے کو دھکے دے رہا تھا لیکن وہ کون ہو سکتا تھا۔ شاید یہ میرا وہم ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا سوچتا رہا۔ بالآخر وہ بستر پر لیٹ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

طلوع آفتاب کے بعد ایک بجارن اس سے ناشتے کے لیے پوچھتے آئی۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی دیکھ کر اس نے کسی نوکر کو آواز دی۔ پروہت بستر سے اٹھا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ بجارن نے باہر سے کنڈی کھولی دی۔ پروہت اپنے کمرے سے باہر نکلا اور بجارن سے کوئی بات کیے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا روپ دلی کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ روپ دلی کے کمرے سے باہر اس کی خدمت گزار عورتیں حیران اور پریشان کھڑی تھیں۔

”روپ دلی کہاں ہے؟“ پروہت نے پوچھا۔

ایک عورت نے جواب دیا: ”وہ یہاں نہیں ہے مہاراج! ہم صبح سے اسے تلاش کر رہی ہیں۔“

پروہت کچھ کئے بغیر واپس مڑا۔ قریباً ایک ساعت کے بعد مندر کے چیدہ چیدہ بجاری خاموشی سے روپ دلی کو تلاش کر رہے تھے۔

اگلی صبح لوگ یہ خوشخبری سن رہے تھے کہ مندر کی نئی دلی بھی مہادیو کے چرلوں میں پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن لوگ اُسے روپ دلی کا کمال سمجھتے تھے اور ہر جگہ اس کے حسن و جمال اور روحانی برتری کی تعریفیں ہو رہی تھیں لیکن پیر

(۶)

اگلے روز روپ دتی گہری نیند سے بیدار ہوئی تو کامنی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

”بہت دیر سوئی ہو تم، کامنی نے کہا۔

”وہ کہاں ہے؟“ روپ دتی نے سوال کیا۔

”رام ناٹھ آیا تھا اور تمہیں سوتے دیکھ کر جہاز کے کپتان کے پاس چلا گیا ہے۔“
”اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟“ روپ دتی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، اب ہم بہت دور آچکے ہیں۔“

روپ دتی نے کہا میں اب بھی یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے ایک بھیا نک پیدا دیکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ سومات کے مندر میں ایسی باتیں ہو سکتی ہیں۔
کامنی نے جواب دیا ”جنگوان کا شکر کر دو تم کچھ کرا گئی ہو۔“

روپ دتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”کامنی میں ایک بات پوچھتی ہوں۔
جب تم مجھ سے آخری بار ملی تھیں تو تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ تم اپنے انجام سے
بے خبر نہیں ہو کیا پروہنت نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہارا وقت آچکا ہے۔“

”ہاں میرے اصرار پر اس نے مجھے بتا دیا تھا اور اگر وہ نہ بتاتا تو بھی میرے لیے
یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ مندر میں میری زندگی ختم ہونے والی ہے۔“

”تمہیں اُس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم مندر میں پھینک دی جاؤ گی؟“

”نہیں مجھے اس نے یہی بتایا تھا کہ میں مہادیو کے چرنوں میں جا رہی ہوں۔“

”اور تمہیں اس بات کا یقین تھا؟“

”نہیں، لیکن اپنے دل کو فریب دینے کے سوا میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔“

روپ دتی نے کہا ”کامنی جب میں تمہاری صورت دیکھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ عبداللہ نے اٹھ کر رنبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

رنبیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں
اس نے کلمہ تو حید پڑھتے ہوئے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”میں مدت سے اسلام
کی صداقت پر ایمان لا چکا ہوں اور آج آپ کے سامنے اس بات کا اعلان کرتا
ہوں۔ خدا سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے ہمت و استقامت عطا کرے اور میرے لیے
ایک نیا نام بھی تجویز کیجئے۔“

عبداللہ نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ”تمہاری صورت دیکھنے کے بعد مجھے
تمہارا نام تجویز کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں نے تمہارے لیے یوسف کا نام پسند کیا
ہے۔ اب تم اپنی بہن کو دیکھنے کے لیے سیر قرار ہو گے۔ وہ دیکھو تمہارا گھوڑا تیار کھڑا ہے۔“
رنبیر کو چند قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑا دکھائی دیا جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ اس
نے کہا ”لیکن آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے کہا
تھا کہ جب تک سومات فتح نہیں ہو گا۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

عبداللہ نے جواب دیا ”عبدالواحد کے مکتوب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی کچھ
مدت اس طرف سلطان کی پیش قدمی کا کوئی امکان نہیں۔ سومات کے متعلق تم
تمام معلومات حاصل کر چکے ہو۔ اس لیے اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں
خصوصاً اس صورت میں جبکہ تمہاری بہن صبح و شام تمہاری راہ دیکھتی ہے۔ میں نے
ان کی زبانی عبدالواحد کا پیغام سننے ہی تمہارا گھوڑا تیار کر دیا تھا۔ لیکن تم سوہنے
تھے۔“

تھوڑی دیر کے بعد رنبیر اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے
مستقل کی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔

آتا کہ کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی تھا دی جان سے کر خوش ہو سکتا ہے۔
 کامنی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سکیاں لیتے ہوئے کہا۔
 ”روپ ٹی اپروہمت کے پاپ چھپانے کے لیے میرا لیدان ضروری تھا کاش لوگ
 مجھے نہ سچانے، اُس کے گناہوں کی گٹھڑی اٹھا کر میرے لیے زندگی ہر لمحہ موت سے
 بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ کامنی پھوٹ پھوٹ کر روسنے لگی۔

روپ دتی نے اس کا سراپا گود میں لیتے ہوئے کہا ”کامنی میری نگاہ میں تم
 ایک دیوی ہو۔“

”دیوی!“ کامنی نے اپنے ہونٹوں پر ایک کرب الگیز مسکراہٹ لانے ہوئے
 کہا ”نہیں نہیں ہیں دیوی نہیں ہوں۔ اگر میں دیوی ہوتی تو وہ رات جب اس نے میری
 آبرورہا تھ ڈالا تھا، میری زندگی کی آخری رات ہوئی۔ اس رات وہ بھولی بھالی لڑکی
 جو مہادیو کی بچاؤ بننا چاہتی تھی، مڑھکی تھی اور وہ کامنی جیسے مندر کے بچاریوں نے اگلی
 صبح دیکھا تھا وہ ایک ایسی عورت تھی جو اپنے ہر پاپ کی قیمت وصول کرنا چاہتی تھی جیسے
 صرف اس امید نے زندہ رہنے پر آمادہ کر دیا تھا کہ وہ ہیروں اور موتیوں میں تولی جائیگی
 اور راجے اور رانیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے۔“

”کامنی تم نے اپنی ایک بھی کوتاہی سے بچا یا ہے۔ میں تمہارے احسان کا
 بدلہ نہیں دے سکتی۔“

کامنی نے کہا ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں اُس سے اپنا انتقام
 لینے گئی تھی۔ اگر زبیر میرا ہتھ نہ روکتا تو میرا بھڑاس کے سینے میں اُتر چکا تھا۔ روپ دتی میں
 دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اب زندگی کا ہر لمحہ میرے لیے موت سے
 زیادہ بھیانک ہے۔“

روپ دتی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”تم ہمارے ساتھ چلو گی

لاسنی میں ساری عمر تمہاری سیوا کروں گی۔“
 ”نہیں میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گی۔ کامنی نے روپ دتی کا ہاتھ جھٹک
 کر کہا ”میرا راستہ تم سے الگ ہے۔“
 ”روپ دتی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”لیکن کہاں جانا چاہتی ہو تم؟“
 ”اس سوال کا جواب میں نے ابھی نہیں سوچا۔“

بانی سارا دن کامنی بے محسوس رہی۔ شام کے قریب وہ روپ دتی کے ساتھ مندر
 کا منظر دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رام ناٹھ کافی دیر اُن کے
 پاس بیٹھا بائیں کرتا ہوا۔ روپ دتی یہ محسوس کر رہی تھی کہ کامنی کی طبیعت رفتہ رفتہ منبعل رہی
 ہے۔ رام ناٹھ چلا گیا اور وہ تھوڑی دیر بائیں کرنے کے بعد سو گئیں۔ صبح کے وقت جب
 روپ دتی کی آنکھ کھلی تو کامنی وہاں نہ تھی۔ اُس نے سمجھا شاید باہر مندر کا نظارہ کر
 رہی ہو گی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اُس کی تلاش میں نکلی، لیکن کامنی کا کہیں پتہ
 نہ چلا۔ سلمان کے پوچھنے پر دو ملاحوں نے بیان کیا ”کافی رات گئے، ہم نے اسے
 جہاز پر بٹھاتے دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اندر میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر پورا خوری
 کے لیے آئی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جہاز کے دوسرے حصہ کی طرف چلی گئی اور اس کے
 بعد ہم نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نیچے اپنے کمرے میں جا چکی ہے۔“ سلمان کے
 حکم سے ملاحوں نے جہاز کا کوئٹہ نہ جھان مارا لیکن کامنی کیس نہ تھی۔ سلمان اور اس کے
 ساتھیوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سو منات کی دیوی سمندر کے آغوش میں پناہ لے
 چکی ہے۔“

دیر آرام کی ضرورت ہے۔

رام ناتھ نے کہا: ”سلمان کساتھا کہ اس جگہ آس پاس ماہی گیروں کی کمی بستیاں ہیں۔ ہم صبح ہوتے ہی کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں تم اچھی طرح آرام کر سکو گے۔“
روپ وتی نے کہا: ”نہیں نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس علاقے سے فوڈ اٹکل جائیں۔
طلوع سحر کے ساتھ انھیں کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک بستی کے آثار دکھائی دیے
اور وہ اس طرف چل دیے۔ بستی سے کوئی آدھ کوس کے فاصلے پر روپ وتی زمین پر بیٹھ گئی
اور اس نے کہا: ”مجھے ذرا دم لینے دو رام ناتھ! میں تھک گئی ہوں۔“

رام ناتھ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ روپ وتی اپنے گلے سے موتیوں کی مالا اتارتے ہوئے
کہنے لگی: ”رام ناتھ اسے چھپا کر اپنے پاس رکھ لو۔ اسے ہن کر میرا بستی میں جانا ٹھیک نہیں۔“
رام ناتھ نے روپ وتی کے ہاتھ سے مالا لی اور قمیص کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ تھوڑی
دیر بعد آرام کر کے وہ پھر اٹھ کر رام ناتھ کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن بستی تک پہنچتے پہنچتے
وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔

ماہی گیروں کی یہ بستی پچاس ساٹھ بھونیڑیوں پر مشتمل تھی۔ بستی کا چوہدری رام ناتھ
کو اونچی ذات کا آدمی سمجھ کر اپنے گھر لے گیا۔ روپ وتی باقی تمام دن اور اگلی رات بخار میں
بتلا رہی۔ رام ناتھ کو اس بستی کے ماہی گیروں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے آٹھ کوس
کے فاصلے پر ایک بہت بڑا قصبہ ہے اور وہاں اچھے دید موجود ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن
اس نے بستی میں ٹھہرنے کی بجائے روپ وتی کو وہاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ بستی کے چوہدری
نے چار تو جوان بلائے اور وہ روپ وتی کی کھاٹ اٹھا کر رام ناتھ کے ہمراہ چل دیے۔

دوپہر کے قریب یہ لوگ قصبہ میں پہنچ گئے۔ رام ناتھ سیدھا وہاں کے مشہور ترین
طبیب کے پاس پہنچا۔ طبیب نے ان کے آرام کے لیے اپنے گھر کا ایک کمرہ خالی کر دیا۔
رام ناتھ کے پاس سونے کے جو چند سکتے تھے وہ اس نے دید کو پیش کر دیے۔

مقرر

چند دن بعد سلمان نے رام ناتھ اور روپ وتی کو رات کے تیسرے پہر سڑج کچے کے
ساحل پر اتار دیا اور وہ ریت پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگے۔ جہاز پر سفر کے آخری دنوں
روپ وتی کی طبیعت ناساز رہی تھی لیکن اُس نے رام ناتھ کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا
رام ناتھ جب کبھی اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر نشتر لیس کا اظہار
کرتا تو وہ اُسے یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ یہ منہ رکی ہوا کا اثر ہے جہاز سے اتنے ہی میری طبیعت
ٹھیک ہو جائے گی لیکن ساحل پر پہنچ کر رام ناتھ نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت پہلے
سے زیادہ مضطرب ہے۔ روپ وتی کچھ دیر اُس کے قریب بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں
کرتی رہی پھر ایک جمائی لینے کے بعد زمین پر لیٹ گئی۔

رام ناتھ نے پریشان ہو کر کہا: ”کیوں روپ وتی! کیا بات ہے؟“
روپ وتی نے جواب دیا: ”کچھ نہیں۔ بونہی لیٹ گئی ہوں۔ رات جہاز پہنچے
بالکل نیند نہیں آئی۔“

رام ناتھ نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔“
روپ وتی نے کہا: ”نہیں، مجھے بخار نہیں۔ یہ تمہارا دم ہے مجھے صرف تھوڑا

نے اطلاع دی۔ ”ایک نوجوان آپ سے ملتے پر ہند ہے۔“

منوراج نے پوچھا: ”کون ہے وہ؟“

”مہاراج! مجھے معلوم نہیں، وہ کوئی اجنبی ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ اس وقت ہم کسی سے نہیں ملا کرتے۔“

”مہاراج! میں نے اُسے بہت سمجھایا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں آپ سے ملے بغیر

نہیں جاؤں گا۔ اس نے پوچھنے سے پہلے ہی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا میں نے

اُسے یہ بھی سمجھایا کہ ہمارے مہاراج عام لوگوں کو منہ نہیں لگاتے لیکن وہ کہتا ہے کہ

میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔“

منوراج نے کہا: ”اچھا بلاؤ اُسے۔“

نوکر باہر نکل گیا اور ٹھوڑی دیر بعد ایک نوجوان کو لے کر آیا۔ یہ رام ناٹھ تھا۔

منوراج کو اس کے پہرے پر امارت کی بجائے تھکاوٹ، پریشانی اور بے بسی کے آثار

دکھائی دیے۔ رام ناٹھ کے کپڑے بھی کافی میلے ہو چکے تھے۔ شاہی طبیب کے تن بدن

میں آگ لگ گئی۔ درودہ رام ناٹھ کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنے نوکر پر برس پڑا۔

”تم... تم بالکل گدھے ہو۔ میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟“

رام ناٹھ نے کہا: ”مہاراج! میں بہت دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں جلدی

کیجیے، میرے ساتھ چلیے۔“

منوراج نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا: ”جس آلہ نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے

وہ میرے نوکر سے بھی زیادہ بیوقوف ہوگا۔“

رام ناٹھ نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈال کر موتیوں اور ہیروں کی مالا نکالی اور منوراج

کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مہاراج! لیکن اگر آپ مجھے

ایک بھکاری سمجھتے ہیں تو اسے ابھی سے اپنے پاس رکھ لیجیے۔“

لیکن تین دن کے علاج کے بعد اُسے محسوس ہونے لگا کہ روپ و تی کی حالت بدستور
مضرب ہو رہی ہے۔ وہ پھر کسی اور طبیب کا پتہ لگانے کی غرض سے مقامی سردار کے
پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ آج کل انہل واڑہ کا شاہی دیدمند ہیر آیا ہوا ہے۔ اگر تم وہاں
پہنچ سکو تو مرلیہ کی جان بچ سکتی ہے لیکن اس سے علاج کرنا معمولی آدمی کا کام نہیں
وہ صرف سونے کی چمک دیکھ کر بات کرتا ہے۔

رام ناٹھ نے پہلی بار انہل واڑہ کے راجہ سے اپنے ذاتی تعلقات بتانے کی ضرورت
محسوس کی اور اس نے سردار کے سامنے راجہ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ بیان کر
دیا۔ سردار اس قدر مغلوب ہوا کہ اس نے روپ و تی کو مند ہیر پہنچانے کے لیے اپنا خوبصورت
دھت اور بہترین ہیل پیش کر دیے۔ اگلے دن رام ناٹھ اور روپ و تی دھت پر سوار ہو کر
مند ہیر روانہ ہو گئے۔

(۲)

انہل واڑہ کے شاہی طبیب منوراج کا آبائی گھر مند ہیر میں تھا اور وہ ہر دوسرے
تیسرے مہینے چند دنوں کے لیے انہل واڑہ سے مند ہیر آیا کرتا تھا۔ یہاں صرف چند
انفرادی ایسے تھے جو اس سے علاج کرا سکتے تھے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ راجہ
نے اُسے ایک بہت بڑی جاگیر دے رکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ پرلے درجے کا
لاچی تھا۔ عوام میں اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ مریض کی شکل دیکھتے ہی اُس
کی امارت یا عزیت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ مند ہیر میں راجہ کا بیچا ٹھا کہ دگھو ناٹھ اس کا
سر پرست تھا اور وہ کسی بیماری کے بغیر بھی اُسے طرح طرح کی دوائیں کھلایا کرتا
تھا۔

ایک صبح منوراج بستر سے اٹھ کر پوجا پاٹ کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے نوکر

”آپ نے کہاں سے لی ہے؟“
”یہ مجھے ایک معمولی سا آدمی دے گیا ہے۔ وہ مجھے کسی کے علاج کے لیے بلانے آیا تھا۔“

بیوی نے کہا: ”ہو سکتا ہے کہ کوئی راجہ آپ کے پاس بھیس بدلی کر آیا ہو۔“
منوراج نے کہا: ”انہل داڑھ سے ہیروں کا بہت بڑا تاثر تھا کہ رگھوناتھ کی دامن کے لیے زیورات لے کر آیا ہوا ہے۔ وہ مالا کو دیکھتے ہی اس کی قیمت بتا دے گا۔“
”تو پھر جلدی اس کے پاس جائیے۔“

”میں پہلے مریض کو دیکھ آؤں، پھر اسے یہیں بلالوں گا۔“
لیکن بیوی ایسے معاملات میں انتظار کرنے کی قائل نہ تھی۔ جونہی منوراج گھر سے نکلا۔ اس نے ایک نوکر کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ فوراً اٹھا کر گوناٹھ کے حمان خانے سے انہل داڑھ کے جوہری کو بلالائے۔ اٹھا کر گوناٹھ کا محل زیادہ دور نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں نوکر جوہری کو لے آیا۔ منوراج کی بیوی نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اُسے مالا دکھائی تو اس نے حیران ہو کر پوچھا: ”یہ مالا آپ کے ہاتھ کیسے آئی؟“
”کیوں کیا بات ہے؟“ منوراج کی بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”آپ کو معلوم نہیں کہ یہ مالا راجہ کی ہے؟“
”مہاراجہ کی؟“

”جی ہاں! یہ انھیں میں نے ہی بنا کر دی تھی۔ اس میں دو ہیرے ایسے ہیں جو دس سال سے میرے پاس تھے۔ مہاراجہ ویدجی پر بہت مہربان معلوم ہوتے ہیں لیکن دیدجی نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا انعام حاصل کر چکے ہیں۔“
منوراج کی بیوی نے ہکھلاتے ہوئے کہا: ”یہ مالا انھیں راجہ نے نہیں بلکہ ایک ادا آدمی نے دی ہے۔“

منوراج تھوڑی دیر کے لیے دم بخود رہ گیا۔ پھر مالا کو ایک سرے سے اُدھر اٹھاتے ہوئے بولا: ”یہ تم نے کہاں سے لی ہے؟“

”یہ چوری کا مال نہیں مہاراج!“

منوراج نے نوکر کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ پھر وہ مالا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر رام ناتھ کی طرف متوجہ ہوا: ”مریض کہاں ہے؟“
”مہاراج! وہ دھرم شالہ میں ہے۔“

”دھرم شالہ میں!“

”جی ہاں! ہم آدھی رات کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اس لیے وہیں ٹھہرنا پڑا۔“

”آپ کو سیدھا میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

”مہاراج! لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ صبح سے پہلے کسی سے نہیں ملتے۔“

منوراج نے کہا: ”یہ پہلا موقع ہو گا کہ میں کسی کو دھرم شالہ میں دیکھنے جاؤں گا۔ تم فوراً واپس جاؤ اور دروازے پر میرا انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”مہاراج! جلدی کیجیے، مریض کی حالت بہت خراب ہے۔“ رام ناتھ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور منوراج دوبارہ مالا کو غور سے دیکھنے لگا۔

منوراج کی بیوی نے عقب کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا: ”آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؟“

منوراج نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مالا کو ایک سرے سے پکڑ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا: ”یہ دیکھو!“

بیوی کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مالا شوہر کے ہاتھ سے لے لی۔

منوراج نے کہا: ”اگر یہ نفی نہیں تو اس کی قیمت کوئی راجہ ہی ادا کر سکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”ہمیں معلوم نہیں، وہ ابھی ابھی انھیں کسی مریض کے علاج کے لیے بلانے آیا تھا۔“

جوہری نے کہا: ”آپ کو یقین ہے کہ وہ چور نہیں تھا؟“

”میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”تو پھر اچھی طرح سوچ لیجیے، کہیں ویدجی کی بدنامی نہ ہو؟“

منوراج کی بیوی نے کہا: ”شاید لوگر کو معلوم ہو کہ وہ کون تھا۔ ٹھہرے میں اُسے بلاتی ہوں۔“ اور وہ دروازے کی طرف جا کر لوگر کو آوازیں دینے لگی۔

لوگر اندر آیا۔ جوہری نے اس سے سوال کیا: ”تمہیں معلوم ہے، ویدجی کس کے علاج کے لیے گئے ہیں؟“

”جی وہ دھرم شالہ کی طرف گئے ہیں۔ جو آدمی انھیں بلانے کے لیے آیا تھا۔ وہ یہی کہتا تھا کہ مریض دھرم شالہ میں ہے۔“

جوہری نے منوراج کی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”ویدجی مجھ پر بہت مہربان ہیں لیکن میں راجہ کا تک کھاتا ہوں۔ ایسی بات چھپانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ویدجی کو بدنامی سے بچانے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ چور کو بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔“

اگر آپ بُرائے مانیں تو میں ابھی ٹھاکر جی کے پاس جاتا ہوں۔ آپ کا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ وہ آدمی جس نے یہ مالا چرائی ہے کوئی معمولی چور نہیں ہوگا۔ آپ اپنے لوگر کو ابھی دھرم شالہ بھیج دیں تاکہ جب تک ٹھاکر جی کے سپاہی چور کو گرفتار کرنے کے لیے ہاں نہیں پہنچتے وہ اس کا خیال رکھے۔“

منوراج کی بیوی نے ملتی آوازیں کہا: ”آپ جانتے ہیں کہ ہم بے قصور ہیں۔ اب ہمیں بدنامی سے بچانا آپ کا کام ہے!“

جوہری نے جواب دیا: ”آپ نکر نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر چور پکڑا گیا تو ہمارا راجہ

ویدجی کو بڑے سے بڑے انعام کا حقدار سمجھیں گے۔“

(۳)

روپ دتی کی نبض دیکھنے کے بعد منوراج نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

”یہ آپ کی بیوی ہے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”جی..... جی ہاں! اور روپ دتی نے بستر پر لیٹے لیٹے رام ناتھ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔“

روپ دتی کی بیماری کے متعلق چند باتیں پوچھنے کے بعد منوراج نے کہا: ”آپ کو

تک نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کا علاج

میرے گھر پر ہو لیکن آج انھیں تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ میں ابھی جا کر لوگر کے ہاتھ

درا بھیجتا ہوں۔ اگر کل تک انھیں کچھ فائدہ ہو گیا تو میں انھیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔

ٹام کو میں انھیں پھر دیکھنے آؤں گا۔ ممکن ہے میں دوپہر کے وقت بھی آجاؤں۔“

رام ناتھ نے التجا کی بعذر آئیے۔ اب مجھے صرف آپ کا آسرا ہے۔“

”آپ نکر نہ کریں، میں انھیں اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔“

منوراج دھرم شالہ سے باہر نکلا تو اُسے تھوڑی دیر اپنا لوگر آتا ہوا دکھائی دیا

لوگر کے چہرے پر بدحواسی کے آثار دیکھ کر منوراج کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ روک کر انتظار کرنے

لگا۔ لوگر اس کے قریب پہنچا۔ منوراج نے پریشانی کی دیر پوچھی تو اس نے مالا کے بارے

میں انہل داڑھ کے جوہری کی معلومات بیان کر دیں۔

تھوڑی دیر کے لیے منوراج کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بالآخر اس نے

کہا: ”ہم دروازے پر سپاہیوں کا انتظار کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی بیوی کو

چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ چور نہیں لیکن وہ مالا اگر راجہ کی ہے

تو ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم کسی بات میں دخل نہ دیں۔“

منوراج کو دھرم شالہ کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ یہ بات اس کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھا کر کے سپاہی نظر آئے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے آگے بڑھا اور سپاہیوں کے افسر سے کہنے لگا: ”دیکھ اڈل تو وہ مجھے چور معلوم نہیں ہوتا۔ اگر وہ چور ہے تو بھی میں نہیں چاہتا کہ سارے شہر میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ میں ایک چور کی بیوی کے علاج کے لیے دھرم شالہ میں آیا تھا۔ ٹھا کر بھی میری بدنای پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے یہ بہتر ہو گا کہ میں اسے کسی بہانے سے باہر لے آؤں اور جب ہم گلی میں پہنچیں تو آپ اسے گرفتار کر لیں۔“

سپاہیوں کے افسر نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور منوراج دھرم شالہ کے اندر چلا گیا۔ جب وہ رام ناتھ کے کمرے میں داخل ہوا تو رام ناتھ روپ وتی کا سر دبا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: ”آپ واپس آگئے ہمارا ج!“

”ہاں! آپ میرے ساتھ چلیں۔ دوا کے استعمال کے بارے میں آپ کو بہت سی باتیں سمجھانی ہیں۔“

رام ناتھ نے قدرے پریشان ہو کر روپ وتی کی طرف دیکھنے لگا۔ روپ وتی نے نحیف آواز میں کہا: ”جائے۔ میری فکر نہ کیجیے۔“

رام ناتھ منوراج کے ساتھ دھرم شالہ سے باہر آ گیا۔ جب یہ دونوں ایک کھلے میدان سے گزر کر تنگ گلی میں داخل ہوئے تو ٹھا کر کے سپاہیوں نے اچانک رام ناتھ کو گھیرے میں لے لیا۔ رام ناتھ تھوڑی دیر چیخنے چلانے اور قوت آزمائی کرنے کے بعد آٹھ دس آدمیوں کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ منوراج اتنی دیر میں تیس چالیس قدم آگے جا چکا تھا۔ رام ناتھ چلا رہا تھا: ”مجھے چھوڑ دو! بھکوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں راجہ کا دوست ہوں۔“ اور سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔

(۴)

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ ایک عالی شان محل کے کشادہ کمرے میں ٹھا کر گھونٹا کے سامنے کھڑا تھا۔ منوراج اور انہل واڑہ کا جوہری ٹھا کر کے دانتیں بائیں کرسیوں پر اور نافرذ تھے۔ فوج کے چند سپاہی اور افسر رام ناتھ کے ارد گرد کھڑے تھے۔

رگھو ناتھ نے رام ناتھ کو مالا دکھاتے ہوئے کہا: ”یہ مالا تم نے کہاں سے لی ہے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”ہمارا ج! یہ مجھے ہمارا جہ نے دی تھی۔“

”ہمارے ہمارا جہ نے؟“

”جی ہاں!“

”کب؟“

”ہمارا ج! اس سوال کا جواب آپ ہمارا جہ سے پوچھ لیتے تو آپ کے سپاہیوں کو مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ مالا مجھے ہمارا جہ نے اس دن دی تھی جب وہ جنگل میں شیر کا شکار کھیل رہے تھے اور میں نے انھیں موت کے منہ سے نکالا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنا ہاتھی بھی دیا تھا۔“

رگھو ناتھ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فوج کا افسر جو رام ناتھ کے پیچھے کھڑا تھا، آگے بڑھا اور اس نے غور سے رام ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”ہمارا ج! میں شکار میں ہمارا جہ کے ساتھ تھا۔ یہ وہی ہیں۔ اگر میں انھیں پہلے دیکھ لیتا تو سپاہی ایسی غلطی نہ کرتے۔“

رگھو ناتھ نے پریشانی کی حالت میں جوہری اور منوراج کی طرف دیکھا اور پھر اچانک آگے بڑھ کر مالا رام ناتھ کے گلے میں ڈال دی۔ منوراج اور جوہری بدحواسی کی حالت میں کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ٹھاکر دگھونا تھ کے چار نوکر رام نا تھ کے ساتھ دھرم شالہ کی طرف گئے اور
تھوڑی دیر بعد روپ دتی کو پا لگی میں بٹھا کر اس کے محل میں لے آئے۔ دگھونا تھ نے
اپنے وسیع محل کا ایک حصہ رام نا تھ کے سپرد کر دیا۔ روپ دتی قریباً ایک ہفتہ زندگی اور
موت کے درمیان لنگتی رہی۔ شہر کے معزز گھرانوں کی عورتیں محض ٹھاکر کو خوش کرنے
روپ دتی کی تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھیں۔ رام نا تھ نے احتیاط کے طور پر روپ
دتی کا نام بدل کر سادتری رکھ دیا تھا لیکن اس کے باوجود عورتوں کی آمد و رفت کے
باعث وہ ہر اس بات سے فکر مند رہتا کہ اگر کسی نے روپ دتی کو پہچان لیا تو کیا
ہوگا۔

دوسرے ہفتے روپ دتی کا بخارا اتر گیا لیکن وہ اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ اس
کی صورت پہچانا بھی مشکل تھا۔ ٹھاکر کی دونوں کرائیاں روپ دتی کی خدمت پر مامور
تھیں تیسرے ہفتے روپ دتی نوکرانی کا سہارا لے کر چند قدم چلنے پھرنے کے قابل
ہو چکی تھی۔ اس عرصہ میں رام نا تھ کئی بار ٹھاکر سے یہ درخواست کر چکا تھا کہ اسے محل
سے باہر کسی مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے لیکن ٹھاکر دگھونا تھ ہر بار یہ کہہ
کر ٹال دیتا کہ جب تک تمھاری بیوی بالکل تندرست نہیں ہو جاتی تم میرے مہمان ہو
محل کے نوکروں کی زبانی رام نا تھ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ٹھاکر کی شادی
ہونے والی ہے اور دور دراز سے سینکڑوں مہمان اس تقریب میں حصہ لینے کے لیے
جمع ہونگے۔ وہ روپ دتی کو ان کی نگاہوں سے دور رکھنے کے لیے شادی سے پہلے محل
خالی کر دینا ضروری سمجھتا تھا لیکن روپ دتی ابھی تک ایک لمبے سفر کے قابل نہ تھی۔
شاہی طبیب منوراج اس کی حالت کے متعلق ٹھاکر اور رام نا تھ کے سامنے اطمینان
کا اظہار کرنے کے بعد واپس انہل واڑہ جا چکا تھا لیکن اس نے سختی سے اس بات
کی تاکید کی تھی کہ مرلیضہ کو چند ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ مند ہیر میں منوراج

رام نا تھ نے مالا اتار تے ہوئے کہا ”نہیں ہمارا ج! میں یہ مالا وید جی کو دے چکا ہوں
اور دی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ آپ اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں تو مرید
جی سے کہیے کہ وہ مرلیضہ کی جان بچانے کی کوشش کریں۔“
”مرلیضہ تمھاری بیوی ہے؟“

”جی.... جی ہاں وہ میری بیوی ہے۔“

دگھونا تھ نے کہا ”اب تم دھرم شالہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ آج سے تم میرے
مہمان ہو۔ میرے آدمی تمھارے ہمراہ جا کر تمھاری بیوی کو یہاں اٹھالائیں گے اور
وید جی اس کے علاج کے لیے یہیں ٹھہریں گے۔ یہ مالا اپنے پاس رکھو، ہم وید جی کو
اس کی قیمت ادا کریں گے۔“

منوراج اپنا کھسیا ناپن پھپانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس
نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ”ہمارا ج! میں اُن سے معافی مانگتا ہوں۔ بھگوان جانتا
ہے میری خواہش یہی تھی کہ جب ان کی بیوی تندرست ہو جائے تو یہ بالا اٹھیں
واپس کر دوں۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ یہ اتنی قیمتی چیز کہیں کھو نہ بیٹھیں۔ سیدھ جی کی
غلطی کے باعث انھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔“

جوہری نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا ”ہمارا ج! مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مالا اٹھیں
ہمارا ج نے خود دی ہے۔“

رام نا تھ نے مالا منوراج کو پیش کرتے ہوئے کہا ”نہیں ہمارا ج! مالا اب
آپ کی ہے۔ میں ان کی جان بچانے کے بدلے میں دنیا کے تمام خزانے آپ کے
قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں۔“

”مجھے زیادہ نادم نہ کیجیے۔“ منوراج نے یہ کہتے ہوئے مالا رام نا تھ کے ہاتھ
سے لے کر زبردستی اس کے گلے میں ڈال دی۔

(۵)

ایک دن روپ دتی اپنی عمر رسیدہ نوکرانی کے ساتھ کوٹھ کی چھت پر کھڑی ٹھا کر دگھونا تھ کی برات دیکھ رہی تھی۔ راجہ، ٹھا کر اور شاہی گھرانے کے چند اور افراد ہاتھیوں پر اور ان کے پیچھے بٹے بٹے سردار اور عہدیدار گھوڑوں پر سوار تھے۔ ٹھا کر نے شادی کے موقع پر جمع ہونے والے بھانڈوں اور مسخروں کو راجہ کی آمد سے پہلے ہی انعامات دے کر رخصت کر دیا تھا۔ تاہم ڈھول پیٹنے اور شہنائیاں بجانے والوں کی ایک پوری فوج برات کے ہمراہ تھی۔ جب برات آگے نکل گئی تو روپ دتی جو اپنے مکان کی چھت پر کھڑی کھڑی تھک گئی تھی، نیچے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھی خادمہ بھی نیچے آ کر آئی اور اس نے روپ دتی کے کمرے میں داخل ہو کر کہا: ”یہ اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے۔ بھگوان کی سوگند وہ چاند کا ٹکڑا ہے اور ٹھا کر کی عمر اس کے باپ سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناٹھ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا اور اس نے روپ دتی کو دیکھتے ہی کہا: ”تمہاری طبیعت کیسی ہے روپا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”چھت پر کھڑی برات دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھی۔“

رام ناٹھ نے کہا: ”میں ایک بہت اچھی خبر لایا ہوں۔ ہمارا ج مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد جب، بارات واپس چلی جائے گی تو ٹھا کر کے محل میں ان کا دوبارہ ملے گا اور جس شخص کو سب سے پہلے دوبارہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے گا، وہ میں ہوں۔ میں ذرا دیر سے آؤں تو گھبرانہ جانا۔“

روپ دتی نے کہا: ”رام ناٹھ! مجھے ڈر لگتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم یہاں سے فوراً

کا ایک شاگرد اپنے استاد کی ہدایات کے مطابق ہر روز اُسے دیکھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے ٹھا کر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ”ہمارا ج میری بیوی اب بالکل ٹھیک ہے اور میں آپ کے احسان کا بدلہ عمر بھر نہیں دے سکوں گا لیکن میں ایک بار پھر آپ کی خدمت میں یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ مجھے محل سے باہر کسی مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اگلے ہفتے آپ کے سینکڑوں مہمان اس محل میں جمع ہو جائیں گے۔ میں نے شہر میں ایک مکان کا بندوبست کر لیا ہے، اس لیے آپ مجھے اپنی خوشی سے وہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔“

دگھونا تھ نے جواب دیا: ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کوئی مہمان تم سے زیادہ عزیز نہیں ہوگا۔ پھر بھی میں تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں یہاں ٹھہرانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن میں تمہیں کسی معمولی مکان میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ شہر کی دوسری طرف میرا ایک مکان خالی پڑا ہے اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میری شادی کے موقع پر اس محل میں مہمانوں کی بھیر تمہیں پریشان کرے گی تو تم وہاں چلے جاؤ۔ میں نے راجہ کو بھی تمہارے متعلق اطلاع بھیج دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ میری شادی پر یہاں آئیں گے تو سب سے پہلے تمہارے متعلق پوچھیں گے۔ وہ انہل اڑے سے کنٹھ کوٹھ چلے گئے ہیں ورنہ اب تک تمہارے پاس اُن کا ابھی آچکا ہوتا۔“

اگلے دن رام ناٹھ اور روپ دتی محل چھوڑ کر دگھونا تھ کی ایک پرانی حویلی میں چلے گئے۔ دگھونا تھ کے نوکر یہاں بھی ان کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ محل سے ایک عمر رسیدہ خادمہ بھی جسے روپ دتی کے ساتھ بہت اُنس ہو چکا تھا، اُن کے ساتھ آئی تھی۔ اس حویلی کے پاس ہی ایک اور عالیشان مکان تھا۔ رام ناٹھ اور روپ دتی کو نوکر دن کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ مکان اس شخص کا ہے جس کی لڑکی سے ٹھا کر دگھونا تھ کی شادی ہونے والی ہے اور اسے حال ہی میں انہی علاقے میں جاگرتی ہے۔

روانہ ہو جائیں، اب میں سفر کر سکتی ہوں۔“

رام ناٹھ نے کہا: ”تم فکر نہ کرو روپ و تی! اب میں راجہ بھیم دیو کی پناہ میں ہوں۔ اب اگر پروہت بھی یہاں آجائے تو وہ اپنی رسوائی کے خوف سے تمہارے متعلق زبان نہیں کھول سکے گا۔“

روپ و تی نے خوفزدہ ہو کر کہا: ”تو تمہارا مطلب ہے کہ ہم ہمیں رہیں گے۔“

”نہیں میرا مطلب نہیں۔ میں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں چند دن اور آرام مل جائے۔ پھر تم جانتی ہو کہ راجہ کے مہمانوں کی حیثیت سے ہمارے لیے سفر کرنا بہت آسان ہوگا۔“

رام ناٹھ یہ کہہ کر چلا گیا اور روپ و تی خیالات کی دنیا میں کھو گئی۔ وہ چند دن سے محسوس کر رہی تھی کہ نئے مکان میں منتقل ہونے کے بعد رام ناٹھ گرد و پیش کے خطرات سے بے پروا ہونا جا رہا ہے اور ٹھاکر کی دوستی آہستہ آہستہ اس کے دل میں یہ احساس پیدا کر رہی ہے کہ وہ دنیا میں بے یار و مددگار نہیں۔ شہر کے لوگ انہیں شہر اور بیوی سمجھتے تھے۔ رام ناٹھ کو گزشتہ واقعات نے مذہب اور سماج کی ہر رسم سے باغی کر دیا تھا۔ اس نے روپ و تی کو سومات کے پروہت کے ہاتھوں سے پھینکا تھا۔ اس نے دیوتاؤں اور ان کے پجاریوں کا مذاق اڑایا تھا اور اب اُن تمام واقعات کے بعد روپ و تی کے ساتھ شادی رچانے کے لیے وہ کسی پنڈت کی خدمات حاصل کرنا مضحکہ خیز سمجھتا تھا لیکن روپ و تی سومات کے پجاریوں اور پروہت سے نفرت اور تحارت کے باوجود سماج کے آئین کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ وہ مرد اور عورت کے ایسے تعلقات کا تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھی جو مذہب اور سماج کی رسوم سے کلیتہً آزاد ہوں۔ اپنے مذہب کے بارے میں اس کے دل میں گونا گوں خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا لیکن یہ طوفان صرف سومات کے مندر کے چند پجاریوں اور

پروہت کی بدعنوانیوں کے خلاف تھا۔ اسے پجاریوں سے نفرت تھی۔ لیکن دیوتاؤں کا خوف اب بھی اس کے دل پر حاوی تھا۔ اس نے دلائل سے زیادہ اپنے آنسوؤں سے رام ناٹھ کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شوہر اور بیوی کا ناٹھ ہوڑنے کے لیے سماج کی رسوم کی باندی کریں گے اور اس مقصد کے لیے خطرے کی حدود سے باہر نکل جانا ضروری تھا۔ اس کے لیے قنوج میں زنبیر کا گاؤں ایک ایسا قلعہ تھا جہاں وہ کسی خطرے کے بغیر اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ روپ و تی رام ناٹھ سے کہا کرتی تھی: ”جب ہم وہاں جائیں گے تو مجھے یہ کہتے ہوئے بھی ڈر محسوس نہیں ہوگا کہ میں سومات کے مندر سے بھاگ کر آئی ہوں۔ سومات کا کوئی پجاری مسلمانوں کے خوف سے ہمارا پیچھا نہیں کرے گا۔ زنبیر خوشی سے اپنے محل کے قریب ہمیں جھونپڑی بنانے کی اجازت دے دے گا۔ پھر جب تم کھیتوں میں کام کیا کرو گے تو میں تمہارے لیے کھانا لے کر آیا کروں گی۔ تم گایا کرو گے اور میں اطمینان سے بیٹھ کر سنا کروں گی۔“

کبھی کبھی رام ناٹھ بھی اس کے ساتھ مستقبل کے تصورات میں کھو جاتا۔ لیکن بعض اوقات اس کے جذبہ خود پسندی کو ٹھیس لگتی اور وہ کہتا: ”نہیں روپا! تم ایک کسان یا چرواہے کی بیوی بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئیں۔ میں زنبیر کے محل کے پاس تمہارے لیے ایک جھونپڑا نہیں بلکہ ایک عالیشان محل تعمیر کروں گا۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ میری تلوار راجوں اور مہاراجوں سے خراج وصول کرے گی۔ جب تک میرے پہلو میں ایک سپاہی کا دل ہے میرے لیے شہرت اور کامیابی کے راستے کھلے رہیں گے۔ انہل واڑہ کے مہاراج نے اپنی مالدار کہ میرے گلے میں ڈالی تھی قنوج کے گورنر نے مجھے اپنا دوست بنایا۔ سلطان محمود نے میری بہادری کا اعتراف کیا تھا۔ اگر مجھے یہاں تمہارے متعلق اطمینان ہوتا تو میں سیدھا راجہ کے دربار میں چلا جاتا اور پھر تم دیکھتیں کہ بڑے بڑے سرداروں کی بہو بیٹیاں تمہیں پر نام کرنے آتی ہیں۔“ رام ناٹھ کے منہ

ہمارا جانے دی ہے۔“

تلوار کی نیام سنہری تھی اور اس کا دستہ میروں سے مزین تھا۔ روپ دتی نے کہا۔
”بھگوان کا شکر ہے کہ ایسی خوبصورت چیز نے تمہیں گھرائے کا راستہ نہیں بھلا دیا؟“
رام ناٹھ نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھ کر کمرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے
انسوس ہے کہ میں نے تمہیں اتنی دیر پریشان رکھا۔ ہمارا جہر کا حکم تھا کہ میں رات کے
وقت ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس کے بعد وہ دیر تک میرا گانا سنتے رہے اور مجھے
اپنی مرضی کے خلاف ان کے پاس بیٹھا پڑا۔ میں تمہارے لیے ایک بہت اچھی خبر لایا
ہوں۔“

روپ دتی نے کہا۔ ”میرے لیے سب سے اچھی خبر یہی ہو سکتی ہے کہ ہم کل یہاں
سے چلے جائیں۔“
رام ناٹھ نے کہا۔ ”نہیں روپ دتی! اب ہمیں درود کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں
گی۔ آج سے میں سردار رام ناٹھ ہوں۔ راجہ نے بھرے دبدب میں یہ اعلان کیا ہے کہ
آج سے تمہارے دوست میرے دوست اور تمہارے دشمن میرے دشمن ہوں گے۔
ہمارا جہر نے مجھے پورے آٹھ گاؤں جاگیر میں دیے ہیں۔“
”نہیں نہیں۔“ روپ دتی نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے یہاں رہنے
کا خیال دل سے نکال دو۔“

رام ناٹھ نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”روپ دتی! تمہیں پریشان
ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے یہاں کوئی خطرہ نظر آتا تو میں انہل واڑہ کی سلطنت
کو بھی ٹھکرا دیتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم قنوج کی نسبت اس جگہ کم محفوظ نہیں۔ یہ
ہمارا وہم تھا کہ سومنات کے بھجادی ہمارے تلاش کر رہے ہیں۔ آج ٹھاکر کے دو
بھجادیوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ سومنات کی نئی دیوی پہلی رات ہی دیوتا

سے ایسی باتیں سن کر روپ دتی کا دل بیٹھ جاتا اور وہ گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش
کرتی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ جلد از جلد قنوج پہنچ جائے۔ ہمار
اترجانے کے بعد وہ ہر روز یہ کہا کرتی تھی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اب سفر کر
سکتی ہوں۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ بھگوان کے لیے جلدی یہاں سے نکل چلو۔
مجھے ڈر لگتا ہے۔ لیکن وید جی نے یہ کہا ہوا تھا کہ مریضہ ابھی سفر کرنے کے قابل نہیں۔
اے چند ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے رام ناٹھ سفر کا خطرہ مول
لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

(۶)

اُدھی رات ہونے کو تھی لیکن رام ناٹھ واپس نہ آیا۔ روپ دتی انتہائی پریشانی کی
حالت میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بوڑھی نوکرانی دیر تک اس سے باتیں کرنے کے
بعد اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ رام ناٹھ کا اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا خلاف معمول
تھا اور جوں جوں رات زیادہ جو رہی تھی، روپ دتی کی ناراضگی خوف میں تبدیل ہوتی جا
رہی تھی۔ بالآخر اُسے صحن میں رام ناٹھ کی آواز سنائی دی اور اس کا دل مسرت سے
اچھلنے لگا۔ وہ کمرے سے اٹھی اور دروازے میں کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ رام ناٹھ
جو کیدار سے باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اچانک اس نے دروازے میں روپ دتی کو دیکھا
اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی تک جاگ رہی ہو روپا؟“

روپ دتی نے پیچھے ہٹ کر اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں
کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ مجھے نیند آگئی ہوگی۔“

رام ناٹھ نے اُس کی شکایت پر توجہ دینے کی بجائے اپنی کمرے زری کی پٹی کھلا
کر تلوار اتار دی اور روپ دتی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو روپ دتی! یہ مجھے

کے چہرہ میں پہنچ گئی تھی اور اگلے دن پروہت نے دیوی کا تاج ایک اور لڑکی کے سر پر رکھ دیا تھا۔ پروہت سرائیں زندہ ہے۔ پجاری کہتے تھے کہ گزشتہ دنوں ان کے وقت سیر بھی پر سے پھسل جانے کے باعث پروہت کے سر پر زخم آگیا تھا۔ مہاراجہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پجاری نے تمھارے فوراً غائب ہو جانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مہادیو نئی دیوی پر بہت مہربان تھے۔

روپ دتی نے کہا: ”تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ پجاری درپردہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔“

”نہیں روپ دتی! پجاری جس مقصد سے یہاں آئے ہیں وہ بھی مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ٹھاکر جی نے مجھے بتایا تھا کہ سومنات کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی کا خطرہ آئے دن بڑھ رہا ہے اور پروہت نے ان پجاریوں کو مہاراجہ سے مشورہ کرنے بھیجا ہے۔ اب تمھاری تلاش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے اگر کوئی پجاری تمھیں پہچان بھی لے تو وہ یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ تم روپ دتی ہو۔ اگر تم خود بھی برسرِ عام شور مچاؤ تو وہ یہ کہیں گے یہ کوئی دیوانی ہے۔ وہ روپ دتی ہو مندر کی دیوی تھی، زمین پر نہیں اکاش میں رہتی ہے۔“

روپ دتی نے کہا: ”فرض کرو اس شہر میں مجھے کوئی ایسی لڑکی مل جائے جس نے مجھے مندر میں دیکھا ہو تو کیا ہوگا؟“

رام ناٹھ نے اطمینان سے جواب دیا: ”کچھ نہیں، اول تو ایسی تمام لڑکیاں یہ سن چکی ہوں گی کہ مندر کی روپ دتی کسی اور دنیا میں جا چکی ہے۔ پھر تم ان سے یہ کہو گی کہ میرا نام روپ دتی نہیں سادتری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے متعلق پروہت اور پجاریوں کے بیانات جھٹلانے کی بجائے یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گی کہ روپ دتی اور سادتری ایک ہی صورت کی لڑکیاں ہیں۔“

روپ دتی نے کہا: ”لیکن اگر یہ بات پروہت تک پہنچ جائے کہ اس شہر میں روپ دتی کی شکل کی ایک اور لڑکی ہے تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو مجھے اس کے انتقام سے بچا سکے گی؟ راجہ اور ٹھاکر کے لیے اس کا معمولی اشارہ بھی حکم کے برابر ہوگا اور پیشتر اس کے کہ میری آواز میرے ہونٹوں سے باہر نکلے میرا کلا گھونٹ دیا جائے گا۔ کسی کو اس بات کا علم تک نہیں ہوگا کہ پروہت نے اپنا پاپ چھپانے کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بے شک راجہ اور ٹھاکر تم پر مہربان ہیں لیکن پروہت کے ماتھے پر ہل دیکھ کر انھیں ہمارے بارے میں یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی کہ ہم نے کیا جرم کیا ہے۔“

رام ناٹھ نے کہا: ”روپ دتی تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ ہم سومنات سے کوسوں دور ہیں۔ میں انہل واڈہ کی سلطنت میں ایک سردار کی حیثیت رکھتا ہوں۔ راجہ بھیم دیو مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر تمھیں پروہت کے حوالے نہیں کرے گا اور پروہت اگر یہ قوت نہیں تو اپنی بدنامی کے ڈر سے مجھ سے اُلجھنا پسند نہیں کرے گا۔“

روپ دتی نے پالوسی کے انداز میں کہا: ”مندریں مجھے کبھی موت کا ڈر محسوس نہیں ہوا تھا لیکن تمھاری دنیا میں آنے کے بعد موت کا تصور میرے لیے بہت بھیانک ہو چکا ہے۔ اب میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اب میرے دیوتا تم ہو۔“

رام ناٹھ نے اپنی کرسی آگے گھسیٹ لی اور روپ دتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: ”تمھارے بغیر میری زندگی بے معنی تھی۔ اب میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب تمھارے لیے ہے۔ میں تمھاری یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ راجہ انہل واڈہ کے آس پاس مجھے جاگیر دینا چاہتا تھا لیکن میں نے یہ بہانہ کیا کہ مجھے شکار کا شوق ہے۔ اس لیے مجھے مشرقی سرحد کے جنگلات کے پاس آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ راجہ نے میری یہ درخواست خوشی سے مان لی ہے

اور مجھے سرحد کے پاس آٹھ گاؤں عطا کر دیے ہیں۔ ان بستیوں سے آگے وسیع جنگل ہے جہاں کہیں کہیں نیچ ذات کے چرواہے رہتے ہیں۔ میں اس جنگل کا جو حصہ آباد کر دوں گا وہ بھی میری جاگیر ہوگا۔ راجہ نے چند برس قبل شکار کے دنوں میں اپنے قیام کے لیے دریا کے کنارے ایک مکان بنوایا تھا۔ اب وہاں سرحدی بستیوں کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ رہتا ہے۔ میں نے اس علاقے کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اور میرے وہاں پہنچتے ہی یہ مکان خالی کر دیا جائے گا۔ سپاہیوں کے لیے مجھے جھوٹے پائیاں ڈالنی پڑیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقام سومنات کے پجاریوں کی پہنچ سے بہت دور ہوگا اور ہم وہاں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ میں کسی برہمن کو پکڑ لاؤں گا اور ہم چپ چاپ شادی کی رسمیں پوری کر لیں گے جنگل میں جو لوگ رہتے ہیں وہ زیادہ تر بھیل ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ سرحد کی بستیوں میں پوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے آجاتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے اگر میں ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی بجائے اچھا سلوک کروں تو یہ امن پسند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمہاری صحت ذرا ٹھیک ہو جائے تو میں چند دن کے لیے وہاں جاؤں گا اور ضروری انتظامات کے بعد تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گا۔ میں تمہارے یہاں چند ہفتے اور ٹھہرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ بیماری کے باعث تمہاری صورت اس درجہ بدل چکی ہے کہ تمہیں دیکھ کر کسی کو اس بات کا شک نہیں ہو سکتا کہ تم ہی روپ دتی ہو۔

روپ دتی نے کہا: ”لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ تم نے قنوج جانے کا ارادہ کیوں بدل دیا ہے۔ میں یہ جانتی ہوں کہ تم ایک عام آدمی کی بجائے ایک سردار بننا چاہتے ہو لیکن کیا زنبیر اور قنوج کے گورنر کی دوستی تمہارے کسی کام نہ آتی۔ کیا وہاں ہم اپنے گزراے کے لیے صرف چند کھیت حاصل کر لینے کے بعد زیادہ خوش نہ ہوتے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”روپ دتی! اگر میں قنوج کے مستقبل سے مطمئن ہوتا تو راجہ کی بڑی سے بڑی جاگیر ٹھکانے پر بھی وہاں چلا جاتا لیکن قنوج اور اس کی ہمسایہ سلطنتوں کے لیے ابھی تک یہ خطرہ موجود ہے کہ محمود کی فوجیں کسی دن واپس چلی جائیں گی اور وہاں کے ہندو ان لوگوں پر لوٹ پڑیں گے جن پر مسلمانوں سے دوستی رکھنے کا الزام ہوگا۔ ان حالات میں زنبیر جیسے لوگوں کی جانیں خطرے میں ہوں گی۔ اگر میں تنہا ہوتا تو یقیناً زنبیر کے پاس رہنا پسند کرتا لیکن تمہارے لیے میں ایسے تمام خطروں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تسلی کے لیے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں قنوج کے حالات سے باخبر رہوں گا اور جو بھی اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ وہاں ہمارا مستقبل محفوظ ہے ہم وہاں چلے جاتیں گے۔“

روپ دتی نے کہا: ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم سومنات پر مسلمانوں کے حملے کے خطرے کے باوجود اس علاقے کو محفوظ سمجھتے ہو۔“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”مجھے اُن سے کوئی خطرہ نہیں۔“

روپ دتی نے پوچھا: ”کیا راجہ کے جاگیردار ہوتے ہوئے تم مسلمانوں کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دو گے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا: ”نہیں یہ جاگیر میں نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا وعدہ کر کے حاصل نہیں کی بلکہ راجہ کی جان بچانے کا صلہ ہے۔ مجبوری کی حالت میں میں ہر وقت سرحد عبور کر کے قنوج یا کسی اور ریاست میں پناہ لے سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ کے دوش بدوش کھڑا ہو کر بھی میں اپنی تلوار مسلمانوں کے خلاف نہیں اٹھا سکوں گا لیکن تمہیں ابھی ایسی باتیں سوچ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ سردست سرحد کے علاقے قنوج سے کم محفوظ نہیں۔ اچھا اب تم آرام کرو۔“

یہ میں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ لیکن رام ناتھ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ ابھی تم کمزور ہو اگر راستے میں دوبارہ بیمار ہو گئیں تو اس دور افتادہ مقام پر کسی اچھے طبیب کی خدمات حاصل کرنا ناممکن نہ ہوگا۔

ٹھا کر رکھنا تھ کی شادی سے چار دن بعد روپ وتی کا اصرار شدید ہو گیا اور رام ناتھ مجبور ہو کر کہنے لگا: ”اچھا تو میں کل اپنی جاگیر دیکھنے چلا جاؤں گا اور پانچ چھ روز میں ضروری انتظامات کرنے کے بعد واپس آ کر تمہیں اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔ اس عرصہ میں تمہاری حالت اور بھی اچھی ہو جائے گی۔“

اگلی صبح چھ سواری جھنڈیں ٹھا کر نے رام ناتھ کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ سواری سے باہر کھڑے تھے اور رام ناتھ صحن میں روپ وتی سے رخصت ہو رہا تھا۔ رام ناتھ دیر نہ لگانا ”روپ وتی نے سراپا التجا بن کر کہا۔“

رام ناتھ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ اگر جوہری میری غیر حاضری میں کنگن لے آئے تو خادمہ کو ساتھ لے کر ٹھا کر کے گھر چلی جانا۔ میں شہر کے دکاندار کو کپڑوں کے لیے کہہ آیا ہوں۔ وہ ایک بہترین جوڑا ٹھا کر کی بیوی کے لیے اور دوسرا تمہارے لیے پہنچا دے گا۔ ابھی جب میں ٹھا کر کے پاس گیا تھا تو انھوں نے تمہارے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے بتایا کہ اب تمہاری صحت بہت اچھی ہے اور تم ایک دو دن میں ٹھا کرانی کو پر نام کرنے آؤ گی۔“

روپ وتی نے کہا: ”جلد آنا میں بہت ڈرتی ہوں۔“
 ”تم ٹھا کر کے گھر جانے سے ڈرتی ہو۔ اب تو اس کے سہان بھی چاچکے ہیں۔“
 ”نہیں.... مجھے کوئی خدشہ نہیں۔ صرف تمہاری فکر ہے۔ اب تم سردار بن چکے ہو، مجھے ڈر ہے کہ کوئی تمہیں میرے ہاتھوں سے چھین نہ لے۔“
 ”روپ وتی! مجھے صرف موت تمہارے ہاتھوں سے چھین سکتی ہے۔“

رام ناتھ اُٹھ کر برابر کے کمرے کی طرف بڑھا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اُسے کوئی خیال آیا اور اس نے فرکڑ دیکھتے ہوئے کہا: ”روپ وتی ٹھا کر کی دلہن کو تمام بڑے بڑے سرداروں کی بیویوں نے تحائف پیش کیے ہیں۔ اب چونکہ یہ مشہور ہو چکا ہے کہ تم میری بیوی ہو اور ٹھا کر کے مجھ پر احسانات بھی ہیں۔ اس لیے تمہیں ٹھا کر کی دلہن کو کوئی بہت قیمتی تحفہ پیش کرنا چاہیے۔ انہل واڑہ کا جوہری ابھی تک یہیں ہے، میں اس سے لی چکا ہوں، اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر انہل واڑہ سے کنگن کا ایک خوبصورت جوڑا منگا دے گا اور قیمت بعد میں وصول کرے گا۔ ٹھا کر کا دل رکھنے کے لیے میں نے اُسے یہ کہہ دیا تھا کہ میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ ندرست ہوتے ہی ٹھا کرانی کو پر نام کرنے کے لیے حاضر ہو گی۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا لیکن روپ وتی بے چینی کی حالت میں کڑوئیں بدل رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی ان دیکھی قوت رام ناتھ کو اس کے ہاتھوں سے چھین کر کہیں دوسرے جا رہی ہے۔ اس کے دل سے بار بار یہ آواز نکل رہی تھی: ”رام ناتھ! تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔“

(۷)

اگلے دن مہاراجہ بھیم دیو نے اپنی راجدھانی کی طرف کوچ کیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے ٹھا کر رکھنا تھ کو ہدایت کی کہ رام ناتھ کو اس کی جاگیر میں آباد کرنے کے لیے ہر ممکن مدد دی جائے۔ روپ وتی کو یقین ہو چکا تھا کہ رام ناتھ قنوج نہیں جائے گا۔ چنانچہ اب وہ کسی تاخیر کے بغیر سرحد پر اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے پر بضد تھی۔ وہ صبح شام رام ناتھ سے کہا کرتی تھی: ”میں اب سفر کر سکتی ہوں۔ اس

”ایسی باتیں نہ کرو۔“ روپ وتی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”میں بچکی ہوں۔ جاؤ تمہارا
ساتھی باہر انتظار کر رہے ہیں۔“

رام ناتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ روپ وتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، رام ناتھ
نے ایک ٹائبر کے لیے مڑ کر روپ وتی کو دیکھا اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل
گیا۔ تھوڑی دیر بعد روپ وتی حویلی سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سن رہی تھی۔

جان چپان

دو دن بعد روپ وتی اپنی خادمہ کے ہمراہ دگھونا تھکے محل میں داخل ہوئی۔
خادمہ ایک چاندی کی طشتری اٹھائے ہوئے تھی جس کے اوپر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہوا
تھا۔ ٹھا کر کی ایک خادمہ جو ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ انھیں ایک کمرے کے سامنے
نظر آکر چلی گئی۔ پسند لمحات کے بعد اس نے واپس آ کر روپ وتی کو اند جانے کا اشارہ
کیا۔ روپ وتی اپنی خادمہ کے ہاتھ سے طشتری لے کر اندر چلی گئی۔
ٹھا کر کی بیوی ایک کشادہ چوکی پر بیٹھی تھی، جو محفل کے گدیوں اور زرد نار جھالوں
سے آراستہ تھی۔ روپ وتی ایک ہاتھ سے طشتری سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر بھکی
اور دوسرے ہاتھ سے اس کا پاؤں چھونے لگی۔ ٹھا کرانی نے اسے بازوؤں سے پکڑ
کر اٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنے دونوں گھٹنے فرش پر ٹیک دیے اور ادب سے
سر جھکاتے ہوئے طشتری آگے کر دی۔ ٹھا کر کی بیوی نے رومال اٹھا کر اس کا تھنہ
دیکھ بغیر طشتری اس کے ہاتھ سے لی اور اپنے قریب رکھ لی۔
روپ وتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹھا کر کی بیوی نے پہلی بار اس کا چہرہ غور سے
دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم! تم یہاں!“

یوں معلوم ہوا جیسے وہ لڑکی روپ بدل کر یہاں آگئی ہے۔
 روپ دتی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ایک ہی صورت کی دو لڑکیاں دیکھ
 کر گھبرانے کی کیا بات تھی؟

نرملانے جواب دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ لڑکی مندر کی دیوی بنتے ہی
 دیوتا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ مجھے وہ بہت یاد آیا کرتی ہے۔
 ”اور آپ نے یہ سمجھا کہ آپ کی یاد نے اُسے میرے روپ میں آپ
 کے پاس پہنچا دیا ہے۔“

”نہیں میں تو ڈر ہی گئی تھی۔“
 روپ دتی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اب تو مجھے دیکھ کر آپ
 نہیں ڈرے گی نا؟

”نہیں۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ مندر دست ہونے کے بعد آپ مجھ سے ملنے
 آیا کریں گی۔“

روپ دتی نے جواب دیا۔ ضرور آیا کر دوں گی۔
 نرملانے قدرے بے توجہی سے طشتری پر سے کپڑا اٹھا لے کر طشتری میں زری
 کی ساڑھی کے اوپر چاندی کی ایک بیڑی رکھی تھی۔ اُس نے ڈبہ کھولی اور لنگن نکال
 کر دیکھنے لگی۔

”ہن! تم نے بہت تکلیف کی۔“ نرملانے کہا۔
 ”مجھے اتنا ہے کہ آپ ایک غریب ہن کا تحفہ نہیں ٹھکرائیں گی۔“
 نرملانے لنگن دوبارہ ڈبہ میں رکھ دیے اور کہا۔ آپ یقین کریں کہ میں اسے
 بہترین تحفہ سمجھتی ہوں۔ مجھے زیور پہننے کا شوق نہیں، لیکن آپ کا یہ تحفہ ہمیشہ
 میرے ساتھ رہے گا۔“

روپ دتی نے گردن اٹھائی اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے
 سامنے نرملاکھڑی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے ہٹی اور ایک کرسی پر گر پڑی۔ اس کا
 سر جھک رہا تھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ چند لمحات کے لیے
 نرملاکو بھی اپنے گرد پیش کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکے کے عالم میں اپنی اس سہیلی کی طرف
 دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں سومنات کے بھاریوں نے چند دن قبل یہ اطلاع دی
 تھی کہ وہ دیوتا کے چرنوں میں پہنچ چکی ہے۔ اہستہ آہستہ روپ دتی کا مرجھایا ہوا چہرہ
 اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس لڑکی سے مختلف دکھائی دینے لگیں جس کے وجود
 میں اس نے زندگی کی تمام دلفریبیاں، سرسٹیاں اور رعنائیاں دیکھی تھیں۔
 روپ دتی کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آہستہ آہستہ زندگی کے آثار نمودار ہو رہے
 تھے لیکن خوف کے باعث اس کے چہرے میں جو تغیر آچکا تھا وہ نرملاکو سرا سیمکی دور
 کرنے کے لیے کافی تھا۔

ہوش میں آتے ہی روپ دتی کی قوت مدافعت بیدار ہو گئی۔ اس نے ڈوبتی ہوئی
 آواز میں کہا۔ ”معاف کیجیے، میں بہت بیمار رہی ہوں۔ مجھے جکر آگیا تھا۔“
 نرملانے کہا۔ ”آپ کو ایسی حالت میں تکلیف نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”میرا خیال تھا کہ میں اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔“
 نرملانے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”میں آپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ آپ کا
 نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام ساد زری ہے۔“
 ”آپ کی کوئی بہن سومنات کے مندر میں تو نہیں تھی؟“
 ”جی نہیں۔“

”سومنات کے مندر میں ایک لڑکی کی شکل بالکل آپ جیسی تھی۔ آپ کو دیکھ کر

روپ دتی رخصت ہونے کے لیے اجازت لینے کا ارادہ کر رہی تھی کہ نسل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ٹھکاندر داخل ہوا۔ روپ دتی جلدی سے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اے سادتری! تم کب آئیں؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ماراج! میں ابھی آئی ہوں۔“

”اب تو تمھاری صحبت اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ نرلا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ ہمارے سب سے جاگیر دار کی دھرم بتی ہیں۔ ان کے پتی نے اپنی جان پر کھیل کر ہمارے ہمارے جہاں کی جان بچائی تھی۔“

روپ دتی کے چہرے پر دوبارہ پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے، اُس نے نرلا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیجیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ نرلا نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا آپ جا کر آرام کریں، لیکن دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ بھولیں۔“

روپ دتی نے ٹھاکر اور ٹھاکرانی کو پرنام کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ٹھاکر نرلا کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرلا نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”جب میں سومات میں تھی تو وہاں محل میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھے اُس کے متعلق بتایا تھا کہ اُس نے راجہ کو چیتے کے حملے سے بچا یا ہے۔“

ٹھاکر نے کہہ۔ ”یہ وہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجہ نے اسے سومات جانے کے لیے اپنا ہاتھ دیا تھا اور وہاں ہمارے محل میں ہی رہا تھا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”رام ناتھ!۔“

”آپ اس لڑکی کا نام جانتے ہیں؟“

”ہاں! اس کا نام سادتری ہے۔“

”آپ کو معلوم ہے اس کا گھر کہاں ہے؟“

ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”رام ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سومات آنے سے پہلے اپنی بیوی کو اُس کے باپ کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ سادتری کا باپ کالجی سرحد پر کی گاؤں میں رہتا تھا۔ جب مسلمانوں کی فوج گوالیار فتح کرنے کے بعد کالجی کی طرف بڑھی تو سادتری کا باپ سرحدی فوج کے چند دستوں کے ساتھ اپنے علاقے کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا۔ سادتری کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اُس نے ایک نادار نوکر کو ساتھ لیا اور رام ناتھ کی تلاش میں نکل پڑی۔ اتفاق سے انھیں باتریوں کا ایک قافلہ مل گیا اور یہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ادھر رام ناتھ کالجی کے حالات سنتے ہی سادتری کا پتہ لگانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ ممکن تھا کہ رام ناتھ کالجی کی خاک چھانتا رہتا اور سادتری سومات میں اسے تلاش کرتی پھرتی، لیکن بھگوان نے ان پر دیا کی اور سومات سے تیس چالیس کوس ادھر ہی ان کا ملاپ ہو گیا۔ رام ناتھ نے دایس سومات جانے کی بجائے انہل وارہ پہنچنے کا ارادہ کیا، لیکن راستے میں اُس کی بیوی بیمار ہو گئی۔ جب وہ یہاں پہنچے تو سادتری کی حالت بہت خراب تھی۔ اس لیے میں نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا۔“

یہ افسانہ رام ناتھ نے ٹھاکر اور شہر کے دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے چھپنے کے لیے زرا شائبہ کیا۔ لیکن ٹھاکر سے چند اور باتیں معلوم کرنے کے بعد نرلا کے شکوک چھتر تازہ ہو گئے۔ اُس پر یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ رام ناتھ وہی نوجوان ہے، جسے اس نے سومات میں رکھا تھا۔ لیکن روپ دتی کے متعلق وہ جس قدر سوچتی تھی اسی قدر اُس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ٹھا کرنے پوچھا۔ ”تم کیا سوچ رہی ہو؟“

نرملہ نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ سادتری کی شکل بالکل اس لڑکی جیسی ہے جسے میں نے سومات کے مندر میں دیکھا تھا۔“ ٹھا کرنے کہا۔ ”اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔ دنیا میں کئی انسانوں کی صورتیں آپس میں ملتی ہیں۔“

نرملہ نے کہا۔ ”لیکن میں تو اس لڑکی کو دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔ آپ نے بچاریوں کی زبانی اُس لڑکی کے بارے میں سنا ہوگا جو سومات کی دیوی کا تاج پہنتے ہی دیوتاؤں کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میں نے سادتری کو دیکھا تو یوں معلوم ہوا کہ مندر کی دیوی ایک نئے روپ میں یہاں آگئی ہے، لیکن جب اس سے بات چیت ہوئی تو میرا ڈر جاتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ روپ دتی جو مندر کی دیوی بنی تھی اس لڑکی سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ پھر بھی میں اس قدر مبہول ہوئی تھی کہ اس لڑکی کو اپنی طرف سے کوئی تحفہ نہ دے سکی۔ وہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ لائی ہے یہ دیکھیے“ نرملہ نے چاندی کی ڈبیہ اٹھائی اور کھول کر ٹھا کرنے کے سامنے کر دی۔

ٹھا کرنے ڈبیہ سے لنگن نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”واقعی یہ بہت اچھے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ سادتری ہمارے گھر سے خالی ہاتھ گئی ہے۔“

نرملہ نے کہا۔ ”میرا ارادہ ہے کہ میں خود اس کے پاس جاؤں اور اپنی طرف سے ایک ہار پیش کروں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ ہمارے ہمارا راج رام ناتھ پر بہت مہربان ہیں اور ہمیں اس کی بیوی کی عزت کرنی چاہیے۔ اس کا گھر تمھارے پتاجی کے مکان کے قریب ہے۔ تم جب چاہو بالکی میں بیٹھ کر وہاں چلی جاؤ۔“

”تو میں کل مزدور جاؤں گی۔ میرا ارادہ ہے کہ وہاں سے پتاجی کو بھی دکھتی آؤں۔“

”بہت اچھا۔“ ٹھا کر یہ کہتے ہوئے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دن کے تیسرے پہر نرملہ کی آنکھ کھلی تو ایک خادمہ نے آکر کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے ٹھا کر جی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ لیکن آپ گہری نیند سو رہی تھیں اور انھوں نے جگنا مناسب نہ سمجھا۔ ٹھا کر جی کو اطلاع ملی ہے کہ سومات کے پردہت جی ہمارا راجہ سے ملنے انہل واڑہ جا رہے ہیں۔ کل رات وہ یہاں ٹھہریں گے آج وہ یہاں سے پندرہ بیس کو کسی سردار کے پاس ٹھہر گئے ہیں۔ ٹھا کر جی ان کے سواگت کے لیے گئے ہیں۔ وہ رات پردہت جی کے پاس رہیں گے اور کل دو پہر تک انھیں ساتھ لے کر واپس آ جائیں گے۔“

(۳)

اگلی صبح روپ دتی اپنے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ خادمہ بھاگتی ہوئی آئی اور اُس نے دروازے سے اندر بھاگتے ہوئے کہا۔ ”ٹھا کر جی کی بیوی آئی ہیں۔“

ایک ثانیہ کے لیے روپ دتی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور لرزتی، کانپتی اور ڈوگلا گئی ہوئی اس کے استقبال کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔ اتنی دیر میں نرملہ برآمدے میں آچکی تھی۔

نرملہ نے کہا۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”آئیے تشریف رکھیے۔“

”میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کر دوں گی۔“ نرملہ نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”روپ دتی نے سمجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں آپ

سے کسی کو س دور ہی تھا کہ وہ مل گئے۔ میں سمجھتی تھی، اس لیے وہ مجھے یہاں لے آئے۔
نرملہ نے کہا: میں نے تو یہ نہیں کہا کہ آپ وہاں گئی تھیں، لیکن میرا خیال تھا
کہ شاید آپ کے پتی لے کبھی آپ سے زبیر کا ذکر کیا ہو۔ میں اُس کے متعلق بہت کچھ
جانتا چاہتی ہوں۔“

روپ دتی نے ڈوبتے ہوئے دل کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا
”ابھی تک انھوں نے میرے سامنے اس نام کے کسی دوست کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن
میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب وہ آئیں گے تو میں اُن سے ضرور پوچھوں گی۔“
”نہیں نہیں، آپ انھیں یہ نہ بتائیں کہ میں نے زبیر کے بارے میں پوچھا ہے“
جگوان کے لیے ایسا نہ کیجیے۔“

”اچھا نہیں پوچھوں گی!“
”آپ کے پتی کب واپس آئیں گے؟“

”وہ سات دن کا وعدہ کر کے گئے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جلد
آجائیں گے۔“

نرملہ نے اٹھتے ہوئے کہا: ”اچھا اب میں جاتی ہوں۔“

روپ دتی ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک
بہت بڑی مصیبت ٹل گئی ہے۔ نرملہ دو قدم اٹھانے کے بعد اچانک رُک
گئی اور مڑ کر روپ دتی کی طرف دیکھنے لگی۔ روپ دتی ایک بار پھر اپنے دل میں
ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔

نرملہ بولی: ”آج باقی دن میرا گھر رہنا ضروری ہے، ورنہ میں شرمگاہ آپ
سے بائیں رُک۔ آپ کیوں نہیں آئیں میرے ساتھ، چلیے آپ بیان لیں کیا کریں گی
ہم دونوں پاکی میں بیٹھ جائیں گی، آج ہمارے گھر سومات کے بڑے پروہت ہی

کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں۔ تشریف رکھیے۔“

نرملہ نے روپ دتی کی خادمہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم جاؤ اور یہ دروازہ بند
کر دو۔ میں ان سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

خادمہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا تو روپ دتی نے اور زیادہ سہمی ہوئی آواز
میں کہا: ”تنہائی کے لیے کچھلا کمرہ زیادہ موزوں ہو گا۔“

”چلیے!“

روپ دتی اور نرملہ عقب کے کمرے میں چلی گئیں۔ یہ کمرہ نسبتاً تاریک تھا۔
نرملہ اور روپ دتی آگے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ نرملہ خاموشی سے روپ دتی کی طرف
دیکھ رہی تھی اور روپ دتی کا دل دھڑک رہا تھا۔ بالآخر نرملہ نے اپنے گلے سے ایک
ہار اتارتے ہوئے کہا: ”میں کل آپ کو یہ نسخہ دینا بھول گئی تھی، لیجیے!“
”نہیں، یہ آپ کے گلے میں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔“

”میرے پاس اور بہت سے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میری شادی ہی
زیورات سے ہوئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نرملہ نے روپ دتی کے گلے میں ہار ڈال دیا۔
چند لمحات دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر نرملہ
نے کہا: ”آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں کافی مدت سومات کے مندر میں رہ چکی ہوں۔
آج مجھے پتہ چلا کہ آپ کے پتی اُسی محل میں ٹھہرے تھے جہاں میں رہتی تھی۔“

روپ دتی محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو رہی ہے۔ نرملہ
نے قد سے توقف کے بعد کہا: ”میرا خیال ہے کہ میں لے آپ کے پتی کو دیکھا تھا
وہاں اُن کا ایک دوست بھی تھا۔ اس کا نام زبیر تھا۔“

روپ دتی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: ”ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ
میں کبھی سومات نہیں گئی۔ میں کالج سے اُن کی تلاش میں آئی تھی۔ ہمارا تعلق ابھی سویتا

لیے مجھے پروہت کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو۔ اور مجھ سے کوئی پاپ بھی تو نہیں ہوا۔ تم یہ نہیں کہو گی کہ ایک عورت کے لیے اپنی عزت بچانا پاپ ہے۔“

ردپ دتی سسکیاں لے رہی تھی۔ زلزلے نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن! میں تمھارے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گی۔ لیکن مجھے بتاؤ تو سہی! یہ کیا راز ہے؟“

ردپ دتی نے کہا۔ ”یہ نہ پوچھو زللا! جھگوان کے لیے! یہ نہ پوچھو۔ تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں آئے گا۔ سچائی کا چہرہ تمھارے لیے اس قدر بھیاںک ہو گا کہ تم میری باتوں کو چننے کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اسے تمھارے کان برداشت نہیں کر سکیں گے۔ تم مجھے بچی کہو گی۔ تم میری دشمن بن جاؤ گی۔“

”تمھیں جھگوان کی سونگند مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمھاری مدد کر دوں گی۔ اگر تمام دنیا تمھیں جھوٹی کہے تو بھی مجھے تمھاری بات پر اعتبار ہو گا۔“

ردپ دتی نے زللا کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے اپنی سرگزشت شروع کر دی۔ ردپ دتی کی سرگزشت کے اختتام پر اسے بار بار تسلیاں دینے کے بعد جب زللا اس کے گھر سے نکلی تو اس کے خیالات کی دنیا میں ایک تلاطم اچکا تھا۔ سومات کے متعلق محبت اور عبادت کے جذبات جو اس کی منہموم زندگی کا آخری سہارا تھے انفرت اور حقارت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بوڑھے ٹھاکر کے ساتھ شادی کرنے کے بعد وہ زندگی کی آرزوؤں اور مسرتوں سے کنارہ کش ہو چکی تھی۔ اپنے باپ کی خواہشات پر قربان ہوتے ہوئے اُسے اگر کوئی اطمینان تھا تو یہ کہ میری اس قربانی سے دیوتا خوش ہوں گے۔ میری زندگی کے اداس لمحات اُن کی یاد سے معمور ہوں گے۔ میں ان پندتوں اور پروہتوں کی سیوا کروں گی۔ جو دن رات دیوتاؤں کی یاد میں گن رہتے

آہے ہیں۔ میں انھیں کہوں گی کہ وہ آپ کی صحت کے لیے پراگھنا کریں۔ چلیے!“
ردپ دتی کے لڑتے ہوئے ہونٹوں سے ”نہیں نہیں“ کی آواز نکلی اور وہ ایک بے جان شے کی طرح فرش پر گر پڑی

زللا ایک تانہ کے لیے بہوت سی ہو کر رہ گئی اور پھر بھاگتی ہوئی برآمدے میں گئی اور خادموں کو آوازیں نیسنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب ردپ دتی کو ہوش آ رہا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور زللا اس کے سر ہانے بیٹھی اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ بورھی خادمہ کے علاوہ چار عورتیں جن میں دو زللا کے ساتھ آئی تھیں اور باقی حویلی کے نوکرؤں کی بیویاں تھیں، اُس کے گرد گھڑی تھیں۔

ردپ دتی نے زللا کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ زللا کو ان خاموش نگاہوں میں اس بے گناہ مجرم کی فریاد سنائی دی، جس کے سر پر جلاؤ کی تلوار چمک رہی ہو۔ اس نے باقی عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”انھیں کمزوری کے باعث جکڑا گیا تھا، اب تم میں سے کسی کو یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔“

ردپ دتی نے ہاتھ کے اشارے سے زللا کی تائید کی اور تمام عورتیں باہر نکل گئیں۔ پھر اُس نے اچانک اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟“
زللا کے رعبے سے شکوک دُور ہو چکے تھے۔ اُس نے کہا۔ ”ردپ دتی! تمھیں مجھ سے اس قدر خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

ردپ دتی کی نگاہیں ایک بار پھر زللا کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ چند لمحات کے بعد اُس نے بے اختیار آگے جھک کر زللا کے پاؤں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”زللا! میں اپنے لیے نہیں رام ناٹھ کے لیے دم کی بھیک مانگتی ہوں اگر مجھ سے کوئی پاپ ہوا ہے تو اس کی سزا رام ناٹھ کو نہیں ملنی چاہیے۔ جھگوان کے

ہیں میں ٹھا کر کی دہانت سے غریبوں اور ناداروں کی مدد کروں گی۔ ورنہ مجھ پر خوش ہوں گے اور موت کے بعد میرا جہنم اس جہنم سے بہتر ہوگا۔ لیکن روپ ٲتی کی سرگزشت سننے کے بعد اس کے حسین تصورات کی دنیا بھی دیران ہو چکی تھی۔ اس کا حال اور مستقبل ایک لئ دوق میدان تھا اور ماضی کی طرت لوٹنا اُس کے لیے ناممکن تھا۔ اُس کی حالت اس سانفر کی سی تھی جو اپنی ساری پرکھی کھو بیٹھنے کے بعد راستہ بھی بھول چکا ہو۔

محل کے باہر نرا دن آدمی سومات کے پردہست کے انتظار میں کھڑے تھے۔ نرلا کی بالکی دیکھ کر وہ راستے سے اُدھر اُدھر ہٹ گئے اور بالکی محل میں پہنچ گئی نرلا بالکی سے باہر کھلی تو بہت سی عورتوں نے اُسے اپنے بھر مٹ میں لے لیا اور یہ پوچھنے کے لیے بے قرار تھیں کہ پردہست جی کیب پہنچیں گے۔ لیکن نرلا انھیں کوئی جواب دے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی بالائی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ گئی۔ تنہائی اور بے بسی کے شدید احساس کے باعث اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُٹ ایا۔

وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ ”نہیرا تم اپنی بہن کی خاطر دنیا کی تمام خوشیاں قربان کر سکتے ہو۔ تم ایک دوست کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال سکتے تھے تم نے میرے پتا کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہوئے اُس وقت معاف کر دیا تھا“ جب تمہارا خنجر اس کی گروں پر تھا۔ تم کا منی اور روپ ٲتی کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیا سکتے تھے۔ لیکن تمہاری نگاہیں میرے ل کی گہرائوں تک نہ پہنچ سکیں۔ تمہیں میری اجازت اور میرے آنسوؤں کا نہ کسکے۔ تمہیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ اب صرف تمہارا دل میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ کاش تم میرے آنسو دیکھ سکتے، میری آہیں سن سکتے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں روپ ٲتی سے کہیں زیادہ بے بس اور مجبور ہوں۔“

ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کھانے کے لیے پوچھا۔ لیکن نرلا نے کہا۔ ”آج مجھے بھوک نہیں۔“ تھوڑی دیر بعد ایک اور خادمہ آئی اور اس نے کہا کہ شہر کے چند معزز گھرانوں کی عورتیں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔ لیکن نرلا نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج میرے سر میں درد ہے۔“

خادمہ نے کہا۔ ”اگر آپ حکم دیں تو وہ کو بلا بھیجوں۔“

نرلا نے برہم ہو کر کہا۔ ”نہیں مجھے وید کی ضرورت نہیں، تم جاؤ اور سب لو کرانیوں سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔“

(۴)

غروب آفتاب کے قریب محل سے باہر سومات کی جے اور ”پردہست کی جے“ کے نعرے سنائی دیے۔ نرلا اپنی کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ محل کی چار دیواری سے باہر ایک کشادہ میدان میں انسانوں کے جھوم سے کچھ دور اُسے پچاس ساٹھ سواروں کا ایک دستہ دکھائی دیا۔ ان سواروں کے نیچے پندرہ بیس ہاتھیوں کی ایک قطار تھی۔ سب سے اگلے ہاتھی کا سنہری ہودج سورج کی آخری شعاعوں سے چمک رہا تھا۔

محل کے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر سواروں کا دستہ ایک طرف ہٹ گیا اور لوگ دیوانہ وار نعرے لگاتے ہوئے سب سے اگلے ہاتھی کی طرف بڑھنے لگے۔ اس ہاتھی کا ماتھا موتیوں اور ہیروں میں چھپا ہوا تھا۔ گالے میں سونے کی بھاری زنجیر تھی جس کے ساتھ گھنٹی لٹکی ہوئی تھی اور سنہری ہودج کے کناروں کے نیچے موتیوں کی جھالیں لٹک رہی تھیں۔ ہودج میں سومات کا پردہست براجمان تھا۔ بالی ہاتھیوں پر سومات کے بھاری تھکے اور اُن سے پیچھے سواروں کا دستہ اور

دوست دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پردہ ہٹا کر دکھونا تھ کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چند بچاری اور شہر کے معززین تھے۔ صحن میں جمع ہونے والی عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر اُس کے پاؤں چھونے لگیں۔

”دھوکا، جھوٹ، خریب“ زمر کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے اور وہ دوبارہ اپنی کرسی پر سر کر بیٹھ گئی۔

عورتوں کا جوش و خروش ختم ہوا تو ٹھکانے اپنے ہاتھ کے اٹلے سے لوگوں کو خاموش کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا: ”پردہ ہٹ گیا ہمارا ج بہت ٹھکے ہوئے ہیں۔ انھیں صبح سویرے یہاں سے کوچ کرنا ہے، اس لیے اب انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہمارا ج سے ملاقات کے بعد واپسی پر آپ یہاں دو تین دن ٹھہریں گے اور آپ سب کو ان کی سیوا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس لیے اب آپ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔“

زمر دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی۔ کمرے میں تاریکی چھا رہی تھی۔ ایک غامض اس کے کمرے میں آئی اور اُس نے چراغ روشن کرتے ہوئے کہا: ”آپ نے دن کے وقت کچھ نہیں کھایا، اگر اجازت ہو تو آپ کا کھانا لے آؤں گا۔“

زمر نے جواب دیا: ”ہاں لے آؤ۔ ٹھہرنا ٹھکانے کے لیے میرے متعلق تو کسی سے نہیں پوچھا۔“

”جی نہیں، وہ ابھی تک ادھر نہیں آئے، وہ ہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔“

”سائے ہمان یہیں ٹھہریں گے؟“

”جی نہیں۔ صرف پردہ ہٹ گیا اور چند بچاری یہاں ٹھہریں گے۔ باقی سب

ہمان خانے چلے گئے ہیں۔“

”اچھا اب تم کھانا لے آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد نوکرانی کھانا لے آئی، زمر چند نوالے کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر یکایک اکٹا ہٹ محسوس کرتے ہوئے اٹھی اور برابر کے کمرے میں جا کر ایک پلنگ پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھکانے کے کمرے میں داخل ہوا اور شکایت کے لیے میں بولا: ”زمر! تجھیں پردہ ہٹ گیا ہے سرگت کے لیے نیچے ضرور آنا چاہیے تھا۔“

”میرے سر میں درد تھا۔“ زمر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اور پھر اتنے آدمیوں کے سامنے جاتے ہوئے مجھے کچھ بھجک سی محسوس ہوتی تھی۔“

”شہر کے آدمیوں کو تو میں نے اُسی وقت بھیج دیا تھا۔ اب پردہ ہٹ گیا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تنہا ہوں گے۔ صرف میں نے کھانے پینا ہی کر رکھا ہے۔ پردہ ہٹ گیا ہے کچھ نا چھونا تمہارا فرض ہے انھوں نے خود کھانے پینے کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ تجھیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر بعد تجھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

ٹھکانے کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ پردہ ہٹ کر کھانا کھلانے کے بعد ٹھکانے پر آیا اور زمر کو کچھ کہنے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑی۔ سبکی منزل کے روشن کمرے میں چند موٹے ناشے بچاری جن کے سر منڈے ہوئے تھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ٹھکانے کے نوکران کی سیوا کے لیے دروازوں کے سامنے کھڑے تھے۔ پردہ ہٹ کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے زمر کے دل میں نفرت اور خفارت کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

پردہ ہٹ ایک زرد نگار چوکی پر آلتی پالتی مائے بیٹھا تھا۔ جسے کرشن اُس کے سامنے ایک کرسی پر ادب سے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ زمر چند تانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی پھر اس نے ٹھکانے کی پریشانی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے پردہ ہٹ

کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنے باپ کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ بے کرشن اُس کا بازو پکڑ کر طہری سے اٹھا اور اُسے پردہت کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا "پردہت جی ہماراج کے پاؤں چھو۔" راجے اور ہماراجے سب ان کے دروازے کے بھکاری ہیں۔"

نرملہ نے مجبوری اور بے بسی کی حالت میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ پردہت کے پاؤں پر رکھ دیے اور پردہت نے بے پردائی سے ایک ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا "کبھی رہو بیٹی!"

نرملہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اٹھانے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "آج ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔"

پردہت نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھے ٹھا کر جی اتم بھی بیٹھ جاؤ بیٹی!"

نرملہ پیچھے ہٹ کر اپنے باپ کے قریب بیٹھ گئی اور ٹھا کر اُس کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹھا کرنے کہا "ہماراج! نرملہ ہر روز آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔" پردہت نے نرملہ کے سر پر ہاتھ پڑھائے ہوئے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا "لیکن آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیں دیکھ کر ڈر گئی ہے۔"

ٹھا کرنے جواب دیا "ہماراج! کبھی کبھی دیوتاؤں کا پریم بچاریوں کے دل میں خوف بھی پیدا کر دیتا ہے اور نرملہ تو بات بات پر خوفزدہ ہو جایا کرتی ہے۔ پرسوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ ہمارے ایک نئے جاگیردار کی بیوی عرصہ سے بیمار تھی۔ پرسوں وہ نرملہ کے لیے شادی کا تحفہ لے کر آئی۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے"

نرملہ نے انتہائی خوف اور اضطراب کی حالت میں ٹھا کر کی طرف دیکھا اور

گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے کہا "اس وقت ہماراج کو آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں"

پردہت نے اطمینان سے کہا "میں ٹھا کر جی کو اپنی بات ختم کرنے دو۔" نرملہ کا دل بیٹھ گیا۔ ٹھا کرنے کہا "میں نے ان سے پوچھا آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ کہنے لگیں جو لڑکی ابھی مجھ سے مل کر گئی ہے۔ اس کی شکل سومات کے مندر کی اس دیوی سے ملتی ہے جو پہلی رات ہی دیرانے کے چرنوں میں پہنچ جانے کے باعث ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکی ہے۔"

پردہت پر سکتہ طاری ہو چکا تھا، لیکن نرملہ کے سوا اُس کے دل کی صحیح کیفیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ ٹھا کرنے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ہماراج! دنیا میں کئی انسانوں کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں اور دیکھنے والا اکثر دھوکا کھا جاتا ہے لیکن نرملہ کو تو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مندر کی دیوی ہے اور ایک نئے روپ میں اُسے دیکھنے آئی ہے، پھر میں نے جب سمجھا یا کہ اس لڑکی کا نام روپ دتی نہیں ساوتری ہے اور وہ سومات سے نہیں بلکہ کالج سے آئی ہے تو بڑی مشکل سے ان کی غلط فہمی دور ہوئی۔" بے کرشن نے اچانک پردہت کی طرف دیکھا اور گہرائی ہوئی آواز میں کہا "کیا ہوا ہماراج آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

پردہت کی چہرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کے آٹا بخودار چھٹے اور اس نے نحیف آواز میں کہا "میں میں ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیا کہہ رہے تھے، یہی کہ کسی لڑکی کی شکل روپ دتی سے ملتی ہے؟"

"میں نہیں ہماراج! نرملہ کو شک ہوا تھا اور یہ ڈر گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ نرملہ نے روپ دتی کو سومات میں دیکھا ہوگا۔ لیکن اس میں ڈر

کی کیا بات تھی۔ کئی صورتیں آپس میں ملتی ہیں۔"

”ہاں مہاراج! جب میں نے اسے سمجھا تو وہ خود ہی مان گئی کہ یہ لڑکی روپے لے
سے مختلف ہے۔“

”اور وہ لڑکی ہمیں رہتی ہے۔“

”ہاں مہاراج!“

”اپنے پتی کے ساتھ!“

”ہاں مہاراج! لیکن آجکل اس کا پتی مشرقی سرحد پر اپنی جاگیر دیکھنے گیا ہوا ہے
لڑکی چونکہ بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ تھی، اس لیے وہ اسے ہمیں چھوڑ گیا
ہے۔“

”کب آیا ہوا تھا ان کا؟“

”اس بات کا مجھے صحیح علم نہیں، لیکن اس لڑکی کا پتی یہ کہتا تھا کہ وہ سومات
کی یا تر اپر جانے سے پہلے شادی کر کے آیا تھا۔“
”تو وہ اس شہر کا رہنے والا نہیں؟“

”نہیں مہاراج! وہ تہذیب کا باشندہ ہے۔ جب وہ سومات کی طرف جا رہا
تھا تو راستے میں اسے ہمارے مہاراج شکار کھیلے ہوئے مل گئے تھے۔ اس نے مہاراج
کی جان بچائی تھی۔ مہاراج اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔“

”تھیک ہے۔ ایسے آدمی کی عزت کرنی چاہیے۔ کیا نام ہے اس کا؟“
”رام ناٹھ!“

نرملاکا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی خطرے کو سر نہ دیکھ کر اس
کی مدافعت وقتیں بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے کہا ”مہاراج! اٹھا کر جی مجھ پر ہنستے ہیں
لیکن اگر آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو معمولی فرق کے سوا وہ آپ کو روپے لے دیکھائی دیگی۔
وہ معمولی فرق بھی دور سے نہیں نزدیک سے دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ ٹھہرتے تو میں صبح

ہونے ہی اسے بلالیتی۔“

پردہ مت نے ایک کھلی ہتھی ہتھ پتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں دیکھنے کی کوئی ضرورت
نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک ہی روپے والی لکھی۔ اب تم جا کر آرام کرو۔
جے کرشن تم بھی جاؤ۔ ٹھاکر جی آپ ذرا ٹھہریں۔“

(۵)

نرملاکے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پردہ مت ٹھاکر سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ٹھاکر
کو دماغ سے نکالنے کے لیے اسے ایک ہی تدبیر نظر آئی۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر
دوقین قدم اٹھائے اور پھر اچانک اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا لے ہوئے فرش پر بیٹھ
گئی ٹھاکر گھبرا کر اٹھا اور جے کرشن نے جلدی سے اس کے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے
کہا۔ ”کیا ہوا بیٹی؟“

”مجھے چکر آگیا تھا میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“ نرملانے کو کہتے ہوئے جواب دیا
ٹھاکر بھی گھبرا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے نرملاکا دوسرا بازو پکڑتے ہوئے پردہ مت کی طرف
دیکھا اور کہا۔ ”میں ابھی ادھر پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔“

پردہ مت نے جواب دیا۔ ”ہاں، اہلیئے، اور دیکھیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں
ہم ان کے لیے مہادیو سے پرانہ ٹھکانا کریں گے۔“

نرملاکا ایک طرف ٹھاکر اور دوسری طرف جے کرشن کا سہارا لیے کمرے سے باہر
نکلے اپنی چال سے وہ ابھی اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس پر ہوشی
طاری ہو رہی ہے۔ لیکن بیڑھیوں کے قریب پہنچ کر وہ سنبھلنے کی کوشش کرتے لگی۔
چند بیڑھیاں پڑھنے کے بعد جے کرشن نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ ”ٹھاکر جی میں اسے
ادھر لے جاتا ہوں، آپ کسی دیکھو بلائیں۔“

۴۴۴

”میں ابھی ملتا ہوں“ ٹھاکر یہ کہہ کر نیچے اتر گیا۔

نرملہ اچانک اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لے ہوئے۔ ”پتا جی، جلدی اور چلیے۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“

جے کرشن انہماکی پر حواسی کی حالت میں بڑی مشکل سے اس کی رفتار کا ریت دے رہا تھا۔ ملا اسے ایک کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کرتے جیسے بولی۔ ”پتا جی! مجھے ابھی اپنے ساتھ گھر لے چلیں۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ بھگوان کے لیے ٹھیک کر جی کر اور پر بلا لائیں۔ آپ ان سے کہیں کہ دید کو بلائے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کئی بار اس کم کا درد ہوا ہے اور اس کی دوا ہمارے گھر میں موجود ہے۔ لیکن نکرنا یاد تلاش نہ کر سکیں۔ آپ کو خواہ کتنی بہانہ کرنا پڑے۔ لیکن مجھے اپنے ساتھ ضرور لے جائیں ورنہ کل آپ میری لاش دیکھیں گے۔“

”لیکن مٹی! مجھے بتاؤ تو سہی۔۔۔۔۔“

نرملہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کے لیے اس وقت آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ مجھے یقین ہے کہ باہر نکل کر میں آپ کی تسلی کر سکوں گی۔ بھگوان کے لیے جائیے!“

جے کرشن کی پریشانی اب اضطراب میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف چلنے لگا۔ برآمدے میں جگہ جگہ چراغ روشن تھے جے کرشن سیڑھیوں سے ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ اُسے ٹھاکر دکھائی دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ ٹھاکر نے سوال کیا۔

”میں آپ کو بلائے جا رہا تھا۔ نرملہ کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔“

ٹھاکر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دید کو بلائے کے لیے

آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی آجائے گا۔“

۴۴۵

جے کرشن نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ آدمی کو واپس بلا لیں۔ نرملہ کو پہلے بھی کئی بار تکلیف ہو چکی ہے میں نے ایک سنیاسی سے اُس کے لیے دوا لی تھی۔ اُس دوا سے اسے فوراً نیند آجایا کرتی ہے۔ مجھے نرملہ نے بتایا ہے کہ اُس دوا کی چند گولیاں اُس نے گھر میں کہیں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”تو آپ فوراً گھر جا کر دوا لے آئیں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ مجھے آنے جانے اور پھر دوا تلاش کرنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ نرملہ کہتی ہے کہ اس نے دوا کسی صندوق میں رکھی ہوئی ہے اب مجھے معلوم نہیں وہ کون سا صندوق ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ نرملہ کو ساتھ لے جاؤں، اس وقت اس کی حالت کچھ ٹھیک ہے لیکن ایک دو گھنٹیاں

گزرنے کے بعد اسے پھر دورہ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے فوراً گھر پہنچا دیا جائے۔ اگر دوا مل گئی تو کھاتے ہی اسے نیند آجائے گی۔ ورنہ وید

کا گھر ہمارے نزدیک ہے جس سے دواں بالوں گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ پر دہشت جی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس لیے مجھے اجازت دیں۔“

”آپ کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ نرملہ کو تیار کریں۔ میں ابھی پالکی کا انتظام

کر دیتا ہوں۔ پر دہشت جی سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد میں خود آپ کے ہاں آکر اُس کا پتہ کر دوں گا۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”نہیں آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں

آپ کو پیغام بھیج دوں گا ورنہ آپ آرام کریں۔“

”اگر ایسے آرام آجائے تو بھی آپ مجھے پتہ دیں۔ اب میں نیچے جا کر بالکی تیار کر آتا

ہوں آپ نرملہ کو نیچے لے آئیں۔“

تھوڑی دیر بعد نرملہ بالکی میں سوار ہو کر اپنے گھر کا رخ کر رہی تھی اور جے کرشن

اس کے ساتھ پیدل چل رہا تھا:

پکارا جاتا تھا:

”تمہارا مطلب ہے کہ روپ دتی زندہ ہے؟“

”ہاں! اور اب جب کہ پروہت کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اس شہر میں ہے وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس وقت وہ ٹھاکر سے اُس کے متعلق مشورہ کر رہا ہوگا۔ اب باتوں کا وقت نہیں، ہمیں اُس لڑکی کو اُس کے گھر سے نکالنا ہے اور ہمیں رام ناتھ کو بھی یہ پیغام بھیجنا ہے کہ اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں روپ دتی کی سرگزشت سن چکی ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر پروہت میرے ساتھ وہی سلوک کرنا جو اُس نے روپ دتی کے ساتھ کیا ہے تو آپ سومنات کے مندر کی اینٹ سے اینٹ بجائے کے لیے تیار ہو جائے۔ روپ دتی دیر تک کے چرنوں میں نہیں پہنچی، بلکہ پروہت سے اپنی عزت بچا کر یہاں آئی ہے، اور اُسے اس دیوتا نے بچایا ہے جس نے اپنے باپ کے قاتل کی گردن پر تلوار رکھنے کے بعد اُسے معاف کر دیا تھا۔ جس نے مجھ سے اپنی بہن کا انتقام لینے کی بجائے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا تھا۔ تیا جی! آپ کو زندگی میں نیکی کا ایک موقع ملا ہے، اُسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ میں اُسے یہاں لے آئی ہوں، آپ گھوڑے تیار کرانیں۔ ایک نوکر کو اس کے ہمراہ بھیج دیں اور دوسرے کو رام ناتھ کی طرف روانہ کر دیجیے۔ میں روپ دتی کو بلا لاتی ہوں۔“

”نہیں نہیں!“ جے کرشن نے زلکا کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں۔ اُس کے نوکر تھیں بچپان لیں گے اور اگر تم روپ دتی کو نکال بھی لائیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں پروہت کے انتقام سے نہیں بچا سکے گی۔“

”تیا جی! جھگوان کے لیے مجھے نہ رد کیے۔ اگر میں روپ دتی کو نہ بچا سکی تو میں ساری دنیا کو یہ بتاؤں گی کہ اُسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ میں ٹھاکر اور

(۶)

اپنے مکان کی ڈیڑھ سی کے قریب جے کرشن نے کہا روں کو روکا اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن نرملا نے کہا: ”تیا جی! اٹھریے، پالکی کو اندر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہیں اُتر دوں گی۔“

جے کرشن نے مڑتے ہوئے کہا: ”اچھا بھئی! ہمیں انار دود اور تم جاؤ۔“

جب کہرام زلکا کو انار کا خالی پالکی اٹھانے لگے تو جے کرشن نے اپنی جیب سے چند سکنے نکال کر ایک کہار کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”انھیں آپس میں بانٹ لینا۔“ کہار تارکی میں غائب ہو گئے اور نرملا اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ڈیڑھ سی سے ذرا دور لے گئی اور کہنے لگی: ”تیا جی! ہمیں اپنے مکان میں داخل ہونے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہے۔“

جے کرشن نے کہا: ”اب صاف بات کرو۔ تم کیا چاہتی ہو۔“

نرملا نے کہا: ”تیا جی! میں آپ کے لیے اپنا بلیڈن دے چکی ہوں۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ میں اس کے بدلے میں آپ کچھ نہیں مانگوں گی لیکن آج میں آپ کے سامنے اپنی بھولی پھیلانے کے لیے مجبور ہوں۔ اپنے لیے نہیں کسی کے لیے۔ میری ذرا سی غلطی سے دو انسان موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ آپ انھیں بچا سکتے ہیں، لیکن اگر آپ نے کچھ نہ کیا تو مجھے آپ اُن کی پتا میں کودنے سے نہیں روک سکیں گے۔“

جے کرشن نے کہا: ”تم رام ناتھ اور اُس کی بیوی کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں! ساوتری وہی ہے جسے سومنات کے مندر میں روپ دتی کے نام سے

راجہ کے سامنے پردہست کا جرم ثابت کر دوں گی۔ میں بھانتی ہوں کہ یہ میری بولیاں
نورچنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں۔“

جے کرشن نے کہا: ”تم مذہبی کو کہاں بھیجنا چاہتی ہو؟“
”اس کے لیے قلعہ میں۔ زبیر کے گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ اسے
صرف سرجر جبر کرنے تک خطرہ ہوگا!“

جے کرشن نے کہا: ”میں پیارے لال کو اس کے ساتھ بھیج سکتا ہوں لیکن
اس وقت اسے گھر سے بچانا آسان نہیں۔ میں اس کے نوکروں کو دھوکا دینے کے
لیے ایک عام سپاہی کا جیس بدل کر اس کے گھر جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں
نوکر دوں سے کہوں گا کہ مجھے رام ناتھ نے ایک غروری پیغام دے کر بھیجا ہے،
لیکن اسے یہ کیوں کر یقین آئے گا کہ میں اس کی جان بچانے کے لیے آیا ہوں؟“
نرمانے اپنے اٹھنے سے کنگن اتار کر جے کرشن کو پتے پتے کہنے لگا: ”یہ کنگن
دکھانے کے بعد آپ جو بات اسے کہیں گے وہ مان جائے گی۔ یہ اسی نے مجھے
دیے تھے۔ میں مکان سے باہر کھڑی رہوں گی۔“

جے کرشن نے کنگن جیسے ہوئے کہا: ”اب تم میرے ساتھ آؤ۔ پہلے ہمارا
گھر جانا ضروری ہے جیسب گدان کرے اب ہمیں تھوڑا سا وقت مل جائے۔“
وہ تیزی سے چلتے ہوئے ڈیڑھ کی طرف بڑھے۔ جے کرشن نے پہرہ کو آواز
دی: ”اُس نے دروازہ کھول دیا۔ ڈیڑھ کی کے اندر مشعل جل رہی تھی۔ جے کرشن
نے اندر داخل ہوتے ہی پہرے دار سے پوچھا: ”پیارے لال کہاں ہے؟“
”جی ہمارا ج! وہ تو شاید سو گیا ہے۔“

”ابھی سے سو گیا ہے۔ جاؤ اُسے جگا کر یہاں بھیجو، اور اس کی جگہ آج تم آرام
کرو۔ وہ یہیں پہرا ہے گا اور اگر بند رام کو بھی یہاں بھیج دو۔“

بہت اچھا انداز! ”نوکر یہ کہہ کر چلا گیا۔“

جے کرشن نرمان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم جلدی سے اندر جا کر اپنے لیے کوئی پُرانی
اڈھنی لے آؤ۔“

نرمان بھاگتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سر پر ایک
پھیٹی پُرانی اڈھنی لیے واپس آئی تو جے کرشن، پیارے لال کے ساتھ اپنے کپڑے
تبدیل کرنے کے بعد اپنے سر پر اُس کی میلی کچیلی پگڑی لپیٹ رہا تھا۔ دوسرا نوکر
گو بند رام حیرت زدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”چلیے پیاجی! بہت دیر ہو گئی ہے۔“ نرمان نے بے قرار سی ہو کر کہا۔
جے کرشن نے نوکر مل کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے
ہیں۔ تم تین گھوڑے تیار کرو اور ایک لمبے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ باقی نوکروں کو
یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ اگر مصطل کی طرف کوئی نوکر ہتھوڑے
دوسری طرف بھیج دینا۔“ جے کرشن، نرمان کے ہمراہ باہر نکل گیا اور نوکر انتہائی
بدحواسی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

پیارے لال جے کرشن کے پرانے نوکروں میں واحد آدمی تھا جس نے مصباح
کے زمانے میں اُس کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے باقی ساتھی ایک ایک
کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ وطن کی یاد اُسے بھی سنایا کرتی تھی لیکن زبیر کا خوف اُس
کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ زبیر کے گاؤں سے کچھ دور اس کے بھائی اور دوسرے
رشتہ دار رہتے تھے۔ اور وہ اس امید پر جے کرشن کا ساتھ دے رہا تھا کہ کسی دن وہ دوبارہ اپنے
علاقہ پر قبضہ کر لے گا اور اُس کے لیے اپنے گاؤں جانے کا راستہ کھل جائے گا۔

گو بند رام، گویا رام فرما کے ماموں کے ہاں ملازم تھا اور نرمان اسے اپنے
ساتھ لے آئی تھی۔

”آپ جاگ رہی ہیں دیوہی؟“ بھوکیدار کی آواز تھی۔

”ہاں، کیا بات ہے؟“

بھوکیدار نے کہا: ”باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ میں سردار رام ناتھ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

روپ دتی جلدی سے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکل آئی۔ ”آدمی اُن کا پیغام لے کر آیا ہے اور تم نے اُسے باہر روک دیا ہے؟“

”اسی وقت کسی کو اندر بلانے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔“

”وہ اکیلا ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سردار کا پیغام صرف آپ کے لیے ہے۔“

”اچھا اُسے لے آؤ اور دیکھو ہوشیار رہنا۔“

”آپ فکر نہ کریں!“

بھوکیدار یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ روپ دتی برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی تھی۔ جب وہ قریب پہنچے تو وہ پیچھے ہٹ کر دروازے کے سامنے روشنی میں کھڑی ہو گئی۔

اجنبی نے کسی ٹھیکہ کے بغیر کہا: ”مجھے سردار رام ناتھ نے بھیجا ہے۔ میں آپ کے لیے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔ شہر سے چند کوس دور میرے گھوڑے نے گر کر دم توڑ دیا تھا ورنہ میں شام سے پہلے یہاں پہنچ جاتا۔“

”وہ کب آئیں گے؟“

”وہ جلد آجائیں گے۔“

”اور پیغام کیا بھیجا ہے اُنھوں نے؟“

اجنبی نے مڑ کر بھوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”مجھے کسی کے سامنے بات

مددگار

روپ دتی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی، لیکن اُس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور کہا: ”آپ ابھی تک نہیں سوئیں؟“

روپ دتی نے جواب دیا: ”مجھے نیند نہیں آتی۔“

”دیا بھادوں؟“

”نہیں نہیں! میں خود بچھا لوں گی!“

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”نہیں! تم جا کر سو جاؤ!“

خادمہ ساتھ ملے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد روپ دتی اُس کے خراٹے سن رہی تھی۔ وہ دیر تک بستر پر پڑی رہی۔ پھر اچانک اسے باہر صحن کی طرف کسی کی آواز سنائی دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بھوکیدار کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اسے برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔

”کون ہے؟“ اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لے لو۔ راستے میں کام آئے گا اور دیکھو تمہارے پہرے دار کو بھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم باہر جا رہی ہو۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ تمہارے اصطبل میں گھوڑا تو ہوگا؟“

”ہاں اصطبل میں تو ایک کی بجائے تین گھوڑے موجود ہیں۔“

”تو تم میرے ساتھ چلو اور پہرے دار سے کہو کہ مجھے واپس جانے کے لیے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ جب وہ اصطبل کی طرف جائے گا تو تمہیں باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ ہی سمجھے گا کہ تم کمرے میں جا چکی ہو۔ حویلی کے پیچھے تمہیں نظر ملے گی، تم اس کے ہمراہ گھر پہنچ جاؤ۔ میں گھوڑا لے کر وہاں آ جاؤں گا۔ اگر پہرے دار کسی اور نوکر کو جگمانے کی کوشش کرے تو اسے منع کر دینا۔“

روپ وتی نے لنگن بچے کرشن کو واپس دے دیے اور ایک صندوق سے اپنے زیورات اور سونے کے سکوں کی ایک تھیلی نکالنے کے بعد بچے کرشن کے ساتھ باہر نکل آئی۔ چونکہ اردو ڈیوڑھی سے باہر صحن میں کھڑا تھا۔ روپ وتی نے اسے کہا: دیکھو انہیں ابھی واپس جانا ہے۔ اس لیے اصطبل سے ایک گھوڑے پر زین ڈال کر ان کے لیے لے آؤ۔ کسی اور کو ان کے آنے جانے کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں بہترین گھوڑا دینا ورنہ سردار خفا ہوں گے اور دیکھو دوسرے نوکر وں کو جگمانے کی ضرورت نہیں۔“

روپ وتی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی اور پہرے دار نے اصطبل کا رخ کیا۔ جب پہرے دار آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو روپ وتی بھاگتی ہوئی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ بچے کرشن نے جلدی سے کنڈی کھولی اور بھاری کواڑ کھینچ کر روپ وتی کو باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے پھر اسی طرح کواڑ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

کرنے کی اجازت نہیں۔“

روپ وتی کے اشارے سے سربوکیدار ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا اور اجنبی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی جیب سے دو لنگن نکالے اور روپ وتی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ لیجئے!“

”یہ انہوں نے بھیجے ہیں؟“

اجنبی نے کہا: ”آپ اندر دیے کے قریب جا کر انہیں غور سے دیکھ لیں، پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس نے بھیجے ہیں۔“

روپ وتی نے لنگن لے لیے اور انہیں دیکھتی ہوئی کمرے میں دیے کے قریب پہنچی۔ ایک ثانید کے لیے اس کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ اجنبی آگے بڑھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں بچے کرشن ہوں۔ نرمل کا باپ۔ نرمل نے مجھے یہ نشانی اس لیے دی تھی کہ شاید تم مجھ پر اعتبار نہ کرو۔ نرمل اس حویلی کے پیچھے کھڑی ہے۔ وہ اس لیے اندر نہیں آئی کہ تمہارے نوکر اسے پہچان لیں گے۔ اگر تم اپنی اور رام ناٹھ کی جان بچانا چاہتی ہو تو میرے کہنے پر عمل کرو۔ ورنہ تمہارے ساتھ میری اور نرمل کی بھی خیر نہیں۔ بروہت کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم روپ وتی ہو اور شاید تھوڑی دیر میں اس کے سپاہی اس حویلی کا محاصرہ کر لیں۔ اب سوچئے کا وقت نہیں، میں تمہیں یہاں سے نکالنے کا انتظام کر چکا ہوں۔“

”لیکن رام ناٹھ!“ روپ وتی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

بچے کرشن نے اس کے قریب جا کر کہا: ”اگر تم یہاں سے نکل گئیں تو ممکن ہے کہ میں رام ناٹھ کی بھی جان بچا سکوں۔ ورنہ تمہاری گرفتاری کے متعلق سن کر وہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اب جلدی یہاں سے نکلو۔ صرف اپنا زلیہ

جے کرشن بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ روپ وتی گھوڑے پر سوار ہو گئی۔
تھوڑی دیر بعد گوبند رام اور بے کرشن آگئے۔ گوبند رام ایک گھوڑے کی باگ تھامے
ہوئے تھا۔

جے کرشن نے کہا: ”گوبند رام! تمہاری منزل تنوچ کا وہ گاؤں ہے جو کبھی
میرا تھا۔ اس دیوی کی عزت کے دشمن اس کا بیچھا کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے
کہ تم جلد سرحد عبور کر جاؤ۔“

نرملانے کہا: ”بتا جی! میں اس دیوی کو سب سمجھا چکی ہوں۔ اس لیے آپ
انہیں اجازت دیں۔“ پھر وہ گوبند رام کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”یہ چا گوبند! اس کی
عزت کو میری عزت اور اس کی جان کو میری جان سمجھنا۔“

اچانک جے کرشن کے دل میں کوئی خیال آیا اور اس نے آگے بڑھ کر روپ وتی
سے کہا: ”تم اپنے جی کے لیے کوئی ایسی نشانی دے سکتی ہو جسے دیکھ کر وہ میرے
اچھی کی باتوں پر یقین کر لے؟“

”ہاں! وہ میری انگوٹھی پہچان لیں گے۔“ روپ وتی نے یہ کہہ کر اپنی انگوٹھی
اتاری اور بے کرشن کے ہاتھ میں دے دی۔

(۳)

تھوڑی دیر بعد روپ وتی اور گوبند رام رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے۔
جے کرشن نرمل کے ساتھ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو وہاں پیارے لال
دو گھوڑوں کی باگیں پکڑے پریشان کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ”مہاراج
گوبند کہاں گیا ہے؟“

”میں نے اسے کسی کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔“ جے کرشن نے اُسے ٹالنے کی
غرض سے کہا۔

(۲)

تھوڑی دیر بعد حویلی کے پیچھے روپ وتی نرمل کے ساتھ جے کرشن کے مکان
کا رخ کر رہی تھی۔ نرمل اس کی تسلی کے لیے کہہ رہی تھی: ”وہ لو کہ جسے میں تمہارے
ساتھ بھیج کر رہی ہوں، بہت وفادار ہے۔ اس نے ساری عمر گوالیار میں میرے
ماموں کے ہاں گزاری ہے۔ میں اُسے وہاں سے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ بتا جی
رام ناٹھ کو خبردار کرنے کے لیے دوسرا لو کہ بھیج دیں گے۔ بھگوان تمہاری مدد کر
رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رام ناٹھ تمہیں آئے گا۔ تم رات بھر سفر کرنا اور دن کے
وقت کسی جنگل میں آرام کر لینا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری صحت ٹھیک نہیں۔
اگر کہیں ٹھہرنے کی ضرورت پڑے تو شہروں کی بجائے کسی چھوٹی بستی میں قیام
کرنا۔ سرحد میں داخل ہونے کے بعد تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“

روپ وتی نے تشکر کے آنسو بہاتے ہوئے کہا: ”نرمل! تم دیوی ہو بھگوان
کے لیے تم رام ناٹھ کو ضرور خبردار کر دینا۔“
”تم فکر نہ کرو!“

روپ وتی نے کہا: ”نرمل! مجھے رام ناٹھ تمہارے دل کا حال بتا چکا ہے تم
رنبیر کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو؟“

”ہاں! اسے صرف یہ بتا دینا کہ نرمل جس سے تم نفرت کرتے تھے، مڑ چکی ہے۔“
مکان کے قریب پہنچ کر انہیں پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور وہ
مڑ کر دیکھنے لگیں۔ جے کرشن نے گھوڑا روک کر اترتے ہوئے کہا: ”روپ وتی! تم
اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ نرمل! تم اس کے پاس ٹھہرو، میں ابھی گوبند رام کو لے
کر آتا ہوں۔ مجھے پیار سے لال پر اعتبار ہے لیکن اُسے ان سب باتوں کا علم نہیں
ہونا چاہیے۔“

”میں نے دو گھوڑوں کی ٹاپ سٹی ہے، اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“
 ”ہاں! اس کے ساتھ ایک اور آدمی گیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم سردار رام ناتھ کو جانتے ہو؟“
 ”وہ جنھیں سرحد پر جاگیر ملی ہے؟“

”ہاں!“

”میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”وہ اپنی جاگیر دیکھنے گئے ہیں اور میں تھیں ان کے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم سیدھے مشرق کی طرف جاؤ۔ جب دیونگر پہنچو گے تو وہاں سے پندرہ کوس آگے دریا کے کنارے جو بستیاں ہیں، وہ رام ناتھ کی جاگیر ہیں۔“
 پیارے لال نے کہا: ”جی میں اُسے تلاش کر لوں گا۔ اس علاقے میں نیا جاگیر دار کافی مشہور ہو چکا ہوگا۔“

”یہ لو!“ جے کرشن نے پیارے لال کے ہاتھ میں روپ دتی کی انگوٹھی دیتے ہوئے کہا: ”یہ اُسے دینا اور میری طرف سے کہنا کہ جس لڑکی نے تجھیں یہ انگوٹھی بھیجی ہے وہ قنوج روانہ ہو چکی ہے۔ اس لیے تم شہر واپس جانے کی بجائے قنوج میں اپنے دوست کے پاس پہنچ جاؤ۔“

نرملانے کہا: ”نہیں پتا جی! اس کی تسلی کے لیے یہ کافی نہیں ہوگا میں اسے ایک خط لکھ دیتی ہوں۔“

”اپنی طرف سے؟“

”میں اپنا نام نہیں لکھوں گی لیکن وہ سمجھ جائے گا کہ میں کون ہوں؟“

”لیکن اگر تمھارا خط پکڑا گیا تو؟“

”اگر پکڑا گیا تو بھی اُس لڑکی کے دشمن ٹھا کر کے سامنے میرے منہ سے یہ سننا

پسند نہیں کریں گے کہ میں نے یہ خط کیوں لکھا ہے۔“
 جے کرشن نے بے بس سا ہو کر کہا: ”نرمل! جو جی میں آئے کرو۔ آج میری عقل کام نہیں کرتی۔ تم نے مجھے ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا ہے جس سے باہر نکلنا میرے بس کی بات نہیں۔“

”نہیں پتا جی! آج میں آپ کو آکاش کی بلند یوں پر دیکھ رہی ہوں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں، میں ابھی آتی ہوں اور دیکھیے اب اپنا لباس پہن لیجیے۔“
 نرمل مکان کے اندر چلی گئی۔ جے کرشن نے پیارے لال کے ساتھ دوبارہ اپنا لباس تبدیل کیا اور ڈیوٹھی سے باہر نکل کر صحن میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پیارے لال کے قریب آکر کہا: ”تم دردازے کی کنڈی لگا دو اور اگر کوئی باہر سے دستک دے تو دردازہ کھولنے سے پہلے گھوڑے اسٹبل کی طرف ہانک دینا۔ میں ابھی اتنا ہوں۔“

(۴)

نرمل ایک کمرے میں بیٹھی خط لکھ رہی تھی۔ خادمہ نے دردازے سے بھانکتے ہوئے کہا: ”میں آپ کے تینوں صندوق دیکھ چکی ہوں، مجھے کوئی دوا نہیں ملی۔“
 نرملانے کہا: ”شاید میں نے پتا جی کے صندوق میں رکھ دی ہو۔ تم سو جاؤ، میں اُٹھ کر خود تلاش کرتی ہوں۔“

خادمہ چلی گئی اور اس سے تھوڑی دیر بعد جے کرشن کمرے میں داخل ہوا۔
 نرملانے کہا: ”پتا جی! میں خط لکھ چکی ہوں۔ دیکھیے!“

جے کرشن نے آگے بڑھ کر خط اٹھا لیا اور چراغ کی روشنی میں کھڑے ہو کر پڑھنے لگا۔ نرمل کے خط کا مضمون یہ تھا:-

و بھیا رام ناٹھ!

جب تم اپنی سے بوجھو گے کہ میں کون ہوں اور کس کی بیٹی
ہوں تو تمہاری تسلی ہو جائے گی کہ میں جو کچھ کھ رہی ہوں بھوٹ نہیں
روپ دتی کا بھید کھل گیا ہے، اس میں کچھ میری غلطی تھی۔ وہ دشمن
جس کے قبضے سے تم نے اُسے نکالا تھا، اس شہر میں اُسے تلاش
کر رہا ہے۔ روپ دتی کہتی تھی کہ زمین نے اُسے بہن کہا تھا۔ میں
اُسے زمین کی طرف روانہ کر رہی ہوں۔ اس لیے تم بھی وہاں پہنچ
جاؤ۔ واپس آئے تو تمہاری جان خطرے میں ہے۔ اپنی ہمارا پرانا
لوکر ہے اور میں اس کے ہاتھ خط کے علاوہ روپ دتی کی ایک
نشانی بھی بھیج رہی ہوں۔

تمہاری ایک بہن

جے کرشن نے جھنجھلا کر نرملا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر تم خط کے نیچے اپنا
نام بھی لکھ دیتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا۔“

”کچھ نہیں“ نرملا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”جی! اگر میں اپنا نام
بھی لکھ دوں اور یہ خط پکڑا بھی جائے تو بھی تمہارے سامنے میری شکایت کرنے
سے پہلے پروہت کو یہ بانٹنا پڑے گا کہ سادھنری روپ دتی ہے اور اس نے اس
کے بائے میں جو کچھ مشہور کیا ہے وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا اور یہ بات
ایسی ہے جو پروہت کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پیارے لال اس
خط کو حفاظت سے پہنچا دے گا۔ آپ صرف اُس سے انعام کا وعدہ کر دیں۔“

جے کرشن نے لاجواب سا ہو کر کہا۔ ”جلو اب جلدی کرو!“

وہ دونوں ڈیڑھ ہی میں آئے۔ جے کرشن نے پیارے لال کو خط دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو پیارے لال! جیب تم واپس آؤ گے تو میں تمہاری دونوں ٹھیلیاں مونے سے
بہر دوں گا۔ یہ خط رام ناٹھ کے سوا کسی کو نہ دکھانا۔“

نرملا نے کہا۔ ”اور میں تمہارے کچھ زمین بھی دلا دوں گی تاکہ تم اطمینان سے
اپنی زندگی بسر کر سکو۔ رام ناٹھ اگر تم سے میرا اور پتا جی کا نام پوچھے تو بتا دینا۔“
جے کرشن نے کہا۔ ”لیکن یہ خط رام ناٹھ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں آ گیا تو میں
تمہاری کھال اتروا دوں گا۔ اب شہر سے جلدی باہر نکل جاؤ۔“

پیارے لال نے دروازہ کھولا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج!
”دوسرے گھوڑے پر کون جائے گا۔“

جے کرشن نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”دوسرا گھوڑا یہیں
رہے گا۔ بھگوان کے لیے اب جاؤ۔“

پیارے لال باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ جے کرشن نے مشعل اٹھاتے
ہوئے کہا۔ ”نرملا! اب تم اندر جاؤ، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے آتے ہی کسی کو
ٹھاکر کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دینا چاہیے تھا کہ تمہاری دوا مل گئی ہے اور تم
آرام سے سو رہی ہو۔ اب میں یہ گھوڑا اصطبل میں چھوڑ کر کسی کو وہاں بھیجتا ہوں،
لیکن سو نہ جانا۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“
”آپ مجھ سے صبح تک بات کر سکتے ہیں۔“

اندر جا کر تھوڑی دیر بعد نرملا ایک کمرے میں بیٹھی جے کرشن کا انتظار کر رہی تھی۔
گزشتہ ذہنی اور جسمانی کوفت کے بعد اب اُسے سکون و اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔
جے کرشن کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر تشویش اور اضطراب کے
آثار دیکھ کر نرملا نے کہا۔ ”پتا می! بھگوان کو خوش کرنے کے بعد آپ کو پریشانی
نہیں ہونا چاہیے۔“

”کہاں ہیں ٹھاکر جی؟“ جے کرشن نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
 نوکر دس کی بجائے ٹھاکر نے کمرے میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا: ”دیکھیے
 مجھے خود آنا پڑا، نرملہ کیسی ہے؟“
 ”اب سو گئی ہے۔ ہمیں دو تلاش کرنے میں بہت دیر لگی۔ میں نے ابھی آپ کی
 نوکر بھیجا ہے وہ شاید آپ کو نہیں ملا۔“

”نہیں، میں بہت پریشان تھا۔ میں فوراً یہاں آنا چاہتا تھا لیکن پردہست جی
 دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔“
 ”تشریف رکھیے۔“

”نہیں، نرملہ کی نیند خراب ہو گئی۔ میں اب واپس جاتا ہوں۔ آپ بھی آرام
 کریں۔“

”تھوڑی دیر بیٹھے نرملہ پر صبح تک دوائی کا اثر رہے گا۔ اب اگر اس کے پاس
 کوئی دھول بھی بیٹھے تو اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ یہ دوا بہت اچھی ہے۔“
 ”جھگوان کا شکریہ ہے کہ آپ کو دوا مل گئی۔ ٹھاکر نے اطمینان سے کمرے
 پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جے کرشن نے کہا: ”پردہست جی مجھے کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ آپ سے کوئی
 خاص بات تو نہیں کہی انھوں نے؟“

”ٹھاکر نے جواب دیا: ”پردہست جی سومات کی حفاظت کے بارے میں
 ہمارا جیسے مشورہ کہنے جا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محمود سومات پر ضرور حملہ
 کرے گا اور دیوتاؤں کی مرضی بھی یہی ہے کہ اس کے سپاہیوں کی لاشیں سومات
 کی دیواروں کے سامنے روندی جائیں، پردہست جی کی خواہش ہے کہ اگلے مہینے تمام
 راجے سومات میں جمع ہو کر یہ حلف اٹھائیں کہ خطرے کے وقت اپنے لشکر کے

بجے کرشن نے نرملہ کو اس کے قریب کمرے پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”میں
 ابھی تک یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے خواب کی حالت میں کیا ہے۔
 معلوم نہیں پردہست جی اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔“
 ”وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ صبح تک روپ دتی کو سون دوجا چکی ہوگی اور
 جھگوان کرے کہ پیارے لال رام ناتھ کو بروقت باخبر کر دے۔“

جے کرشن نے کہا: ”میں اب ان کے متعلق نہیں، تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔
 پردہست کو جب معلوم ہوگا کہ روپ دتی غائب ہو چکی ہے تو وہ یقیناً تم پر شک
 کرے گا اور اس کا انتقام بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”میں اس سے نہیں ڈرتی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ روپ دتی کو سرحد
 عبور کرنے کے لیے وقت مل جائے۔ پتا جی! کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس
 سارے کام میں جھگوان نے آپ کی مدد کی ہے؟“

جے کرشن نے نرملہ کو جواب دیا: ”اگر جھگوان میرے حال پر اسی طرح مہربان
 رہا تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میں میرے لیے سانس لینے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہے
 گی۔“

نرملہ کو شش کے باوجود اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی:

(۵)

باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور جے کرشن نے گھبرا کر کمرے سے
 اُٹھتے ہوئے کہا: ”کون ہے؟“

ایک نوکر نے جواب دیا: ”ہمارا جی! ٹھاکر جی تشریف لائے ہیں۔“

جے کرشن نے نرملہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ فوراً کمرے سے اُٹھ
 کر سبزی ریٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اڑکھ رہے تھے۔“

جے کرشن نے پوچھا۔ ”وہ سب پردہت جی کے ساتھ گئے ہیں“

”نہیں، صرف سات یا آٹھ بھاری اور ان کے اپنے چند سپاہی“

”آپ نے ان کی سیوا کے لیے اپنے سپاہی کیوں نہیں بھیج دیے؟“

”میں تو یہی چاہتا تھا لیکن پردہت جی کہتے تھے کہ ان کے مندر میں جانے کا

کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ مندر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے مجھے بھی رخصت

کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ تم نرملہ کی خبر لو۔ ہم باقی رات یہیں گزاریں گے۔“

”انہیں معلوم ہے کہ نرملہ میرے ساتھ آگئی ہے؟“

”نہیں، میں نے سوچا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ اس لیے نہیں بتایا۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”تو آپ یہیں آرام کریں۔ میں آپ کو صبح ہوتے ہی جگا دوں گا۔“

”نہیں اب تو صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ مجھے گھر جا کر پردہت جی کا انتظام

کرنا چاہیے۔ بھگوان کرے وہ صبح سفر کا ارادہ تبدیل کر دیں، ورنہ میسر ابراہام ہوگا۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”ٹھہریے! میں آپ کے لیے رختہ تیار کرتا ہوں۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”رختہ کی ضرورت نہیں، میں آپ کا گھوڑا لے جاتا ہوں۔“

اس گفتگو کے دوران نرملہ جو بستر پر آنکھیں بند کیے یہ باتیں سن رہی تھی

اپنے دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ جے کرشن اور ٹھاکر کے اٹھتے ہی اس نے

انگڑائی لی اور ”پانی! پانی!“ کہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

”میں ابھی لاتا ہوں بیٹی!“ جے کرشن یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

ساتھ سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ ہمارے مہاراج نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ انہل واڑہ کی فوج کو سومنات میں جمع ہونے کی بجائے کاٹھیاواڑ کی سرحدوں کی حفاظت کرنی چاہیے لیکن پردہت جی کو یہ اطمینان نہیں کہ انہل واڑہ کی فوج حملہ آوروں کو کاٹھیاواڑ کی سرحدوں پر روک سکے گی۔ اس لیے اب وہ خود مہاراج سے بات چیت کرنے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں میں بھی اُن کے ساتھ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔“

جے کرشن نے پوچھا۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“

ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”میری رائے بھی یہی ہے کہ جنوب کے تمام راجے سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہو جائیں اور ہم اپنی سرحدوں پر ڈٹ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دشمن کو سرحد پر روک سکیں گے لیکن اگر ہم اُسے نہ بھی روک سکے تو پیچھے ہٹتے ہوئے قدم قدم پر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس طرح سومنات تک پہنچتے پہنچتے دشمن کی بیشتر قوت زائل ہو چکی ہوگی اور ہمارا وہ لشکر جو سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہوگا، آسانی سے اُسے تباہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ دشمن کا ایک آدمی بھی ہمارے دیوتاؤں کے غدا ب سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔ مجھ سے باتیں کرنے کے بعد پردہت جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ انہل واڑہ جانے سے پہلے شرجی کے مندر کے بھاریوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ محل میں آرام کرنے کی بجائے مندر میں تشریف لے گئے ہیں۔“

”اس وقت؟“

”ہاں! میں ابھی انہیں وہاں پہنچا کر آیا ہوں، پردہت جی رختہ پر سوار ہونے کی بجائے مندر تک پیدل گئے ہوں گے۔ وہ تو دیوتا ہیں۔ بیند اور تھکاوٹ کا ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے لیکن بعض بھاریوں کا بُرا حال تھا۔ بچارے چلتے ہوئے

ٹھا کرنے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”اب تمہارا کیا حال ہے؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ یہاں کب تشریف لائے ہیں؟“
 ”میں ابھی آیا ہوں!“ ٹھا کر یہ کہہ کر نرلا کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔
 ”آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ مجھے دوا کھاتے ہی خیند آگئی تھی۔ تاجی نے آپ کو پیغام نہیں بھیجا؟“

”نہیں، مجھے ان کا پیغام نہیں مل سکا اور اگر مل بھی جاتا تو بھی تمہیں دیکھنے بغیر میری تسلی نہ ہوتی۔ میں صبح سویرے پر وہت جی کے ساتھ انہل واڑہ جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہاں شاید مجھے چند دن ٹھہرنا پڑے۔ اس لیے جانے سے پہلے تمہارے متعلق اطینان کرنا ضروری تھا۔ اس تکلیف کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے میں واپسی پر منور ارج کو لینا آؤں گا!“

نرلا نے کہا: ”نہیں، آپ انہیں تکلیف نہ دیں۔ مجھے اس دوا سے فوراً آرام آ جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے پر وہت اور دوسرے مہمانوں کو پریشانی ہوئی۔“

ٹھا کرنے جواب دیا: ”نہیں، انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ پر وہت جی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں آگئی ہو۔“

نرلا نے کہا: ”آپ کو رخصت کرنے کے لیے میرا گھر میں ہونا ضروری ہے۔“
 ٹھا کرنے کہا: ”ہاں! تم پر وہت جی کے درشن کر لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو میں صبح روانہ ہونے سے پہلے تمہارے لیے پالکی بھجوا دوں گا۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ پیدل

چلنے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”عورت کو اپنے بچے کے ساتھ چلنے میں تکلیف نہیں ہوتی۔“

ٹھا کرنے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ شادی کے بعد نرلا کے طرز عمل نے اُسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شاید اپنی تمام دولت اس کے قدموں پر بچھا کر رکھنے کے بعد بھی اس کی محبت نہ خرید سکے۔ اس نے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا: ”تو چلو، میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جے کرشن پانی کا کٹورا اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ نرلا نے کٹورا اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ٹھا کرنے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ اجازت دیں تو میں نرلا کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”اگر نرلا کی طبیعت ٹھیک ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اس وقت...؟“

نرلا نے پانی کے چند گھونٹ حلقی سے آتارتے ہوئے کہا: ”تاجی! ٹھا کر جی صبح پر وہت جی کے ساتھ جا رہے ہیں اور انہیں رخصت کرنے کے لیے میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔ نازہ ہوا میں پیدل چلنے سے میری طبیعت اور زیادہ ٹھیک ہو جائیگی۔“

”لیکن یہ عجیب سی بات ہوگی۔ اچھا تمہاری مرضی۔“

تھوڑی دیر بعد ٹھا کر اور نرلا اپنے محل کا رخ کر رہے تھے۔ ٹھا کر تھکاوٹ سے نڈھال ہونے کے باوجود بے حد مسرور تھا۔ جے کرشن کے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلنے ہی اُس نے نرلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: ”نرلا! اب مجھے ہر قدم پر تمہارے سہارے کی ضرورت پڑے گی۔“

نرلا نے آہستہ سے جواب دیا: ”آپ کی سیوا میرا فرض ہے۔“

ٹھاکر نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا: تم دیوی ہو، نرملہ! اور تمہارا یہ بچاری اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ تم اس سے نفرت نہ کرو۔ نرملہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ پر کسی نے دھکا ہوا انگارہ رکھ دیا ہے وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی: چلیے! ٹھاکر نے منموہ لہجے میں کہا: میں جانتا ہوں نرملہ! تمہیں میرے سفید بالوں کے ساتھ پریم نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے صرف رحم کی بھیبک مانگتا ہوں۔ نرملہ نے کرب انگیز لہجے میں کہا: ایسی باتیں نہ کیجیے میں آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ چلیے! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔

”نہیں نہیں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ ایک بچاری کو اپنی دیوی سے شکایت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔“ ٹھاکر یہ کہہ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

(۶)

گھر پہنچ کر انھیں پہ چلا کہ پروہت جی ابھی تک نہیں آئے۔ نرملہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے تو ٹھاکر نے کہا: نرملہ! اب صبح ہونے کو ہے پروہت جی آتے ہی ہوں گے۔ تم لیٹ جاؤ۔ جب وہ آجائیں گے تو میں تمہیں جگا دوں گا۔

نرملہ نے کہا: مجھ سے زیادہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ پروہت جی ذرا دیر سے آئیں اور آپ کو تھوڑی دیر آرام کے لیے وقت مل جائے آپ کو سفر کرنا ہے اور میں تو سارا دن سو سکتی ہوں۔

ٹھاکر تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا اُس نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا: بہت اچھا، میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔

نرملہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد اسے ٹھاکر کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ نرملہ نے چراغ کی دھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے تصورات ماضی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ماضی جو رنیر کے پہنوں سے بھر پور تھا۔ ماضی جہاں اس کی جوانی کے تمام دلوں نے دم توڑ چکے تھے ماضی جس کی طرف لوٹنا اس کے بس کی بات نہ تھی اور جس نے اُسے آہوں اور آنسوؤں کی پونجی دے کر مستقبل کی بھیا ناک دستوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ نرملہ کا دم گھٹنے لگا وہ اٹھ کر بالکنی کی طرف بڑھی اور اپنی آنکھوں میں چپکے ہوئے آنسو پونچنے کے بعد آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ مشرق کے افق سے صبح کا ستارہ نمودار ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی اور رات کی تاریکی صبح کے دھندلے میں تبدیل ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے محل کی چار دیواری سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اُسے چند سوار دکھائی دیے جو اصطبل سے نکل کر دوسری طرف جا رہے تھے۔ سوار جلد ہی اس کی نگاہوں سے ادھل ہو گئے۔ نرملہ داپس مڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے پروہت جی محل کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ نرملہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے ٹھاکر کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوٹے ہوئے کہا: پروہت جی آگئے ہیں۔

ٹھاکر ہڑبڑا کر اٹھا اور اُس نے آنکھیں ملتنے ہوئے کہا: کہاں ہیں پروہت جی؟

”وہ نیچے اپنے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔“

”بھگوان کرے وہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دیں۔“ ٹھاکر یہ کہہ کر لٹکھڑاتا ہوا

دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک ساعت کے بعد ٹھاکر داپس آیا تو نرملہ کرسی پر بیٹھی اُدگھ رہی تھی۔ اُن

تم انہی تکٹ بھی ہوئی ہو۔ تمہیں سو جانا چاہیے تھا۔
”میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

”میں آج نہیں جاؤں گا۔ پردہنت جی نے مندر حیر جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مہاراجہ کو ہمیں بلایا جائے۔ میں نے ان کا پیغام مہاراجہ کو بھیج دیا ہے۔“

نرملہ نے کہا۔ ”آپ کو جگانے سے پہلے میں نے محل سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سی تھی میرا خیال ہے کہ چند سوار اسٹبل سے نکل کر کہیں گئے ہیں۔“

”ہاں وہ پردہنت جی کے محافظ دستے کے آدمی تھے۔ پردہنت جی نے انہیں ہمارے پڑوس کے راجوں اور سرداروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ وہ ان کے درشن کے لیے یہاں پہنچ جائیں۔ پردہنت جی نے مجھ سے ایک عجیب سی بات کہی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”وہ کہتے ہیں کہ ایک خوبصورت لڑکی سومات کے مندر میں داسی بن کر آئی تھی۔ لیکن پجاریوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کی جاسوس ہے۔ چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں اچانک وہ تیبہ خانے سے بھاگ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندر کی حفاظت کرنے والی فوج میں کسی بہن آدمی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ سومات کے جاسوس کئی دنوں سے اس کی تلاش میں تھے۔ اب انہیں یہ سراغ ملا ہے کہ وہ لڑکی ہمارے شہر میں کسی کے ہاں چھپی ہوئی ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ تاہم میں نے پردہنت جی کی تسلی کے لیے شہر کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا ہے۔ اب میرے سپاہیوں کی مدد سے سومات کے پجاری شہر کے ہر گھر کی تلاشی لیں گے۔ اگر وہ لڑکی مل گئی تو پجاری اس کے باقی

ساتھیوں کا کھوج لگانے کے لیے اسے سومات لے جائیں گے۔ سومات کے مندر میں دشمنوں کے جاسوسوں کا ہونا بہت خطرناک ہے۔ میں نے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹوانے کا ارادہ کیا ہے کہ اس لڑکی کو تلاش کرنے والے کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔ پردہنت جی آج دوپہر سے پہلے کسی سے ملاقات نہیں کریں گے۔“

نرملہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک بڑھیا ہانپتی کا منیتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا پیر بن جبکہ جبکہ سے پٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ضربوں کے نشان تھے۔ ٹھاکر لے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ اس کی پرانی خادمہ تھی جسے اس نے رام ناتھ کے گھر بھیجا تھا۔ بڑھیا سسکیاں لیتی ہوئی ٹھاکر کے پاؤں پر گر پڑی۔ چند نوکرانیاں اور نوکر حیران و پریشان دروازے سے باہر کھڑے تھے۔ ٹھاکر نے بڑھیا کے بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا تمہیں؟“

”مہاراج! مجھے ڈاکوؤں نے مارا ہے۔ وہ رات کے تیسرے پہر حویلی کی دیوار پھاڑ کر اندر آ گئے تھے۔ انھوں نے چوکیدار اور تین نوکروں کو قتل کر دیا ہے۔ پوچھا تو کہ جاں کنی کی حالت میں پڑا ہے۔ پھر انھوں نے مجھے چوکیدار کی بیوی اور مال کی لڑکی کو پکڑ کر ایک کمرے میں بٹھا دیا اور دو آدمی تلواریں سونت کر ہمارے سر پر کھڑے ہو گئے۔ باقی آدمیوں نے مکان کی تلاشی لینے کے بعد ہم سے پوچھا کہ سردار کی بیوی کہاں ہے۔ تم نے اسے کہاں چھپا دیا ہے۔ مہاراج! ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ رات کے وقت اپنے کمرے میں تھی اور میں نے اسے حویلی سے باہر جاتے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے وہ کسے تھے کہ تم جھوٹ بولتی ہو۔ پھر انھوں نے دوبارہ مکان کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن ساوتری وہاں نہیں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کمرے کا دروازہ

بندر کے ہمیں پٹینا شروع کر دیا۔ چوکیدار کی بیوی اور مالی کی لڑکی لے کر اپنی جان چھڑالی کہ ان کے گھر حویلی کے دوسرے کونے میں ہیں اور رات کے وقت صرف میں سادہ تری کی خدمت میں رہا کرتی ہوں۔ ڈاکوؤں نے ان کی مشکلیں کس کر انھیں کمرے کے اندر بند کر دیا اور مجھے حویلی کے کچھ اڑے کھیتوں میں لے گئے۔ وہاں ان کے چند ساتھی کھڑے تھے۔ ہمارا ج! انھوں نے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں ڈر کے مارے حویلی کی طرف نہیں گئی، اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے کئی بار گری ہوں۔

ٹھاکر نے کہا: ”میرے شہر میں ایسی جرأت کون کر سکتا ہے۔ تم ان میں کسی کو پہچان سکو گی۔“

”نہیں ہمارا ج! انھوں نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھے تھے۔“

”وہ کہتے تھے:“

”ہمارا ج! آٹھ آدمیوں نے حویلی پر حملہ کیا تھا۔ اور تین کو میں نے کھیت میں دیکھا تھا۔“

ٹھاکر نے پوچھا: ”اور سردار رام ناتھ کی بیوی کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں۔“

”نہیں ہمارا ج! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ رات کے وقت سونے سے پہلے میں نے اُسے اُس کے کمرے میں دیکھا تھا۔“

”اب تم یہیں رہو۔ ٹھاکر یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا اور نوکر دوں کو اپنے راستے سے مٹانا ہوا باہر نکل گیا۔“

دوپہر کے قریب شہر کے ڈھنڈورچی گلیوں اور کوچوں میں رام ناتھ کے گھر پر حملہ کرنے والے ڈاکوؤں اس کی بیوی اور سونمات کے قید خانے سے فرار ہوئے والی لڑکی کا ہتھ دینے والوں کے لیے انعامات کا اعلان کر رہے تھے:

(۷)

دوپہر سے تھوڑی دیر بعد پیارے لال ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ وہ تھکاوٹ سے ٹڈھال تھا اور گھوڑا بھی جواب دے چکا تھا۔ گاؤں کے چوہال سے باہر ایک درخت کے نیچے چند آدمی بیٹھے تھے۔ پیارے لال رہائی لوگوں سے کام لینا جانتا تھا۔ ذرا سی دیر میں ایک آدمی نے اس کے گھوڑے کے لیے چارے اور پانی کا انتظام کر دیا اور دوسرا اس کے لیے روٹی، مکھن اور لسی لے آیا۔ اپنا پیٹ بھر لینے کے بعد پیارے لال تھوڑی دیر سنانے کی غرض سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔ ایک دہائی نے اس سے سوال کیا: ”ہمارا ج! آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”ہمارا ج“ کا لفظ سن کر پیارے لال نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کی اور کہا: ”تم مندرہیر کے ٹھاکر جی کو جانتے ہو؟“

”انھیں کون نہیں جانتا ہمارا ج! آپ ان کے.....“

پیارے لال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”دیکھو بھئی! تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

ایک عمر رسدہ آدمی نے کہا: ”ہمارا ج! آپ کا گھوڑا بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے اگر حکم ہو تو اس کی زین اتار دوں؟“

پیارے لال نے گردن اٹھا کر حکمانہ انداز میں جواب دیا: ”نہیں! ہم ابھی روٹا ہوا جائیں گے۔“

ایک اور دہائی بولا: ”ہمارا ج! آپ کا گھوڑا بہت خوبصورت ہے۔“

پیارے لال نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: ”تم نے اسے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں پچھلے پر مندرہیر سے نکلا تھا اور اب یہاں پہنچ گیا ہوں۔“

”اتنی جلدی؟“ دیہاتی نے حیران ہو کر پوچھا
”ہاں اور کیا؟“

چند دیہاتی یکے بعد دیگرے اٹھ کر گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے اس کے کانوں سے لے کر دم کے بالوں تک کی تعریف شروع کر دی۔
ایک سادہ دل دیہاتی نے پیارے لال سے پوچھا ”مہاراج! اس کی قیمت کیا ہوگی؟“

”کہوں! تم اسے خریدنا چاہتے ہو؟“ پیارے لال نے اس پر غضب آلود
”نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔“

”اُس نے کھینا ہوا ہو کر جواب دیا۔“ نہیں مہاراج! میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا۔“
”اسے نہیں خرید لو۔ اس کی قیمت صرف ایک گاؤں ہے۔“

سادہ دل دیہاتی بدحواسی کی حالت میں اپنے ساتھیوں کے قسمقے سن رہا تھا
تھوڑی دُور ایک سرسٹ سوار گاؤں کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا اور چند دیہاتی اُٹھ
کر کھڑے ہو گئے۔ پیارے لال بھی اُن کی دیکھا دیکھی کھاٹ سے اتر کر سوار کے راستے
میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں سوار چرپال کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اُس نے
گھوڑا روکنے کی کوشش نہ کی۔ دیہاتی گھبرا کر ادھر ادھر ہٹ گئے۔ سوار ایک بجولے
کی طرح آگے نکل گیا۔ پیارے لال پوری قوت کے ساتھ چلایا ”مہاراج! رام ناٹھ!
ٹھہرو! ٹھہرو! رام ناٹھ! رام ناٹھ!“

لیکن رام ناٹھ گردے بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پیارے
لال اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن رام ناٹھ کے گھوڑے کے
مقابلے میں اُس کے گھوڑے کی رفتار بہت سُست تھی۔ وہ اس اُمید پر چلتا رہا
کہ رام ناٹھ کسی نہ کسی جگہ دم لینے کے لیے ضرور ٹھہرے گا۔ راستے میں کوئی بستی

آئی یا کوئی سافرنانا تو وہ رام ناٹھ کے متعلق پوچھ لیتا۔ اس کے گھوڑے کی رفتار
بہت رنج کم ہوتی گئی اور تیسرے پہر کے قریب گھوڑا چلتے چلتے رک گیا۔ پیارے لال
نے اسے ایڑ لگا کر تودہ چند چھلانگیں لگانے کے بعد پھر رک گیا۔ پیارے لال
عبوراً نیچے اترا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ اس علاقے میں دُور
دُور تک جھاڑیوں اور درختوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پیارے لال شام سے
پہلے کسی گاؤں میں پہنچنا ضروری سمجھتا تھا۔ کوئی آدھ کوں چلنے کے بعد اسے گھنی
جھاڑیوں کے نیچے سرسٹ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور وہ گپٹا ہڈی سے
ہٹ کر ایک درخت کے اوپر چڑھ گیا۔ پندرہ سلح سوار جن کے نیزے ڈھوپ
میں چمک رہے تھے پوری رفتار سے اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ جلدی
نیچے اترا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ آں
کی آں میں سوار گردے کے بادل اڑاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پیارے لال گھوڑے
کی باگ پکڑ کر پھر گپٹا ہڈی پر ہوا۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے
پر سوار ہو گیا۔ تھکا ہوا گھوڑا گردن جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کوئی ایک
کوں چلنے کے بعد پیارے لال کو ایک دیہاتی دکھائی دیا جو گدھے پر سوار تھا۔
پیارے لال نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہاں
سے اگلا گاؤں کتنی دُور ہے؟“

”مہاراج کوئی دو کوں ہوگا۔“

”تم نے راستے میں ایک سوار دیکھا ہے؟“

”میں نے راستے میں کئی سوار دیکھے ہیں مہاراج! ایک ٹولی تو آگے

جا چکی ہے شاید آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔“

”ہاں وہ کون تھے؟“

کہ چند سپاہی اُس کے سر پر نیزے تان کر کھڑے ہو گئے۔ اب اس کے سامنے ہارٹنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ تین چار سپاہی گھوڑوں سے اترے اور اُنھوں نے رستے سے اس کے ہاتھ باندھ لیے۔ میں نے دہاں سے کھٹکنا چاہا۔ لیکن ایک سپاہی نے مجھے دیکھ لیا اور نیزے سے ہانکنا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ میں ایک غریب دھوبی ہوں اور صرف ڈر کے مارے جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ان میں سے چند آدمی قیدی کر لے کر واپس چلے گئے اور باقی آگے نکل گئے ہیں۔ آپ اسے جانتے ہیں ہمارا ج؟“

”اُس سوار کو جسے گرفتار کیا گیا ہے؟“

”نہیں۔“ پیارے لال نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے کہا۔

گھوڑا پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پیارے لال نے مڑ کر دھوبی کی طرف دیکھا اور کہا: ”بھئی میرے ساتھ ایک سودا کر لگے؟“

”کیسا سودا ہمارا ج؟“

”اپنے گدھے کے بلے میرا گھوڑا لے لو۔ اسے کسی دن مندر ہیر لے آنا تمہیں انعام ملے گا۔ مجھے اگلے گاؤں سے کوئی سواری مل گئی تو میں تمہارا گدھا واپس چھوڑ دوں گا۔“ دھوبی نے جواب دینے کی بجائے گدھے کی گزن پر ایک ڈنڈا رسید کیا اور آن کی آن میں جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

(۸)

اگلے روز دوپہر کے وقت نرلا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار تھے۔ ٹھاکر گھوناٹھ کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے

”معلوم نہیں ہمارا ج! اپنے گاؤں سے نکلتے ہی مجھے اپنے پیچھے ایک فوج دکھائی دی۔ چالیس پچاس سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مجھ سے آگے نکل گئے۔ خورڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی سپاہی ایک سوار کے گرد گھیرا ہوا ہوئے ہیں۔ گدھے سے اتر کر میں ڈر کے مارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ سپاہیوں نے اُس سوار سے ہتھیار ڈال دینے کا مطالبہ کیا، لیکن اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ تم کس کے حکم سے مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔“

پیارے لال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”اس سوار کے گھوڑے کا رنگ مشکي تھا؟“

”جی ہاں!“

”اچھا پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس کی شکل بالکل مندر ہیر کے مندر کے ایک پجاری سے ملتی تھی جو ہر سال ہمارے گاؤں میں دان لینے آیا کرتا ہے۔ اُس نے سوار کو سمجھایا کہ تم تمہیں گرفتار کر کے مندر ہیر لے جانا چاہتے ہیں، واپس جا کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا ہے۔ لیکن سوار نے کہا۔ میں خود ہی مندر ہیر جا رہا ہوں۔ تم میرے پیچھے آ سکتے ہو۔ اس کے بعد ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ ہم سو منات کے سپاہی ہیں اور پردہت جی ہمارا ج کے حکم سے تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ مندر ہیر کا ٹھاکرا نسل ڈاڑ کا ہمارا جہ تھا دی مدد کرے گا۔ سوار نے یہ سنتے ہی تلوار نکالی اور اُن کا گھیرا توڑ کر ایک طرف نکلنے کی کوشش کی، لیکن ایک سپاہی کا نیزہ اس کے گھوڑے کے سر میں لگا اور گھوٹا دتین بار اچھلنے کے بعد اپنے سوار سمیت گر پڑا۔ سوار ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا

نرملہ کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پردہت جی نے رام ناتھ کا جرم بتانے سے انکار کر دیا ہے۔"

نرملہ نے پوچھا۔ "آپ رام ناتھ سے ملے ہیں؟"

"نہیں، پردہت جی اس سے کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ اس وقت مندر کی چار دیواری میں قید ہے اور دروازے پر پردہت جی کے آدمی پہلے سے لپے ہیں۔ شہر کے کسی اور آدمی کو مندر کے قریب آنے کی اجازت نہیں۔" نرملہ نے کہا۔ "کیا آپ کو یہ اختیار بھی نہیں کہ اپنے شہر کے ایک آدمی کی گرفتاری کی وجہ پوچھ سکیں؟"

"پردہت جی کے سامنے میرے تمام اختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔"

"آپ اس علاقے کے حاکم ہیں، اگر رام ناتھ نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے آپ کی عدالت میں پیش ہو جانا چاہیے اور رام ناتھ ایک عام آدمی نہیں وہ مہاراجہ کا دوست ہے۔"

"پردہت جی اگر چاہیں تو مجھے بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"یوہنی۔ کسی جرم کے بغیر!"

"تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ پردہت جی نے رام ناتھ کو کسی جرم کے بغیر گرفتار کیا ہے؟" نرملہ نے جواب دیا۔ "نہیں، مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رام ناتھ نے کوئی جرم نہیں کیا اور اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ ایسا ہے جس کے ظاہر ہو جانے سے پردہت جی کو اپنی بدنامی کا خوف ہے۔"

رگھو ناتھ نے غصے میں آکر کہا۔ "نرملہ! جھگڑانے کے لیے ہوش میں آؤ، تمہیں اس محل کے کسی لوکر کے سامنے بھی ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔"

نرملہ نے کہا۔ "مجھ پر بھروسے کی بجائے آپ پردہت جی سے یہ پوچھ آئیں کہ مندر"

کی دیواریں مہادیو کے چرنوں میں پہنچ کر دوبارہ اس دنیا میں کیسے آجاتی ہیں؟" "نرملہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے، جھگڑانے کے لیے مجھے پریشان نہ کرو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

نرملہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جے کرشن دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رگھو ناتھ نے بھی کرسی سے اٹھ کر جے کرشن کا سواگت کیا اور اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو بلاؤں۔ نرملہ بہت پریشان ہے۔ اسے کسی نے پردہت جی مہاراج کے متعلق بہکا دیا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ پردہت جی کے متعلق اپنے دل میں بڑا خیال لانا بھی باپ ہے۔"

جے کرشن نے انجان بن کر کہا۔ "نرملہ! کیا شکایت ہے تمہیں پردہت جی مہاراج کے متعلق؟"

نرملہ نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں بتا جاؤ! میں ان سے کہہ رہی تھی کہ اگر پردہت جی رام ناتھ کا کوئی جرم ثابت کر سکتے ہیں تو وہ اسے ان کی عدالت میں پیش کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟"

رگھو ناتھ نے تمللا کر کہا۔ "دیکھو نرملہ! میں ایک بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں پردہت جی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔"

نرملہ کچھ کہے بغیر اٹھی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رگھو ناتھ نے پریشانی کی حالت میں جے کرشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ جھگڑانے سے کیا ہو گیا ہے۔"

جے کرشن نے جواب دیا۔ "آپ کو نرملہ کی باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بہت رحم دل ہے۔ جب ہم قنوج میں تھے تو وہاں بھی یہ بدترین مجرموں کی جان بچانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔"

مندھیر میں شوچی کا مندر اپنی قدامت و وسعت اور فن تعمیر کے لحاظ سے بہت مشہور تھا پتھر کی چار دیواری کے اندر ایک وسیع تالاب تھا اور اس تالاب کے عین درمیان مندر کی پرشکوہ عمارت کھڑی تھی جس کے سنہری کلس دُور دُور تک دکھائی دیتے تھے۔ اور جس کے اندر ایک ہزار بت نصب تھے۔ تالاب کے چاروں کناروں سے مندر تک پہنچنے کے لیے سنگ مرمر کی گزرگاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر روز سینکڑوں یاتری مندر کے تالاب میں آستان کرنے اور مورتیوں کے سامنے نذرانے پیش کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ملک میں شوچی کے کئی اور مندروں کے پجاریوں کی طرح اس مندر کے پجاری بھی سومات کے بڑے پردہت کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور اس کی آمدنی کا ایک حصہ ہر سال سومات کے مندر کی بھینٹ کیا جاتا تھا۔

گزشتہ دو دن سے یہ مندر سومات کے پردہت کی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا اور اس کے دروازے تمام یاتریوں کے لیے بند ہو چکے تھے۔ عام پجاریوں کو بھی مندر سے دُور رہنے کا حکم مل چکا تھا۔ دروازوں پر سومات کے سپاہی پھر رہے تھے۔ سومات کے پردہت کے ساتھیوں اور مندھیر کے چند پجاریوں کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ عام لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ رام ناتھ کو ایک قیدی کی حیثیت سے اس مندر کے اندر لایا گیا ہے اور عنقریب سومات کے خلاف کسی خطرناک سازش کا انکشاف ہونے والا ہے۔

رام ناتھ مندر کے اندر ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اور ایک سپاہی اُس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا رہا تھا۔ سومات کا پردہت اور چند پجاری اُس کے قریب کھڑے تھے۔ جب ام ناتھ نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈھیل چھوڑ دی تو پردہت نے سپاہی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ام ناتھ کو سر کے بالوں

رگھو ناتھ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: ”آپ اطمینان سے باتیں کریں میں ذرا نیچے جا رہا ہوں۔“

رگھو ناتھ کمرے سے باہر نکل گیا اور جے کرشن قدے توقف کے بعد اُٹھ کر برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔ نرلا صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کے سامنے کھڑی تھی جے کرشن نے اُس کے قریب جا کر کہا: ”بیٹی! تم آگ کے ساتھ کھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر ایسی باتیں پردہت کے کانوں تک پہنچ گئیں تو اس کا انتقام بہت خطرناک ہوگا۔ اگر اسے تمام حالات معلوم ہو جائیں تو اس کے آدمی تنوج کی حد تک روپ دہنی کا پتھا کریں گے۔ تمہیں اگر میرا یا اپنا خیال نہیں تو کم از کم روپ دہنی کی خاطر چند دن کے لیے اپنی زبان قابو میں رکھو۔“

نرلا نے آبدیدہ ہو کر کہا: ”لیکن پتا جی! وہ رام ناتھ کو قتل کر ڈالیں گے“ اور روپ دہنی اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکے گی۔“

جے کرشن نے جواب دیا: ”پردہت اسے قتل نہیں کرے گا۔ جب تک روپ دہنی اُس کے قبضے میں نہیں آتی، رام ناتھ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ روپ دہنی کی خوش قسمتی ہے کہ پردہت کے سپاہی اسے صرف مندھیر اور رام ناتھ کی جاگیر کی لہنتیوں میں تالاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسے میں یا اسے لال کو پکڑ کر اس کی تلاشی لے لیتے تو تمہارا خطر ہماری تباہی کے لیے کافی تھا۔ اب بھی مجھے ڈر ہے کہ اگر اُسے ہم پر شک ہو گیا تو بیاہ لال جیسے نوکروں سے سچی بات اُگلا لینا اُس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ تمہیں ٹھاکر جی کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہم رام ناتھ کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہیں۔ اب بھگوان ہی اُسے بچا سکتا ہے۔ ہمارے بس میں کچھ نہیں رہا۔ مجھ سے وعدہ کر دو کہ تم احتیاط سے کام لوگی۔“

”پتا جی! میں وعدہ کرتی ہوں۔“ نرلا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:

رام ناتھ نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا: "تم مجھ سے صرف دپ دتی کے متعلق کیوں پوچھتے ہو؟ کسی کے متعلق کیوں نہیں پوچھتے؟"

پردہت کے چہرے پر اچانک سیاہی پھیل گئی اور اُس نے انتہائی سرسیمی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا: "کاشی کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟"

"میں اس کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ جب تم نے اسے دیوتا کے پاس بھیجا تھا تو وہ راستے سے لوٹ آئی تھی اور اس کے بدلے تھلے چند بچاری ہاں پہنچ گئے تھے۔ اگر تم اس کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو تو مجھے مندر کے ٹھاکر اور انہل وارہ کے مہاراج کے پاس لے چلو۔ بولو خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا تم سونتا کی دیوی کے متعلق یہ بھی نہیں جانتا چاہتے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟"

پردہت کچھ دیر بہت کھڑا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر سیاہی کے ہاتھ سے کورا اچھین لیا اور بے تحاشا رام ناتھ کو سینا مشرعی کر دیا۔

"مہاراج! مہاراج!" ایک بچاری نے کہا: "یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔"

ہمیں ابھی اسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کاشی بھی روپتی کی طرح رہو تو ہوجی ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ سومات میں رام ناتھ کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔ اسے قتل کرنے سے پہلے ان کا سراغ لگانا ضروری ہے۔"

پردہت نے کورا زمین پر پھینکتے ہوئے کہا: "اب اس کا ایک پل کے لیے بھی یہاں رہنا ٹھیک نہیں، تم اسے فوراً سومات لے جاؤ۔ اگر یہ راستے میں کسی سے بات کرنے کی کوشش کرے تو اس کی زبان کاٹ دو میں روپتی کو تلاش کرنے کے بعد دلپس آؤں گا۔ جاؤ اب تیاری کرو۔"

سے پڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

رام ناتھ نے آنکھیں کھولتے ہوئے جواب دیا: "میری جان لینے کے لیے تمہیں بہانے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں میں اسے گھر میں جھوڑ کر گیا تھا۔ اگر وہ مری غیر حاضری میں گھر سے غائب ہو گئی ہے تو تم سے زیادہ اس بات کا کسی اور کو علم نہیں ہو سکتا۔"

ایک بچاری نے کہا: "مہاراج! یہ بہت سخت جان ہے۔ اس کا دماغ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔"

"اس کا دماغ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے پردہت نے سپاہی کو اشارہ کیا اور اس نے پھر رام ناتھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد جب رام ناتھ کے چہرے سے بے ہوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو پردہت نے کوڑے مارنے والے سپاہی کو ایک بار پھر روکا، اور پانی لانے کے لیے کہا۔ ایک سپاہی نے مندر کے تالاب سے ایک بالٹی میں پانی لا کر رام ناتھ کے قریب رکھ دیا اور کٹورا بھر کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ رام ناتھ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ پردہت نے سپاہی کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر رام ناتھ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ لیکن ابھی اُس نے ایک ہی گھونٹ حلق سے اتارنا تھا کہ پردہت نے کٹورا نیچے ہٹا کر سارا پانی زمین پر انڈیل دیا اور کہا: "اگر پانی پینا چاہتے ہو تو میرے سوال کا جواب دو۔"

رام ناتھ نے ڈوبتی ہوئی آوازیں کہا: "اگر میری جگہ تم اس ستون کے ساتھ بند ہوئے ہوتے اور میرے ہاتھ میں کٹورا ہوتا تو اب تک شہر کے ہر آدمی کو معلوم ہو چکا ہوتا کہ روپ دتی کہاں ہے۔"

پردہت نے کہا: "تمھارے لیے یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میرے دایاں میں تھلے سے لیے جسم کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔"

گھٹتے ہوئے سرے پر پاؤں لکھ دیا اور سمجھونا تھ اپنی گردن میں ایک چھٹکا محسوس کرنے کے بعد پگڑی کے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔ عام حالات میں وہ محل کے باقی نوکرانوں کی ایسی گستاخیاں برداشت کرنے کا عادی نہ تھا، لیکن رنیر کو قریب آنا دیکھ کر وہ پریدار کو صرف گدھے کے لفظ سے یاد کرنے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا اور پگڑی دبیں پھوڑ کر بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔

”ہماراج! ہماراج! آپ آگے۔ جھگوان نے بڑی کربا کی ہے۔ ٹکنٹلا دیوی مدت سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر رنیر کے پاؤں چھوئے کی کوشش کی۔ لیکن رنیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ سمجھونا تھ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”ہماراج! ہم بہت پریشان تھے۔ ٹکنٹلا دیوی صبح دشام آپ کی راہ دیکھا کرتی ہے۔ اب بھی آپ کے انتظار میں اس کے کمرے میں چراغ جل رہا ہوگا۔ وہ اس گرمی میں بھی رات کے وقت دبیں سوتی ہے۔ میں اسے خبر دیتا ہوں ہماراج!“

”نہیں چچا! میں خود اسے جگاؤں گا۔“ رنیر نے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں دوسرے نوکر ایک نوکرانی کو جگا کر دروازہ کھولا چکے تھے۔ رنیر اندر داخل ہوا اور اندرونی صحن کو عبور کرنے کے بعد بالائی منزل کی سیڑھیاں پڑھنے لگا۔ پگڑی دیر میں وہ اپنے مکان کے ایک روشن کمرے میں کھڑا تھا، اس سفر کی طرح جو مدتوں ایک بے آب گیاہ صحرائیں بھٹکنے کے بعد اپنی اسیدوں کا ٹکڑا دیکھ رہا ہو۔

ٹکنٹلا اپنے بستر پر سو رہی تھی، اور وہ یوں محسوس کر رہا تھا کہ وقت کی آندھیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اس کی ننھی بہن ایک عورت بن چکی تھی، لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک ایک بچے کی سی معصومیت تھی۔ رنیر کچھ دیر بستر کے قریب بے حس حرکت

بہن اور بھائی

رات کے پچھلے پر سمجھونا تھ محل کے اندرونی دروازے کے سامنے کشادہ چبوترے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اور نوکر چارپائیوں پر لیٹے نراٹے لے رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھلنے ہوئے تھے اور فضا میں کمی قدر تلخی تھی۔ ایک پریدار بھاگتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھا اور اس نے سمجھونا تھ کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا۔ ”چچا سمجھو! اٹیٹھے سردار رنیر آگئے ہیں۔“

سمجھونا تھ نے ہڑا کر سر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کب آئے؟ کہاں ہیں وہ؟“

پریدار نے باہر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اُدھر دیکھیے وہ آ رہے ہیں۔“

سمجھونا تھ کو صحن میں تھوڑی دیر ایک مشعل بردار کے پیچھے محل کے چند نوکرانوں اور پریداروں کے درمیان رنیر دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جگایا اور سر ہانے سے اپنی پگڑی اٹھا کر جلدی جلدی سر پر لپیٹا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ پگڑی اس کے سر کی ضرورت سے بہت بڑی تھی۔ چبوترے کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس کا آخری سرا بھی تک فرش پر بھاڑ دے رہا تھا۔ پریدار نے غلطی سے زمین پر

جگہ ایک اور لڑکی تھی۔

وہ جسے کرشن کی لڑکی۔ میں اس کے متعلق سن چکی ہوں، اسے ہماری نوکرائی نے بتایا تھا کہ میرے کمرے میں رات کے وقت لکشی دلوئی آیا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی میری طرح ساری رات دیپ جلانے دیکھتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ وہ جسے کرشن سے مختلف تھی۔ اسے میرے گم ہو جانے سے بہت دکھ ہوا تھا اور جسے کرشن نے صرف اس کے مجبور کرنے پر میری تلاش کے لیے انعام مقرر کیا تھا۔

رنیر نے کہا: شکنتلا! اس وقت میں تمہارے متعلق سننا چاہتا ہوں۔
شکنتلا بولی: ”نہیں بھیا! اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔ جب آپ سو کر اٹھیں گے تو میں پہروں آپ کے ساتھ باتیں کر سکوں گی۔ یہاں شاید آپ کو گرمی محسوس ہو، میں اُدھر پارہ دری میں آپ کا بستر بچھا دیتی ہوں۔“

رنیر نے جواب دیا: اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ تمہیں دیکھنے سے تھکاوٹ کا احساس نہیں رہا۔

”تو میں کچھ کھانا لاتی ہوں۔“ شکنتلا یہ کہہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔
رنیر نے کہا: ”شکنتلا! کھانا کھانے کی ضرورت نہیں۔ کسی نوکر سے کہو، میرے لیے صرف وہی کا ایک کٹورا لے آئے۔ کھانا میں نے راستے میں ایک سردار کے ہاں کھالیا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد شکنتلا رنیر کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی اسے اپنی سرگزشت سنارہی تھی۔

(۲)

طلوعِ سحر کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ کئی دنوں کی مسلسل بے آرامی کے باوجود

کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بالآخر اس نے جھک کر شکنتلا کی پیشانی پر اپنا کانپٹا ہوا ہاتھ رکھ دیا اور بھرائی ہوئی آوازیں کہا: ”شکنتلا! شکنتلا!“

”کون؟“ شکنتلا نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

”شکنتلا! شکنتلا! میں رنیر ہوں۔“ اس نے لرزتی ہوئی آوازیں کہا۔

شکنتلا چند ثانیے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ رنیر نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ اٹھی اور بے اختیار اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ ”بھیا! بھیا!“ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ الفاظ کا تلاطم ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور وہ ایک نیچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اچانک وہ پیچھے ہٹی اور غور سے رنیر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رنیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”بھیا! بھیا! شکنتلا نے قدرے توقف کے بعد کہا۔“ مجھے بتاؤ کیا یہ سنا تو نہیں؟“

رنیر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر دوبارہ اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جواب دیا: ”نہیں شکنتلا۔ یہ سنا نہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کے متعلق پسے نہیں دیکھا کریں گے۔ اب تمہیں اپنے بھائی کے لیے ہر رات دیا جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

تھوڑی دیر بعد رنیر اور بھائی آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے پر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹیں بچھا کر رہے تھے۔ شکنتلا نے کہا: ”بھیا! میں اپنے پسوں میں ہمیشہ یہ دیکھا کرتی تھی کہ آپ رات کے وقت آتے ہیں، اس کھڑکی کے راستے۔“

رنیر نے جواب دیا: ”ایک دفعہ میں اس کھڑکی کے راستے آیا تھا۔ لیکن یہاں تمہاری

رنبیر کو نیندا تھکا دٹ کا احساس تک نہ تھا۔ اچانک اسے دور سے ایک آواز سنائی دی اور اُس نے شکنتلا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر کے مجھے کہا۔
”یہ کیسی آواز ہے شکنتلا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں میں کوئی مسلمان اذان دے رہا ہے۔“

شکنتلا نے غور سے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے قد سے تو قف کے بعد کہا۔ ”ہاں بھیا! یہاں ایک اجنبی آیا ہوا ہے اور اس کی باتیں سن کر گاؤں کے چند آدمی مسلمان ہو چکے ہیں۔ چچا شمشو کہتا ہے کہ اس کی زبان میں جاؤ ہے۔“
”شکنتلا! تم آرام کرو۔ میں ذرا باہر جانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے رنبیر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

شکنتلا نے قد سے پریشان ہو کر سوال کیا۔ ”بھیا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“
”میں اگر بناؤں گا شکنتلا! رنبیر کہہ کر باہر نکل گیا۔“

شکنتلا دیر تک پریشانی کی حالت میں بیٹھی رہی پھر اٹھی اور چھت پر جا کر کھلی ہوا میں ٹہلنے لگی۔ آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے اور مشرقی آفتی پر طلوع آفتاب کے آٹا کودار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر چھت پر ٹہلنے کے بعد شکنتلا تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اُتری اور ایک خادمہ کو ناشتہ تیار کر لے کا حکم دے کر پھر اوپر آگئی۔

”بھیا کہاں گئے ہیں بہت دیر ہو گئی۔“ وہ بار بار اپنے دل میں یہ سوال دہرا رہی تھی۔ بالآخر وہ بارہ دری کے اندر جا کر سنگ مرمر کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔

”شکنتلا! شکنتلا!!“ اسے اچانک رنبیر کی آواز سنائی دی اور وہ اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رنبیر بیڑھیوں سے نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔

”بھیا! شکنتلا نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ آپ نے بہت دیر لگائی میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ کہاں گئے تھے آپ؟“

رنبیر نے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ شکنتلا۔ شکنتلا بیٹھ گئی اور رنبیر کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ رنبیر نے قد سے توقف کے بعد کہا۔ ”شکنتلا! میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔ میں....“
رنبیر مذہب سا ہو کر شکنتلا کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں بھیا! کو! آپ رک کیوں گئے۔“

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم مجھ سے روٹھ نہ جاؤ۔“

”بھیا! میں آپ سے روٹھ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرے لیے اچھائی اور

برائی کا معیار آپ کی پسند ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہی ناکہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔“

”ہاں! لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ یہی کہنا چاہتے تھے نا؟“

”ہاں! میں یہی کہنا چاہتا تھا۔“ رنبیر نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”اور آپ اذان سن کر نماز پڑھنے گئے تھے؟“

”ہاں!“

”بھیا! مجھے آپ سے یہ گھٹہ ہے گا کہ یہ خبر آپ نے سب پہلے مجھے کیوں

نہ سنائی۔ مجھے تو اسی دن معلوم ہو گیا تھا جب آپ کے دوست یہاں آئے تھے۔“

”کون عبد الواحد؟“

”ہاں!“

”لیکن انھیں تو معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ میں نے تو اُس دن کلمہ پڑھا تھا جب تمھارے گھر پہنچنے کا پیغام ملا تھا۔“

”انھوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی باتیں سننے کے بعد میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اُن کا کوئی دوست اُن کے مذہب سے محبت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ ان کا دشمن بھی انھیں قریب سے دیکھنے کے بعد اُن کے مذہب سے نفرت نہیں کر سکتا۔“

”اور مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ میری نفی بہن میری زبان سے اسلام کا نام سن کر میرا منہ نوچنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ آج نماز کے بعد میں نے انتہائی عاجزی سے یہ دعائیں گئی تھیں کہ خدا تمھیں بھی اسلام قبول کر لے کی توفیق دے۔“

شکنتلا کی آنکھوں میں سترت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کہا: ”بھیا! آپ کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ میں کئی دنوں سے اسلام کی صداقت پر ایمان لاپچی ہوں اور آج میں گاؤں کی تمام عورتوں کو بلا کر یہ اعلان کر دوں گی کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔“

تھوڑی دیر دو دنوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر شکنتلا نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”آپ اس بات پر رضا تو نہیں ہوں گے بھیا!“

”میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا شکنتلا! مجھے تم پر فخر ہے۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ میری بہن کا ضمیر اس قدر روشن ہے تو میں اتنی مدت تذبذب کی حالت میں نہ گزارتا میرے لیے دعا کیا کرو کہ خدا مجھے جنت اور استغاثت دے۔“

”بھیا! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری تمام دعائیں آپ کے لیے ہوتی ہیں۔ میرے علاوہ اُن گاؤں کے کئی لوگ آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔“

زبیر نے کہا: ”آج جب میں نماز کے لیے پہنچا تو جماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں پچھلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد جب لوگوں نے مجھے دیکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ امام نے مجھے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ میں نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ میں آج ظہر کی نماز کے بعد گاؤں کے تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دوں گا۔“

شکنتلا نے جواب دیا: ”اسلام کے مبلغ کی بیوی قریباً ہر روز میرے پاس یا کرتی ہے میں نے بھی اس سے وعدہ کیا تھا کہ جس دن میرا بھائی آجائے گا میں گاؤں کی تمام عورتوں کے سامنے مسلمان ہونے کا اعلان کروں گی۔“

زبیر نے کہا: ”فرض کرو اگر میں گراہی کا راستہ نہ چھوڑا تو۔“

”بھیا مجھے یقین تھا کہ آپ اسلام کی روشنی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔“

”صرف عبد الواحد کی باتوں سے تمھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا؟“

”شکنتلا نے جواب دیا: ”مجھے صرف اُس کی باتوں سے ہی اس بات کا یقین نہیں ہوا تھا بلکہ جے کرشن کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا تھا وہ بھی مجھے اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ آپ کے خیالات میں ایک بہت بڑا انقلاب آچکا ہے۔ جب میں نے یہ کہانی اسلام کے مبلغ کی بیوی کو سنائی تھی تو اُس نے بھی یہ کہا تھا کہ تمھارا بھائی دیر تک اسلام سے دور نہیں رہ سکتا۔“

زبیر نے کہا: ”میں نے دین کے ساتھ اپنا نام بھی تبدیل کر لیا ہے اور آج سے تم اپنے بھائی کو زبیر کی بجائے یوسف کے نام سے پکارا کرو گی۔“

”یوسف! مجھے یہ نام بہت پسند ہے بھیا۔ اور آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کو نئے ناموں سے پکارا کریں گے۔“

”ابھی تک میں نے تمھارے لیے کوئی نیا نام نہیں سوچا۔“

”آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں! اسلام کے مبلغ کی بیوی مجھے زہیدہ کے نام سے پکارا کرتی ہے اور مجھے نام پسند ہے۔“

شام تک یہ دونے نام گاؤں کے ہرنچے اور بوڑھے کی زبان پر تھے۔ ایک ہفتے کے اندر ان درگاؤں کے نصف سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور مٹی کے اس چبوترے کی جگہ جہاں آٹھ دس آدمی نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے ایک مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔

زہیر کے لوگوں میں شہبونا تھو نے سبقت کی۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ زہیر اور شہبونا مسلمان ہو چکے ہیں تو وہ سیدھا اسلام کے مبلغ کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا۔ ”یوسف کا کیا مطلب ہے؟“

مبلغ نے جواب دیا۔ ”یوسف ایک مینبر کا نام ہے۔“

”مینبر کون ہوتا ہے؟“

خدا اپنے جن بندوں کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجتا ہے انہیں مینبر کہا جاتا ہے۔“

”یوسف کے کسی نوکر کا نام آپ کو یاد ہے؟“

”اُن کے کسی نوکر کا نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”تمہارا ج! میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سردار مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے

اپنا نام بدل کر یوسف رکھ لیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ میرا نام بھی تبدیل کر دیں۔“

”تو آپ پہلے مسلمان ہو جائیں پھر کوئی نام سوچ لیا جائے گا۔“

”میں تیار ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد شہبونا تھو نے عمل میں واپس آیا اور تمام نوکروں کو جمع کر کے اعلان

کیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میرا نام ابراہیم ہے۔ ہر شخص اچھی طرح سُن لے اور آپ اگر مجھے کسی نے شہبونا تھو کہا تو اس کی خیر نہیں۔“

(۳)

یوسف دن بھر یا تو مسجد کی تعمیر کے کام کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا یا آس پاس کی بستیوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ زہیدہ گاؤں کے مبلغ کی بیوی سے قرآن کا درس لیا کرتی تھی۔ گاؤں کی نو مسلم عورتوں کے لیے اس کے محل کا دروازہ کھلا رہتا اور وہ بھی زہیدہ کے ساتھ قرآن پڑھا کرتی تھیں۔

رات کے وقت سونے سے پہلے بہن اور بھائی درتکسا آپس میں باتیں

کیا کرتے تھے، پرانے دفتوں کی باتیں۔ زہیدہ، یوسف کو اپنے مصائب کے دور

کی تفصیلات سنایا کرتی تھی اور وہ اس کے سامنے نذد کی قید کے زلے کے مختلف

واقعات بیان کیا کرتا تھا۔ یوسف کی اکثر داستانوں میں عبد الواحد کا ذکر ضرور آتا تھا۔

بھائی کی طرف سے بے پناہ محبت اور عقیدت کے انظار نے عبد الواحد کی شخصیت کو

زہیدہ کے لیے اور زیادہ پر شکوہ بنا دیا تھا۔ آخری ملاقات کے بعد عبد الواحد اس

کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز بن چکا تھا اور وہ مستقبل میں اُس کی دائمی رفاقت

کے تصور سے مرشار رہا کرتی تھی۔ لیکن بعض اوقات بھائی کی باتیں سننے کے بعد وہ

یوں محسوس کرتی، جیسے وہ مٹھن سینوں کی دنیا میں جی رہی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتی

”عبد الواحد سرکشوں کی گردنیں جھکانے، گوسے ہٹوں کو سہارا دینے، مظلوموں کے

آنسو پر نہچنے اور جھٹکنے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ

میری کسی خوبی سے متاثر نہیں ہوا۔ اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی مصیبت میں گرفتار

ہوتی تو وہ اُسے بھی اپنی توجہ کا مستحق سمجھتا۔“ ایسے خیالات سے اُس کا دل

تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ پھر وہ پہلی ملاقات کا تصور کرتی اور اس کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہونے لگتے۔ ”وہ مجھے دیکھتے ہی تھوڑی دیر کے لیے ہنسوت سا کیوں ہو گیا تھا؟ یہ آشا کون ہے؟ اُس نے مجھے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیوں کیا تھا؟“

ایک دن یوسف نندنہ کے کسی قیدی کا حال سنا رہا تھا۔ زبیدہ نے بھیجتے ہوئے سوال کیا۔ ”بھیا! عبدالواحد کی بیوی زندہ ہے؟“
یوسف نے جواب دیا۔ ”ابھی تک اس کی نشادی نہیں ہوئی۔“
زبیدہ نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ بُرا نہ مائن تو میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“
”پوچھو!“

”آشا کون تھی؟“

یوسف نے حیران ہو کر کہا۔ ”تمہیں آشا کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟“
”مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ جب آپ کے دوست پہلی بار مجھے دیکھا تو اُن کے منہ سے بے اختیار آشا کا لفظ نکل گیا تھا۔ پھر انھوں نے پریشان سا ہو کر کہا تھا کہ تمھاری صورت کسی اور لڑکی سے ملتی ہے اور میری نگاہیں دھوکا کھا گئی تھیں۔ پھر جب یہاں آئے تھے تو میں نے صرف اس خیال سے کہ آشا شاید اُن کی بیوی ہو، اُن سے پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ابھی تم اس سوال کا جواب نہ پوچھو۔ جب تمھارا بھائی آئے گا تو انھیں آشا کے متعلق بہت کچھ بتا سکے گا۔“

یوسف نے پوچھا۔ ”کیا انھوں نے یہ کہا تھا کہ تمھاری صورت آشا سے ملتی ہے؟“

”اے!“

یوسف نے قدرے ترقف کے بعد کہا۔ ”انھوں نے مجھے خود آشا کی کہانی سنائی تھی۔ اور یہ اس قدر دردناک ہے کہ تمہیں سن کر تکلیف ہوگی۔“

”میں ضرور سنوں گی بھیا!“

”بہت اچھا۔“ یوسف نے یہ کہہ کر عبدالواحد اور آشا کی داستان شروع کر دی۔ جب وہ اس المناک کہانی کا آخری حصہ سنا رہا تھا تو زبیدہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ عبدالواحد اب اس کے لیے ایک مہمان تھا، بلکہ ایک ایسا انسان تھا جسے اپنی تمام عظمت اور شوکت کے باوجود کسی کے محبت کے سہارے کی ضرورت تھی؛ کیا میں اس کی آشا بن سکتی ہوں؟ ”وہ اپنے دل سے بار بار یہ سوال پوچھ رہی تھی۔“

بستر پر لیٹنے کے بعد اسے دیر تک نیند نہ آ سکی۔ آشا کا لفظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ پھر وہ پسینوں کی دنیا میں جا چکی تھی۔ وہ آشا تھی اور عبدالواحد کے ساتھ پیاروں، ندیوں اور آبشاروں کے دلکش مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد راجہ کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے اور وہ ایک بلند پہاڑ پر دوڑ رہے تھے۔ وہ تھک گئی تھی، عبدالواحد اسے سہارا دے رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اُن کے سامنے ایک تاریک کھد تھی اور آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ پھر راجہ کے سپاہی انھیں پکڑ کر کالی دیوی کے سامنے لا رہے تھے۔ ایک مہیب انسان پھرا لیے کھڑا تھا۔ وہ چلا رہی تھی۔ ”ہیں چھوڑ دو۔ بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔“

(۴۱)

ایک روز وہ پرکے وقت یوسف اپنا بڑا اپنی بہن کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ہند آواز میں کہا۔ ”زبیدہ! زبیدہ! وہ آگئے ہیں۔“

”کون؟“ زبیدہ نے چونک کر سوال کیا۔

عبدالواحد! مجھے ابھی ان کا پیغام ملا ہے وہ غزنی سے قریب پہنچ گئے ہیں۔
اور میں کل اُن کے پاس جا رہا ہوں۔“

زبیدہ کا چہرہ سرت سے دمک اٹھا، ”آپ! آپ! کب آئیں گے؟“ اس نے پوچھا
یوسف نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا، ”میں بہت جلد
واپس آ جاؤں گا۔“

”انھوں نے آپ کو بلایا ہے؟“

”نہیں، انھوں نے اپنے اچھی کو صرف میرا پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ اچھی
نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگر بہت زیادہ مصروف نہ ہوتے تو خود یہاں آتے اب میں
انھیں یہاں آنے کی دعوت دیتے جا رہا ہوں۔ مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔“
”کیسا کام؟“ زبیدہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔

یوسف نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا، ”زبیدہ! میں جب بھی تمھارے
متعلق سوچتا ہوں میرے خیالات ادھر ادھر بھٹکتے کے بعد عبدالواحد پر مرکوز ہو جاتے
ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس سے بہتر تمھارے مستقبل کا محافظ اور کوئی نہیں ہو
سکتا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم ایک دوسرے کے لیے قدرت کا بہترین انعام ثابت
ہوئے۔ میں جانے سے پہلے تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔“

زبیدہ نے جواب دینے کی بجائے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
یوسف نے قدرے توقف کے بعد کہا، ”زبیدہ! تمھیں میرے انتخاب
پر اعتراض تو نہیں؟“

زبیدہ کچھ کسمے بغیر اٹھی اور بھاگتی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ یوسف کچھ

دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا، ”زبیدہ! زبیدہ! ادھر آؤ!“

زبیدہ بھگتی اور کشتی ہوئی دوبارہ اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ اس کی نگاہیں
زمین میں گڑی جا رہی تھیں اور گالوں پر حیا کی سرخ و سپید لہریں قہقہے کر رہی تھیں۔ یوسف
نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا، ”زبیدہ! نام ناگھ اور روپ دتی
کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، میں ان کے متعلق پریشان ہوں۔ اگر یہ
تمھارے متعلق ایک دن پہلے اطلاع مل جاتی تو میں ان کے ساتھ آتا، اب مجھے ڈر
ہے کہ وہ کاٹھیا واڈ کی مدد سے گزرتے ہوئے گرفتار نہ کیے گئے ہوں۔ اگر وہ سبھی
غیر حاضری میں یہاں پہنچ جائیں تو ان کا خیال رکھنا۔ نام ناگھ میرا من ہے، اس نے
میری جان بچائی تھی، ممکن ہے وہ کامنی کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ کامنی بہت ظلم
ہے، اُسے یہ احساس نہ ہونے دینا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں بھیا! میں بڑی بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہی ہوں۔“

یوسف نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، ”اچھا! میں اب جاتا ہوں۔“

”بھیا! زبیدہ نے جھگٹے ہوئے کہا، ”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی
ہوں آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟“
”نہیں پوچھو!“

”آپ کو معلوم ہے کہ اب نرملہ کہاں ہے؟“

”میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ سومات سے کہاں گئے ہیں
لیکن تمھیں اس کا خیال کیوں آیا؟“

”بھیا! مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ وہ آپ کی طرف سے بہتر سلوک
کی حتمی گواہی کی صورتوں نے مجھے بتایا ہے کہ میرے دُروپوش ہونے کے بعد وہ
مندرمیں جا کر میرے لیے دُما میں مانگا کرتی تھی۔ بے کوشش نے اُس کے عجز کرنے

دیکھ رہی تھی اس کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ یوسف مسکرایا اور اس کی کائنات
مسترت کے قہقروں سے لبریز ہو گئی۔

”زبیدہ!“ یوسف نے کہا: اگلے چاند کی پانچ تاریخ کو تمہاری برات آ رہی
ہے۔ مجھے عبدالواحد کے سامنے التجا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب میں نے کہا
کہ میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں تو اس نے کہا: تمہارے پیسے میری ایک درخواست
سُن لو۔ پھر اس کی باتیں سننے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی نگاہوں سے
کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ زبیدہ تم ایک داسی نہیں بلکہ رانی کی حیثیت سے اس
کے پاس جا رہی ہو۔ میرا ارادہ تھا کہ تمہاری شادی بڑی دھوم دھام سے کروں،
لیکن عبدالواحد ایسی رسوم کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے ہمراہ برات میں صرف چند
میں آدمی آئیں گے۔ عبدالواحد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر سال اپنی شخصیت
کے دن یہاں گزاریں گے۔“

شام تک یہ خبر اس پاس کی بیٹیوں میں مشہور ہو چکی تھی کہ یوسف کی بہن کی
شادی توج کے فوجی گورنر سے ہوتے والی ہے اور مردوں اور عورتوں کی ولیاں
یوسف اور زبیدہ کو مبارک باد دینے آ رہی تھیں۔

گیارہ دن بعد زبیدہ اپنے محل کی چھت پر کھڑی نئے مینے کا چاند رکھ رہی تھی۔
پھر ایک صبح وہ دلہن کا لباس پہننے محل کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی ہوئی
تھی۔ گاؤں کی خواتین کے علاوہ قرب و جوار کے نو مسلم اور غیر مسلم سرداروں کی بہن
بیٹیاں اس کے گرد جمع تھیں، ایک کس لڑکی بھاگتی ہوئی اندرونی صحن میں داخل
ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا: ”برات آگئی!“ آن کی آن میں چند لڑکیاں
بھاگ کر بالا خانے کی چھت پر چڑھ گئیں اور باقی عورتیں مکان سے باہر کھلے صحن
میں جمع ہو کر برات کا انتظار کرنے لگیں۔

پر میرا سلخ لگانے والوں کے لیے انعام مقرر کیا تھا۔ اس نے آپ کی جان بچانے
کی بھی کوشش کی تھی۔ زکرائیوں نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے آنسو اس وقت تک
خفک نہیں ہوئے جب تک اُسے یہ خبر نہیں مل گئی تھی کہ آپ جان بچ کر محل
گئے ہیں۔ پھر جب اس نے محل چھوڑا تھا تو وہ دور رہی تھی۔ بھائی جان! جب
یہاں تھی تو کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے؟
یوسف نے جواب دیا: ”اُس وقت میں یہی سوچ سکتا تھا کہ وہ میرے کرشن
کی بیٹی ہے۔“

”اور اب؟“

”اب اس کے متعلق سوچنے سے کیا فائدہ؟ ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے
ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔“ یوسف یہ کہہ کر اٹھا اور سفر کا لباس تبدیل کرنے
کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

(۵۱)

یوسف کو گئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ سہ پہر کے قریب آسمان پر بادل چھلنے
ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ زبیدہ ایک کمرے کے درپچے کے
سامنے بیٹھی باہر بھانک رہی تھی۔ اچانک باہر برآمدے میں سے کسی کے پاؤں کی
آہٹ سنائی تھی اور وہ فرد دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ یوسف کمرے میں داخل
ہوا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ باؤ زبیدہ۔“ یوسف نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

زبیدہ بیٹھ گئی۔ یوسف نے اپنی کمر سے تلوار اُتار کر دیوار کے ساتھ کھونٹی پر لٹکا
دی اور زبیدہ کے قریب بیٹھ گیا۔ زبیدہ جھکی ہوئی نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف

خادم نے جواب دیا: "ہمارا ج! ایک عورت آپ سے فنا چاہتی ہے۔"
 "کون ہے وہ؟ میں اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔"
 کسی نے خیف آواز میں کہا: "جی میں روپ دیتی ہوں۔"

روپ دیتی! "یوسف نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ خادم کے ساتھ
 ایک خیف اور لاغر عورت کھڑی تھی۔ یوسف چند ثانیے پریشان سا ہو کر اس کی طرف
 دیکھتا رہا پھر اس نے کہا: "رام نا تھ کہاں ہے؟"

روپ دیتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا
 "مجھے معلوم نہیں۔ برا خیال تھا کہ وہ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ میں مندر سے ایک
 اور آدمی کے ساتھ یہاں پہنچی ہوں۔ بیماری کے باعث مجھے کسی جگہ رستے میں ٹھہرنا پڑا
 اب تک انھیں یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔"
 یوسف نے کہا: "آئیے! اندر بیٹھ کر امینان سے بات کیجیے۔"

روپ دیتی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

یوسف نے سوال کیا: "آپ ابھی یہاں آئی ہیں؟"

"نہیں، میں کل آپ کے گاؤں میں پہنچ گئی تھی۔ لیکن آپ اپنی بہن کی
 شادی میں مصروف تھے اس لیے میں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم
 گاؤں کے ایک مکان کے گھر ٹھہر گئے تھے۔"

"آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"میرے ساتھ بے کرشن کا ایک نوکر ہے۔"

"کون سا بے کرشن؟"

"نرملہ کا باپ۔ اگر وہ میری مدد نہ کرتا تو اب تک دوبارہ سومات پہنچ

چکی ہوتی۔"

محل کی ڈیوڑھی سے باہر عوام کا ایک سجم کھڑا تھا۔ براتی مددازے کے قریب
 پہنچ کر گھوڑوں سے اترے اور علاقے کے معوزین انھیں پھوؤں کے مار پہنانے
 لگے۔ براتیوں کی تعداد دو لکھا سیمت پندرہ تھی۔ ان میں سے آٹھ فوج کے افسر اور باقی
 فوج کے بااثر سردار تھے۔ جب یہ لوگ صحن میں داخل ہوئے تو عورتوں نے ٹلک کی
 رسم کے مطابق ایک راگ شروع کر دیا۔

رات مہمان خانے کے سامنے ایک وسیع شامیانے کے نیچے بیٹھ گئی۔
 عبدالواحد اپنے لباس سے ایک ٹرک معلوم ہوتا تھا۔ شامیانے کے ارد گرد جمع ہوئے
 والوں کی نگاہیں اس کے پیرے پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جب نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی تو پڑوس کے ایک
 راجپوت سردار کی لڑکی زبیدہ کے کان میں کہہ رہی تھی: "بھگوان کی قسم تمہارا بیویوتا
 معلوم ہوتا ہے۔"

اگلی صبح کہاں زبیدہ کی ڈولی اٹھا کر باہر نکلے تو یوسف کی آنکھوں سے بے اختیار
 آنسو اتر پڑے۔

دردرازے سے باہر عبدالواحد اور اس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے
 بعد یوسف محل کے اندر داخل ہوا تو اسے اپنے گرد پیش کی ہرہیز ادا اس اور ہنوم
 نظر آنے لگی۔ وہ کسی سے بات کیے بغیر بالائی منزل کے ایک کمرے میں پہل گیا اور
 دروازہ بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا: "میری بہن۔ میری شکنتلا۔ میری زبیدہ۔ وہ
 ایک بچے کی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اس نے کہا۔

خادم نے آواز دی: "ہمارا ج! میں ہوں۔"

"کیا بات ہے؟"

”مجھے تمام حالات اطمینان سے سنائیے۔ یوسف یہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور روپ دتی نے تفصیل سے اپنی سرگزشت بیان کر دی۔

یوسف دیر تک سر جھکائے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہنان مالات میں نام نہاد کو آپس سے کئی دن پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں۔ میں خود منہیر جا کر اس کا پتہ کر دوں گا۔ سبے کرشن کا نوکر کہاں ہے؟“

دشمن کے گھر میں

”روپ دتی نے جواب دیا: میں اسے دوانے کے باہر چھوڑ آئی ہوں۔“

یوسف نے کہا: ”مجھے اگلے ہفتے اپنی بہن کو لینے قنوج مانا تھا۔ اب میں اسے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ منہیر جا رہا ہوں۔ وہ زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر میں اُن سے مل کر واپس آ جاؤں گا اور کل سُورج نکلنے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ سبے کرشن کے نوکر کا نام کیا ہے؟“

”گو بند رام!“ روپ دتی نے جواب دیا۔

”میں اسے مہمان خانے میں بھیج دیتا ہوں آپ یہیں آرام کریں۔ نوکرانی آپ کے لیے کھانا لے آئے گی۔“ یوسف یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر کے قریب یوسف واپس آ گیا اور اس نے روپ دتی سے کہا: ”میری بہن اگلے ہفتے واپس آ جائے گی۔ اگر عبدالعزیز کو فرمات ہوئی تو وہ بھی اس کے ساتھ چند یہاں رہے گا۔ آپ کے علاج کے لیے کسی اچھے طبیب کی ضرورت ہے۔ میں نے عبدالعزیز سے کہہ دیا ہے اور انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ قنوج پہنچتے ہی ایک تجربہ کار طبیب علاج کے لیے بھیج دیں گے۔ میں علی الصباح گو بند رام کو ساتھ لے کر منہیر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ وہاں مجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔“

شام کے وقت زطاپائیں باغ میں گھوم رہی تھی کہ اچانک گو بند رام اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خوف اور اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ گو بند رام نے ہاتھ باندھ کر پرنام کرتے ہوئے کہا: ”میں روپ دتی کو وہاں پھونڈا ہوں۔“

زطاپائیں اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ”تم واپس کب آئے؟“

”میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ سردار گھر پر نہیں تھے اس لیے میں خود ہی آپ کو اطلاع دینے آ گیا ہوں۔ میں نے رام ناتھ کے متعلق بہت بُری خبر سنی ہے اب اسے بچانے کی کوئی صورت نہیں؟“

”نہیں“ اب اس کی مدد کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ اور تم بہت دیر میں واپس آئے ہو۔ میں روپ دتی کے متعلق بہت پریشان تھی۔“

”اس کی بیماری کے باعث ہمیں راستے میں کسی دن رکنا پڑا۔“

زطاپائیں پوچھا: ”زبیر اپنے گھر میں تھا؟“

گو بند رام نے جواب دیا: ”ہاں! اور اب وہ میرے ساتھ آئے ہیں۔“

پوچھے تو اسے کہ دینا کہ انھیں گواہی دے میرے ماموں نے کسی ضروری کام کے لیے پتا جی کے پاس بھیجا ہے۔
گو بند رام نہ کہہ سکا، لیکن اگر تھا کر جی نے پوچھ لیا کہ آپ اس وقت گھر کیوں جا رہی ہیں تو؟
وہ سوسنات گئے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو پتا جی کے گھر جانے کے لیے مجھے ان سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔
گو بند رام کو رخصت کرنے کے بعد نرملہ نے عمل کا رخ کیا۔ وہ اپنے دل میں بیک وقت شرم، خوف اور اضطراب محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں ڈنگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پالکی میں بیٹھی اپنے باپ کے مکان کا رخ کر رہی تھی۔

(۲۱)

نرملہ ایک کمرے کے دروازے میں کھڑی صحن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پیارے لال تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا: آپ نے مجھے بلایا ہے؟
وہ بولی: ہاں میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ پتا جی ابھی تک آپس کیوں نہیں آئے؟
”جی مجھے تو وہ یہی کہہ گئے تھے کہ وہ شام تک آپس آجائیں گے، لیکن ممکن ہے کہ وہ دوسرے گاؤں کی فصل دیکھنے کے لیے چلے گئے ہوں اور آج رات وہیں ٹھہر جائیں۔“
”تم ابھی گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤ اور میری طرف سے یہ پیغام دو کہ ایک مہمان آیا ہے اس لیے آپ ابھی گھر آجائیں۔“
”مہمان کہاں ہیں؟“
”اب تم وقت مناسب نہ کرو۔ جلدی جاؤ، مہمان تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ

ایک ٹائیہ کے لیے نرملہ کی رگوں کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا۔
اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: رہبر تھلے ساتھ آیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟
”میں انھیں دھرم شالہ میں چھوڑ آیا ہوں۔“
”وہ یہاں کیوں آیا ہے؟“
”رام ناٹھ کا پتہ کرنے۔“
”تھیں اس کی بہن کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔“
”جی ہاں! جس دن ہم وہاں پہنچے تھے۔ اُسی دن اُس کی بہن کی بلات آئی تھی۔ اُس کی شادی قزوج کے مسلمان حاکم سے ہوئی ہے۔“
”مسلمان سے؟“
”جی ہاں رہبر خود بھی مسلمان ہو چکا ہے۔“
”تم نے یہ بات شہر میں کسی اور سے تو نہیں کہی؟“
”جی نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔“
”مجھ سے وعدہ کرو کہ تم پتا جی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کرو گے۔“
”میں وعدہ کرتا ہوں۔“
”رہبر کو معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو۔“
”ہاں! انھوں نے خود مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“
نرملہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: تم انھیں میری طرف سے کہو کہ اگر آپ ابھی تک ہیں تو ابلی نفرت نہیں بھٹتے تو پتا جی کے گھر کا دروازہ آپ کے لیے کھلا ہے، آپ کو دھرم شالہ میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ میری دعوت قبول کر لیں تو انھیں وہاں لے آؤ۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گی۔ گھر میں کوئی نوکر اگر ان کے متعلق

جائے گا۔“

”تشریف رکھیے: زمرانے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

یوسف دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

زمرانے تدریس توقف کے بعد کہا: ”پتا چلی آج فصل دیکھنے کے لیے گئے تھے، مجھے اُمید ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“

یوسف نے کہا: ”آپ کو معلوم ہے میں کنسے لیے آیا ہوں؟“

زمرانے یوسف کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا: ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ لیکن اب رام ناٹھ کو بچا ناکسی کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ سومات کے پردہت کی قید میں ہے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے؟“

”ہاں۔ وہ اس کو قتل نہیں کریں گے۔ وہ اسے ہر روز موت سے زیادہ بھیانک سزائیں دینے کے لیے زندہ رکھیں گے۔ وہ اس سے یہ پوچھتے ہوں گے کہ ٹوپ لٹی کہاں ہے۔ اسے مندر سے نکالنے والے کون تھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ آپ کا دوست ہے اور آپ کو اس کی وجہ سے بہت صدمہ ہوگا۔ لیکن کاش میں اس کی مدد کر سکتی۔“

یوسف نے کہا: ”آپ نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کے لیے میں آپ اور آپ کے پتا چلی کا احسان مند ہوں۔“

”آپ کے مُنہ سے یہ الفاظ میرے لیے بہت بڑا انعام ہیں۔ میں آپ کے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں؟“

”کیسے؟“

”میرے ساتھ وعدہ کیجیے کہ آپ سومات میں رام ناٹھ کا بیچا نہیں کریں گے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میں دہاں جا کر کچھ نہیں

پیاے لال تے کہا: ”آپ کو گوبند رام کے متعلق معلوم ہو چکا ہے؟“
زمرانے جواب دیا: ”ہاں! لیکن اب باتوں کا وقت نہیں تم فوراً پتا چلی کوٹے کر یہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔“

پیاے لال کچھ اور کہنا چاہتا تھا، لیکن زمرانے کیوردیکھ کر خاموشی سے مہبط کی طرف چل دیا۔ زمرانے کچھ دیر برآمدے میں مہلتی رہی پھر کمرے کے اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رنبیر کے متعلق ہر لحظہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

یوسف اور گوبند رام بچے کرشن کے مکان میں داخل ہوئے۔ گوبند رام نے یوسف کے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک خادمہ کھڑی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر یوسف سے سوال کیا: ”آپ گوالیار سے آئے ہیں؟“

یوسف اس سوال کا جواب سوچ رہا تھا کہ گوبند رام بولی اٹھا: ”ہاں! انھیں اندر لے جاؤ۔“

”آئیے!“

یوسف نوکرائی کے پیچھے ہو لیا۔ وسیع صحن سے گزرنے کے بعد وہ ایک برآمدے میں داخل ہوئے اور خادمہ نے ایک روشن کمرے کے دروازے کے سامنے ٹکتے ہوئے کہا: ”آپ اندر تشریف رکھیں میں زمرادیوی کو بلاتی ہوں۔“

یوسف جھکنے ہڑا کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہر لحظہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے بچے وائیں ناٹھ دوسرا دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے نماز دیکھا اور اپنا تک اٹھ کر

کھڑا ہو گیا۔ زمرادروازے میں کھڑی تھی۔ یوسف نے نگاہیں جھکائیں لیکن ایک تصویر بدستور اس کے دماغ کی سطح پر گھوم رہی تھی۔

کر سکتا۔ لیکن اگر کسی دن مجھے اس بات کی امید ہو گئی کہ میں اپنی جان بچھیل کر اپنے دوست کی جان بچا سکتا ہوں تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔

میں بھی یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اس وقت اگر آپ وہاں جانے کا خطرہ مل بھی لیں تو بھی اپنے دوست کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

”میرا فوراً وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں، لیکن وہ دن بہت جلد آ رہا ہے جب سوشلٹ کی دیواریں میرا راستہ نہیں روک سکیں گی۔“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر نرملہ نے لٹکتے ہوئے کہا: ”میں آپ کے لیے کھانا لے گئی ہوں۔“

”نہیں، کھانا میں نے شام ہوتے ہی کھا لیا تھا۔“

”تو میں دیکھ لاتی ہوں۔“

”نہیں ابھی مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

نرملہ مایوس سی ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے کہا: ”مجھے آپ کی بہن کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس کی شادی پر ایک تحفہ بھیجنا چاہتی ہوں۔“

یوسف مسکرایا: ”آپ کا تحفہ اُسے مل چکا ہے۔“

”کون سا تحفہ؟“

”وہ گنگن جو آپ وہاں چھوڑ آئی تھیں۔“

”وہ میرے نہ تھے۔“ نرملہ کی آنکھوں میں آنسو ٹپک رہے تھے۔

یوسف نے کہا: ”آپ کے چہنچاہی ابھی تک نہیں آئے، میں جانے سے پہلے

اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔“

نرملہ نے جواب دیا: ”میں نے انہیں بلانے کے نوکر بھیج دیا ہے، لیکن آج

آپ نہیں جاسکتے۔“

”یہ آپ کا حکم ہے۔“

”نہیں یہ التجا ہے۔ اگرچہ مجھے اب آپ سے التجا کرنے کا بھی حق نہیں رہا۔“

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک کھڑکے

کنارے پہنچ چکا ہے۔ اس کا ضمیر کہہ رہا تھا: ”یوسف سنبھل جاؤ۔ تم ماضی کو واپس

نہیں لاسکتے۔ تمہارے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار کھڑی ہے۔ تمہارے راستے

ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ اس نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند لیں۔

نرملہ شاید اُس کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی،

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ”نرملہ! بنیر میری طرف دیکھو۔“

یوسف کا سارا جسم کپکپا اٹھا۔ اس نے گردن اٹھا کر نرملہ کی طرف دیکھا اُس

کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یوسف نے دوبارہ آنکھیں نیچی کرتے ہوئے

کرب انگیز آواز میں کہا: ”نہیں نہیں۔ مجھے آپ کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔

زندگی میں ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔

بہر نام بنیر نہیں یوسف ہے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ آپ سلمان ہو چکے ہیں لیکن میں ہر راستے میں آپ کا

پہنچا کروں گی۔“

یوسف کی مدافعت تو میں پوری شدت سے بیدار ہو چکی تھیں۔ اُس نے

اٹھتے ہوئے کہا: ”آپ مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش نہ کریں کہ میں نے

یہاں آنے میں غلطی کی ہے۔“

نرملہ نے کہا: ”میں آپ کو جانے سے نہیں روک سکتی، لیکن میں آپ کو

ہمیشہ یاد دلاتی رہوں گی۔“

ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

”تشریف رکھیے، جے کرشن نے کہا۔

یوسف کرسی پر بیٹھ گیا۔

جے کرشن اس کے قریب بیٹھ کر زلا کی طرف متوجہ ہوا۔ بیٹھ جاؤ بیٹی! تم لے

انہیں کھانا کھلایا ہے یا نہیں؟

”نہیں پتا جی! یہ ہمارے گھر کا کھانا نہیں کھائیں گے؟“

یوسف نے کہا: ”میں نے یہاں پہنچنے سے پہلے کھانا کھا تھا۔ لیکن آپ کا

گلہ دہر کرنے کے لیے میں دودھ کے چند گھونٹ پیئے کو تیار ہوں۔“

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ زلا یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

جے کرشن اور یوسف کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے

رہے۔ پھر جے کرشن نے کہا: ”وہ رنگی آپ کے پاس پہنچ گئی ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”ہاں! میں اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں“

اور میری بہن بھی گھر پہنچ گئی ہے۔“

”کب؟“

وہ گوالیار پر مسلمانوں کے حملے کے فوراً بعد گھر پہنچ گئی تھی۔ مجھے سونات میں

ذرا دیر سے اطلاع ملی۔“

”وہ کہاں تھی؟“

”وہ گوالیار کے ایک غریب کسان کی پناہ میں تھی۔“

جے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: ”آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ

آئے لیکن بھگوان جانتا ہے میں ہر روز آپ کی بہن کے لیے دعائیں مانگا

کرتا تھا۔ میری بیٹی کے ساتھ آپ نے جو موت کی تھی وہ ایک پتھر کو بھی بوم کر

یوسف نے تدریس نہ ہو کر کہا: ”لیکن زلا اب تمہاری شادی ہو چکی ہے۔“

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”میرا مذاق نہ اڑاؤ ورنہ میرے بلیڈان

کو شادی نہ کرو۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

یوسف کی قوت برداشت بواب سے پکی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر دروازے

کی طرف بڑھا۔ زلا چلائی۔ ٹھہر ورنہ مجھ سے روٹھ کر نہ جاؤ۔ میں بگلی ہوں۔ مجھے

معاف کر دو۔“

یوسف رُک گیا، لیکن اس میں زلا کی طرف دوبارہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی

ہمت نہ تھی۔

خادم ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: ”زلا دیوی،

سردار جی ہمارا راج آگئے ہیں۔“

زلا نے اپنے افسوس پوچھتے ہوئے کہا: ”انہیں یہاں لے آؤ۔“

خادم نے ٹھکر دروازے سے باہر بھاگتے ہوئے کہا: ”وہ آ رہے ہیں۔“

یوسف تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا، جے کرشن کمرے میں داخل ہوا۔ زلا

اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

آپ..... جے کرشن نے یہ کہہ کر اپنی نگاہیں یوسف کے چہرے

پر گاڑ دیں۔

”میں ورنہ ہوں۔“

جے کرشن چند تانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ورنہ

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”مجھے.... مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ کسی دن میرے گھر

ایک مہمان کی حیثیت سے آئیں گے۔“

یوسف نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ دیر دونوں خاموشی سے

متحد اور منظم ہو رہی ہیں؟

”آں!“

اور اس کے باوجود آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عمود سومات کو فتح کر لے گا؟
”ہاں، مجھے یقین ہے کہ اس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ قدرت نے جس مقصد کی تکمیل کے لیے عمود مغربی کو منتخب کیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ وہ ایک آندھی کی طرح آئے گا اور سومات کے دروازے پر پرہہ دینے والی افواج اس کے سامنے بشکول کا انبار ثابت ہوں گی۔

اپنی بیٹی کی زبانی رُپ و تی کے حالات سننے کے بعد سومات کے پردہت سے بے کرشن کی عقیدت نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود ابھی تک سومات کے سندر اور اُس کی مورتی سے اس کی عقیدت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ اُس نے گنگو کا رخ بدلنے کی نیت سے کہا: ”میرا خیال ہے کہ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“

”نہیں“ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔“

”آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟“

”میں اب واپس جاتا چاہتا ہوں۔“

بے کرشن نے کہا: ”عالات کچھ ایسے ہیں کہ میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ پردہت کے جاسوس رام ناتھ کے دوستوں اور ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔ خاص کر اس شہر میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔“

یوسف نے کہا: ”جانے سے پہلے میں آپ سے ایک مزدوری بات

کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیسے!“

دینے کے لیے کافی تھی۔ آج میری آتما کو جو سکون نصیب ہوا ہے اس کا اندازہ شاید آپ نہ لگا سکیں۔“

نرملا چاندی کے کٹورے میں دودھ سیلے کمرے میں داخل ہوئی۔ یوسف نے اس کے ہاتھ سے گھٹالے لیا اور دودھ پینے کے بعد واپس دیتے ہوئے کہا: ”اب آپ کو مجھ سے کچھ نہیں رہا۔“

”نہیں!“ نرملا نے اپنے منہ پر ہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور نرملا کے ہاتھ سے خالی کٹورا لے کر باہر چلی گئی۔ نرملا اپنے باپ کے اشارے سے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

یوسف نے کہا: ”میں رام ناتھ کا پتہ لگانے آیا ہوں۔“

بے کرشن بولا: ”مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں نے اسے خبردار کرنے کی کوشش کی لیکن میرے نوکر کی ذرا سی غفلت نے تمام کام بگاڑ دیا۔ اب وہ پردہت کی قید میں ہے۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔ پردہت کے سامنے اس ملک کے کسی بڑے سے بڑے راجہ کو بھی دم مارنے کی جرات نہیں۔ رام ناتھ کو اب صرف کوئی غیب کی طاقت ہی بچا سکتی ہے۔“

یوسف نے کہا: ”سومات کے آہنی دروازوں کو توڑنے والی قوت ظہور میں آچکی ہے۔ جس تلوار کو عمود مغربی نے بے نیام کیا ہے وہ اس ملک میں بسکتی اگر ابھی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کی پکار کا جواب ہے۔“

بے کرشن نے کہا: ”آپ کو یقین ہے کہ وہ سومات تک پہنچے گا۔“

”مجھے یقین ہے۔“

اور آپ کو ان قوتوں کا بھی اندازہ ہے جو اس کا راستہ روکنے کے لیے

یوسف یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

بجے کرشن نے کہا: تھوڑی دیر بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" یوسف بیٹھ گیا۔ بجے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ تم ایک دن مجھے قتل کرنے کا ارادہ لے کر آتے تھے اور آج تم مجھے تہنوج آنے کی دعوت دے رہے ہو۔ میں اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

یوسف نے جواب دیا: "میں جس اندھیری بات میں جھٹک رہا تھا وہ گزر چکا ہے اور اب میں آپ کو صبح کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے میرے باپ کا قاتل نہیں بلکہ وہ انسان ہے جس نے ایک بے کس لڑکی کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔"

"میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ اگر میں اپنے لیے کوئی زبردست خطرہ محسوس کرتا تو شاید میں دُپ دنی کی مدد کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔"

سومنا کے دیوتا کی ناراضی سول لینے سے زیادہ خطرناک بات اور کیا ہو سکتی تھی؟

"میں نے سومنا کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ میرا مقصد دُپ دنی کو پرست کے عظم سے بچانا تھا۔"

وہ دن دُور نہیں جب آپ سومنا کے مندر کو اس کے پردہ ہت سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت سمجھیں گے۔ میں نے نندنہ کے قید خانے میں جس آفتاب کی روشنی دیکھی تھی وہ یہاں بھی نمودار ہونے والا ہے۔ میں روشنی دیکھنے کے بعد بھی کچھ عرصہ اپنے ترہنات کی تادیبوں میں جھٹکتا رہا۔ آپ بھی شاید یہی کریں لیکن وہ دن دُور نہیں جب میرا در آپ کا راستہ ایک ہو گا۔ میری طرح آپ کو اس وقت تک سکون نصیب نہیں ہو گا۔ جب تک کہ آپ ان گنت دیوتاؤں سے مُنہ موڑ کر اس خدا کی

تہنوج کے راجہ نے آپ کی جائداد کا ایک حصہ چھین کر میرے پتا کوڑے دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی جو جائداد ہمارے قبضے میں ہے آپ کو واپس لانا دی جائے۔ میری بہن بھی اس فیصلے میں شریک ہے۔"

بجے کرشن نے حیرت زدہ ہو کر پہلے بڑبلا اور پھر یوسف کی طرف دیکھا اور کہا:

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا محل اور آپ کی زمین آپ کو واپس لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

بجے کرشن نے منہ موم لہجے میں کہا: "دُربیر! میں پہلے ہی شرم اور ندامت کے بوجھ تلے پا جا رہا ہوں، جھگوان کے لیے مجھے اور زیادہ شرمسار نہ کرو۔"

یوسف نے پریشان سا ہو کر کہا: "اگر آپ کو میری بات سے صدمہ ہوا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں، لیکن آپ کو میرے غلوں پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے آپ کے غلوں پر شبہ نہیں، لیکن اس عمل اور زمین کا ذکر میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

یوسف نے کہا: "ہمیں ماضی کو بھول جانا چاہیے۔ آپ کی جائداد میرے پاس امانت ہے۔ آپ جب چاہیں اسے واپس لے سکتے ہیں۔"

لیکن وہ جائداد مجھ سے آپ کے پتا جی نے نہیں بلکہ تہنوج کے راجہ نے چھینی تھی۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا اس پر کوئی حق ہے تو میں آپ کے لیے اس حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

"نہیں! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر آپ کسی دن اپنے وطن آنے کا فیصلہ کریں تو اپنی جائداد کے متعلق آپ کو میرا وعدہ یاد دلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

عظمت اور تقدیس کے سامنے سر نہیں جھکا دیں گے جو زمین اور آسمان کا خالق ہے جس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں۔ وہ بُت جن کی آڈیں صدیوں سے ایک انسان نے دوسرے انسان کا شکار کھلا ہے۔ ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گے۔ انسانیت کا بول بالا ہوگا۔ چھوٹ اور اچھوٹ ایک دوسرے سے نکلے مل رہے ہوں گے۔ انسان اپنے رنگ اور خون سے نہیں بلکہ اعمال سے پہچانا جائے گا۔

سچے کرشن نے کہا: ”دُشمنِ مسلمان ہو چکے ہو“

”ہاں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی کے ستارے آنکھیں بند نہیں کریں گے۔ اب مجھے اجازت دیجیے اور یہ یاد رکھیے کہ میں آپ کو کسی شرط کے بغیر قہوج آگے کی دعوت دے چکا ہوں۔“

سچے کرشن نے کہا: ”ٹھہریے! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا آپ کو خوشی حاصل ہوگی۔ دُنیا میں ہر شخص اپنے گرد ایسے آدمی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جنہیں وہ اپنے خیال کے مطابق بہترین سمجھتا ہے۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آپ کے دل میں مجھے اسلام کا پرچار کرنے کا خیال کیسے پیدا ہوا اور آپ نے اپنے باپ کے قاتل کے ہارے میں یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ میرا جُرمِ معاف کر چکے ہیں، لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ مجھ سے آپ کی نفرت دوستی میں تبدیل ہو چکی ہے؟“

”آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے خود ایک ایسے آدمی نے اسلام کی طرف مائل کیا تھا جسے میں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ نندنہ کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد میں نے ایک پاداشی کو اپنا آخری مورچہ بنا لیا تھا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ اس پاداشی کا محاصرہ کر لیا۔ میرے لیے جان

بچا کر بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میرا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں ہتھیار ڈالنے کی بجائے دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر دوں گا۔ لیکن وہ اپنے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑ کر اکیلا بڑھا۔ اُس کی زبان میں جادو تھا اور اس کی باتوں میں اگر میرے کئی ساتھیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ اس کی سیٹھی بیٹھی باتیں میرے لیے زہر میں بجھے ہوئے نشتر تھیں۔ اُس کی مسکراہٹ میرے لیے ایک گالی تھی۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ میرے تیر کے سامنے آچکا تھا اور ایک لمحو کے لیے میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے مستقبل سے بے پروا ہو کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دوں، لیکن اس نے کوئی ایسی بات کہی جس سے زندہ رہنے کی خواہش مجھ پر غالب آگئی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ دُنیا میں میرا بہترین دوست ہے۔ جنگ میں اگر ہم ایک دوسرے کا سامنا کرتے تو شاید وہ میرا یا میں اس کا قاتل ہوتا۔ لیکن آج میں اُسے اپنا بھائی کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ اُسے مجھ سے اُس وقت بھی نفرت نہ تھی جب میں اپنی کمان اس کی طرف سیدھی کر چکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔“

سچے کرشن نے کہا: ”اور آج آپ یہی خواہش میرے متعلق لے کر آئے ہیں۔“

”ہاں، لیکن میں آپ کو اس وقت تک اسلام قبول کرنے کے لیے نہیں کہوں گا جب تک کہ آپ کا دل اس کی صداقت کا قائل نہیں ہوتا۔“

سچے کرشن نے کہا: ”اس وقت کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی میں صرف یہ جانتا ہوں کہ سردارِ مہمن چند کا بیٹا مجھ سے انتقام لے چکا ہے۔ اب باقی تمام عمر میری آتما کو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ دُشمن نے مجھے قتل نہیں کیا لیکن میری دُنیا کو دیرانِ سرور کر دیا ہے۔ اب مجھے دولت اور زمین کی فتنہ نہیں۔ اب مجھے

ہو کر کہا: "چلیے" وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ بڑے لمبے عرصے تک کھڑی رہا۔
 میں ان کچے پاؤں کی آہٹ سن رہی تھی، اور اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں
 کے پردے چل رہے تھے۔

جے کرشن 'یوسف' کے ساتھ کھٹے صحن میں داخل ہوا تو چاند نمودار ہو چکا
 تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سامنے چند لوگ چارباہیوں پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
 جے کرشن نے گوبند رام کو آواز دی اور وہ بھاگتا ہوا آیا۔ جے کرشن نے کہا: "یہ
 واپس جا رہے ہیں ان کا گھوڑا نھکا ہوا ہے۔ تم ان کے لیے میرا کھانا تیار کرو"
 اور دیکھو پیارے لال کہاں ہے؟

"مہاراج وہ اپنی کوٹھڑی کی پھٹ پر سو رہا ہے"

"اُسے تم یہاں بھیج دو" اور تم ایک کی بجائے دو گھوڑے تیار کرو۔"

گوبند رام بھاگ گیا تو یوسف نے جے کرشن سے پوچھا: "دو گھوڑے
 کس لیے؟"

جے کرشن نے جواب دیا: "میں ایک نوکر آپ کے ہمراہ بھیجنا چاہتا ہوں
 اس کا گھر آپ کے گاؤں کے قریب ہے۔ جب میں وہاں سے نکلا تھا تو وہ
 میرے ساتھ آ گیا تھا۔ اب اُسے اپنے رشتہ داروں کی یاد دلاتی ہے۔ اس نے
 صرف آپ کے خوف سے وہاں جانے کی جرأت نہیں کی۔ اب آپ اُسے تسلی
 دے کر اپنے ساتھ لے جائیں اور اسے اپنے پاس نوکر رکھ لیں۔ وہ تھوڑا سا بیروٹ
 ہے لیکن وفادار ہے۔ اب اس کا یہاں رہنا ویسے بھی ٹھیک نہیں۔ میں نے
 اُسے رام ناٹھ کو خبردار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے حماقت
 میں آکر کسی کو یہ بتا دیا کہ میں نے رام ناٹھ کو بھانے کی کوشش کی تھی تو ہماری شامت
 آجائے گی۔ لیجیے وہ آ رہا ہے۔"

حکومت کی خواہش نہیں۔ تم نے میری تمام دلچسپیوں کو موت کے گھاٹ اتار
 دیا ہے۔"

یوسف نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا: "میں بہت جلد اُس دنیا میں
 آپ کا سراگت گا جو آپ کی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع، رنگین اور پرہیزگار ہے۔ جہاں
 آرزوئیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ظلم اور استبداد کے قلعے جو مظلوم اور بے بس انسانوں کی
 ہڈیوں پر تعمیر ہوئے ہیں، صرف ایک جھٹکے کے مستطیل ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ گرتی
 ہوئی دیواروں کو سہارا دینے والوں کا ساتھ نہ دیں۔"

جے کرشن نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: "کاش یہ باتیں میری سمجھ میں آ
 سکتیں صرف اتنا جاننا ہر کہ میں اب کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

یوسف نے نرم لہجے کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اٹھ لی اور اپنے
 باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولی: "بتا دیجیے، ٹھہریے میں ان کی بہن کے لیے ایک
 کھنڈ دینا چاہتی ہوں۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔"

(۴۱)

جے کرشن اور یوسف خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔
 نرم لہجہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے چاندی کی ایک ڈبرہ یوسف کو پیش
 کی۔ یوسف نے ڈبرہ کھول کر ایک خوبصورت آنکھوٹھی دیکھتے ہوئے کہا: "مری بہن!
 آپ کا ہاتھ دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔"

نرم لہجہ کہنا چاہتی تھی، لیکن جذبات کے بحران میں اُس کی قوت گویائی
 سلب ہو چکی تھی۔ چند لمحات کے لیے اس کی نگاہیں جن میں ہزاروں العبابیں
 تھیں، یوسف کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یوسف نے جے کرشن کی طرف متوجہ

ضائع نہ کرو۔

”ہمارا ج! مجھے معاف کیجیے، مجھے ان کے یہاں آنے کی اُمید نہ تھی۔ میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔“ پیارے لال! یہ کہہ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگا۔ وہاں سے ایک کھڑی کا چھوٹا سا صندوق نکال کر باہر چاند کی روشنی میں لے آیا اور اُسے کھول کر ایک چھوٹی سی تھیلی جس میں نقدی تھی اور کپڑوں کے دو نفیس جوڑے نکالے اور ایک کھڑی میں باندھ لیے، پھر اُس کے دل میں کوئی خیال آیا اور کھڑی بغل میں دبا کر نکال کر طرف گیا۔ نرمل سے چند باتیں پر پھنے کے بعد اُس کے تمام خدشات دور ہو گئے اور وہ تیزی سے اُستبل کی طرف بھاگ گیا۔ گو بند رام دو گھوڑے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ایک گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا: گو بند رام! میں بہت دُور جا رہا ہوں، میری کوٹھڑی میں بتنا سامان ہے وہ سب تمہارا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جے کرشن ڈیوڑھی سے باہر یوسف اور پیارے لال کو الوداع کہہ رہا تھا۔

پیارے لال! انھیں ملتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ جے کرشن نے کہا: پیارے لال! تم اپنے گھر جانا چاہتے ہو تو فوراً تیار ہو جاؤ۔“

”ہمارا ج! آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو جاؤں!“

”ہاں! اب تمہیں وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ سردار رنیر خود نکلائے ساتھ ہوں گے۔“

”سردار رنیر!“

”ہاں! سردار رنیر تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ تم انھیں نہیں پہچانتے؟“

پیارے لال جواب دینے کی بجائے بدحواس سا ہو کر یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

یوسف نے کہا: اب تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں تمہاری حفاظت کا ذمہ لے چکا ہوں۔“

جے کرشن نے کہا: ”ماؤ! اب جلدی سے تیار ہو جاؤ! میں نے گو بند رام کو تمہارے لیے گھوڑے پر زین ڈالنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ لیکن یہاں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کون ہیں۔“

”ہمارا ج! آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ آج تک میں نے رام ناتھ کے متعلق بھی کسی سے کوئی بات نہیں کی، لیکن آپ بڑا نہ مانیں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہیں؟“

”ہاں یہ وہی ہیں۔“

”ہمارا ج! میرا مطلب ہے کہ یہ سردار موہن چند کے بیٹے ہیں؟“

”ہاں! تمہیں یقین نہیں آتا تو جا کر نرمل سے پوچھ لو، لیکن باتوں میں وقت

ملتان سے آگے

کالنجری کی آخری مہم سے واپسی کے بعد قریباً اڑھائی سال تک سلطان محمود کی افواج جنوب کی رزمگاہوں کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ اس عرصہ میں سومناست ہندوستان کا سب سے بڑا دہلی ہمسایہ بن چکا تھا۔ ملک کے سینکڑوں رلیجے اور سردار اپنے مضبوط ترین قلعوں کو غیر محفوظ سمجھ کر سومناست کی چار دیواری میں پناہ لے رہے تھے۔ مختلف مندروں کے پجاری اپنی دولت اور سونے چاندی کی مورتیوں کو وہاں منتقل کر رہے تھے۔ سومناست کے پجاری ہندو سماج کے سُورماؤں کا خون گرانے کے لیے ملک کے طبعی دعوں میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ عوام کو سومناست کی عظمت اور تہذیب کے افسانے سنا کر ایک متحدہ محاذ پر جمع ہونے کی ترغیب دیتے۔ آئے دن مختلف سمتوں سے رضا کاروں کی ٹولیاں سومناست پہنچ رہی تھیں۔ سومناست پلورہ کی پجاری ہندوستان کا قومی نعرہ بن چکی تھی۔ اڑھائی سال کی تیاریوں کے بعد سومناست کے محافظے شروع کر رہے تھے کہ شاید محمود واپس نہ آئے اور یہی اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے غزنی کا رخ کرنا پڑے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب ہندوستان کے شمال میں پانچویں دریاؤں کی سرزمین

غازیان اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپے دہل رہی تھی سلطان محمود نے ۲۲ شعبان ۶۱۶ھ ہجری کو غزنی سے کوچ کیا اور ماہ رمضان کے پندرہویں روز ملتان پہنچ کر شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کی باتا عمدہ فوج تیس ہزار آزمودہ کار سواروں پر مشتمل تھی، لیکن راستے میں ہر منزل پر رضا کاروں کی ٹولیاں اس کے ساتھ شامل ہوتی گئیں۔ ملتان اور سومات کے درمیان وہ صحرا حائل تھا جس کی بھیانک وسعتوں میں پاؤں رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ راستے میں کسی کسی نماز کی تکب سپاہیوں اور ان کے گھوڑوں کے لیے خوراک اور پانی ملنے کی امید نہ تھی سلطان نے ہر سپاہی کی رسد اور پانی اٹھانے کے لیے دو دو اونٹ مہیا کیے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار اونٹ صرف پانی لادنے کے لیے وقف کر دیے۔ ماہ رمضان کے اختتام تک ریگستان کے سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں عبید کی نماز کے بعد سلطان محمود منبر پر کھڑا ہو کر اپنی فوج کے سپاہیوں اور رضا کاروں کے سامنے یہ تقریر کر دیا تھا:

”میرے رفیقو! تم یمن چکے ہو کہ ہم کل میاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ ہماری منزل دُور اور آسہ کٹھن ہے۔ سومناست کی جنگ میرے نزدیک ہندوستان کی سرزمین میں کُفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہے اس جنگ میں ہماری فتح کے بعد آلے والی نسلوں کے لیے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے راستے کھل جائیں گے اور ہماری شکست کے ساتھ ان لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے جو اس ملک میں انسانیت کا بول بالا چاہتے ہیں۔ تم وہ خوش نصیب ہو جنہیں تقدیر نے باطل کا بول بالا چاہتے ہیں۔ تم وہ خوش نصیب ہو جنہیں تقدیر نے باطل کا آخری حصار توڑنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ شہرت اور ناموری کے شوق میں ہم کسی ملک میں گھوڑے دوڑا چکے ہیں لیکن آج میں جس

مقصود کے لیے تھیں تلوار اٹھانے کی دعوت لے رہے ہوں وہ میری ذات کے لیے زیادہ بلند ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ایسا ہے جو صرف میری خوشنودی کے لیے جنگ میں حصہ لینا چاہتا ہے تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیے مجھے صرف ان مجاہدوں کی ضرورت ہے جو شہادت کی تمنا رکھتے ہیں۔

سومناں ان تاریکیوں کی آخری جگہ پر پہنچے ہیں جن کے تعاقب میں ہم گنگا اور جھانکی دریاؤں میں جا چکے ہیں۔ سومناں کی دیواروں کے سامنے تمہارا مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو بھڑکی سردیوں کو فضا کا شریک سمجھتے ہیں۔

اُن کی تعداد تمہاری تعداد سے زیادہ اور ان کے وسائل تمہارے وسائل سے زیادہ ہوں گے۔ لیکن یاد رکھو! جن مجاہدوں کے خون سے تمہارے ماضی کی تاریخ کے روشن ترین صفحات لکھے گئے ہیں ان کی تعداد گنگا کے مقابلے میں ہمیشہ کم تھی۔ ایک ہزار یا ایک لاکھ بھیڑیوں کی جگہ ایک شیر کی گرج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سومناں کے مجاہدوں کو اپنے لشکر کی تعداد پر ناز ہے۔ انھیں اپنے ہتوں کی اعانت پر بھروسہ ہے لیکن اگر تم صدق دلی سے اس بات پر ایمان رکھتے ہو کہ فتح و شکست تمہارے خدا کے ہاتھ میں ہے تو میں تمہیں فتح کی بشارت دیتا ہوں۔ اگر تم صرف خدا کی خوشنودی کے لیے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو کوئی بھڑکی پیادہ اور کوئی سمندر تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔ اگر تم خدا کے دین کا لولہ بالا چاہتے ہو تو دنیا کی تمام عظمتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔

اگلی صبح اہلِ ملتان اس عظیم الشان قافلے کو گرد کے ہادلوں میں روپوش ہونا دیکھ رہے تھے جس کی منزلی مقصود سومناں تھی۔ درمیانے سلیج عبور کرنے کے بعد یہ لشکر اس وسیع صحرائی داخل ہوا جہاں آفتِ پرینگوں آسمان کا کنار ا ریت کے ٹیلوں سے

بلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریگستان میں کہیں کہیں تھوڑے اور چھوٹے چھوٹے جھاڑیوں کے ہوا سنہرے کانام و نشان نکلتے تھے۔ موسم سرما کے آغاز کے باعث صحرائی ہوا میں ایک خوشگوار تبدیلی آچکی تھی، دن بھر کی تھکی ماندی فوج جب شام کے وقت پڑاؤ ڈالتی تو صحرائی خاموش فضا اونٹوں کی بلہا ہٹ اور گھوڑوں کی ہنہٹا ہٹ سے گونج اٹھتی۔ رات کے وقت سپاہی ٹھنڈی ریت پر لیٹ جاتے۔ پچھلے پیر پڑاؤ کے ہر گوشے سے نقاروں کی صدا ایں نہیں گھمکی تھی۔ بھر مؤذن کی اذان سنائی دیتی اور وہ نماز کے لیے جمع ہو جاتے۔ سورج کی ابتلائی کرکے اس قافلے کو اگلی منزل کا رخ کرتے ہوئے دکھتے ہیں۔

رسم اور پانی کی تقسیم میں مکمل مساوات کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔ سلطان اور بڑے بڑے جرنیلوں کو بھی اتنا ہی راشن ملتا تھا جتنا کہ ایک عام سپاہی کے لیے ملتا تھا۔ راستے میں سلطان نے دودھ واہ کے مشہور تلے پر حلقہ کیا۔ اہلِ قلعہ نے کچھ دیر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کی لیڈر کے سامنے اُن کی پیش قدمی سلطان کے سپاہی پتھروں اور تیروں کی بارش سے بے پروا ہو کر ٹیڑھیوں اور کندوں کی بدد سے تلے کی فسیل پر چڑھ گئے۔ اہلِ قلعہ کے محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس کے بعد قریباً ایک ماہ کے طویل اور صبر آزمات سفر کے بعد سلطان کی فوج اہلِ دارہ کے سامنے کھڑی تھی۔

(۲)

اہلِ دارہ کے مہاراجہ بھییم دیو کی خود اعتمادی بلا وجہ نہ تھی۔ اس کا لشکر قریباً ایک لاکھ سواروں، دو سو ہاتھیوں اور نوے ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس نے سومناں کے پردہت کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ دشمن کی فوج شمال کے صحرائی عبور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ چنانچہ سلطان محمود کو سومناں تک پہنچنے کے

انھیں بدلی کا طعنہ نہیں دیتا۔ ہمارے ٹک کے کئی بخوبی بہتا چکے ہیں کہ دشمن سوناٹا ضرور پہنچے گا۔ آپ کے دربار میں جو راجے اور سردار موجود ہیں ان میں سے اکثر کے رائے یہ سننے کو ملک کے باقی راجاؤں کی افواج کی طرح ہمارے لشکر کو بھی سوناٹ میں جمع ہونا چاہیے تھا۔ سوناٹ کی دیواروں تلے ہم زیادہ خود اعتمادی اور زیادہ جوش و خروش سے لڑ سکتے ہیں مجھے ڈر ہے کہ اگر شمال سرحد پر ہماری فوج کو شکست ہوئی تو انہل داڑھ میں بدلی پھیل جائے گی اور لیکن ہے پھر ہمارے کئی اور ساتھی بھی یہاں لڑنے کی بجائے سوناٹ چلے جائیں۔

راجہ بھیم دیو نے جوش میں آکر کہا: اگر تم میں سے کوئی ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتا ہے تو ہم اس کا راستہ نہیں روکیں گے۔ ہم آخری دقت تک اپنے اس عہد پر قائم رہیں گے کہ محمد کا لشکر ہماری لاشیں روندے بغیر سوناٹ کا رخ نہیں کر سکتا۔ ہم مندر ہیر کی فوج کو بھی پہنچنے کا کم لٹے چکے ہیں۔

ایک عمر رسیدہ سردار کچھ کہنے کے لیے اٹھا، لیکن اچانک سامنے کے دروازے سے انہل داڑھ کے لشکر کا سپہ سالار نمودار ہوا، اور ہمارا راجہ اور اس کے درباری سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سپہ سالار نے منہ کے قریب پہنچ کر فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

بھیم دیو نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: سینا پتی جی! آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟

”اُن داتا میں.....“

”کیسے خاموش کیوں ہو گئے؟“

”اُن داتا! مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ مجھے دشمن کا راستہ روکنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔“

ہمارا راجہ بھیم دیو نے کہا: تمہارا چہرہ بہت کچھ بتا رہا ہے۔ تم صاف کیوں نہیں

لیے مشرق کی طرف سے ایک طویل چکر کا رخ کر لے گا۔ ایسی صورت میں اگر اس نے سوناٹ پہنچنے سے پہلے انہل داڑھ کا رخ کیا تو ہم شمال مشرقی سرحد پر ہی اُسے روک لیں گے اور اگر وہ ہم سے ٹکریے بغیر بلا راست سوناٹ کی طرف بڑھ گیا تو ہم عقب سے حملہ کر کے اس کی فوج کو تتر بتر کر دیں گے۔ لیکن صحرا کی طرف سے سلطان کی پیش قدمی نے انہل داڑھ کے در و دیوار پر ایک لرزہ طاری کر دیا۔ راجہ بھیم دیو نے تیس ہزار سپاہی دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ کر دیے اور باقی فوج کو جو مشرقی سرحد پر متعین تھی اپنی راجدھانی کی حفاظت کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا۔

ایک صبح بھیم دیو اپنے تخت پر رونق افروز تھا۔ سلطنت کے اکابر اور ہمہ سایہ ریا ستوں کے باجگزار حکمران اس کے دربار میں حسب مراتب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ہمارا راجہ نے کچھ دیر خاموشی سے حاضرین دربار کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہمارے چند ساتھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں لیکن ہماری فوج کی تعداد اب بھی دشمن سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں اس بات کی ہرگز اُمید نہ تھی کہ دشمن ریگستان کو عبور کرنے کی مجرات کرے گا۔ لیکن اب ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے ہمیں یقین ہے کہ ہمارے تیس ہزار سپاہی شمال کی سرحد پر ہی دشمن کا راستہ روک لیں گے، لیکن اگر انھیں دشمن کے دباؤ سے پیچھے ہٹ پڑا تو سوناٹ کی جنگ انہل داڑھ کی دیواروں کے سامنے لڑی جائے گی اور ہم دشمن کو یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ انہل داڑھ کے سورما فوج، کا لچر اور گوالیار کے سورماؤں سے کہیں مختلف ہیں۔

ایک باجگزار راجہ نے اٹھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: ہمارا ج! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔

”کیسے؟“ بھیم دیو نے جواب دیا۔

”ہمارا ج! ہمارے جو ساتھی یہاں جمع ہونے کی بجائے سوناٹ چلے گئے ہیں اُن

کہ سلطان محمود کو سومات کے سوا ہر میدان میں فتح ہوگی۔

لیکن تم اس دہم کا مذاق اڑا کر دیتے تھے۔

”میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ دشمن کی قوت کے متعلق میرے اندازے غلط تھے۔ وہ ایک سیلاب ہے اور دیوتاؤں کی مدد کے بغیر کوئی طاقت اس کے سامنے نہیں بٹھ سکتی۔“

ہمارا راجہ نے حاضرین دربار کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اب ہمارا سینا پتی بھی ہمیں پر مشورہ دے رہا ہے کہ ہم اپنی رعایا کو اس کے حال پر چھوڑ کر سومات بھاگ جائیں، لیکن یاد رکھو جو سیاہی ایک بار دشمن کو بٹھ دکھاتا ہے وہ دوبارہ سینماں کرکھڑا نہیں ہو سکتا۔

ایک یا جگر راجہ نے اٹھ کر کہا: ہمارا ج! لڑائی میں ہنتر بدلتے اور بھاگنے میں بہت فرق ہے۔

ہمارا راجہ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: ”مجھے تم جیسے ساتھیوں کی ضرورت نہیں تم جا سکتے ہو۔ دشمن کے مقابلے کے لیے میری اپنی فوج کافی ہے۔“

راجہ کچھ اور کہنے بغیر باہر نکل گیا۔

ہمارا راجہ بھیم دیو چٹابا: تم میں سے کوئی اور بھی ہے جو اس کا ساتھ دینا چاہتا ہے؟ باج گار راجائوں کے دواؤں، مگران اور مشرقی سرحد کے باج سردار اٹھ کر باہر نکل گئے۔ دربار میں تھوڑی دیر کے لیے مٹا چھا گیا۔

بھیم دیو نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: اگر ان لوگوں کے پاس سومات جانے کا بہانہ ہوتا تو ہم انھیں زندہ زمین میں کاڑھ دیتے۔ ہم ہڑلوں اور بہادروں کو ایک گچے میں جمع نہیں کرنا چاہتے۔ سینا پتی جی! آپ بھی ان لوگوں کے ساتھ جا سکتے ہیں؟ سینا پتی نے کہا: اُن دانا! آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔

کہتے کہ تھیں شکست ہوئی ہے۔

ہمارا ج! دشمن کا حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ہماری فوج کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ اُن کی آن میں اس کے ہرادل دستے ہماری فوج کے دونوں بازوؤں کو پھیرتے ہوئے عقب میں پھینچ گئے۔ اس کے بعد باقی لشکر ہم پر ٹوٹ پڑا۔

ہمارا راجہ نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا: اور پھر تم بھاگ نکلے۔ اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم کتنی فوج بچا کر لائے ہو؟

”اُن دانا! ہمارے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے ہیں۔“
”اور دشمن کا نقصان ہمارے نقصان سے زیادہ ہو گا۔“

”ہاں ہمارا ج!“

”مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے شکست کھانے کے بعد ہر سینا پتی یہی کہا کرتا ہے۔ اب ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اطلاع دینے کے لیے تم نے خود یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟ کیا باقی بائیس ہزار سپاہیوں میں سے کوئی بھی تمہارا اہلکی بننے کے قابل نہ تھا؟“

”اُن دانا! چند بائیس ایسی ہیں جن کے لیے میرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ ہمارے اکثر سپاہی یہ خیال کرتے ہیں کہ دشمن کو صرف سومات کے میدان میں شکست دی جا سکتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ واپس آتے ہی تمام لشکر میں بددلی پھیلا دیں گے۔“

”ہمارے لشکر میں ایسے لوگوں کی تعداد پہلے ہی کم نہیں۔ ہمارے بعض ساتھی تمہاری اطلاع کا انتظار کر سکتے ہیں۔ پہلے ہی سومات پہنچ چکے ہیں۔“

سینا پتی نے کہا: ہمارا ج! مجھے یقین ہے اہل دارہ میں ہمارا لشکر دشمن کے دانت کھٹے کر سکتا ہے، لیکن کاش ہم اپنے سپاہیوں کا یہ دہم دور کر سکتے

یہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں فوراً اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ آخری وقت ہمارے
ساتھ کتنی فوج رہ جائے گی۔ اس وقت فوج کے علاوہ شہر کے لوگوں کو بھی تسلی
دینے کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنے گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔

بھیم دیو نے کہا: تم اسی وقت چھاؤنی خالی کر دو۔ اور فوج کو شہر بیاہ کے
اندر جمع کر کے تمام دروازے بند کر دو۔ کاش میں ایسے بزدلوں کو زنجیروں میں جکڑ
کر دشمن کے آگے ڈال سکتا۔

سیناپتی نے جھکتے ہوئے پوچھا: کیا ہمارا ج کا آخری فیصلہ یہی ہے کہ ہم
انہل وارڈ میں ڈٹے رہیں۔

”اس وقت ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ۔“

سیناپتی کمرے سے باہر نکل گیا اور ہمارا بھٹہ حال سا ہو کر ایک گڑسی پر
بیٹھ گیا۔ ساتھ دالے کمرے سے ہمارا بی نمودار ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر سوال کیا
”سیناپتی کیا کہتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ آپ آرام کریں۔“

”لیکن آپ بہت پریشان ہیں۔“ ہمارا بی نے اس نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔
ہمارا بھٹہ کچھ کہنے کو تھا کہ باہر دروازے کے قریب کسی کے پاؤں کی آہٹ
سنائی دی پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی: ”ان داتا!“

راجہ کے کان اس آواز سے مانوس تھے اس نے کہا۔ اندر آ جاؤ۔ کیا بات ہے؟
محل کا دروازہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمسید کے بغیر کہا: ”ان داتا!“
شہر کے لوگ محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں اور شہر کے رہنوں کا ایک وفد
اس وقت آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا بھٹہ جلدی سے باہر نکلا تو اسے برآمدے سے تھوڑی دُور سیناپتی اور تعلقے

اس کے بعد آپ کا جو فیصلہ ہو اس پر عمل کرنا میرا دھرم ہے۔“

ایم سیناپتی کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک سپاہی کی حیثیت سے
ہمارا ساتھ دے سکتے ہو۔ ”یہ کہہ کر ہمارا راجہ حاضرین دربار کی طرف متوجہ ہوا۔ ہمارا آخری
فیصلہ یہی ہے کہ ہم اسی جگہ لڑیں گے۔ اگر تم میں سے کسی کو ہمارے اس فیصلہ سے
اتفاق نہ ہو تو اس کے لیے یہی بستر ہے کہ وہ ابھی سے ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔“

ایک سردار نے اٹھ کر کہا: ”ان داتا! ہمارا جینا اور مرنا آپ کے ساتھ ہے۔“

ہمارا راجہ نے کہا: ”ہم ایک بار پھر پوچھتے ہیں کیا تم سب ہمارے ساتھ ہو؟“

”جی ہمارا راجہ!“ حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا۔

اس کے بعد کچھ دیر لڑائی کی مختلف تجاویز پھیلتی رہتی رہی پھر دوبارہ بغاوت

ہو گیا۔

(۳)

رات کے تیسرے پہر ہمارا بھیم دیو گہری نیند سے بیدار ہو کر اپنے نئے سیناپتی کی
زبانی یہ خبر سُن رہا تھا کہ تادمہ فوج کے پندرہ ہزار سپاہی معزول شدہ سیناپتی کی راہنمائی
میں سومات کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اور باقی فوج میں بھی علم بغاوت کے آثار پاتے جاتے ہیں۔
ہمارا راجہ نے غصے سے کانپتے ہوئے سوال کیا: ”تم نے انھیں روکنے کی کوشش کیوں نہ کی؟“

نئے سیناپتی نے جواب دیا: ”ہمارا راجہ! میں نے فوج کو ان کے گرد گھیر ڈالا ہے
کاظم دیا تھا لیکن کسی نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ وہ سب یہی کہتے ہیں کہ سومات کی
رکشا کے لیے جانے والوں کا راستہ روکنا پاپ ہے۔ میں ان کا یہ دھم دور نہیں کر سکتا
کہ سومات کے سوا ہمیں کسی اور میدان میں کامیابی نہیں ہوگی۔ فوج کے فسر حکم کھاتے کہ
ہمیں کھارا ج کا نسل وارڈ میں جنگ کرنے کا فیصلہ تبدیل کرنا پڑیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ
صبح تک فوج کے کئی اور دستے ہمارا ساتھ نہ چھوڑ جائیں۔ دشمن باغیہ پیر کے اندر اندر

کے چند فوجی افراد دکھائی دیے۔ سینا پتی نے آگے بڑھ کر کہا: ہمارا ج! حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ شہر کے لوگ محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں اور ہماری فوج کے کئی دستے بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ مجھے یہ حالات دیکھ کر دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔

بھیم دیو نے سرانگی کی حالت میں سوال کیا: وہ کیا چاہتے ہیں؟
ہمارا ج! وہ صرف "سومنات چلو" کا نعرو لگا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے چند الفاظ انھیں مطمئن کر دیں گے۔
بھیم دیو نے کہا: چلو!

تھوڑی دیر بعد ہمارا جہ نے محل کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر لوگوں کے ہجوم کو مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز سومنات چلو کے پرجوش نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اگلی رات جب سلطان محمود کی فوج انہل داڑھ سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی، ہمارا جہ بھیم دیو کنپڑ کوٹ کا رخ کر رہا تھا۔ ہاتھیوں کے علاوہ بیس ہزار سوار اس کے ہمراہ تھے۔ اس کے بیس ہزار سپاہی سومنات کے دیوتا کے چروں میں جان دینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور باقی مغرب کے ساحل علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

(۴۱)

ٹھاکر دگھونا تھ کے محل سے باہر ایک کھلے میدان میں مندر اور اس کے قریب جوا کے سردار اپنی اپنی فوج کے ساتھ جمع ہو رہے تھے۔ زملامل کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی تھی۔ ایک خادم نے اس کے قریب آ کر کہا: آپ کے پتا جی آئے ہیں۔

زملامل نے کہا: انھیں یہاں لے آؤ۔

تھوڑی دیر بعد جے کرشن کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمبید کے بغیر کہا: زملامل! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟

زملامل نے جواب دیا: پتا جی! میں نے ابھی تک مندر چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کیا۔
بیٹی! اب سوچنے کا وقت نہیں۔ مسلمانوں کی فوج انہل داڑھ کے قریب پہنچ چکی ہے اور انہل داڑھ کے متعلق میں نے جو بارہ خبر ہے اس سے میرا اندازہ ہے کہ سلطان محمود کو یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔
انہل داڑھ کے متعلق آپ نے کیا سنا ہے؟

جے کرشن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ٹھاکر نے تمھیں نہیں بتایا۔
نہیں! وہ مجھے صرف سفر کی تیاری کا حکم دے گئے ہیں۔ انہل داڑھ کے متعلق انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔

جے کرشن نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ سلطان محمود کی پیش قدمی روکنے کے لیے ہمارا جہ نے جو فوج شمال سرحد کی طرف روانہ کی تھی اسے شکست ہوئی ہے اور ہمارا جہ کے ساتھیوں میں سے چند راجے اور سردار اپنے اپنے لشکر کے ساتھ سومنات روانہ ہو گئے ہیں۔ گزشتہ رات یہ افواج ہمارے شہر کے قریب گزری تھیں۔ اب معلوم نہیں سلطان کا لشکر کب یہاں پہنچ جائے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔
زملامل نے کہا: پتا جی! میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔

جے کرشن نے کہا: دیکھ بیٹی! نادان نہ بنو تمھیں مسلمانوں کے متعلق اس قدر مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ جب آندھی آتی ہے تو بھارتیوں کے ساتھ کبھی کبھی پھل دار درخت بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب وہ آئیں گے تو دیر میں یہ لوگ تمھیں پناہ دینے کے لیے موجود نہیں ہوں گے۔ جب تک یہ ظوفان گزر نہیں جاتا ہمیں

(۵)

نرملہ کو روانہ کرنے کے بعد ٹھاکر گھوٹا تھ نے یہیں ہزار سواروں اور چالیس ہاتھیوں کے ساتھ انٹل واڑہ کا رخ کیا۔ لیکن وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اُسے شمال کے آفتی پر ایک لشکر دکھائی دیا۔ ٹھاکر نے اپنی فوج کو روکنے کا حکم دیا اور ایک تجربہ کار افسر کو چند سواروں کے ہمراہ آگے بھیج دیا۔ افسر نے واپس آکر اطلاع دی کہ وہ فوج انٹل واڑہ سے آرہی ہے۔ سینا پتی ٹھاکر داس خود اس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

”وہ کہاں جا رہے ہیں؟“ ٹھاکر نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔

”ہمارا ج! وہ سومات جا رہے ہیں۔“

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ہمارا ج کا یہی ارادہ تھا تو انھوں نے ہمیں انٹل واڑہ میں جمع ہونے کا حکم کیوں دیا اور ٹھاکر داس تو بسینا پتی بھی نہیں رہا۔ افسر نے کہا: ہمارا ج! میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ وہ میرے تمام سوالات کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں کہ تم ٹھاکر جی کو میرے پاس بھیج دو۔ دیکھیے ہمارا ج! انھوں نے راستہ بھی تبدیل کر لیا ہے۔ شاید وہ ہم سے کترا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔“

”تم میرے واپس آنے تک فوج کو یہیں روکو۔“ ٹھاکر نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

ایک ساعت کے بعد ٹھاکر گھوٹا تھ واپس آکر فوج کے سرداروں اور افسروں کو نئی صدمتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا اور انٹل واڑہ سے آنے والا لشکر آگے جا چکا تھا۔ انٹل واڑہ کے اکابر اور فوج کے افسروں سے دیر تک بحث کرنے کے بعد ٹھاکر نے یہ فیصلہ کیا کہ یہیں اگلے شہر میں پڑاؤ ڈال کر انٹل واڑہ

مندھیر سے باہر رہنا چاہیے۔ ٹھاکر نے اپنا خزانہ بھی میرے سپرد کر دیا ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے میدانِ جنگ سے دُور رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔ لیکن اگر تم نے یہاں ٹھہرنے پر ضد کی تو مجھے ٹھاکر کے ساتھ جانا پڑے گا۔“

ٹھاکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے جلدی کیجیے۔
”ہم تیار ہیں۔“ جے کرشن نے کرسی سے اٹھ کر جواب دیا۔

ٹھاکر نے نرملہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”نرملہ پر نشان ہونے کی کوئی بات نہیں مجھے یقین ہے کہ تمہیں کنٹھ کوٹ پہنچنے سے پہلے یہ خبر مل جائے گی کہ ہم نے دشمن کے لشکر کا منہ پھیر دیا ہے۔“

نرملہ نے کہا: لیکن میں نے سنا ہے کہ انٹل واڑہ کی فوج نے ابھی سے بھاگنا شروع کر دیا ہے۔“

ٹھاکر برہم ہو کر جواب دیا: چند بُزدل راجوں اور سرداروں کے چلے جانے سے انٹل واڑہ کی طاقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب تم جلدی کرو، میں جلنے سے پہلے تمہیں رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک ساعت کے بعد نرملہ اور جے کرشن عورتوں اور بچوں کے ایک قافلے کے ساتھ کنٹھ کوٹ کا رخ کر رہے تھے۔ نرملہ اپنی دو نوکرانیوں کے ساتھ ایک ہاتھی کے ہونج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پانچ ہاتھیوں پر دو سکر سواروں کے بال بچے سوار تھے اور دو ہاتھیوں پر ٹھاکر گھوٹا تھ کا خزانہ لدا ہوا تھا۔ باقی عورتیں بچے اور چند بوڑھے گھوڑے اور بیل گاڈیوں پر سوار تھے۔ قریباً ڈیڑھ سو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے۔ جے کرشن اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

چلایا: یاد رکھو! آج سونامی کا دیر تا تھیں دیکھ رہا ہے۔ ہم کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

تھوڑی دیر میں مندر کی فوج گاؤں سے باہر ایک کھلے میدان میں سونامی کی جے "کے نعرے لگا رہی تھی۔ سامنے سے آنے والی فوج کے دستے کوئی نصف میل کے فاصلے پر رک گئے۔ اُن کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مندر کے سپاہیوں کی سرانگی ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ لگھونا تھ کے حکم سے فوج کا ایک انفر گھوڑا بھگاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے تھوڑی دیر بعد واپس آکر اطلاع دی کہ وہ سلطان کی فوج کے سپاہی ہیں۔

لگھونا تھ نے انتظار کیے بغیر فوج کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مندر کی فوج کے قلب میں ہاتھیوں کا دستہ اور دائیں بائیں اور پیچھے سواروں کی صفیں گر کر بادل اڑاتی ہوئی آگے بڑھیں، لیکن سلطان کی فوج کے دستے جو اہل دارہ سے یلغار کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے، اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد مندر کے لشکر کی اگلی صفوں کے سوار دشمن کو دونوں پہلوؤں سے گھیر کر ہاتھیوں کی زخمی لانے کی غرض سے ایک نصف دائرے کی صورت میں پھیل گئے اور ہاتھیوں کی تعداد اُن کی جگہ پر کرنے کے لیے آگے آگئی۔ اچانک مسلمانوں کے دستوں میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور رضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ترکمان شہسواروں کے ایک دستے نے مندر کی فوج کے بائیں بازو پر حملہ کیا اور اس کے پیچھے فوج کے باقی تمام دستے دشمن کی صف کو چیرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اُن کی آن میں لگھونا تھ کے ہاتھیوں کے سامنے گرد کے بادلوں کے ہوا کچھڑ تھیں۔ قبل اس کے کہ مندر کی فوج اپنی بدحواسی پر قابو پا تی۔ مسلمانوں کے دستے پلٹ کر دوبارہ حملہ کر چکے تھے اور بائیں بازو کے سوا باقی افراتفری کے ماحول میں

کے تازہ حالات معلوم کر لینے چاہتے تھے۔ چنانچہ مغرب آفتاب کے قریب اس فوج نے شمال مغرب کی طرف کوئی تین کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے شہر کے باہر ٹپاؤ ڈال دیا اور چند سردار سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمراہ اہل دارہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اگلی صبح ٹھاکر اپنے فاصدوں کی زبانی یہ خبر سُن رہا تھا کہ ہمارا بھیم پوکھنڈ کوٹ کی طرف بھاگ گیا ہے۔ اور سلطان کے ہراول دستوں نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اہل دارہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے۔

ٹھاکر نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ تیسرے پہر یہ فوج مندر سے کوئی چھ سات کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہی تھی کہ ایک سپاہی شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں چلایا: ہمارا راج ہمارا راج! ایک اور فوج آ رہی ہے۔

ٹھاکر اور اس کے ساتھیوں نے مُوکر دیکھا تو افاق پر سواروں کی ایک دُھندلی سی بھلک دکھائی دی۔ ٹھاکر نے کہا: یہ دشمن کی فوج نہیں ہو سکتی وہ اتنی جلدی یہاں نہیں پہنچ سکتا۔

ایک عمر رسیدہ سردار نے کہا: ہمارا راج! ہو سکتا ہے کہ دشمن نے اپنے ہراول دستے پہلے روانہ کر دیے ہوں، ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔

ٹھاکر نے گرجتی ہوئی آواز میں جواب دیا: اگر وہ دشمن کے سپاہی ہیں تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ میں بھاگنے والوں کا ساتھ نہیں دوں گا۔ بہادری ہمیشہ اپنے سینے پر تیر کھاتے ہیں۔

مندھیر کے سردار تذبذب پریشانی اور خوف کی حالت میں ٹھاکر لگھونا تھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے گھوڑے سے اُترا اور ایک ہاتھی پر سوار ہو کر

پڑھتے ہی انہل وارہ روانہ ہو جاؤ اور سلطان معظم کو اطلاع دو کہ انہل وارہ سے مندر تک راستہ صاف ہو چکا ہے اور ہم کل صبح مندر کی چار دیواری سے باہر ملک کا انتظار کریں گے؟

(۶)

مندھیر کی بیشتر آبادی یہاں مندر کے علاوہ بڑے بڑے سواروں کے محلات تھے، قدیم شہر کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر تھی۔ علی الصباح سلطان کی فرج کے طوفانی دستوں نے شہر سے باہر ملک کا انتظار کرنے کی بجائے شہر کے گرد چکر لگایا اور پھر مشرق کی طرف سے اندر داخل ہو گئے۔ مندر کے سپاہی اور عوام شہر کو خالی چھوڑ کر مندر کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ جب حملہ آوروں نے مندر کا رخ کیا تو انھیں تدم تدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے پے پیچے حملے کیے لیکن مندر کے دروازے تک پہنچنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ مندر کے اندر بڑا بڑا انسان آخری دم تک لڑنے کا حلف اٹھا چکے تھے۔ جب حملہ آوروں کے ہاؤسے دروازے کے محافظوں کا ایک گروہ پیچھے ہٹا تو دوسرا گروہ اس کی جگہ لے لیا۔

اہل مندر جس جوش و خروش سے مندر کے دروازے پر لوہے سے تھے اگر اسی جوش و خروش سے آگے بڑھ کر جوابی حملہ کرتے تو ان کے لیے مٹی بھر حملہ آوروں کو شہر سے باہر پھیل دینا مشکل نہ تھا، لیکن شہر کے رہن انھیں یہ بتا چکے تھے کہ اگر انھوں نے مندر چھوڑ کر کوئی نیا محاذ بنایا تو ان پر دیوتاؤں کا عتاب نازل ہو گا۔

دوپہر سے قبل مندر کے دروازے پر لاشوں کا انبار لگ گیا اور اہل مندر نے مندر کا دروازہ بند کر لیا۔ لیکن حملہ آوروں کا ایک دستہ ایک جگہ سے دیوار بچھانہ کر اندر داخل ہو گیا۔ مندر کے محافظوں نے اس دستہ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی،

ہاتھیوں کی صف کی طرف سمٹ رہے تھے۔

عرب اور افغان سواروں کے چند دستوں نے عقب سے پکر کاٹ کر حملہ کیا اور ہاتھیوں کی صف اور بائیں بازو کے سواروں کے درمیان شکاف ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد مندر کی فرج میں افزائری پھیل چکی تھی سوار کسی نظم کے ماتحت رٹنے کی بجائے کئی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے دستے ایک طرف سے حملہ کرتے اور انھیں بتر بتر کرتے ہوئے دوسری طرف نکال جاتے۔ مندر کے کئی سوار افزائری میں اپنے ہاتھیوں کی زد میں آکر ہلاک ہو چکے تھے۔ گھوڑا اپنے بڑھاپے کے باوجود جرات اور ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا اس نے چند بار ہاتھیوں کا رخ پھیر کر دشمن پر حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے تیز رفتار گھوڑے ہر بار اس کی زد سے بچ کر ادھر ادھر نکل جاتے۔ ایک ساعت کے بعد جب مندر کے بعض سردار اپنے اپنے دستوں کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو وہ اپنے ہاتھی کے ہوج میں کھڑا دونوں ہاتھ مندر کے انھیں دھرم کی نصیحت کا واسطہ بنے رہا تھا — اچانک دشمن کے کسی سپاہی کا تیراؤس کے سینے میں لگا اور وہ تیرا کر ہوج میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر ہاتھیوں کے دستے کے ایک افسر نے اپنے سپاہیوں کو سپاہی کا گم دیا۔

مندھیر کی بیشتر فرج پہلے ہی میدان سے دو چکر ہو چکی تھی۔ ہاتھیوں کے میدان سے نکلنے کی دیر تھی کہ وہی سہی فرج بھی بھاگ نکلی مسلمانوں نے کوئی تین کوس تک بھاگتے ہوئے لشکر کا پیچھا کیا اور سینکڑوں سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے بالآخر ان کے سالار نے انھیں روکنے کا حکم دیتے ہوئے کہا "اب ہم آگے نہیں جاسکتے۔ ہمارے گھوڑے ہوابے چکے ہیں۔ مغرب کی ناز کے بعد ہم آس پاس کی کسی بستی میں قیام کریں گے۔ پھر اس لیے ایک نوجوان افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم ناز

لیکن تھوڑی دیر میں چند اور دستے دیوار پھانڈ کر اندر آ گئے اور انھوں نے مندر کے محافظوں کو ایک طرف دھکیل کر باقی فوج کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اہل مندر ہیر نے چاروں اطراف سے سمت کر ایک جان توڑ حملہ کیا۔ لیکن عین اس وقت جب بند میں داخل ہونے والے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے سلطان کی فوج کے دس ہزار مزید سپاہی آپہنچے اور اہل مندر ہیر کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ سرسبزگی کی حالت میں اُدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کوئی دیوار پھانڈ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی تالاب میں کود رہا تھا۔ مندر کے پجاری جو اب اپنی شکست یقینی سمجھتے تھے جنوب کا دروازہ کھلوا کر پڑنے شہر کی طرف نکل گئے۔

ستی

ٹھاکر کے زخمی ہونے کا علم فوج کے چند افراد اور ان سپاہیوں کے ہوا اور کسی کو نہ تھا جو آخری وقت تک اس کے ساتھ تھے۔ مات کے وقت اسے محل میں پہنچانے کے بعد فوج کے افسر اعلیٰ نے شہر کے چند معززین اور مندر کے پردہت کو صورت حالات سے باخبر کیا تو وہ ٹھاکر کو دیکھنے کے لیے آئے۔ ٹھاکر کی حالت نازک تھی پردہت نے شہر کے اکابر سے کہا: ٹھاکر کے زخمی ہونے کی خبر سن کر شہر کے عوام میں بدولی پھیل جائے گی! اس لیے ہمیں یہ مشورہ کر دینا چاہیے کہ ٹھاکر فوج کی شکست کے بعد مندر ہیر کی حفاظت کے لیے راجہ بھیج دیو سے مدد لینے کنبھ کوٹ گئے ہیں اور بہت جلد واپس آجائیں گے؟

اتفاق سے اہل واٹھ کا شاہی طبیب مندر میں موجود تھا۔ ٹھاکر کے نوکر اسے ٹھاکر کی مرہم پٹی کے لیے لے آئے۔ اگلے دن جب سلطان کے ہراول دستے مندر پہنچ گئے تو ٹھاکر کی فوج کے افسر نے محل کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ٹھاکر کو ایک نوکر کے گھر پہنچا دیا اور ایک سوار کو جے کرنن کی طرف یہ پیغام لے کر روانہ کر دیا کہ ٹھاکر زخمی ہو گئے ہیں! اس لیے آپ راستے میں رُک جائیں اور دوسری اطلاع کا انتظار کریں

تفسیر سے پھر سلطان محمود اپنی بیشتر افواج کو راستے میں ایک منزل کے نامیلے پر بیٹھا کرتا ہوتا مندر ہیر پہنچا تو مندر کے علاوہ شہر پر بھی مسلمانوں کے پرچم لہرا رہے تھے اور تالاب کے کنارے مندر میں نصب کیے ہوئے ایک ہزار بتوں کے ٹکڑے انسان کے تراشے ہوئے خداؤں کی بے ثباتی کا اعتراف کر رہے تھے۔ مندر ہیر کے مندر کی دولت اس خزانے سے کہیں زیادہ تھی جو اہل واٹھ میں سلطان محمود کے ہاتھ آیا تھا۔

ہو گیا تھا، مندر کے چند بھاریوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا۔ اس نے جے کرشن اور ٹھاکر کے رشتہ داروں سے دسی ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد کہا: مجھ اس بات کا افسوس ہے کہ ٹھاکر گھوٹا تھا جی اپنی موت سے پہلے ہمارے دھرم کے دشمنوں کا انجام نہیں دیکھ سکے۔ دیوتاؤں نے مسلمانوں کو تباہی کے راستے کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اہل ایمان سے بیٹھے رہیں۔ جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ فوجاً سمونات روانہ ہو جائیں۔ اب دشمن دوبارہ یہاں نہیں آئے گا۔ اس سے انتقام لینے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم اس کا پیچھا کریں، راجہ بھیم دیو نے ہمارے دیوتاؤں کو ناراض کیا ہے۔ اب اس کے لیے ہمارے سامع میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اگر وہ بزدلی کا ثبوت دیتا تو ہم اس دنیا ہی کا سامنا نہ کرتے۔

ایک برہمن نے آگے بڑھ کر پوچھت کے کان میں کچھ کہا اور اس نے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا: سردار جے کرشن ہماری رائے یہ ہے کہ ٹھاکر جی کی آخری رسم پوری کرنے میں دیر نہ کی جائے۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر فوجاً سمونات پہنچنا چاہتا ہوں۔ آپ اندر جا کر زملہ دیوی کو تیار کریں۔

جے کرشن کے لیے یہ کھانا مشکل نہ تھا کہ زملہ کو کس مقصد کے لیے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔ اس نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹھاکر جی کے تمام رشتہ داروں کے یہاں پہنچ جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ کل تک ہمارا راجہ بھیم دیو بھی یہاں پہنچ جائے گا۔

پڑھت نے جواب دیا: بھیم دیو اہل واڈہ سے بھاگنے کے بعد ہمارا راجہ نہیں رہا۔ اب ٹھاکر گھوٹا تھا کے رشتہ دار کسی حیثیت سے بھی ہماری کسی کم میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جے کرشن نے کہا: ہمیں کم از کم ان کے باقی رشتہ داروں کا انتظار کرنا چاہیے۔

مندھیر فتح کر لے کے بعد سلطان نے گھوٹا تھا کے محل میں قیام کیا لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس محل کا مالک پاس ہی ایک تنگ دھاریک کوٹھڑی میں پڑا کرہا رہا ہے۔ تیسرے روز سلطان نے اپنے فکر کے ساتھ کوچ کیا۔ اس کے بعد کرہ کو دوبارہ محل میں لایا گیا۔ منوراج کے علاج کے باوجود اس کی حالت میں کوئی افادہ نہیں ہوا تھا۔ محل میں پہنچتے ہی اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے تیار داروں کو دیکھا اور خیف آواز میں پوچھا: زملہ نہیں آئی؟

منوراج نے جواب دیا: وہ آپ کے زخمی ہونے کی اطلاع ملنے پر راستے میں رُک گئے تھے۔ آج صبح دشمن کے یہاں سے کوچ کرتے ہی ان کی طرف ایک سار بھیج دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کل صبح تنگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن ٹھاکر گھوٹا تھا زیادہ دیر ان کی راہ نہ دیکھ سکا۔ اگلے دن طلوع آفتاب سے تھوڑی دیر بعد جب زملہ اپنے باپ کے ہمراہ واپس پہنچی تو اس کا شوہر مر چکا تھا۔ تانے قبل آخری بار اس کا نام لینے کے بعد دم توڑ چکا تھا۔

(۲)

زملہ ٹھاکر کی لاش کے پاس بیٹھی تھی اور شہر کی عمر رسیدہ عورتیں اسے ایک ہندو بیوی کا آخری فرض پورا کرنے کی تیاری کا مشورہ دے رہی تھیں۔ مندھیر کے عوام جو مسلمانوں کے کوچ کے بعد کسی حد تک اپنے ہوش و حواس پر قابو پا چکے تھے ٹھاکر کے محل سے باہر جمع ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کی موت ان کے نزدیک قوم کے ایک بہت بڑے ہیرو کی موت تھی۔ جے کرشن زملہ کو شہر کی خواتین کے ہجوم میں چھوڑ کر عمان خانے میں داخل ہوا تو وہاں ٹھاکر کے رشتہ دار شہر کے اُمراء اور برہمن موجود تھے۔ یہ لوگ ٹھاکر کی موت پر افسوس کر رہے تھے اتنے میں شہر کا راجہ مندر کے فتح کے بعد میں غائب

بیوی کے لیے سستی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور میری بیٹی کی دگوں میں بھی تو ایک راجپوت کا خون ہے اگر میں اسے منع کروں تو بھی وہ ٹھاکر جی کی پٹائی کٹا جائے گی۔
ماضی کے اطمینان کا سانس لیا اور پروہت نے کہا "مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ میرے خیال میں اب دیر نہیں کرنی چاہیے اور ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے ناریخ ہو جانا چاہیے۔"

"ہماری طرف سے دیر نہیں ہوگی مہاراج!" ٹھاکر کے ایک نشہ دار نے کہا، پروہت نے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا "ٹھاکر جی نے جو خزانہ آپ کے پروردگار کے پاس ہے؟"

جے کرشن نے جواب دیا: "مہاراج! میں نے وہ خزانہ یہاں واپس لانے کی بجائے سپاہیوں کے ایک دستے کی حفاظت میں کنڈھ کوٹ بھیج دیا تھا، لیکن نرملہ کے تمام زیورات اس کے پاس ہیں میرے پاس بھی کچھ سونا چاندی ہے اور وہاں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس موقع پر دان کر دیا جائے۔ نرملہ کی خواہش ہے کہ ٹھاکر جی کی تمام جائداد مندر کو دے دی جائے۔"

برہمنوں کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے، لیکن ٹھاکر کے رشتہ دار خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ پروہت نے کہا: "بہت اچھا۔ سزا جے کرشن جی اب آپ تیاری کریں؟ جے کرشن اٹھ کر چل دیا۔"

(۳)

تھوڑی دیر بعد نرملہ ایک خادمہ نے اس کے کان میں کہا: "آپ کے پتی جی دوسرے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

جو لوگ ہم دیر کے ساتھ کنڈھ کوٹ بھاگ گئے ہیں وہ اب ٹھاکر کی ارحی کو ہاتھ لگانے کا حق نہیں رکھتے۔ ٹھاکر جی کے رشتہ دار وہ ہیں جو آخری دم تک ان کے ساتھ تھے، آپ باہر نکل کر دیکھیں شہر کے تمام بچے اور بوڑھے محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں سینکڑوں ایسے ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ دشمن کا پیچھا کرنے سے پہلے ٹھاکر جی کی آخری رسم پوری کرتے جائیں۔

جے کرشن نے کرب اگے آوازیں کہا: "لیکن ٹھاکر جی کی یہ خواہش نہ تھی کہ نرملہ کو ان کے ساتھ سستی کیا جائے، وہ اس رسم کو قابل نفرت سمجھتے تھے اور یہی دہر تھی کہ جب انھوں نے اپنے لیے خطرہ محسوس کیا تو نرملہ کو باہر بھیج دیا تھا۔"

ماضی کی نگاہیں جے کرشن کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ٹھاکر کے ایک رشتہ دار نے کہا: "یہ غلط ہے۔ ٹھاکر جی موت سے پہلے اپنی بیوی کو گھر میں دیکھنا چاہتے تھے۔"

برہمن نے کہا: "میں حیران ہوں کہ قنوج کے ایک راجپوت سردار کو اپنی بیٹی کا سستی ہونا پسند نہیں اور وہ بھی ٹھاکر گھوٹا تھ جیسے شوہر کے ساتھ۔"

ٹھاکر کے ماموں زاد بھائی ارجن دیو نے قدرے جوش میں اگر کہا: "مہاراج! قنوج کے راجپوتوں کا خون سفید ہو چکا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کے لیے سردار جے کرشن کا مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔"

شہر کے چند اداکار نے اس بحث میں حصہ لیا اور جے کرشن کو محسوس ہونے لگا کہ اس کا احتجاج یا التجا بے سود ہیں۔ اب نرملہ کو بچانے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں بھاگ جائے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا کپڑا لہجہ بدلتے ہوئے کہا: "آپ کیوں بگڑتے ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس رسم کے خلاف ہوں۔ میں نے صرف ٹھاکر جی کی راتے ظاہر کی تھی۔ ٹھاکر گھوٹا تھ کی

بہم محل میں رہیں گا تھکے بلے میں کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔ میں دیکھ آیا ہوں محل کا پچھلا دروازہ کھلا ہے اور آج وہاں کوئی پرو بھی نہیں ہے۔ اس گماگمی میں تمھاری طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ سیکٹر دوں عورتیں محل میں گھوم رہی ہیں تمھیں صرف یہ احتیاط کرنی ہے کہ کوئی غور سے تمھارا چہرہ نہ دیکھے۔

”لیکن پتا جی.....“

جے کرشن نے عاجز سا ہو کر کہا: بھگوان کے لیے اب بحث نہ کرو۔ تم جانتی ہو کہ تھکے بغیر میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ میں تم سے پہلے چتا میں کود جاؤں گا۔ لیکن میرا کما ماننے سے تم میری ادا اپنی جان بچا سکو گی۔ بھاگنے کی کوشش خطرناک ضرور ہے لیکن چتا میں چلنے سے زیادہ خطرناک نہیں۔ اس میں تو بچ بچنے کی امید ہے لیکن چتا کے شعلوں سے کون بچا ہے۔ نرملا! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم زندہ رہو گی۔ بھگوان! جس نے رام ناٹھ جیسے لوگوں کی ہیکار سن کر مسلمانوں کو

سومنات کا راستہ دکھایا ہے تمھاری مدد ضرور کرے گا۔ ہمت سے کام لو بیٹی۔“

خادمہ اپنی بغل میں کپڑوں کی ایک گھڑی دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ نرملا نے کپڑے اس کے ہاتھ سے لیے اور کہنے لگی: پتا جی! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کو کوئی خطرہ نہیں؟

جے کرشن نے تھلا کر جواب دیا: مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ بھگوان کے بلے جلدی کرو۔“

نرملا عقب کے کمرے میں چلی گئی اور جے کرشن نے خادمہ سے مطالبہ ہو کر کہا: تم نے مجھ سے آج جو نیکی کی ہے اس کا جملہ شایدمیں غریبوں کے لیے سکون۔ اب تمھیں نرملا کو محل کے پچھلے دروازے سے باہر نکالنا ہے۔“

خادمہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا: نرملا کے لیے میں اپنی

نرملا اٹھ کر خادمہ کے ساتھ محل دی۔ جے کرشن محل کے دوسرے سرے پر ایک کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ نرملا اُس کے قریب پہنچ کر ایک شانہ کے لیے رُک کر اور پھر بلے اختیار سکیاں لیتی ہوئی اپنے ہا پ سے لپٹ گئی۔

جے کرشن نے خادمہ سے کہا: اب تم جلدی سے اپنے پڑا لے کپڑوں کا ایک جوڑا لے آؤ۔ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو۔“

خادمہ چلی گئی اور جے کرشن نرملا کا بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لے آیا۔

”نرملا! کاش تم میرے مشورے پر عمل کرتیں اور تم یہاں نہ آتے۔“

”لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ مرحا بلے گا اور میں اس کے ساتھ سستی ہو جاؤں گی۔ پتا جی! مجھے موت کا خوف نہیں، لیکن ٹھا کر کی چتا میں کود کر جاؤں یا میری برداشت سے باہر ہے۔“

جے کرشن نے کہا: نرملا! اب تمھاری جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ تمھاری خادمہ نے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے ابھی وہ تمھارے لیے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر آجائے گی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد تم محل کے پچھلے دروازے سے اپنے گھر پہنچ جاؤ۔ میں نے گو بند رام کو گھوڑے تیار کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ وہ تمھارا انتظار کر رہا ہو گا تم فوراً دروازہ کی طرف بھاگ جاؤ۔ مسلمانوں کی فوج اس طرف گئی ہے اس لیے اگر یہاں سے کسی نے تمھارا پیچھا کیا تو وہ اس طرف جانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے حالات سننے کے بعد مسلمان فوراً تمھیں اپنی پناہ میں لے لیں گے میں تمھیں بھاگنے کا موقع دینے کے لیے کچھ دیر بیٹھ رہوں گا۔ پھر شاید پہلی منزل ہی میں تمھارے ساتھ آملوں۔“

نرملا نے کہا: نہیں نہیں پتا جی یہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو یہاں چھوڑ کر...“

جے کرشن نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں جب

جان تک قربان کر سکتی ہوں؟

جے کرشن نے کہا: نرملا کو دروازے سے باہر نکال کر مجھے اطلاع ضرور دینا اس کے بعد تم اس کمرے میں جاؤ جہاں ٹھاکر کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ وہاں جو عورتیں جمع ہیں ان کو نرملا کے بارے میں تشویش ہوگی تم انہیں باتوں میں لگائے رکھو۔ نرملا لباس تبدیل کرنے کے بعد عقب کے کمرے سے نمودار ہوئی اور جے کرشن نے اسے کوئی ادب بات کرنے کا موقع دینے کی بجائے برآمدے کی طرف دھکیل دیا۔ خادمہ اس کے ہمراہ چل پڑی اور جے کرشن نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگالی۔

(۴۱)۔

نرملا کو روانہ کرنے کے بعد جے کرشن انتہائی اضطراب کی حالت میں دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔ جب بھی برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھولی کر برآمدے میں بھاگتا، لیکن نرملا کی خادمہ کی بجائے کسی اور کو دیکھ کر دوبارہ دروازہ بند کر لیتا۔ ہر لحظہ اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خادمہ ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ دروازے پر نرملا کو کسی نے پہچان لیا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خادمہ مجھے اطلاع دینا ضروری سمجھ کر سیدھی ٹھاکر کے کمرے میں چل گئی ہو؟ اس کے پاس ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔ کمرے کے اندر ایک ایک لمحہ اسے مہینوں سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا اور اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کمرے میں بیٹھنے لگا۔ اتنے میں برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور پھر وہ ایک بار دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا: دروازہ کھولیں۔
جے کرشن کا دل بیٹھ گیا اور اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: کون ہے؟
باہر سے کسی نے ٹھکانے میں کہا: دروازہ کھولیں! یہ ٹھاکر گھونٹا تھ کے ماموں زاد بھائی سردار ارجن دیو کی آواز تھی۔

جے کرشن نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟
آپ ذرا باہر آئیے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ نرملا دیوی کو آپ لے کہاں بھیجا تھا؟

جے کرشن چند ثانیے بہت کھڑا رہا پھر اس نے لڑتے ہوئے ہاتھوں سے نرملا کھول دیا۔ برآمدے میں سردار ارجن دیو کے علاوہ محل کے پانچ نوکر اور شہر کے دو برہمن کھڑے تھے۔ ان کے چہرے گواہی دے رہے تھے کہ نرملا محل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ جے کرشن نے ارجن دیو کا ہاتھ پکڑ لیا اور سراپا التجا بن کر کہا: سردار ارجن دیو مجھ پر رحم کر۔ نرملا میری اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ارجن دیو نے کہا: تو وہ آپ کی مرضی سے بھاگنا چاہتی تھی۔
"ہاں! وہ کہاں ہے؟"

ارجن دیو نے جواب دیا: اس کا جواب انھیں شہر کی بچاریت کے سامنے دیا جائے گا۔ چلو نیچے۔

جے کرشن نے کہا: بھگوان کے لیے مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے؟

"وہ نیچے ہے اور جب تک سی کی رسم پوری نہیں ہو جاتی پر وہت جی ہمارا اس کی حفاظت کریں گے۔"

جے کرشن نے بے اختیار اس کے پاؤں پر گر تے ہوئے کہا: ارجن دیو! اس

مزا تھیں نہیں دے سکتے۔ تم ان سے کہہ دو کہ تم نے اپنی مرضی کے خلاف
ٹھاکر سے شادی کی تھی۔

اور زلا پھوٹ پھوٹ کر دم ہی تھی جیسے کرشن پر دہشت کی طرف متوجہ ہوا۔
تم لوگ میری بیٹی کو اس لیے سی کرنا چاہتے ہو کہ اس کا زور تمہارے ہاتھ آئے گا لیکن
تم اسے چتا میں ڈالے بغیر بھی سب کچھ لے سکتے ہو۔ میں اپنی جائداد بھی تمہیں دینے کے لیے
تیار ہوں۔ زلا نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ بھگوان کے لیے اسے چھوڑ دو۔

سرکار ارجن دیو نے کہا: یہ پاگل ہو گیا ہے اسے لے جاؤ۔

چند فکروں نے آگے بڑھ کر بے کرشن کو بانڈوں سے پکڑ لیا۔ ٹھاکر کے ایک
ادرشتہ دار نے زلا کو کھینچ کر اس سے عنیدہ کیا اور نوکر بے کرشن کو ہار لے گئے۔
دو چار لڑکھائیاں بھی چھوڑ دو تم ظالم ہو بھڑیے ہو۔ لیکن یاد رکھو سلطان پھر سبائیں آئیں
گے اور تم سے زلا کی موت کا بدلہ لیں گے۔

(۵)

پر دہشت اور شہر کے چند معززین کی رائے یہ تھی کہ بے کرشن کو قید خانے میں
بھیج دیا جائے۔ لیکن ارجن دیو نے اس رائے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا: اس میں
شک نہیں کہ بے کرشن کا دماغ خراب ہو گیا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ
وہ ٹھاکر جی کا خسر ہے۔ جب تک سستی کی رسم پوری نہیں ہوتی ہم اسے حل کے کسی
کمرے میں بند رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں اس کا دماغ ٹھیک ہو
جائے گا۔ اب ہمیں ٹھاکر کی ارحی اٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

شہر کے اکابر نے ارجن دیو کی تجویز سے اتفاق کیا اور بے کرشن کو محل کی
تیسری منزل کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ محل کے ایک ادرکرے میں زلا کو قیدی رکھا

کی جان بچاؤ اور اس کے حوض مجھے ٹھاکر کی چتا میں ڈال دو۔

ارجن دیو نے کہا: مجھے ایک راجپوت کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم محسوس
ہوتی ہے جے کرشن ہوش میں آؤ دنیا کیلکے گی۔

بے کرشن نے کہا: میں اپنی بیٹی کی جان بچانا چاہتا ہوں مجھے دنیا کی ہر وہ
نہیں۔ ارجن دیو میری مدد کرو میں اسے لے کر قنوج چلا جاؤں گا۔ تم میری جائداد
لے سکتے ہو لیکن زلا کو بھڑو۔

ارجن دیو نے جواب دیا: راجپوت اپنی غیرت کا سودا نہیں کرتے تھیں یہ
باتیں اس دن سوتی چاہیے تھیں جب تم نے ٹھاکر سے اپنی بیٹی کی شادی چاہی تھی۔
جے کرشن اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے ارجن دیو کا بازو بھڑو تے ہوئے چلا یا۔
تم زلا کو اس کی مرضی کے خلاف ٹھاکر کی چتا میں نہیں ڈال سکتے یہ پاپ ہے۔ میں
ایسا پاپ نہیں ہونے دوں گا۔

تم پاگل ہو گئے ہو؟ ارجن دیو نے اُسے دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔
جے کرشن بھاگتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ٹھاکر کی لاش پڑی ہوئی
تھی۔ زلا! زلا! اُس نے بلند آواز میں کہہ کر ادھر ادھر سے گھس گھس کر زلا
کو وہاں نہ پا کر جے کرشن بیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ نیچے ایک وسیع دالان سے باہر شہر
کے لوگ جمع تھے جے کرشن انھیں ادھر ادھر ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ مندر کا پر دہشت چند
برہمنوں اور شہر کے معززین کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا اور زلا اہمائی بے کسی
کی حالت میں اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

زلا! زلا! جے کرشن چلایا اور وہ پتا جی! پتا جی! کہتی ہوئی اس
سے لپٹ گئی۔

زلا! میری بیٹی! میری زندگی! میں تمہیں سستی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ لوگ میری

تیسرے پیرٹھا کر گھونٹا تھکے ساتھ بچے کرشن کی اڑھی بھی ششان مجھ ہی کا رخ کر رہی تھی :

(۶)

زمرلا کی درخواست پر بچے کرشن کی چٹا کو پہلے اٹھ نکا دی گئی۔ جب شعلے بلند ہوئے تو زمرلا نے بھاگ کر چٹا میں کودنے کی کوشش کی۔ ارجن درو کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہ تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ زمرلا چلائی۔
”بھے چھوڑ دو“ میں ٹھاکر کی بھانے اپنے پتا کی چٹا میں سی ہونا چاہتی ہوں۔ لیکن لوگوں نے اس کے ہاتھ پاؤں ہانڈھ کر اُسے ٹھاکر کی لاش کے قریب چٹا میں بٹھا دیا۔
ٹھاکر کے نوکروں اور رشتہ داروں نے خشک ٹکڑیوں کے انبار پر گہکی کے ٹکے اٹھیل دیے اس کے بعد وہ عود، عنبہ اور دوسری خوشبودار چیزیں لا کر چٹا پر ڈھیر کرنے لگے۔ چند برہمن شعلیں لیے کھڑے تھے اور مندر ہیر کا پرہمت سنسکرت میں کچھ شلوک پڑھ رہا تھا۔

زمرلا کی نگاہیں اپنے باپ کی چٹا پر مرکوز تھیں اور وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی ”پتا جی! آپ کا مرجانا ہی بہتر تھا۔ تھوڑی دیر بعد آگ کے شعلے مجھے بھی اپنی آغوش میں لے لیں گے۔ اگر آپ زندہ ہوتے تو میری چھین برداشت نہ کر سکتے۔ آپ کہتے تھے کہ میں زندہ رہوں گی اور اُس وقت میں موت کس قدر ڈرتی تھی لیکن اب مجھے موت کا خوف نہیں رہا۔ اب میری زندگی کی کسی کو ضرورت نہیں۔ اب میری چھین سن کر کسی کو دکھ نہیں ہوگا“ پھر اسے زنبیر کا خیال آیا اور موت کا چہرہ بھیا نک دکھائی دینے لگا۔ وہ زنبیر کی ایک خیالی تصویر سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی : کاش تم اس وقت یہاں ہوتے اور جب آگ کے شعلے میرے قریب پہنچ جاتے تو میں بلند آواز سے تمہارا نام پکارتی۔ میں کہتی زنبیر قنوج چھوڑنے کے بعد میری زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں

اور زیورات سے آراستہ کیا جا رہا تھا ایک عمر رسیدہ عورت اسے بکھا رہی تھی۔ یعنی ہمت سے کام لو، تمہیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ تم ٹھاکر گھونٹا تھکے جیسے دیشی بھگت کے ساتھ سی ہو رہی ہو۔ مندر ہیر کی عورتیں تمہاری قسمت پر رشک کیا کریں گی۔ اپنے شوہر کی لاج رکھو۔“ اور زمرلا کہنے کے عالم میں بٹھی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بھیا نک غلا کے ہوا کچھ نہ تھا۔

محل کی تیسری منزل پر بچے کرشن اپنے کمرے کا دروازہ توڑنے کی ناکام کوشش کے بعد دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی صحن کی طرف کھلتی تھی لیکن کھڑکی کے راستے زندہ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بچے کرشن کھڑکی سے باہر بھاگ سکتے ہوئے بلند آواز میں چلا یا : ”بھگوان کے لیے مجھے باہر نکلنے دو۔ میں آخری وقت اپنی بیٹی کے پاس رہنا چاہتا ہوں“

لیکن اس کی چیخ ہجوم کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ دوپہر کے وقت ناتوس کی صدائوں کے ساتھ محل سے ٹھاکر گھونٹا تھکے کی اڑھی اٹھائی گئی۔ آگے آگے برہمنوں کی ایک ٹولی بھجن گا رہی تھی۔ پیچھے زمرلا ایک دلس کی طرح نیچے لباس اور قیمتی زیورات سے آراستہ ایک کھلی پاکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”زمرلا! زمرلا! بچے کرشن پوری قوت سے چلا یا۔ لیکن زمرلا کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی۔ پھر چند مردوں اور عورتوں کی چھینوں کے درمیان صحن میں کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اور ان کی آن میں صحن کے اندر اور باہر ایک کمر کمر مچ گیا۔ زمرلا کا باپ کھڑکی سے کود کر جان لے چکا تھا۔

جلوس رک گیا۔ زمرلا پاکی سے اتر کر بھاگتی ہوئی آئی اور بچے کرشن کی لاش سے لپٹ کر پھینک دی گئی۔ پھر وہ شہر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر چلائی۔ ”بھگوان کے لیے میرے پتا کی اڑھی بھی ہمارے ساتھ ہی لے چلو“

تھی۔ نوجوان نے اسے زمین پر لٹا دیا اور اپنا منہ زخم نکال کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیاں کاٹ دیں۔ اتنی دیر میں باقی سوار گھوڑوں سے اتر کر زلا کے گرد جمع ہو گئے۔ نوجوان نے ایک سپاہی سے پانی مانگا اور اس نے گھوڑے کی زین سے اپنی چھالگ اُتار کر پیش کر دی۔

نوجوان نے زلا! زلا! کہتے ہوئے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ زلا نے ہوش میں آگرا نکھیں کھولیں اور اس کی نگاہیں نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ یوسف تھا۔ زلا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے ایک سخت سی آواز نکلی۔ "زیر! تم آگئے۔ مجھے معلوم تھا کہ موت کے بعد ہم ایک دوسرے سے ضرور ملیں گے۔"

"تم زندہ ہو زلا۔" یوسف نے اپنے ہاتھ سے اُس کی گردن کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

زلا چند ثانیے بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بے اختیار یوسف کے ساتھ لپٹ گئی اور سکیاں پیتے ہوئے بول: وہ.... وہ مجھے ٹھاکر کے ساتھ سی کر رہے تھے۔ اب تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔ اب میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ادھر دیکھو وہ میرے پتا کی جتا ہے۔ دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔" یوسف نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا زلا۔

"میں ایک بیوہ ہوں۔ زلا یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یوسف نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: اس ملک کے نئے رولج میں

بیوہ کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جائیگا۔"

"کیا میں سچ مج زندہ ہوں زبیر؟ اور یہ بھی ایک خواب نہیں کہ تم یہاں ہو؟" یہ خواب نہیں زلا، اُنھوں نے ہمارے ساتھ چلو۔"

تمہاری یاد سے غافل رہی۔ میں ہر وقت یہی سوچا کرتی تھی کہ تم کسی ملے آؤ گے۔ تم آئے۔ لیکن تمہاری نگاہیں میرے دل کی گرائیوں تک نہ پہنچ سکیں۔ میں ہمیشہ تمہاری تھی، لیکن تم نے ہمیشہ مجھے غیر سمجھا۔ زبیر! زبیر! تم کہاں ہو؟"

پردہ ہت کے ساتھ برہنہ کی ٹولی بھجنے لگی۔ اُن کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ پردہ ہت کے اشارے سے ایک نوجوان شعل اٹھائے چٹا کی طرف بڑھا۔ زلا نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ہجوم میں سے کوئی بلند آواز آوازیں چلایا۔ "فوج آگئی! فوج آگئی!! اُن کی آن میں تمام لوگ سرسبکی کی حالت میں مشرق کی طرف سے سرپٹ سواروں کا ایک لشکر آتا دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بدحواسی کی حالت میں شعل پھینک دی اور چٹا کے کنارے آگ سلگ اٹھی۔ سواروں کا دُخ شہر کی طرف تھا لیکن لوگوں کے غیر معمولی ہجوم نے اُن کی توجہ نشان بھومی کی طرف مبذول کر دی۔ تھوڑی دیر میں چند سوار بانی فوج سے کٹ کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے نشان بھومی کے قریب پہنچ گئے۔"

(۷)

لوگوں میں افراتفری مچ گئی، لیکن پردہ ہت نے بلند آواز میں کہا: بونو! یہ تو ہمارے ملک کے سپاہی ہیں۔ تم بھاگ کیوں رہے ہو؟ چٹا کو اچھی طرح آگ لگا دو چند اور آدمیوں نے اپنی اپنی شعلیں چٹا میں پھینک دیں۔ لیکن ہجوم کی توجہ چٹا کی بجائے آنے والے سپاہیوں کی طرف تھی۔ جب سواروں کا دستہ چٹا کے قریب پہنچا تو آگ کے شعلے زلا کے قریب پہنچ چکے تھے، لوگ بھاگتے اور چپختے مچاتے۔ ادھر ادھر ہٹ گئے ایک نوجوان گھوڑے سے چھلانگ لگا کر بھاگتا ہوا چٹا کی طرف بڑھا۔ زلا کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر چٹا سے باہر لے آیا۔ زلا ہیوش

”کہاں؟“

”آج ہم تمہارے شہر میں قیام کریں گے۔“

نرملہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی دیر میں باقی فوج جو دو ہزار سواروں پر مشتمل تھی وہاں آپہنچی۔ اس فوج کا سپہ سالار عبدالواحد تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر آگے بڑھا تو یوسف نے کہا: ”یہ نرملہ ہے۔ اسے سستی کیا جا رہا تھا۔“

عبدالواحد نے کہا: ”خدا کا شکر ہے کہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔“

نرملہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: ”اگر آپ چند گھنٹی پہلے پہنچ جاتے تو شاید میرے بچے کی جان بھی بچ جاتی۔“

عبدالواحد کے چند اور سوالات کے جواب میں نرملہ نے بے کراہی کی موت کا واقعہ بیان کر دیا۔ نرملہ سے اظہارِ افسوس کرنے کے بعد عبدالواحد یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہم آج رات مندر میں قیام کریں گے اور علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے سلطان راستے میں ہمارا انتظار نہیں کریں گے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم سونٹا کی جنگ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

شہر کے لوگ ادھر ادھر منتشر ہو چکے تھے۔ لیکن مندر کا پروہت چند سزاوردی اور بہنوں کے ساتھ تھوڑی دُور کھڑا تھا۔ وہ دُتے دُتے آگے بڑھا اور عبدالواحد کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم کون ہو؟“ عبدالواحد نے سوال کیا۔

”ہمارا ج! میں.... میں اس شہر کا پروہت ہوں۔“

”جادو شہر کے لوگوں سے کہو کہ ان کی جان اور مال کو کوئی خطرہ نہیں۔“

”ہمارا ج! آپ کہاں سے آتے ہیں؟“

”تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“

پروہت دوبارہ اپنے ساتھیوں سے باہر۔

(۸)

رات کے وقت نرملہ محل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک خادمہ نے دروازے سے بھاگتے ہوئے کہا: ”وہ اوپر آ رہے ہیں۔“

نرملہ نے کہا: ”انہیں یہیں لے آؤ۔“

خادمہ واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد نرملہ کو برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ اضطراری حالت میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ نرملہ نے کہا: ”آئیے؟“

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا: ”میں اپنے سالار سے مشورہ کر چکا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ سفر کی تکلیف برداشت کر سکیں تو تیار ہو جائیں ہم کچھلے پہر یہاں سے کوچ کریں گے۔“

نرملہ نے یوسف کی طرف دیکھا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”میں تیار ہوں؟“

یوسف نے کہا: ”نرملہ! اب صبر کے ہوا کوئی چارہ نہیں۔“

”تشریف رکھیے؟“ نرملہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”نہیں! اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“ یوسف یہ کہہ کر دروازے کی طرف مڑا۔ لیکن نرملہ نے کہا: ”ذرا ٹھہریے میں آپ سے شکنتلا اور روپے کی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔“

یوسف نے جواب دیا: ”شکنتلا بہت خوش ہے اور روپے کی کی صحت بھی اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ لیکن اس کے درد کا ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا وہ ہمارے ساتھ آنے پر مصر تھی۔ میں نے بری شکل سے اُسے سمجھایا کہ تم اسنے

مجھے سفر کے قابل نہیں ہو۔ خدا کرے رام نا تھ زندہ ہو ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔
 نرملانے کہا: اگر آپ اجازت دیں تو میں گو بند رام کو اپنے ساتھ لے چلوں۔
 گو بند رام مجھے ابھی راستے میں ملا تھا اور میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ علی الصبح
 تیار ہو جائے اور دیکھیے میں نے آپ کی حفاظت کے لیے اس عمل پر اپنے
 آدمیوں کا بھرا ہٹھا دیا ہے۔

نرملانے جواب دیا: جتنا سے زندہ بچنے کے بعد مجھے موت کا ڈر نہیں
 رہا۔ کیا میرے لیے اپنے اس مالک کی حفاظت کا فی نہیں جس نے آپ کو
 میری مدد کے لیے بھیجا تھا؟

یوسف نے قدرے توقف کے بعد کہا: ہماری رفتار بہت تیز ہوگی اس
 لیے آپ کو بھی ہمارے ساتھ گھوڑے پر سفر کرنا پڑے گا۔

نرملانے جواب دیا: آپ میری فکر نہ کریں میں آپ کے ساتھ پیدل چلنے
 کے لیے بھی تیار ہوں۔ اب میرے لیے اس عمل میں ایک دن بھی ٹھہرنا ممکن نہیں۔
 بہت اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ یوسف یہ کہہ کر نرملانے کے جواب کا انتظار
 کیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلی صبح فتوح کے نو مسلم رضا کاروں کا لشکر جنوب کا رخ کر رہا تھا۔ نرملانے
 گھوڑے پر سوار تھی، اُسے یہ فکر نہ تھی کہ اس کی سزلی کہاں ہے۔ اُس کے لیے صرت
 یہی کافی تھا کہ یوسف اس کے ساتھ ہے۔

(۹۱)

سومرات کے قید خانے میں رام نا تھ کے لیے ہر لمحہ موت سے زیادہ بھیانک تھا
 بھوک پیاس اور مار پیٹ کی ناقابل برداشت ادیتوں کے باوجود وہ پردہت کے

آدمیوں کو اس سوال کا تسلی بخش جواب دے سکا کہ نہ پتی کہاں ہے۔

ابتداء میں وہ بھی سمجھتا تھا کہ رُوپ دتی پردہت کے قبضے میں ہے چنانچہ
 جب اسے الٹیں دی باتیں تو وہ چلا اٹھا: تم میری جاں لے سکتے ہو، لیکن اس
 طرح پردہت کے گناہوں پر پردہ نہیں ڈال سکو گے۔ رُوپ دتی اگر زندہ ہے تو وہ
 پردہت کے قبضے میں ہے اور اگر وہ مہنگی ہے تو اُسے پردہت نے قتل کیا ہے۔
 لیکن چند ہفتوں کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ سٹاید پردہت کو بھی دپٹی
 کے متعلق کوئی علم نہ ہوا اور وہ منہ دھیر میں اُس کی آمد کی خبر ملتے ہی رُوپوش
 ہو گئی ہو۔

ایک رات پردہت اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا رام نا تھ!
 تمہاری جلد بے معنی ہے! اگر رُوپ دتی کو زمین نہیں نکل گئی تو ہم ایک نہ ایک
 دن اسے مزدور تلاش کریں گے ویسے بھی ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں، اس
 ملک کا کوئی آدمی ہمارے خلاف اس کے الزامات نہیں سُنتے گا۔ لیکن تم ہمیں
 رُوپ دتی کا پتہ دے کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم رُوپ دتی
 پر کوئی سختی نہیں کریں گے۔

رام نا تھ نے جواب دیا: تم جانتے ہو کہ میرے پاس تمہارے سوال کا کوئی
 جواب نہیں! میں رُوپ دتی کو گھر میں چھوڑ کر گیا تھا اور اس کے بعد سب میں
 واپس آ رہا تھا تو تمہارے آدمیوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اب میں کیسے یہ بتا سکتا
 ہوں کہ وہ کہاں ہے؟

پردہت نے قدرے تاخیر کے بعد کہا: مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ رُوپ دتی
 کو تم نے دوبارہ نہیں دیکھا، لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ رُوپ دتی گھر سے نہا
 کیسے ہو گئی؟

تھا۔ لکھے دن وہ ایک ہی ساقی عورت کا بھیس بدل کر مندر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے تمام حالات سے خبردار کر دیا۔ میں نے باقی دن اسے کمرے میں پھپھائے رکھا۔ پھر رات کے وقت جب نئی دیوی کا جشن منایا جا رہا تھا تو کامنی نے تھارے محل تک میری راہنمائی کی۔ وہ مندر کے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھی۔ اس لیے ہم کسی وقت کا سامنا کیے بغیر تھارے محل میں پہنچ گئے۔ پھر جب تم رُوپ دتی کو لے کر وہاں پہنچے تو ہم ایک کوٹھڑی میں چُپ کر تھارا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا میں تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تھارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تھارے وہ بچاری جنھوں نے کامنی کی جان بچائی تھی تھارے محل کے قریب ماہی گیروں کی ایک کشتی پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ رُوپ دتی کے چند زیور ان ماہی گیروں کو خوش کرنے کے لیے کافی تھے۔ ہم دو دن کشتی پر سفر کرتے رہے پھر ہمیں مالابار کا ایک جہاز مل گیا جو سندھ جارا تھا اور اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں رُوپ دتی بیمار ہو گئی اور مجھے اس کے ساتھ جہاز سے اُترنا پڑا۔ میں نے چند دن سفر کرنے کے بعد مندر میں پناہ لی۔

یہ کامنی رام ناتھ کے کسی دن کے خود فکر کا نتیجہ تھی، لیکن پردہت پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا: کامنی اور بچاری کہاں ہیں؟

رام ناتھ نے جواب دیا: ہم نے انھیں جہاز پر بھونڈ دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سندھ پہنچ گئے ہوں گے۔ کامنی کشتی کے میں ٹوڈ غزنوی کے پاس جاؤں گی۔

پردہت نے پوچھا: کامنی اور بچاریوں کو یہ معلوم تھا کہ تم مندر سے جا رہے ہو؟

ہاں! میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ اٹھل واڑہ کا ہمارا میرا دوست ہے اور مجھے وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

رام ناتھ نے کرب انجیز لہجے میں جواب دیا: کاش مجھے اس بات کا علم ہوتا۔ پردہت نے کہا: میں تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ رُوپ دتی تھارے محل کے بغیر کہیں رُوپوش ہو گئی ہے۔ لیکن تمہیں میرے اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ وہ مندر سے کیسے غائب ہو گئی؟ اگر تم رُوپ دتی کو مندر سے اخرا کرنے والے آدمیوں کا پرستہ دے سکو تو میں تمہاری جان بچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔

رام ناتھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: تم ان پریداروں کی موبوگی میں اس سوال کا جواب سنا پسند نہیں کرو گے؟

پردہت نے پریداروں کی طرف اشارہ کیا اور وہ کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ رام ناتھ نے کہا: تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جو بچاری کامنی کو مندر میں پھینکنے گئے تھے وہ واپس کیوں نہیں آئے؟

چند ثانیے پردہت کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اس نے ڈھنسی ہوئی آواز میں کہا: تم ان کے متعلق جانتے ہو؟

رام ناتھ نے جواب دیا: میں ان کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ ان میں سے بعض کامنی کے ساتھ مل گئے تھے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں کو مندر میں پھینک دیا تھا۔

پردہت چلایا: تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم ایسی کہانیاں سن کر مجھے یہ قوت نہیں بنا سکتے۔

رام ناتھ نے کہا: یہ جھوٹ نہیں بچاریوں نے کشتی کو چند کوبل دُور لے جا کر آگ لگا دی تھی اور اس کے بعد وہ صبح تک دریا کے کنارے جھگی میں چھپے رہے۔ کامنی کو رُوپ دتی سے ہمدردی تھی اور اُسے میرے اور رُوپ دتی کے تعلقات کا بھی علم

اور خود کو ٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

اسی شام رام ناتھ کو قید خانے کی ایک زمین دوز کو ٹھڑی میں مستقل کر دیا گیا۔ اس تنگ دہانے کو ٹھڑی میں رام ناتھ کے لیے زندگی ایک شتم ہونے والی رات تھی۔ ہر روز پریدار آتے اور اس کے لیے کھانا اور پانی رکھ کر چلے جاتے لیکن کسی کو اس سے ہمکلام ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دو ماہ بعد ایک دن پریدار اُسے پر دہشت کے سامنے لے گئے۔ یہ طافات بہت مختصر تھی، پر دہشت نے اسے سمجھایا کہ اگر تم دشمن کے جاسوسوں کا پتہ دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے لیکن رام ناتھ کا پہلا اور آخری جواب یہی تھا کہ میں کسی جاسوس کو نہیں جانتا، اس کے بعد کسی اور پہلے گزر گئے اور رام ناتھ کو بر محسوس ہونے لگا کہ اُسے قید کرنے والے اُس کو بھول گئے ہیں۔

اس صبر آزمائی میں رُوپ و تہ کی یاد اُس کا آخری سہارا تھی اور پریدار اسے مایوسی کی آندھیوں میں اُمید کے چراغ جلانے پر آمادہ کرتی رہی۔ اسے اس آفتاب کا انتظار تھا جو سومات کی تاریک فضاؤں کو ایک نئی صبح کا پیغام دینے والا تھا۔ وہ تصور میں سومات کے دروازے پر اس راجل عظیم کا خیر مقدم کیا کرتا تھا جس سے رُہت کے کنارے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ میرے بھائی بھی مسلمانوں کے پاس چلے گئے ہیں؟“
”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن جہاز پر ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے یہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے گزشتہ گناہوں پر نادم ہیں، وہ سومات اور سومات کے پروہت سے نفرت کرتے ہیں۔“

”جہاز کا کپتان کون تھا؟“

”وہ ایک مسلمان تھا لیکن مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔“

پر دہشت نے قید خانے کے وقف کے بعد کما کما جھوٹ بولنے میں بہت ہوشیار ہو لیکن مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میرے بھائی میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ سومات کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہو رہی ہے اور جب تک مجھے یہ علم نہیں ہوتا کہ اس سازش میں جھگڑ لینے والے کون کون ہیں۔ تم میری قیدیں رہو گے۔“

مجھے اب تمہاری قید کا خوف نہیں رہا۔ لیکن میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ رُوپ و تہ کہاں ہے اور تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟“

پر دہشت نے جواب دیا: ”اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ اس ملاقات میں ہمارے دشمن کے جاسوس کون ہیں؟“

”میں کسی جاسوس کو نہیں جانتا۔“

”تم بہت کچھ جانتے ہو اور شاید اپنے سے گھر میں منتقل ہونے کے بعد تم ہمیں بتانے کے لیے تیار بھی ہو جاؤ۔“ پر دہشت نے یہ کہتے ہوئے پریداروں کو آواز دی

عرب نوجوان بھی شریک ہوا جو سلطان کے اکثر ساتھیوں کے جیسا جہنی تھا سلطان نے اس نوجوان کو اپنے دائیں ہاتھ بٹھاتے ہوئے اپنے جہنیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔
”یہ پہلے سے ساتھی ہیں اور ان کا نام سلمان ہے۔ تم انھیں سومات کی جنگ میں اہم ترین محاذ پر دیکھو گے۔“

جب اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو حاضرین کو معلوم ہوا کہ سلطان کی نگاہوں میں اس امینی کی قدر و منزلت بلا وجہ نہ تھی۔ سومات کے قلعے کی مضبوطی اور اس کی فوجی قوت کے متعلق اس کی معلومات حیرت انگیز حد تک مکمل تھیں۔ اجلاس کے اختتام پر سلطان کے جہانگیرہ افسر اٹھ کھڑے ہوئے فوج کے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے۔ اگلے روز دو ہزار نو سو ستمنا کاروں کی فوج جو عبداللہ کی قیادت میں قنوج سے آئی تھی، سلطان کے لشکر سے آگے اور تیسرے دن سلطان نے دلوادہ سے کوچ کیا۔

(۲)

۶ جنوری ۱۵۲۶ء کو جہات کا دن تھا اور سلطان محمود کا لشکر اپنے سامنے سومات کے مندر کے سنہری کلس کھڑا تھا۔ سلطان نے رسد بردار دستوں کو کھینچے جھوڑ کر پیش قدمی کی۔ ہندو اپنی ساری طاقت قلعے کے اندر جمع کر چکے تھے۔ شہر اور مصافحات کی ابتدا قریباً خالی ہو چکی تھی اور سلطان کے ہراول دستوں نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر ان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان قلعے کی طرف بڑھا اور دوپہر کے قریب اس کی فوج قلعے سے تھوڑی دُور کھڑی ایک عجیب منفرد دیکھ رہی تھی۔

سومات کے اُن گنت محافظ فعیل پر کھڑے غیر معمولی جوش و خروش سے محو اور ان کو لگا رہے تھے کہ کوئی ان کا منہ چڑھا رہا تھا اور کوئی گلا چھڑا رہا تھا کہ یہ کہہ رہا تھا کہ اب تم بچ کر نہیں جا سکتے، سومات کا دیوتا تم سے اس ملک کے تمام دیوتاؤں کی توہین کا بدلہ لے گا۔

آخری معرکہ

جب سلطان محمود کا لشکر دلوادہ کے قریب پہنچا تو اچانک کمر کے بادل نوا ہوسے اور فضا میں تاریکی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں تاریکی اس قدر زیادہ ہو گئی کہ لوگ دوپہر کے وقت بھی رات کے پچھلے پہر کا سماں دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں کے لیے چند قدم آگے دیکھنا مشکل تھا، لیکن سلطان نے رُکنا گوارا نہ کیا۔
دلوادہ کے برہمن عوام کو بھارہے تھے کہ یہ سومات کے دیوتا کی کرامت ہے۔ یہ تاریکی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ سومات کے دشمنوں کا ہر قدم انھیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

شہر کے اکابر یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ تباہی کا سامنا کرنے کے لیے اس کا سومات پہنچنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب سلطان کا لشکر شہر میں داخل ہوا تو اہل شہر نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔
دلوادہ میں عبداللہ اور اس کے چند ساتھی سلطان کے استقبال کے لیے مجبور تھے۔ ان لوگوں سے سومات کے تازہ حالات معلوم کرنے کے بعد سلطان نے جہنیوں کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں عبداللہ کے ساتھیوں میں سے ایک

کوشش کی لیکن دشمن نے انھیں تفصیل پر پاؤں جاملے کا موقع نہ دیا سلطان محمود شمس کی قلعہ سے باخیر تھا لیکن ان کا یہ جوش و خروش اُس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ شام تک مسلمانوں کو متعدد حملوں کے باوجود تفصیل کے کسی حصے پر پاؤں نہ جمانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ رات کے وقت سلطان نے اپنے لشکر کو قلعے سے دُور پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا قلعے میں ناتوس اور گھنٹیوں کی صداؤں کے ساتھ سومات کی بجے کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور مسلمانوں کے پڑاؤ میں عشا کی نماز کی اذان سنائی دے رہی تھی۔

(۳)

انگل صبح کا آفتاب سومات کی دیواروں تلے ایک گھسان کی جنگ لکھ رہا تھا سلطان یتروں کی بارش میں کھڑا تھا اور اس کے جانباز جُرات اور ہمت کے مظاہرے میں لیکہ دسر میں سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تفصیل کے محافظ حملہ آوروں پر تیروں اور پتھروں کے علاوہ کھوٹا ہوا تیل ڈال رہے تھے۔ کنڈیں ٹوٹ رہی تھیں سیڑھیاں جل رہی تھیں اور تفصیل کے نیچے لاسٹوں کے انبار لگ رہے تھے لیکن حملہ آوروں کے جوش و خروش میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا مشرق کی طرف سے چند دستوں نے اس شدت سے تیر و ساز کر تفصیل کے محافظ تھوڑی دیر کے لیے مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے چند جانباز بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور انھوں نے سیڑھیاں لٹکا کر تفصیل پر چڑھنا شروع کر دیا تیرانہ اڑوں نے تفصیل کے محافظوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا اور ان کی آن میں پسند میں سپاہیوں نے دشمن کو ادھر ادھر پٹا کر تفصیل پر پاؤں جمایا یہ تفصیل کے محافظوں نے جراتی محاکمہ اور مسلمان اُن کے دباؤ سے سٹھنے لگے لیکن اتنی دیر میں کئی اور سرفروش اُپر آ گئے۔ انھوں نے ہندوؤں کو ایک بار پھر واپس اور بائیں طرف دھکیل دیا۔ تھوڑی دیر میں مسلمان تفصیل کے ایک برج سے نیچے اترنے والی سیڑھی پر قبضہ کرنے

تفصیل کی طرح قلعے کی اندرونی عمارت کی چھتوں پر بھی انسانوں کے ہجوم کھڑے تھے اور قلعے کے وسیع احاطے میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اُن گنت انسانوں کی بیخ پکار ایک آتش فشاں پہاڑ کی آغوش میں اُٹتے اور کھوتے ہوئے لاوے کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ مہیب تھی۔ ایسا غم سے ہوتا تھا کہ اس ملک کی تمام آبادی سٹ کر سوسائٹی کی جا دیواری میں سما گئی ہے۔

سلطان نے اپنے محو غم دستوں کو حکم دیا کہ باقی لشکر کے گھوڑے پیچھے لے جائیں اس کے بعد اُس نے نہایت اطمینان سے ظہر کی نماز ادا کی۔ بارگاہ الہی سے فتح و نصرت کی دعا مانگی اور پھر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا:

"مجاہد! یہ ہندوستان کی سرزمین میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہے ہم نے سومات کے ظلمت کد میں خدا کی توحید کا پرچم لہانے کا عہد کیا ہے اور اب ہمارے سلسلے ددہی راستے ہیں۔ فتح یا شہادت۔ خدا کے بندوں کی سب بڑی فحالی ان کا ایمان ہے اور اگر تمہارا ایمان متزلزل نہ ہوا تو ہم اس امتحان سے سُرخرو ہو کر نکلیں گے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ کل ہم جمعہ کی نماز سومات کے قلعے میں ادا کریں گے۔"

فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی سلطان نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی صفوں میں چکر لٹکایا اور سالاروں کو ہدایات دینے کے بعد ملے کا حکم دیا۔ اُن کی آن میں مسلمانوں کی فوج اکٹھی ہوئی لڑکر طرح تفصیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اللہ اکبر کے نعروں کے جواب میں قلعے کی طرف "مہادیو کی جے" کے نعرے بلند ہونے لگے اور تفصیل کے محافظوں نے انڈھا دھند تیروں کی بارش شروع کر دی۔ حملہ آور بھی تیروں کا جواب تیروں سے دے رہے تھے لیکن تفصیل کے محافظ اپنے مددچروں میں اُن کی نسبت زیادہ محفوظ تھے اُفان اور ترک سپاہیوں کے چند دستے ایسی ڈھالوں پر دشمن کے تیر وکتے ہوئے تفصیل کے نیچے پہنچ گئے اور انھوں نے کندوں اور سیڑھیوں کی مدد سے تفصیل پر چڑھنے کی

جیسے یہ مجبور کر دیتے۔ اس عرصے میں سلطان کے دوسرے سپاہی شمالی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کے دو طرفہ حملے سے ہندوؤں کی صفوں میں افرا تفری پھیل گئی۔ تھوڑی دیر بعد شمال اور مشرق کے دروازوں سے قلعے میں داخل ہونے والے دستے آپس میں مل گئے اور ہندوؤں کے پے درپے حملوں کے باعث منہ کی طرف سٹپے لگے قلعے کو مندر کے احاطہ سے جدا کرنے والی خندق کے سامنے ہندوؤں کے چند دستے مسلمانوں کے سامنے ڈٹ گئے اور ان کی باقی فوج کڑی کے بجوں سے گزر کر مندر میں داخل ہونے لگی ایک ساعت کے بعد ہندوؤں کے صفِ خندق سے حملہ آوروں کو خندق کے پول سے دُور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور باقی فوج مندر کے احاطہ میں جمع ہو چکی تھی۔ ہندو فوج کے سپہ سالار کے حکم سے تینوں پل اٹھا دیے گئے۔ مسلمانوں کو خندق کے آس پاس ہندوؤں کے سپہ سے دستوں کا صفایا کرنے میں دیر نہ لگی۔ لیکن ان کے لیے خندق عبور کر کے مندر میں داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔

قلعے کے وسیع صحن میں ہندوؤں کے منتشر دستے عمارتوں میں پناہ لے چکے تھے۔ اور نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ ہم ان عمارتوں پر قبضہ کرنے سے پہلے نماز جمعہ ادا کریں گے۔ نوؤں نے شمالی دروازے کے برج پر کھڑے ہو کر اذان دی اور مسلمان صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ان کی نماز کا نظارہ عجیب تھا قلعے کی عمارتیں ہندوؤں کے دستے تیر رہے تھے، لیکن مسلمان انتہائی ضبط و سکون سے بارگاہِ الہی میں سرسجود تھے۔ نماز کے بعد سلطان نے اپنے جانبازوں کی طرف نگاہ دوڑائی جن کی پیشانیوں پر فتح و نصرت کی بشارت لکھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں شکر کے آنسو چھلک رہے تھے۔ سلطان نے شہیدوں اور زخمیوں کو قلعے سے باہر لے جانے کے لیے اپنے چند دستے متعین کر دیے اور باقی دستوں کو قلعے کی عمارات پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ دن کے عرصے میں مسلمان قلعے کی کئی عمارات پر قبضہ کر چکے تھے۔ لیکن اس جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ ابھی

کی کوشش کر رہے تھے اور قلعے کے اندر سے ہندوؤں کا ایک سلاب اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مسلمانوں نے ایک زوردار حملہ کیا اور چند جانبازینے پر دشمن کی لاشیں روندتے ہوئے صحن میں اتر آئے۔ صحن میں ان کے داییں بائیں اور سامنے انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس سمندر کی موجیں انھیں اپنے آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھیں، لیکن زینے کے راستے مسلمان اس پہاڑی ندی کی سی تسدی اور تیزی سے آ رہے تھے جس کے تمام بند ٹوٹ چکے ہوں۔

تھوڑی دیر میں سینکڑوں مسلمان صحن میں پہنچ گئے اور دشمن کی صفوں پر بے تماشا تیر سارے شروع کر دیے۔ اُدھر فیصلی پر چڑھنے والوں کی تعداد میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ اتنے میں سلطان محمود بھی فیصلی کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے عثمانی نگاہ سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ باہر سے چند بیڑھیاں کھینچ کر صحن کی طرف لگادیں۔ ہندو یہ دیکھ کر آگے بڑھے، لیکن نیروں کی بارش میں ان کی پیش نہ گئی۔ ایک ساعت کے بعد سلطان کے آٹھ ہزار جانباز قلعے کے صحن میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں ترکمانوں کے چند دستے قلعے کی شمالی دیوار کے کچھ حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔

سلطان نے ایک شدید حملہ کیا اور دشمن کی صفیں روندنا ہوا مشرقی دروازے کے قریب جا پہنچا۔ دروازے کی حفاظت کے لیے ہندوؤں کی صفیں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں لیکن مسلمانوں کی خارا شگاف تلواروں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ تھوڑی دیر میں لاشوں کے انبار لگ گئے اور مسلمانوں نے دروازہ کھول دیا۔

باہر سے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے اور سلطان کی فوج اندر داخل ہونے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوؤں نے آگے بڑھ کر شدید حملہ کیا اور مشرقی دروازے کے سامنے ایک بار پھر گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ کبھی مسلمان دشمن کی صفیں روندتے ہوئے چند قدم آگے نکل جاتے اور کبھی قلعے کے محافظوں کے زوردار حملے انھیں دروازے کی طرف

بڑھایا اور کہا: "مجھے تمہارا انتقام تھا، کہو کیا خبر لائے ہو؟"

سلطان نے جواب دیا: "دشمن کے بارہ نئے جہاز جن کے متعلق میں نے آپ کے کل اطلاع دی تھی، سومات کے قریب لنگر انداز ہو چکے ہیں بغرب آفتاب کے بعد میں اپنے جہاز کو ان جہازوں کے ساتھ ہی دشمن کے بڑے کے عقب میں لے آیا تھا، ابھی تک دشمن ہمارے متعلق یہ خبر ہے اگر اسے صبح تک ہمارا بہتہ نہ چل گیا تو میں اس کے کئی جہاز تباہ کر سکوں گا۔ سپاہیوں کے علاوہ ان جہازوں کے بیشتر تاج بھی سومات کے مندر میں جمع ہو چکے ہیں اور میرے لیے چند جہازوں پر قبضہ کر لینا بھی مشکل نہیں۔ اس وقت حملہ کروں گا۔ جب جنگ آخری مرحلہ میں پہنچ چکی ہوگی۔ سمندر کے کنارے دشمن کی سیکنڈ کشتیاں کھڑی ہیں، ہماری آخری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دشمن ان کشتیوں سے ناندہ نہ اٹھا سکے۔"

سلطان نے جواب دیا: "میں نے اس کا انتقام کر لیا ہے۔ میرے سواروں کے محفوظ دستے ساحل کے ساتھ ساتھ دشمن کی کشتیوں کا پیچھا کریں گے۔ جھوک اور بیاس دشمن کو بہت جلد سمندر سے بھٹکنے پر مجبور کر دے گی۔"

سلطان نے کہا: "دشمن ساحل سے باہر ہو کر شاید اُس پاس کے ٹاپوؤں پر پناہ لینے کی کوشش کرے، لیکن مجھے امید ہے کہ ان ٹاپوؤں پر فوج اتارنے کے لیے میں آپ کو چند جہاز مہیا کر سکوں گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے، مجھے اپنے جہاز پر پہنچنے کے لیے ایک طویل چکر کاٹنا پڑے گا۔"

سلطان نے کہا: "میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں کل انشا اللہ سومات کے مندر میں ہماری طاقت ہوگی۔ خدا حافظ!"

میخے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سپاہی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا سلطان نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ ٹھکادی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سمندر کے کنارے پہنچ

باقی تھا۔ خندق کے پار مندر کے احاطہ میں ہندو سپاہی اور ان کے سردار اپنے مقدس دیوتا کی حفاظت کے لیے آخری دم تک لڑنے کا عہد کر رہے تھے۔

اچانک مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صدائیں بلند ہوئیں، خندق پر کرنی کے پل دوبارہ ڈال دیے گئے اور ہندوؤں کا سیلاب ایک بار پھر قلعے کے صحن کی طرف پھوٹ نکلا۔ یہ حملہ جس قدر اچانک تھا اسی قدر شدید تھا۔ تھوڑی دیر ہندو قلعے کے ایک تہائی حصے پر قبضہ جما چکے تھے۔ مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا اور ہندوؤں کو ایک بار پھر خندق کی طرف سٹپے پر مجبور کر دیا، لیکن ان کی جدوجہد ایک دریا کی طغیانی کے آگے بند ماندھنے کے مترادف تھی۔ خندق کے پلوں پر ہندوؤں کا تاننا بندھا ہوا تھا اور مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ سومات کی سٹی ایک نئی فوج کو جنم دے رہی ہے۔ غروب آفتاب کے وقت مسلمان مشرق اور شمال کے دروازوں کی طرف سمت رہے تھے۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی تو سلطان نے فوج کو پسپائی کا حکم دیا اور مسلمان ایک منظم طریقے سے لڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔

(۴)

رات کو مجلس شوریٰ کا اجلاس برضا مست کرنے کے بعد سلطان اپنے خیمے میں ٹھہر رہا تھا۔ اُس کے پیروے پر تردد اور پریشانی کے آثار تھے۔ فوج کا ایک افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا: "عالی جاہ! سلطان آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔"

"بلداؤ اسے۔"

افسردہ بارہ سلام کر کے خیمے سے باہر نکل گیا۔ چند ثانیے بعد سلطان خیمے میں داخل ہوا سلطان نے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ

گیا اور گھوڑے سے اتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔ کشتی بیڑے کی طرف روانہ ہو گئی۔

(۵)

لگے روز دوپہر سے قبل مسلمان ایک بار پھر قلعے پر قبضہ کر چکے تھے اور مندر کے احاطے کو قلعے سے جدا کرنے والی خندق کے قریب گھسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ خندق کے کنارے ہندوؤں کی صفیں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں۔ مسلمانوں کے پیٹے و درپے حملوں کے باعث وہ بھاری نقصان اٹھا رہے تھے، لیکن ان نقصانات کو پورا کرنے کے لیے ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ مندر سے ہر اک ان کے تازہ دم دستے نمودار ہوتے اور پل بمبار کرنے کے بعد اپنی صفوں کے خلا کو پُر کر دیتے۔

سلطان نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا، اور ہندو اس فتح سمجھ کر سرت کے فخر سے لگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کھلے صحن میں پہنچ کر مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی صفیں کئی ٹوٹیوں میں تقسیم ہو کر ہندوؤں پر ٹوٹ پڑیں۔ اس مشہل حال کا سامنا کرنے کے لیے ہندوؤں کے لشکر کو بھی کئی حصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ اچانک بائیں بازو سے مسلمانوں کے چند دستے دشمن کو پیچھے دھکیلتے ہوئے خندق کے ایک پل کے قریب جا پہنچے، ہندو بدحواس ہو کر خندق کی طرف بھاگ نکلے، لیکن مسلمانوں نے انھیں دباؤ منظم ہونے کا موقع نہ دیا۔ انتہائی انتشار کی حالت میں ہندوؤں کی آخری کوشش یہ تھی کہ دشمن کو خندق کے پلوں سے دُور رکھا جائے، لیکن سلطان کے بائیں بازو کے دستوں نے ایک پل پر قبضہ کر لیا اور ہندو باقی دو پلوں کے راستے مندر کی طرف بھاگنے لگے۔ ایک ساعت کے بعد خندق کے تینوں پل مسلمانوں کے قبضے میں تھے اور ان کے کئی دستے خندق کے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ باقی فوج قلعے کے صحن میں دشمن کی دہی مہی ٹوٹیوں کا صفایا کرنے میں مصروف تھی۔

مند میں کفر و اسلام کی جنگ اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوؤں کی ٹولیاں سومات کی موتی کے سائے گزر گدا کر دعائیں مانگتیں اور پھر ایک نئے جوش و خروش سے مسلمانوں پر حملہ کر دیتیں۔ بیڑنی عمارتوں کی گزر گدا ہوں اور برآمدوں میں لاشوں کے انبار لگانے کے بعد مسلمان اُس کشادہ صحن میں داخل ہوئے جو اپنی حیثیت کے پجاریوں اور داسیوں کے محلات سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں ہزاروں ہندو سردھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ مسلمانوں نے پہلے درپے حملوں کے بعد انھیں ایک طرف ہٹے پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے تازہ دم دستے ارد گرد کی عمارات کی بالائی منزلوں سے اتر کر صحن میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے جمع ہو رہے تھے، لیکن مسلمان بتدریج صحن پر قبضہ کر رہے تھے نصف ساعت کے بعد صحن میں ہزاروں آدمی ڈھیر ہو گئے اور ہندو ارد گرد کی عمارات میں پناہ لینے لگے۔

(۶)

دن کے تیسرے پر مسلمان مندر کے ارد گرد کئی عمارات پر قبضہ کر چکے تھے اور ہندو مندر کے وسط میں اس وسیع کمرے کو بچانے کی فکر میں تھے جہاں سومات کا بیت نصب تھا اس کمرے کے تین اطراف بہت گنڈہ کمرے پائے جاتے تھے۔ لیکن ہندوؤں نے ان کو روک کر قبضہ کرنے کے لیے چند حملے کیے۔ لیکن ہندوؤں نے انھیں پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا۔ یہ کمرے پیڑ جیوں کے ذریعے زمین دوز کو ٹھکڑوں سے ملے ہوئے تھے۔ ہندو سپاہی ان کو ٹھکڑوں سے نمودار کرتے اور اپنے قتل یا زخمی ہونے والے ساتھیوں کی جگہ ڈٹ جاتے۔ پہلے درپے حملوں کے بعد مسلمانوں نے ایک کمرے پر قبضہ کر لیا، لیکن اس سے قبل وہ آہنی دروازہ جو اس کمرے کو وسطی کمرے سے ملاتا تھا بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے چند سپاہی تلواریں سونت کر زمین دوز کو ٹھکڑوں کی

سلطان محمود وسطی کمرے پر یلغار کرنے والے مجاہدوں کے ساتھ تھا۔ اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بلند آواز میں کہا: "سندھ کی طرف بڑھو۔ فتح قریب ہے۔" آن کی آن میں شکر کے سالار اپنے اپنے دستوں کو سلطان کا حکم پہنچا چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد مسلمانوں کے دستے شمال اور جنوب کی سمتوں سے چکر کاٹ کر چوتھے پر حملہ کر رہے تھے۔ ادھر وسطی کمرے میں لڑنے والے مجاہدین نے ایک زوردار حملہ کیا اور ہندوؤں کو مارتے، دانتے اور دھکیلتے ہوئے چوتھے کی طرف لے گئے۔ ہندوؤں نے جوابی حملہ کر کے دوبارہ اپنے دیوتا کے چرنوں تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن مسلمان ان کے سامنے آہنی دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ سندھ کے کنارے اس وسیع چوتھے پر سومات کی جنگ کا آخری معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ مندر کے وسطی کمرے پر قبضہ ہو جانے کے باعث ہندوؤں کے حصے ٹوٹ چکے تھے اور ان کی چیخیں اپنے دیوتاؤں کی بے بسی کا اعتراف کر رہی تھیں۔ سندھ میں سینکڑوں کشتیاں کھڑی تھیں اور ہندو مسلمانوں کے حلوں سے مغلوب و کراہت افزا قری کی حالت میں سندھ کے کنارے پہنچ کر کشتیوں میں سوار ہونے لگے۔ ساحل سے کچھ دُور سومات کی جنگ میں حصہ لینے والے ملاحوں اور مہاراجوں کے جہاز دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک ایک جہاز میں آگ کے شعلے دیکھ کر کشتیوں کے ملاحوں نے چیخ مچا کر شروع کر دی اور ہندوؤں کی یہی سہی فوج میں سرسنگی پھیل گئی۔ وہ چینیٹے پتلے اور بھلے گئے ہوئے کشتیوں پر سوار ہونے لگے۔ ہزاروں سپاہی جنہیں کشتیوں میں جگہ نہ ملی، سندھ میں پھلانگیں لگا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کشتیوں پر سوار ہو کر فرار ہونے والے ہندو ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنے لگے۔ کوئی نامعلوم دشمن تین اور جہازوں میں آگ لگا چکا تھا۔ اور باقی جہازیں

طرف آتے دہانے نیسے پر کھڑے ہو گئے۔ ادبائی آہنی دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ دروازہ چند دھکوں کے بعد ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی وسطی کمرے سے ہندوؤں کا ایک نیا حملہ ہوا۔ فریقین ایک تنگ محاذ پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے کبھی ہندو مسلمانوں کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیتے اور کبھی مسلمان وسطی کمرے کے دروازے تک پہنچ جاتے۔ اس اتھا پائی میں مسلمان تلواروں کی جگہ بھجراستمال کر رہے تھے۔ مندر کا پردہ بہت سومات کی موتی کے سامنے کھڑا ہو کر چلا رہا تھا:

"مہاراجا سومات سے کام لو، دشمن کی تباہی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دیوتا مسلمانوں کو بھگم کرنے سے پہلے تمہاری غیرت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ آج کے دن اپنے سینوں پر دار دکھانے والے بہادر سیدھے سودرگ میں بباؤں گے۔"

اور ہندو آخری وقت کی بھڑکے کی اُمید پر جان کی بازی لگا رہے تھے۔ لیکن ایک شدید حملے کے بعد چند سپاہی وسطی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہندو انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے دوسری طرف سے ایک در کمرے: بر قبضہ کر کے وسطی کمرے کی طرف کھلنے والا دُوسرا دروازہ بھی توڑ دیا اور اُلٹا کمرے کے نعرے لگاتے ہوئے سومات کے محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔

اب ہندوؤں کے لائق و سپاہی زمین و آسمان کا ہوں اور مکانوں کی چھتوں سے نمودار ہو کر وسطی کمرے کے اس وسیع دروازے کے سامنے جمع ہو رہے تھے جو مندر کی طرف کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر میں مندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ طویل چوتھے پر تمل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سومات کی موتی کے گرد گھسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور مندر کے کنارے جمع ہونے والے ہندو اندر داخل ہونے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

خفیہ آواز میں کہا: اب مجھے کسی کا خوف نہیں۔ میں نے پروہت کو قتل کر دیا ہے اس کی یہی سزا تھی۔ کاش میں اسے اُسی رات قتل کر دیتی اور یہ مند تباہی سے بچ جاتا۔ تمہارا بادشاہ کہاں ہے۔ وہ بہت دیر سے آیا۔ اسے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔ ایک ہندی نو مسلم نے اپنے ساتھیوں کو اس کے لحاظ کا مطلب سمجھایا۔ انہوں نے اُسے اٹھا کر باہر نکالا اور کھلے صحن میں بٹا دیا۔ ایک سپاہی فوجی طبیب کو جانے کے لیے بھاگا، لیکن مندر کی دیوی طبیب کے پیچھے سے پیٹلے اپنا سفر حیات پورا کر چکی تھی :

(۷)

رام ناتھ ایک تنگ قاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ سومات کی جنگ کے دوران میں اُس کا کرپنٹا کو پیرغ چکا تھا۔ پہلے دن وہ اپنی کوٹھڑی سے کانٹھا کو مندر کے محافظوں کی چیخ پکار سُنا رہا۔ جب دروازے سے باہر کسی پرے دار کے پاؤں کی آہٹ سنانی دی تو وہ چلا اٹھا۔ بھگوان کے لیے مجھے بتاؤ باہر کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہمارا ہے۔ کیا مسلمانوں کی فوج آگئی ہے۔ کیا انہوں نے مندر پر حملہ کر دیا ہے؟ لیکن کوئی اس کی چیخ پکار کی طرف توجہ نہ دیتا۔ اگلے دن سومات کی بے کے نعروں کے جواب میں اللہ اکبر کی صدائیں اس کے دل میں مسرت کی دھڑکنیں بیدار کر رہی تھیں۔ پھر جب رات کے وقت مندر کے محافظ مسرت کے نعرے بلند کر رہے تھے تو اس کی امیدوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

جب مندر میں فیصلہ کن معرکہ شروع ہوا تو رام ناتھ کے دل میں زندگی کے نئے دلوے کر دیں لینے لگے۔ جنگ کے اختتام پر جب ناتوس اور گھنٹیوں کی صداؤں کے ساتھ سومات کے بھاریوں کے پر جوش نعرے بھی خاموش ہو گئے

پران کے راجاؤں کے بھندوں کی بجائے مسلمانوں کے ہلالی پرچم ہمارے تھے۔ ساحل سے دُور جا رہے تھے۔ جلتے ہوئے جہازوں کے عقب سے ایک اور جہاز جن پر ہلال پرچم ہمارا ہوا تھا نمودار ہوا اور اپنے دائیں بائیں چند اور جہازوں پر آتشیں گولے پھینکتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ اُن کی آن میں دو اور جہازوں کے بادبانوں میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ انہی درمیان بہت سی کشتیاں جہازوں کے قریب پہنچ چکی تھیں، اور باقی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال اور جنوب کا رخ کر رہی تھیں۔

مندر کی دہی سہی فوج بھاگنے کے راستے مسدود دیکھ کر ہتھیار ڈال چکی تھی۔ راجے سردار اور بھاری سلطان محمد کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مندر کے طول و عرض میں ہندوؤں کی پچاس ہزار لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ پروہت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سلطان کے سپاہیوں نے اس کے محل کی تلاشی لی تو وہاں سے سیکنڈوں داسیاں برآمد ہوئیں۔ ایک داسی کی زبانی معلوم ہوا کہ پروہت مندر کی دیوی کو اپنے ساتھ لے کر محل کے ایک کونے کے کمرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس کمرے کی تلاشی لی گئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ جب سپاہی کمرے سے باہر آئے لگے تو انہیں کسی کے کرپنٹے کی آواز سنانی دی۔ ایک سپاہی نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ کان لگا دیے اور پھر چانک اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اس دیوار کے پیچھے کوئی کراہ رہا ہے اچھی طرح دیکھو شاید اس جگہ کوئی چور دروازہ ہو۔" پھر اس نے بھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ زنجیر کھینچو۔" دوسری سپاہی نے بھت سے شکلی ہوئی زنجیر کھینچی تو دیوار میں آہستہ آہستہ ایک شکاف نمودار ہونے لگا۔ چور دروازہ کھل گیا اور سپاہی جلدی سے عقب کی تنگ کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ سومات کے پروہت کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور اس کے قریب ہی مندر کی دیوی جس کے سینے میں بنجر بیوست تھا اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ اس نے

سنائی دی۔ اس کے بعد کسی نے دھکا دے کر دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیے۔
رام ناتھ کے سامنے قید خانے کے دو محافظ اور سلطان کی فوج کے چند مشعل بدار
سیاہیوں کے درمیان یوسف اور عبدالواحد کھڑے تھے۔ رام ناتھ "رنیر! رنیر!"
کہتا ہوا کوٹھڑی سے نکلا اور بے اختیار یوسف سے لپٹ گیا۔ اس نے بسکیاں
لیتے ہوئے کہا: "رنیر! رنیر! تم آگئے۔ مجھے یقین تھا کہ قدرت میری مدد کرے گی
خدا کے لیے مجھے بتاؤ، رُوپ و تہی کہاں ہے؟"

یوسف نے کہا: "رُوپ و تہی ہمارے گھر میں تھا، انتظار کر رہی ہے۔"
ایک لمحہ کے لیے رام ناتھ مسرت کے ساتویں آسمان پر تھا۔ اس نے
عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "کیا یہ سچ ہے؟"
"ہاں یہ سچ ہے۔" عبدالواحد نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔
"تو میں اس قید سے آزاد ہونے سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے
اسلام قبول کر لیا ہے۔"
عبدالواحد نے اپنے سیاہیوں اور قید خانے کے محافظوں کو حکم دیا کہ تم اس
قید خانے کی تمام کوٹھڑیوں کی تلاشی لے کر قیدیوں کو رہا کر دو۔

(۸)

عصر کی نماز کے بعد سلطان محمود اس کشادہ کمرے میں داخل ہوا جہاں سونٹا
کا بڑا بُت نصب تھا۔ اس بُت کے ارد گرد کئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں نصب
تھیں سلطان کے حکم سے ان تمام مورتیوں کو توڑ دیا گیا۔ لیکن جب بڑے بُت کی باری
آئی تو ہندو راجے اور بھاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور انھوں نے گڑگڑا کر
التماس کی کہ اگر آپ اس مورتی کو چھوڑ دیں تو ہم اس کے ذرا بے پروا دینے کے لیے تیار ہیں۔

تو اس کے لیے جنگ کے نتیجے کا انکار نہ لگنا مشکل نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد ہر لمحہ
بڑھتا ہوا سکوت اس کے لیے صبر آزما تھا۔ کیا مسلمان فتح کے بعد واپس جا رہے
ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ اس تاریک کوٹھڑی
میں ایک مظلوم انسان کی راہ دیکھ رہا ہے؟ اگر وہ مجھے یہیں پھونڈ کر چلے گئے تو
کیا ہوگا؟ دیر تک ان سوالات کا جواب سوچنے کے بعد وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلنے لگا۔
مسلمانو! مجھے یہاں پھونڈ کر نہ جاؤ۔ میں نے مدتوں تمہارا انتظار کیا ہے۔ میں
نے رُود کر تمہاری فتح کی دُعا میں مانگی ہیں۔

لیکن اس پاس اُس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر اپنی کوٹھڑی کے
دروازے کو دھکے دینے کے بعد وہ منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا اور گدگدائیں
مانگنے لگا۔ مسلمانوں کے خدا! میں تیری صداقت پر ایمان لاتا ہوں۔ میں تیری پناہ
مانگتا ہوں، میری مدد کر۔ تو میرا آخری سہارا ہے۔ اس تاریک کوٹھڑی میں میرا دم گھٹا
جا رہا ہے۔ میں اپنی موت سے پہلے صرف ایک بار تیرے شولج کی چمک تیرے
چاند کی روشنی، تیرے ستاروں کی جھلک، ہسٹ اور تیرے پھولوں کی مسکراہٹ دیکھنا چاہتا
ہوں۔ میں کھلی فضاؤں میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ میں دریاؤں کے کناروں اور پہاڑوں
کی چوٹیوں پر تیری عظمت کے گیت گانا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کے خدا! میرے خدا،
اور ساری دنیا کے خدا میری مدد کر۔

دُعا ختم کرنے کے بعد رام ناتھ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اچانک باہر سے
اُسے چند آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کوئی یہ کہہ رہا تھا: ہمارا راجہ!
رام ناتھ اس کوٹھڑی میں ہے۔

کسی نے حکمانہ لیچے میں کہا: "بہت اچھا! دروازہ کھول دو۔ جلدی کرو!"
پھر رام ناتھ کو دروازے کا مالا کھٹنے کی آہٹ اور بھاری زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ

سلطان کا چہرہ غصے سے تپا اٹھا اور اس نے جواب دیا: میں بُت فروش نہیں، بُت شکن کھانا چاہتا ہوں۔

سلطان نے دونوں ہاتھوں سے ایک بھاری گُڑا اٹھایا۔ فضا میں سومات کے پجاریوں کی جھنجھٹیں بلند ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی پتھر کے چہند ٹکڑے اُدھر اُدھر بکھر گئے۔ سپاہیوں نے سلطان کی تقلید کی اور پلے درپلے مڑیوں سے بُت کا ٹلیہ بگاڑ دیا۔ اس کے بعد سلطان کے حکم سے بُت کے گرد ایندھن کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی گئی تھی۔

مندر سے جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس کی مالیت دو کروڑ دینار کے برابر تھی۔ اس کے بعد سلطان محمود اپنے پڑاؤ کا رخ کر رہا تھا۔

جنگ کے بعد

رات کے وقت جب مسلمان پڑاؤ کے قریب شہدائے لاشیں دفن کر رہے تھے، رام ناتھ اور نرملہ ایک عیمے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ رام ناتھ کو اپنی سرگزشت سنانے کے بعد نرملہ نے اُسے بتایا کہ میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں اور یوسف نے میرے لیے نرملہ کی بھلے سعیدہ کا نام پسند کیا ہے۔

رام ناتھ نے کہا: میں اپنے قید خانے کا دروازہ کھلنے سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ میں نے پہلی بار سنا اس انسان کے پیچھے ادا کی ہے جس نے اس ملک میں کفر کا سب سے بڑا قلعہ مہاراجہ کیلے لیکن ابھی تک مجھے اپنا نیا نام دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نرملہ نے کہا: بھیا مجھے بہت سے مسلمانوں کے نام معلوم ہیں تم ان میں سے کوئی نام پسند کر لو۔

”اچھا بتاؤ۔“

نرملہ نے کسی نام بتا دیے۔ رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: مجھے تو عثمان

پسند ہے۔

نرملہ نے کہا: بھیا میں نے ابھی تک آپ کو ایک خوشخبری نہیں سنائی

لے بعض روایات کے مطابق یہ بُت اندر سے کھوکھلا تھا اور جب اسے توڑا گیا تو اس میں سے بیش قیمت ہیرے اور جواہرات برآمد ہوئے۔ یہ دولت اس دولت سے کہیں زیادہ تھی جو ہندو اس بُت کے عوض پیش کرنا چاہتے تھے۔

اسے یہ بُت پونے کے پتھر کا بنا ہوا تھا اور آگ میں جلنے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق سلطان نے اس بُت کے چند ٹکڑے یا دھار کے طور پر غزنی بھیج دیے تھے۔

بعض روایات کے مطابق یہ دولت مرن سلطان کے ہتھ میں آئی تھی اور یہ اہل مال غنیمت کا پانچواں حصہ تھی۔

”وہ کیا؟“

”یوسف نے مجھے بتایا تھا کہ روپ وتی بھی مسلمان ہو گئی ہے اس کا نام بھی بہت اچھا ہے لیکن مجھے یاد نہیں رہا۔“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر رام ناتھ نے کہا: ”بہت دیر ہو گئی وہ ابھی تک نہیں آئے۔“

زمر نے کہا: ”آپ کو غینہ آرہی ہے؟ ان کا خیمہ دائیں ہاتھ ہے۔ باہر ان کا نوکر کھڑا ہوگا آپ وہاں جا کر لیٹ جائیں۔“

رام ناتھ نے اٹھتے ہوئے کہا: ”مجھے آج مدت کے بعد غینہ آرہی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ یوسف کے خیمے میں نیم خوابی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ اسے یوسف کی آواز سنائی دی۔ ”رام ناتھ سو گئے؟“

”میں ابھی لیٹا ہوں اس نے جواب دیا۔“

”اچھا سو جاؤ۔“ یوسف یہ کہہ کر خیمے کے دوسرے کونے میں لیٹ گیا۔

رام ناتھ نے قدے وقفے کے کہا: ”زیر... معاف کیجیے آپ کا نیا نام

ابھی تک میسر ہی زبان پر نہیں چڑھا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ روپ وتی کا نیا نام کیسا ہے؟“

”کیا تمہیں زمر نے بتا دیا ہے کہ روپ وتی مسلمان ہو چکی ہے؟“

”ہاں! لیکن انھیں اس کا نام یاد نہیں۔“

”روپ وتی کا نیا نام ظاہر ہے۔“

”ظاہر ظاہر؟“ رام ناتھ اپنے دل میں یہ نام کئی بار دہرانے کے بعد سو گیا۔

اگلی صبح رام ناتھ گہری غینہ سے بیدار ہوا تو یوسف عبدالواحد اور سعیدہ اس کے قریب کھڑے تھے۔ رام ناتھ نے اٹھ کر انھیں ملے ہوئے پوچھا: ”صبح ہو گئی!“

یوسف نے جواب دیا: ”اب تو دوسرے ہونے والی ہے تم بہت گہری غینہ سو رہے تھے۔“

”مجھے مدت کے بعد ایسی غینہ نصیب ہوئی ہے۔“

یوسف نے کہا: ”اسی لیے میں نے تمہیں جگنا مناسب سمجھا۔ اب تو سورج

بہت اوپر آچکا ہے۔ بدی سڑکی تیاری کر دو تمہارے ساتھی انتظار کر رہے ہیں۔“

رام ناتھ نے کہا: ”ہم آج ہی جا رہے ہیں۔“

”تم آج ہی جا رہے ہو اور سعیدہ بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔ ہم یہاں سے

کنٹرکٹ تک سلطان کے ہمراہ جائیں گے۔“

رام ناتھ حیرانی اور سرت کے ملے جلے جذبات سے یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

عبدالواحد نے کہا: ”ہمارے ڈیڑھ ہزار سپاہی تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ ان کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا تو مدت تک دھوپ نہ

دیکھنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ فوج کے سپاہی کوچ کے لیے

تیار کھڑے تھے۔ رام ناتھ اور سعیدہ (زمر) گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

(۲)

سومات کا مندر لاشوں سے بھرپڑا تھا متعفن فضا میں گدھوں اور چیلوں

کے غول مڈلا رہے تھے سلطان نے قلعے سے چند میل ہٹ کر دریا کے کنارے

پڑاؤ ڈال لیا لشکر کے سینکڑوں سپاہی سومات کی جنگ میں زخمی ہو چکے تھے۔

اور انھیں چند دن آرام کی ضرورت تھی سلطان نے یہاں قریباً دو ہفتے قیام کیا۔ اس

سورے میں بتلعین کی کوششوں سے قرب وجوار کے ہزاروں ہندو مسلمان ہو گئے

تھے۔ پندرہویں روز سلطان محمود نے وہاں سے کوچ کیا۔

سومات کی تباہی کی خبر سے کاٹھیا والا کی ہمایہ ریاستوں میں غم و غصہ کھل

دوڑ گئی۔ وہ راجے اور سردار جو سلطان کی برقی رفتاری کے باعث سومات کی جنگ میں حصہ لینے سے محروم رہے تھے، آلو کے راجہ پریم دیوا کے جھنڈے تلے جمع ہو کر کچھ دور ایرادلی کی پہاڑیوں کے درمیان سلطان کا راستہ روکنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان کے سامنے اہم ترین سدان سیکڑوں زنجیروں کی حفاظت تھا جو اچھی تمک کی جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ دوبارہ اس میب صحر کو عبور کرنا غیر ضروری سمجھتا تھا چنانچہ اس نے اپنا رخ زیادہ تر مغرب کے ساحل کی طرف رکھا۔

ایک دن سلطان کا لشکر ایک ایسے مقام پر جا نکلا جہاں کوسوں تک پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان آلو کے راجہ کے لشکر کی نقل و حرکت سے باخبر تھا

اس علاقے میں گھر جانے کے بعد غنیمت دشن کے حملے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔ سلطان کے پیچھے ساری فرج گھٹنے گھٹنے پانی میں کود پڑی۔ نشیب کے اس علاقے کی وسعت سلطان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے گھوڑے کبھی گھٹنوں اور کبھی گردنوں تک پانی میں ڈوب رہے تھے کبھی وہ اپنے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو دیکھتے تو سمجھتے کہ کنارہ قریب آ رہا ہے لیکن تھوڑی دور سطح زمین پر چلنے کے بعد انھیں حدنگاہ تک پھر پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔

جن مجاہدوں نے سومات کی طرف بلنا کر تے ہوئے ایک بھیا تک ریگستان کے سراپ دیکھے تھے۔ وہ اب سند میں گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یہ ان جو افرادوں کا ایک نیا امتحان تھا جو سرزمین ہند میں ایک نئی صبح کا پیام لے کر آئے تھے۔ ان کے عوام بلند اور ان کے حوصلے ناقابل شکست تھے۔

دو دن صبر آزمائشکات کا سامنا کرنے کے بعد سلطان کا لشکر خشکی پر پہنچ گیا۔ ان گنت مصائب کے باوجود لشکر کے علاوہ بار بڑاری کے دولاکھ آدمی اور گھوڑوں کا بخفا کھٹ پار پہنچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کے بعد سلطان نے کٹھ کوٹ

کا رخ کیا۔ راجہ بھیم دیو سلطان کی آمد کی خبر سنتے ہی بھاگ گیا اور سلطان نے کسی مزاحمت کے بغیر کٹھ کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ کٹھ میں سلطان نے دو دن قیام کیا۔ تیسرے روز صبح کی نماز کے بعد عبدالواحد اور اس کے ساتھی سلطان کے لشکر کو الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔

روضت ہوتے وقت سلطان نے یکے بعد دیگرے عبدالواحد، یوسف اور دوسرے نو مسلم سرداروں سے کہا: "میں اپنا حمد پورا کر چکا ہوں۔ اس ملک میں ظلم و استبداد کا سب سے بڑا لقمہ مٹا رہا ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے حصے کا بہت سا کام باقی ہے۔"

عبدالواحد! یوسف! میں تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں میری واپسی پر غم نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ راہ حیات پر میری آخری منزل قریب چلی ہے۔ لیکن ہے ہم ایک دوسرے کو دوبارہ نہ دیکھ سکیں لیکن وہ عظیم مقصد جس کی تکمیل کے لیے فدت نے ہمیں منتخب کیا ہے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اللہ کی راہ میں وہ لوگ یقیناً بھڑے آگے تھے جو سومات کی دیواروں تلے شہید ہوئے اور تم جیسے نوجوان اس درخت کا پھل ہیں جسے گناہ مجاہدوں نے اپنے خون سے سنبھالا ہے انھوں نے ظلم و ستم اور کفر و احماد کی عمارت کو گرایا ہے لیکن اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنا تمہارا کام ہے۔

میں اس یقین کے ساتھ واپس جا رہا ہوں کہ تم وہ چراغ کبھی نہیں بجھنے دو گے جو شہیدوں نے اپنے خون سے جلائے ہیں۔ تم خن و صداقت کا وہ پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہونے دو گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں نے لہ کیا ہے خدا نفع سلطان گھوڑے پر سوار ہو گیا اور لشکر روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد عبدالواحد

لے کچھ کا علاقہ عبور کرتے ہوئے سلطان کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض

اور اس کے ساتھی اُس تانے کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے، جس کا امیر گزشتہ تیس برس سے شاہ راہ حیات پر اپنی فتوحات کے پرچم لہرایکا تھا۔

(۳)

ظاہرہ (دوپ دتی) محل کے ایک کمرے میں عصر کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی کہ اُسے برآمدے سے زبیدہ کی آواز سنائی دی۔
”ظاہرہ! ظاہرہ!“

”کیا ہے بہن؟“ ظاہرہ نے دُعا ختم کرنے کے بعد دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ظاہرہ وہ آگئے ہیں۔“ زبیدہ نے اندر بھاگتے ہوئے کہا۔
ایک ثانیہ کے لیے زندگی کی تمام دھوکسیں سمٹ کر ظاہرہ کی آنکھوں میں آگئیں۔

زبیدہ مڑ کر برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سے مخاطب ہوئی: ”آئیے آپ اُرک کیوں گئے۔“

ظاہرہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی، لیکن اس کی ٹانگیں رکھڑا رہی تھیں عثمان (رام ناتھ) دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ چند ثانیہ وہ ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ اُن کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

زبیدہ ایک طرف ہٹ گئی عثمان کمرے میں داخل ہوا۔ ”بیری روپا! میری ظاہرہ بیری زندگی!“ اُس نے فطرتاً سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

ظاہرہ پیچھے ہٹی اور اپنا ایک قبلہ زوہر کر سجدے میں گر پڑی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی اور عثمان بے حس و حرکت اس کے قریب کھڑا تھا۔ جب اُٹھی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔ اس نے کہا: ”دامِ ناتھ میں مُسلمان ہو چکی ہوں۔“

توج نے جنگ کا محاصرہ کر لیا اور اس کے کئی ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سلطان نے دریائے سندھ کے کنارے سفر جاری رکھا۔ اس علاقے میں جاؤں کے جنگجو قبائل نے سلطان کے لشکر کو کافی نقصان پہنچایا۔ یہ لوگ اپنا ملک کنارے کے بھاریوں اور سرکنڈوں کے جنگل سے نمودار ہوتے اور سرد بڑا دستوں پر حملہ کر کے بھاگ جاتے۔ بالآخر سلطان ایک طویل اور صبر آزما سفر کے بعد ۲۰ اپریل ۱۰۲۶ کو غزنی پہنچ گیا۔

اگلے سال مارچ کے مہینے میں سلطان نے ان جاؤں کو سزا دینے کے لیے عمان کا مُدع کیا۔ عمان کے قریب دریا کے کنارے چڑاؤ ڈال کر اس نے چودہ سو اکیسیتوں کا بیڑا تیار کرایا۔ جن کے دائیں بائیں لوہے کے گولے کی لمبی میخیں لگی ہوئی تھیں۔ کپڑے میں بیس

روایات کے مطابق سومات کا ایک پجاری جس نے مسلمانوں سے انتقام لینے کا عہد اٹھایا تھا سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سلطان کو راستہ بتانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں سلطان کا شکر اس شخص کی راہنمائی میں ایک ایسے بیابان میں پہنچا جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ سلطان نے اس سے باز پرس کی تو معلوم ہوا کہ وہ سومات کا پجاری ہے اور قسماً مسلمانوں کو غلط راستے پر لے آیا ہے جس پر سلطان کے حکم سے اس شخص کی گردن اُٹا دی گئی سلطان کو چند دن اس کٹھن راستے پر سخت معائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر وہ اپنی فرج کو تباہی سے بچا کر سندھ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ راستے میں سلطان نے منصورہ پر حملہ کیا۔ منصورہ کے قریبی حاکم نے شہر سے فرار ہو کر کھجوروں کے ایک جنگل میں پناہ لی سلطان کی

”مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“

”بھائی یوسف کہاں ہیں؟“

”وہ چند دن کے بعد آئیں گے۔ تمھاری ایک سہیلی میرے ساتھ آئی ہے۔“

”وہ کون؟“

”سعیدہ!“

”سعیدہ کون ہے؟“

”سعیدہ زملادیری کا نام ہے۔“

زملادیری بنی یسری محسن کہاں ہے؟ طاہرہ یہ کہتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ رابر کے کمرے سے زبیدہ نے آواز دی: ”طاہرہ! زملادیریاں ہیں۔“ وہ جلوی سے کمرے داخل ہوئی اور بے اختیار آگے بڑھ کر زملادیر سے ٹپٹ گئی۔

(۴)

سومات کی جنگ کو تین ماہ گزر گئے۔ اس عرصہ میں سعیدہ کی یوسف سے اور طاہرہ کی عثمان کے ساتھ شادی ہو چکی تھی۔ یوسف کی بہن زبیدہ اپنے شوہر

سپاہی تیرکازوں، دھالوں اور آتشیں گوں سے مسلح موجود تھے۔

جاٹ چاہنڈ کشتیوں پر سوار ہو کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے آئے لیکن سلطان نے عبرتناک شکست دی۔ جاٹوں نے دریائے نل کر بھاگنے کی کوشش کی تو دونوں کناؤں پر ترکمان سواروں کے دستے اور ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے تیراندازان کی تاک میں تھے جنگ کے بعد جاٹوں کی ہزاروں لاشیں دریا میں بہ رہی تھیں اور ہزاروں کناؤں پر بکھری تھیں۔ اس جنگ کے بعد سلطان کو کچھ بھی ہندوستان آنا نصیب نہ ہوا۔

عبدالواحد کے ہمراہ قنوج جا چکی تھی۔

ایک دن یوسف کو عبدالواحد کا یہ پیغام ملا کہ تم فوراً قنوج پہنچ جاؤ۔ ایلچی سے دریافت کرنے پر یوسف کو معلوم ہوا کہ عبدالواحد نے کئی سرداروں اور بااثر لوگوں کو بھی قنوج لے جانے کی دعوت دی ہے۔ یوسف اور عثمان اسی وقت قاصد کے ہمراہ روانہ ہو گئے اور تیسرے روز دہلی کے قریب قنوج پہنچ گئے۔

جب وہ عبدالواحد کی قیام گاہ پر پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر میں ہے۔ عثمان کو ہمان خانے میں بٹھرا کر یوسف اپنی بہن سے ملا اور تھوڑی دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد عثمان کو لے کر عبدالواحد کے دفتر پہنچا۔ عبدالواحد نے ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی انھیں دفتر میں بلا لیا۔ یوسف اور عثمان مصافحہ کے بعد اس سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عبدالواحد نے یوسف سے دریافت کیا: ”آپ گھر سے ہر کر آئے ہیں؟“

”جی ہاں! زبیدہ نے مجھے نہایت پریشان کن خبر سنائی ہے۔ کیا آپ سچ بچ

قنوج چھوڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں؟“

”ہاں!“ عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن کیوں۔ کیا سلطان معظم یہاں آپ کی کارگزاری سے مطمئن نہیں؟“

عبدالواحد نے جواب دیا: ”میں نے خود ہی سلطان سے یہ درخواست کی تھی کہ مجھے اب رخصت دی جائے۔ میں اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے اپنی باقی زندگی اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ یہ زمین اب خدا کے دین کے لیے ہموار ہو چکی ہے۔ یہاں میرے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ درپوش خصلت انسان آگئے ہیں جن کے سینے نور ایمان سے منور ہیں۔ اب دلوں کی تسخیر کا کام باقی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں کی نگاہیں تلواروں سے زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ لیکن نگر کوٹ کے دور افتادہ گوشوں میں بھی ایسے لوگوں کی

کہا: یہ سلطان کا حکم نامہ ہے۔ میں نے ان کے استفسار پر ایک ایسے آدمی کا نام پیش کیا تھا جو میری نگاہ میں بہترین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے یا اس کو نہیں کر دو گے بیٹھ جاؤ یوسف۔

یوسف بیٹھ گیا۔ عبدالواحد کے اصرار پر اس نے کانپتے ہاتھوں سے کراسلہ کھولا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو پھلکنے لگے۔ کراسلہ پڑھنے کے بعد اس نے عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: آپ نے میرے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا ہے۔

عبدالواحد نے جواب دیا: آپ کے کندھے ایک پہاڑ کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔

(۵)

تیسرے دن قنوج کے سردار شہر کے عوام اور ہمسایہ ریاستوں کے سفیر قلعے کے وسیع صحن میں جمع تھے اور عبدالواحد ان کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔

”دوستو اور بھائیو! میں نے آپ کو یہ خبر سنانے کے لیے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی ہے کہ میں اپنے ہمدرد سے شکوہ پیش کر دیا گیا ہوں میں نے سلطان معظم سے درخواست کی تھی کہ اپنے وطن جانا چاہتا ہوں اور انھوں نے میری یہ درخواست منظور کر لی ہے۔ مجھے سے پہلے آپ کے لیے میرا آخری پیغام یہ ہے کہ اب ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک نیلاباں شہر جو پہلے شمال سے جوگھٹا اٹھی تھی وہ برس چکی ہے۔ اب اس سے نامہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔ سلطان محمود کو قدرت نے جس مقصد کے لیے منتخب کیا تھا وہ پڑھا ہو چکا ہے، دہنڈام جس نے انسانوں کے درمیان نفرت اور حقارت کی دیواریں کھڑی کی تھیں اور جس نے ایک انسان کو چھرت اور دوسرے کو اچھوت بنایا تھا شکست کھا چکا ہے، ہندوستان جس نے اس ملک کے اپنے ذات انسانوں کو نیچ ذات انسانوں کی ٹہریوں پر سر مشرت کردے تیر کر کے ان کی اجازت دی تھی ایک ایسی تہذیب اب کھا چکی ہے جس کا

ضرورت ہے جو اسلام کی تبلیغ کو اپنا مقصد حیات بنا چکے ہوں اس شہر میں خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا نعرہ بلند کرنا چاہتا ہوں، جہاں کالی دیوی کے سامنے انسانوں کا بلیدان دیا جاتا تھا۔ میں اس ندی کے کنارے اذانیں دینا چاہتا ہوں، جہاں مجھے آٹا کی پچھیں سنائی دی تھیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں ہزاروں انسان میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

یوسف نے کہا: لیکن آپ کی جگہ کون لے گا؟

عبدالواحد نے جواب دیا: یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھ سے بہتر کام کر سکتے ہیں اور سلطان نے ان میں سے ایک کو قنوج کا نیا حاکم مقرر کر دیا ہے۔ میں اس سے مطمئن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ قنوج کے نو مسلم اور غیر مسلم عوام بھی اس کا خیر مقدم کریں گے۔

”وہ کون ہے؟“

عبدالواحد نے جواب دیا: میں پرسوں کی عام اجلاس میں اس کے نام کا اعلان کر دینگا۔ یوسف نے کہا: اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس کا نام ریافت کر سکتا ہوں؟

”بہت اچھا۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں، لیکن پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ اس کی تائید کریں گے۔“

”آپ جانتے ہیں کہ جس فیصلہ کی آپ تائید کریں گے۔ میں دل و جان سے اس کی حمایت کروں گا۔“

عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے مسکراتے ہوئے یوسف کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں اور کہا: قنوج کا نیا حاکم اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے اور اس کا نام یوسف ہے۔ یوسف اضطراری حالت میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”نہیں نہیں! میں اس قابل نہیں۔“ عبدالواحد نے میز پر سے ایک کراسلہ اٹھایا اور اٹھ کر یوسف کو پیش کرتے ہوئے

مقتصد انسانوں کے درمیان رنگت و نسل کی مدد بربال توڑنا ہے۔ محمود غزنوی اس ملک میں ایک نئی صبح کا آفتاب بن کر آیا تھا۔ وہ ان کروڑوں انسانوں کی بچار کا جواب تھا جو ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے تھے۔ اب اُن بتوں کا ظلم ٹوٹ چکا ہے جو انسانوں کو بھیڑوں اور بھیڑیوں کے گروں میں تقسیم کرتے تھے۔ اب اس ملک میں اس تہذیب کے سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا جس کی روشنی میں انسان اپنے خون سے نہیں بلکہ اپنے اعمال سے پہچانا جائے گا۔

اس ملک کے باشندو! میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے خون پر پلٹے ہیں تمہیں اس تہذیب کے غلات اکسائیں گے۔ وہ کبھی ریگوارا نہیں کرینگے کہ اس ملک کے بے بس اور نادار انسانوں کو ان کے بوجھ سے بھٹکا را حاصل ہو۔ وہ تمہیں اُن بتوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کریں گے جو انہیں برزی عطا کرتے ہیں لیکن یاد رکھو! انسانوں کے بنائے ہوئے بُت انسانوں کے ہاتھوں ٹوٹتے رہیں گے۔ وہ کسی نئے سومات کے لیے ملے لیر کریں تو قدرت کسی اور محمود کو بھیج دے گی۔

قنوج کے سرداروں اور ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں نے ہمارے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ اسلام کی تبلیغ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے میں اس یقین کے ساتھ یہاں سے واپس جا رہا ہوں کہ اس معاہدے کی غلات ورزی نہیں ہوگی۔ ورنہ شمال سے ایک لاکھ طوفان اٹھے گا جو پہلے کی نسبت زیادہ شدید ہوگا۔ اپنے نو مسلم بھائیوں سے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا مقصد جس قدر بلند ہے اسی قدر تمہاری ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ اس ملک میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے اُنھیں خوشنڈی اور بے لوث قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری ملت کے شہیدوں نے اس ملک کی زمین کو اپنے خون سے سیراب کیا ہے اب ایک نئی بود کو پال چڑھانا تمہارا کام ہے۔ اختتام پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے قنوج کے حکم کی حیثیت میں حتی الامکان

اسلام کے منابطہ اخلاق کا پابند رہنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دانستہ طور پر کسی مسلم کے ساتھ بے جا رعایت یا کسی غیر مسلم سے بلاوجہ زیادتی نہیں کی لیکن اس کے باوجود اگر مجھ سے کسی کو کوئی دکھ پہنچا ہو تو میں صدق دل سے معذرت کا طلب گاہ ہوں۔ اب میں اپنا آخری فرض ادا کرنا ہوں۔ آپ میرے جانشین کا نام سننے کے لیے بیقرار ہوں گے۔ سلطان معظم نے میری درخواست پر یوسف کو تمہارا نیا حاکم مقرر کیا ہے۔ آپ میں سے اکثر اسے رہبر کے نام سے جانتے ہوں گے ذاتی طور پر میں اُسے اس عہدے کے لیے موزوں ترین آدمی سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ آپ کا بہترین دوست اور حلقہ خام ثابت ہو اور مجھے قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمسار نہ ہونا پڑے۔ اب میں آپ کے ساتھ تھے حاکم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی سند پر تشریف لائیں۔

یوسف اٹھ کر منہ کے قریب گیا اور کچھ دیر ہجوم کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لڑکھرائی ہوئی آواز میں کہا: بھائیو! میں صرف آپ کے انسا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری نیک نیتی سے اپنا فرض ادا کروں گا۔ میں اس ملک میں عدل و انصاف کا جھنڈا سرنگوں نہیں ہونے گا۔ وہ لوگ جو انسانیت کا بول بالا چاہتے ہیں انہیں مجھ سے ایسی نہیں ہوگی اور جو لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اُن کے غلات مجھے آپ سے آگے دیکھیں گے۔ مجھے ہر اس شخص کے تعاد کی ضرورت ہے جو قنوج کو اس کا گھر بنانا چاہتا ہے۔ اس وقت میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔

(۶)

اگلے روز شہر سے باہر ہزاروں لوگ عبدالواحد کو الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ پچاس ہزار سوار جو گرگوٹ کے باشندے تھے عبدالواحد کے ہمارا جانے کے لیے تیار تھے۔ اربیدہ بھی اپنے شوہر کے قریب گھوڑے پر سوار تھی اور یوسف اس کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

”بھیا!“ زبیدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ”آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے؟“
یوسف کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے جواب دیا: ”پگلی کیوں کی۔ میں
تجھے کیسے بھول سکتا ہوں؟“

وہ بولی: ”میں جانے سے پہلے بھابی سے نل سکی، آپ وعدہ کریں کہ اُن کے
ساتھ آپ نگر کوٹ ضرور آئیں گے۔“

میں وعدہ کرتا ہوں، ہم سال میں کم از کم ایک بار ضرور تھارے پاس آیا کریں گے۔“
پھر زبیدہ نے عثمان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ اور بہن طاہرہ بیٹی آئیں گے ہمارے گھر؟“
عثمان نے جواب دیا: ”بہن، ضرور آئیں گے۔ ہم بہت جلد گوالیار جا رہے ہیں
اور وہاں سے آپ کو ملنے نگر کوٹ آئیں گے۔“

”آپ گوالیار کیوں جا رہے ہیں؟ بھیا کے پاس نہیں رہیں گے؟“
”نہیں، اب میں بھی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں وہاں میری زندگی کا مقصد بھی
اسلام کی تبلیغ ہو گا۔“

عبدالواحد نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”اب ہمیں اجازت دیجیے۔“
یوسف اور عثمان نے یکے بعد دیگرے اُس کے ساتھ مصافحہ کیا اور عبدالواحد نے
قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد یوسف اور عثمان ایک ٹیلے پر کھڑے اس قافلے کی آخری جھلک دیکھ
رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ یوسف آہستہ آہستہ یہ الفاظ دہرا
رہا تھا: ”خدا حافظ، میرے بھائی، میرے رفیق، میرے محسن اور میرے رہبر خدا حافظ!“